الکوثر فی تفسیر القرآن

محسن علی نجفی

مصباح القرآن

ٹرسٹ لاہور

الكوثر
في تفسير القرآن

جلد سوم

مُحسن علی نجفی

مِصْبَاحُ الْقُرآن ٹرسٹ۔ لاہور

تفسیر

الانعام۔ الاعراف۔ الانفال۔ التوبة

نام کتاب: الکوثر فی تفسیر القرآن (جلد سوم)
مفسر: محسن علی نجفی
کمپوزنگ و فارمٹنگ: خادم حسین
انتظامی امور: علی حیدری
تعداد: ایک ہزار
باراول: ذی القعدہ ۱۴۳۴ھ رستمبر ۲۰۱۳
مطبع: شوکت پریس۔ لاہور
پیشکش: جامعة الکوثر۔ اسلام آباد
ناشر: مصباح القرآن ٹرسٹ۔ لاہور
فون: 0321 448 1214
ای میل: info@misbahulqurantrust.com
ویب: www.misbahulaqurantrust.com

اس کتاب میں نقل شدہ اکثر روایات کے متن اور حوالوں کی اصلاح و تطبیق، کتب احادیث پر مبنی سافٹ ویئر "جامع الاحادیث" تیار کردہ کمپیوٹر ریسرچ سینٹر آف اسلامک سائنسز اور المحدث سے کی گئی ہے۔

نهج البلاغة کے اکثر اقتباسات کا ترجمہ نهج البلاغة ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ مطبوعہ امامیہ کتب خانہ لاہور سے نقل کیا گیا ہے۔

تشریح کلمات مفردات القرآن راغب اصفہانی، ترجمہ مولانا محمد عبدہ فیروز پوری سے ماخوذ ہے۔

ملنے کا پتہ: محمد علی بک ایجنسی۔ کراچی کمپنی۔ اسلام آباد
معراج کمپنی۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

قارئین کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ!مصباح القرآن ٹرسٹ عہد حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے امت مسلمہ کے لیے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔ ادارہ ہذا کی یہ شہرت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور آپ حضرات کی تائید واعانت کا ثمرہ ہے۔

خالقِ کائنات نے ''انسان'' کو روح و بدن سے مرکب، عقلِ سلیم اور قوتِ گویائی کی نعمات سے مالا مال فرما کر موجوداتِ عالم میں منفرد و ممتاز مقام عطا فرمایا ہے۔ جس طرح بدن کو اپنے ہی اعضا کی تقویت و ارتقا کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح روح کی بلندی اور تازگی کے لیے زہد و تقویٰ سے ملبوس ہو کر علمی تفکر کے میدان میں اترنا پڑتا ہے۔ روحانی تسکین اور معرفت کی بلندیوں سے فیض یاب ہونے کے لیے آیاتِ قرآن پر غور وفکر کرنا، اس کے رموز و حقائق کو سمجھنا اور فرمودات الٰہی پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی گزارنا آخرت کی کامیابی کا باعث ہے۔

بلاشبہ قرآنِ مجید دین اسلام کا حقیقی آئین و دستور ہے۔ دنیا کے ہر طبقہ اور ہر نسل کو اپنی استعداد کے مطابق اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا: کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کو جس قدر بیان اور نشر کیا جاتا ہے اسی قدر اس میں مزید تازگی آجاتی ہے؟ جواب میں امام علیہ السلام نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو نہ ایک زمانے کے ساتھ مخصوص فرمایا، نہ کچھ لوگوں کے ساتھ، بلکہ یہ ہر دور میں جدت اور ہر قوم کے لیے قیامت تک تازگی رکھتا ہے۔''

کامیاب زندگی گزارنے کے لیے دنیا کے ہر شخص کے لیے قرآنی آیات کے مفہوم اور تفاسیر کا سمجھنا ضروری ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر علمائے اسلام نے عربی، فارسی، انگریزی اور دیگر کئی زبانوں میں

قرآن مجید کی بہت سی تفاسیر اور تراجم مرتب فرمائے ہیں۔ اس سلسلے میں برصغیر پاک و ہند کے اہل تشیع و اہل سنت علما نے بھی اردو زبان میں قرآن کریم کے متعدد تراجم وتفاسیر پیش کیے ہیں۔ پاکستان میں اردو زبان میں طبع شدہ اکثر تراجم وتفاسیر انڈیا (لکھنؤ) کے مترجمین ومفسرین کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ لکھنؤ کی اُردو پاکستان کی موجودہ اردو سے ذرا مختلف ہے۔

چونکہ دنیا کا ہر شخص دوسری زبانوں کے علاوہ اپنی قومی زبان بلکہ اپنے خطے کی زبان سے زیادہ مانوس ہوتا ہے لہٰذا خطے کی موجودہ اردو زبان کے پیش نظر اور قرآنی تصریحات کے بارے میں نئی نسل کی طرف سے اٹھنے والے سوالات کے جوابات اور جدید معاندانہ تحریروں اور الزام تراشیوں کے مقابلے میں مکتب اہل بیت علیہم السلام کا موقف بیان کرنے کے لیے ۱۰ جلدوں پر مشتمل زیر نظر تفسیر قرآن "الکوثر فی تفسیر القرآن" کی جلد سوم قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ تفسیری مجموعہ حجۃ الاسلام والمسلمین الشیخ محسن علی نجفی مدظلہ العالیٰ کی غیر معمولی مساعی اور شبانہ روز محنت کا ثمر ہے۔ خداوند عالم اُن کا سایہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے اور انہیں طاقت وصحت کی نعمت سے سرفراز فرمائے۔

اراکین مصباح القرآن ٹرسٹ قبلہ موصوف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ادارہ ہذا کو یہ تفسیری مجموعہ پرنٹ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مزید برآں آپ ہماری کتب مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ:

www.misbahulqurantrust.com

کے ذریعے گھر بیٹھے بھی پڑھ سکتے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق مصباح القرآن ٹرسٹ کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔ اس گوہر نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے اور ادارے کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔

والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاهور۔

پاکستان

سُورَةُ الأَنعَامِ
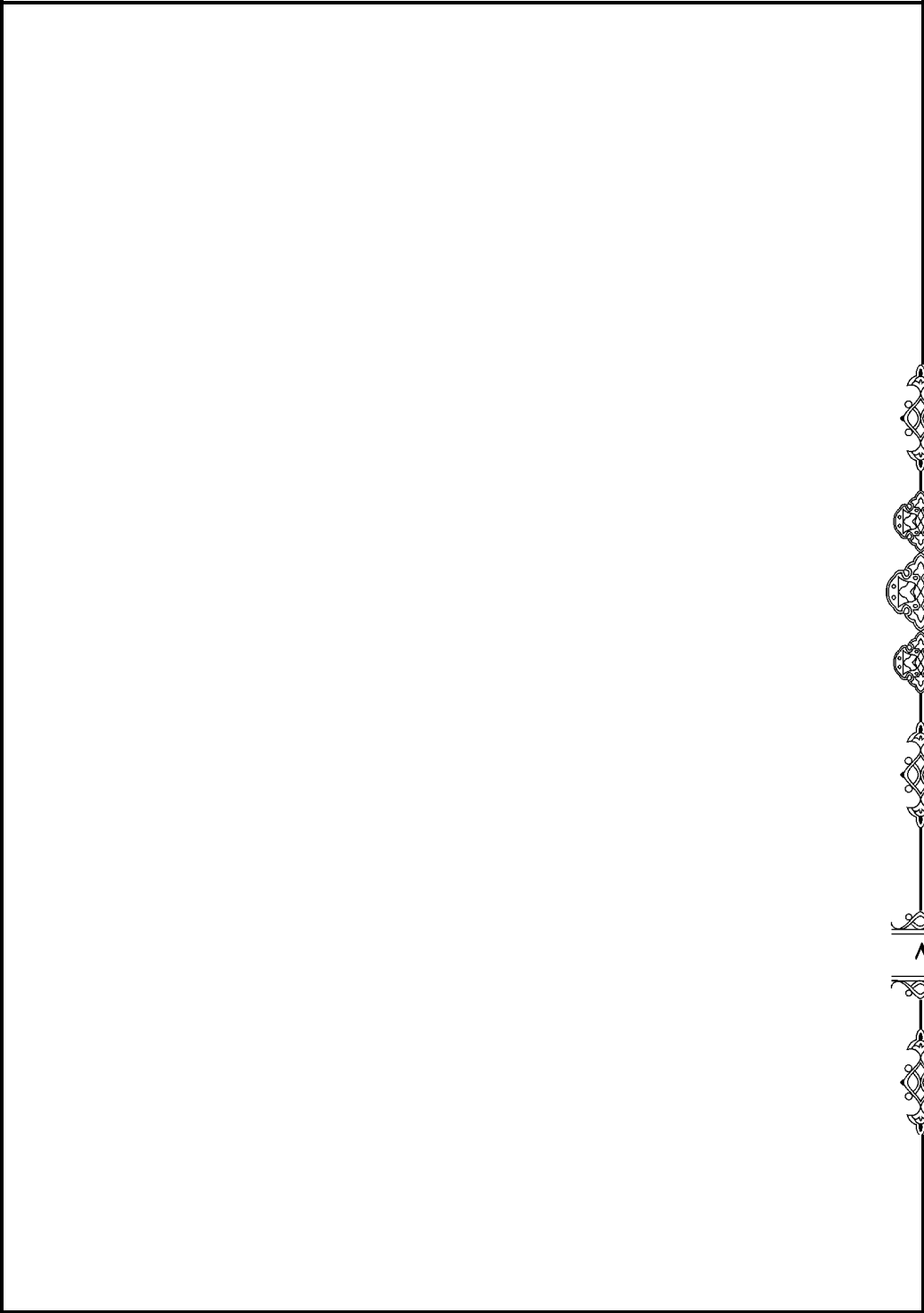
بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن تدریجاً قلب رسولؐ پر نازل ہوا ہے، سوائے اس سورہ کے جو بیک وقت نازل ہوا۔ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ بروایت ابن عباس چھ آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔ دیگر روایات کے مطابق تین آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔

ابی بن کعب کی روایت کے مطابق یہ سورہ ایک ہی رات میں جب بیک وقت نازل ہوا تو ستر ہزار فرشتے تسبیح و تحمید کے ساتھ اس کی مشایعت کر رہے تھے۔

مکی زندگی میں بھی تدوین قرآن کے اہتمام کا یہ عالم تھا کہ جس رات یہ سورہ نازل ہوا، اسی رات حضور (ص) نے اسے قلمبند کرا دیا۔

شان نزول: جس ماحول میں یہ سورہ نازل ہوا ہے، اسے ذہن نشین کرنے سے اس سورہ کے مضامین کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

یہ سورہ مکی زندگی کے تقریباً اواخر میں نازل ہوا۔ اس وقت اسلام کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور اس دعوت کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ مشرکین کی طرف سے مخالفت اور ستم گری بھی انتہائی درجہ کو پہنچ گئی۔ خصوصاً حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجہ (س) کی وفات کے بعد کفار مکہ کی طرف سے ظلم و ستم میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ لوگ حضور (ص) کا تمسخر اڑاتے اور مختلف حربوں سے حضور (ص) کی شان میں گستاخیاں کرتے تھے۔ اس سورہ میں ان تمسخروں کی طرف اشارہ موجود ہے: وَلَقَدِ اسۡتُهۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ ....(آیت ۱۰)

آپ (ص) سے پہلے بھی پیغمبروں کے ساتھ تمسخر کیا گیا۔ مشرکین کی طرف سے دی جانے والی اذیتوں کا اندازہ اس آیت سے ہو جاتا ہے: قَدۡ نَعۡلَمُ اِنَّهٗ لَيَحۡزُنُكَ الَّذِىۡ يَقُوۡلُوۡنَ .... (آیت ۳۳) ہمیں علم ہے کہ ان کی باتوں سے آپ کو رنج پہنچتا ہے۔ آپ (ص) ہر قسم کے مادی سہارے سے بھی محروم تھے اور اسلام قبول کرنے والوں کو بھی جب طرح طرح کی اذیتوں کا نشانہ بنایا جاتا تو اس کی سب سے زیادہ تکلیف بھی آپ (ص) ہی کو محسوس ہوتی تھی اور ایک طویل جہاد کے باوجود خاطر خواہ نتیجہ نہ ملنے کی وجہ سے لوگوں پر یاس و ناامیدی کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہ سورہ اسی قسم کی مشکلات کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ گزشتہ امتوں

نے بھی کامیابی آسانی سے حاصل نہیں کی۔ سنة الاولین یہ ہے کہ فَصَبَرُوۡا عَلٰی مَا کُذِّبُوۡا وَ اُوۡذُوۡا حَتّٰۤی اَتٰہُمۡ نَصۡرُنَا ...[1] اور تکذیب و ایذا پر صبر کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ البتہ ایک امید افزا بات یہ تھی کہ یثرب کے اوس اور خزرج کے بڑے بارسوخ افراد نے رسول (ص) کے ہاتھ پر بیعت کی جو بیعت عقبة کے نام سے مشہور ہے اور یثرب میں کسی مزاحمت کے بغیر اسلام پھیل رہا تھا۔

مضامین: ان حالات میں نازل ہونے والے سورہ کے سامنے سب سے اہم مسئلہ عقیدے کا تھا کہ جو تمام مسائل کی بنیاد ہے اور مشرکین کے ساتھ اصل جنگ شرک و توحید کی تھی۔ اس مقدس جنگ میں حضور (ص) کی طرف سے یہ نعرہ بلند ہوتا تھا: قولوا لا الہ الا اللّٰہ تفلحوا۔ عام حالات میں بھی کسی کے عقیدہ کے خلاف جدید نظریہ قائم کرنا اور اس کو منوانا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن عرب جاہلیت کا مقابلہ تو نہایت ہی مشکل عمل تھا۔ اسلامی نظریہ توحید کو پیش کرتے ہوئے قرآن آفاق و انفس میں موجود اللہ کی نشانیوں میں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے اور مخاطب انسان ہے۔ انسان کی فکر، سوچ، اس کے مضمرات، اس کی جبلت، اس کی انسانیت، اس کا وجدان اور اس کا ضمیر قرآن کا مخاطب ہے۔

----

[1] ٦ انعام ٣۴

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	بنام خدائے رحمن و رحیم
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوۡرَ ۬ؕ ثُمَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱﴾	۱۔ ثنائے کامل اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا، پھر بھی یہ کافر (دوسرے دیوتاؤں کو) اپنے رب کے برابر لاتے ہیں۔

تفسیر آیات

اللہ اپنی حمد و ستائش خود بیان فرماتا ہے کہ حمد و ثنا کی حقیقت بس اللہ کے لیے ہے، ورنہ بندہ نہیں جان سکتا کہ اللہ کی حمد کس طرح ہونی چاہیے۔ اس کے بعد موجب حمد ہونے کے اسباب و صفات میں سے دو صفات بیان ہوئی ہیں: خلق اور جعل کی صفات۔ چنانچہ خلق ایجاد کو کہتے ہیں اور جعل قرار دینے کو کہتے ہیں۔

نور اور ظلمت ایک دوسرے کے ساتھ مفہوم پیدا کرتے ہیں کہ نور نہ ہونے کا نام ظلمت ہے۔ نور کی تعریف میں کہتے ہیں: الظاھر بنفسہ و المظھر لغیرہ۔ نور وہ ہے جو خود نمایاں ہو اور دوسروں کو بھی نمایاں کرے۔ چنانچہ نور جس کا مصدر سورج ہے، مصدر حیات اور مایہ زندگی ہے اور تاریکی، شب، رحمت و نعمت الٰہی ہے اور آرام و سکون کے لیے ایک پرکیف فرصت ہے۔ نور اور ظلمت کا یکے بعد دیگرے آنا، بالفاظ دیگر لیل و نہار کی گردش، اللہ کے اس کائناتی نظام کا اہم حصہ ہے۔ لہٰذا یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ظلمت، نور نہ ہونے کا نام ہے اور مخلوق نہیں ہے۔ بِرَبِّہِمۡ یَعۡدِلُوۡنَ: اس کے باوجود محسوس پرست لوگ اس عظیم رب کو ان بے حس و حرکت اور جامد بتوں کے برابر ٹھہراتے ہیں اور ان سے امیدیں وابستہ رکھتے ہیں۔ یعنی ان کو بھی رَبّ کہتے ہیں، جن کا تخلیق میں کوئی دخل ہے، نہ تدبیر میں۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ: خلق جب اللہ کی طرف منسوب ہوتا ہے تو ایجاد ہے اور ایجاد، عدم سے ہوتی ہے۔

وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوۡرَ: جَعل قرار دینے کو کہتے ہیں۔ یعنی جس طرح روشنی مخلوق ہے، اسی طرح تاریکی بھی اللہ کی مخلوق اور اس کی نشانی ہے۔

اہم نکات

۱۔ جب خلق و جعل، تخلیق وتدبیر اللہ کے ہاتھ میں ہے تو غیر اللہ کے پاس کیا چیز لینے جاتے ہو؟

۲۔ نور وظلمات کا یکے بعد دیگر لانا، اللہ کی طرف سے تدبیر کائنات کا ایک اہم مظہر ہے۔

۳۔ نور اور ظلمت کا ایک ہی خالق ہے۔ مجوسیت کی رد۔

هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ طِیۡنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنۡدَہٗ ثُمَّ اَنۡتُمۡ تَمۡتَرُوۡنَ ﴿۲﴾

۲۔ اسی نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر ایک مدت کا فیصلہ کیا اور ایک مقررہ مدت اس کے پاس ہے، پھر بھی تم تردد میں مبتلا ہو۔

تفسیر آیات

خَلَقَکُمۡ مِّنۡ طِیۡنٍ: انسانی جسم کی تخلیق میں زمینی اجزاء استعمال ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی ایسا عنصر نہیں ہے جو غیر ارضی ہو۔ لہٰذا انسان ایک ارضی اور خاکی مخلوق ہے۔

ثُمَّ قَضٰۤی: یہاں دو مدتوں کا ذکر ہی

۱۔ اَجَلًا: یہ وہ مدت ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا ہے، لیکن اس فیصلے کو مبہم رکھا ہے، چونکہ یہ مدت اللہ تعالیٰ کی لوح محو و اثبات سے مربوط ہے۔ اس کا تعلق انسان کے اعمال و کردار سے ہے۔ مثلاً احادیث کے مطابق درازی عمر کے لیے درج ذیل عوامل مؤثر ہیں:

i۔ صلہ رحم۔ الکافی ۲: ۱۵۷۔ باب صلة الرحم

ii صدقہ۔ الکافی ۴: ۲۔ باب فضل الصدقة

iii۔ دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر الکوثر جلد ۱ صفحہ ۴۹۸۔

iv۔ نیکی (البر) مستدرك الوسائل ۵: ۱۷۷

v۔ زیارۃ قبر الحسین علیہ السلام۔ الوسائل ۱۴: ۴۱۳

۲۔ وَاَجَلٌ مُّسَمًّی: مقررہ مدت ۔ اسے اجل محتوم قطعی، ناقابل تغیر اجل کہتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی اس سنت اور قانون سے متعلق ہے، جس میں تبدیلی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے: وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ۔[1]

---

[1] ۳۳ احزاب: ۶۲

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی رہنمائی کے مطابق انسانی زندگی کو دو قسم کے عوامل کا سامنا ہے: طبیعی اور غیر طبیعی۔ انسان بھی ایک مشینری ہے، جو طبیعی حالات میں ایک معین مدت تک کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کا انحصار مشینری بنانے والے پر ہے لیکن کسی حادثے کی صورت میں اس مشینری کی زندگی مختصر بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا دار و مدار حالات پر ہے۔ بالکل اسی طرح انسان کو اللہ نے طبیعی اعتبار سے، مثلاً ایک سو چالیس (۱۴۰) سال زندہ رہنے کے لیے بنایا ہے، اس کے بعد اسے حتمی طور پر مرنا ہے، جسے اجل مسمیٰ کہا گیا اور اجل محتوم بھی اور اسے طبیعی موت بھی کہتے ہیں لیکن کسی غیر طبیعی علل و اسباب کی وجہ سے انسان کی عمر مختصر بھی ہو جاتی ہے۔ یہ مدت غیر معین ہے چونکہ اس کا دار و مدار حالات پر ہے۔ اس کی موت کو غیر حتمی اور اجل غیر مسمیٰ کہیں گے۔ یہ دونوں مدتیں اللہ ہی کی طرف سے ہیں۔ صرف یہ کہ حتمی اجل فیصلہ کن اور ناقابل تغیر ہے، جب کہ غیر حتمی، قابل تغیر ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ دونوں مدتوں کا تعین علم خدا میں ہے لیکن علم خدا کے باوجود طبیعی تقاضے اپنی جگہ قابل تغیر ہیں۔ انسان کی عمر ایک حتمی ہے اور ایک غیر حتمی۔ غیر حتمی عمر کا بھی اللہ کو علم ہے کہ یہ انسان اپنے اختیار اور پوری خود مختاری سے کون سی مضر صحت چیزوں کا استعمال کرے گا، جس سے اس کی موت جلدی واقع ہو جائے گی، جب کہ اللہ نے اس کے لیے جو طبیعی موت مقرر کی تھی، اس کی مدت اس سے زیادہ تھی۔

۳۔ تمام مشرک قوموں کی رد میں فرمایا: زمین کا دیوتا اور آسمان کا دیوتا الگ الگ نہیں ہے، بلکہ آسمان اور زمین پر ایک ہی اللہ کی حکمرانی ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

هما اجلان اجل موقوف يصنع الله ما يشاء و اجل محتوم۔[1]	اجل دو ہیں: ایک مشروط اجل۔ جس میں اللہ جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے۔ دوسری حتمی اجل ہے۔

اہم نکات

۱۔ نور اور ظلمت کا ایک ہی خالق ہے۔ مجوسیت کی رد۔

۲۔ انسانی جسم کی تخلیق میں ارضی عناصر استعمال ہوئے ہیں اور انسان کو خاک سے پیدا کیا گیا ہے۔

۳۔ انسان کے لیے جہاں ایک حتمی موت مقرر ہے: ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ، وہاں ایک غیر حتمی موت بھی ہے، جو انسان کے اپنے کردار سے مربوط ہے: وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنۡدَہٗ ...۔

۴۔ آسمانوں اور زمین میں ایک ہی خدا کی حکمرانی ہے، متعدد خداؤں کی نہیں۔

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ فِي	۳۔ اور آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی وہی

---

[1] بحار الانوار ۴: ۱۱۶ باب ۳۔ البداء و النسخ۔ المیزان ۷: ۱۴

الۡاَرۡضِ ؕ یَعۡلَمُ سِرَّکُمۡ وَ جَہۡرَکُمۡ وَ یَعۡلَمُ مَا تَکۡسِبُوۡنَ ③

ایک اللہ ہے، وہ تمہاری پوشیدہ اور ظاہری باتوں کو جانتا ہے اور تمہارے اعمال کو بھی جانتا ہے۔

تفسیر آیات

رخ کلام مشرکانہ نظریات کی طرف ہے کہ جن کے ہاں ہر موضوع کے لیے علیحدہ رَبْ ہوتا ہے۔ آسمان کا رَبْ اور ہے اور زمین کا رَبْ کوئی اور۔

اللہ جیسے آسمانوں میں رَبْ ہے، ایسے ہی زمین میں رَبْ ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَ ہُوَ الَّذِیۡ فِی السَّمَآءِ اِلٰہٌ وَّ فِی الۡاَرۡضِ اِلٰہٌ ....[1]

اور وہی ہے جو آسمان میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے۔

یَعۡلَمُ سِرَّکُمۡ وَ جَہۡرَکُمۡ: تمہارے نہاں و عیاں سے واقف ہے تو تمہارے امور کی تدبیر وہ جامد بت نہیں کر سکتے جو تمہارے ظاہری و باطنی حالات سے بے خبر ہیں۔

وَ یَعۡلَمُ مَا تَکۡسِبُوۡنَ: تمہارے ان اعمال سے بھی باخبر ہے جو تمہارے قلب و ضمیر سے مربوط ہیں۔

اہم نکات

۱۔ آسمانوں اور زمین میں ایک ہی خدا کی حکمرانی ہے، متعدد دیوتاؤں کی نہیں۔

۲۔ تمہارے امور کی تدبیر اس ذات کے ہاتھ میں ہے جو تمہارے نہاں و عیاں سے واقف ہے۔

وَ مَا تَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ اٰیَۃٍ مِّنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِمۡ اِلَّا کَانُوۡا عَنۡہَا مُعۡرِضِیۡنَ ④

فَقَدۡ کَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَہُمۡ ؕ فَسَوۡفَ یَاۡتِیۡہِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا مَا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ⑤

۴۔ اور اللہ کی نشانیوں میں سے جو بھی نشانی ان کے پاس آتی ہے یہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

۵۔ چنانچہ جب حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے اسے بھی جھٹلا دیا، پس جس چیز کا یہ لوگ مذاق اڑاتے ہیں اس کی خبر عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گی۔

تفسیر آیات

وَ مَا تَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ اٰیَۃٍ: اللہ کی ربوبیت پر دلالت کرنے والی آیات یکے بعد دیگرے ان کے سامنے آتی رہیں لیکن مشرکین اور مفاد پرستوں کا ہمیشہ یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ الٰہی پیغام کی تکذیب کرتے ہیں اور جب

[1] ۴۳ زخرف: ۸۴

بھی حق کا پیغام ان کے پاس آیا، اس کا مذاق اڑایا۔ جدید جاہلیت کے شکار افراد بھی آیات الٰہی، تعلیمات قرآن اور اسلام کے نظام حیات کا مطالعہ کیے بغیر دین اور دین والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو خبردار فرماتا ہے کہ جس حق بات کا یہ لوگ مذاق اڑا رہے ہیں، اس کا انہیں عنقریب علم ہو جائے گا۔ دنیا میں حق کی فتح و نصرت کی خبریں سنیں گے اور آخرت میں عذاب الٰہی کے ذریعے اس مذاق کا مزہ چکھنا ہوگا۔

یَاۡتِیۡہِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا: یعنی حق کی فتح کی خبر ان تک آنے ہی والی ہے۔ یہ خبر ان کے لیے نہایت گراں گزرے گی کہ کل جس چیز کو وہ اعتنا میں نہیں لاتے تھے بلکہ اس کا تمسخر اڑاتے تھے، آج وہی ان پر غالب آ گئی ہے۔

اہم نکات

۱۔ حق کے ساتھ تمسخر سے پیش آنا جاہلیت قدیم و جدید کا وطیرہ ہے۔

۲۔ حق اپنی طاقت کے ذریعے بالآخر کامیاب ہو جاتا ہے۔

اَلَمۡ یَرَوۡا کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مَا لَمۡ نُمَکِّنۡ لَّکُمۡ وَ اَرۡسَلۡنَا السَّمَآءَ عَلَیۡہِمۡ مِّدۡرَارًا ۪ وَّ جَعَلۡنَا الۡاَنۡہٰرَ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہِمۡ فَاَہۡلَکۡنٰہُمۡ بِذُنُوۡبِہِمۡ وَ اَنۡشَاۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِیۡنَ ﴿۶﴾

۶۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی ایسی قوموں کو نابود کر دیا جنہیں ہم نے زمین میں وہ اقتدار دیا تھا جو ہم نے تمہیں نہیں دیا؟ اور ہم نے ان پر آسمان سے موسلا دھار بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں جاری کر دیں پھر ہم نے ان کے گناہوں کے سبب انہیں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ہم نے اور قومیں پیدا کیں۔

تشریح کلمات

قَرۡنٍ: (ق ر ن) ایک زمانے کے لوگوں یا امت کو کہتے ہیں۔

مِّدۡرَارًا: (د ر ر) صیغہ مبالغہ ہے۔ بہت برسنے والا یہ دَرٌّ سے ہے، جو دودھ کے معنوں میں ہے۔ بارش کے لیے استعارۃً استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یَرَوۡا: یہاں بھی مخاطب وہ مشرکین عرب ہیں جو نہایت تکبر و نخوت سے اہل اسلام کی توہین

کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں اہل اسلام نہایت فقر و تنگ دستی اور بے بسی کے عالم میں تھے۔ اللہ تعالیٰ یہاں سرکش قوموں کی عبرتناک تاریخ سے اہل اسلام کو نوید اور مشرکین کو ان کے انجام کی خبر سنا رہا ہے اور تاریخ کی مقتدر اقوام کے ساتھ ایک تقابل بھی ہے۔

۲۔ مَّكَّنّٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ: وہ سرکش جو اپنے گناہوں کی وجہ سے نابود ہو گئے، وہ تم سے زیادہ مقتدر تھے اور مال و دولت کی فراوانی میں بھی تم سے بہت آگے تھے۔

۳۔ وَاَرۡسَلۡنَا السَّمَآءَ: وہ تمہاری طرح خشک اور بے آب و زرع سرزمین میں نہیں، سرسبز و شاداب اور نہروں والے باغات میں ہوتے تھے۔ چنانچہ نمرود و فرعون کا تو ان مکہ والوں کے ساتھ کوئی تقابل نہیں ہے، بلکہ قوم ثمود بھی ان سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تمدن کی مالک تھی۔

۴۔ مَا لَمۡ نُمَكِّنۡ لَّكُمۡ: ان کے مقابلے میں مکہ والوں کی حیثیت کا اندازہ خطبۂ زہراء سلام اللہ علیہا کے ان جملوں سے ہوتا ہے، جن میں آپ (س) مکہ والوں کی ذلت آمیز زندگی کی تصویر پیش فرماتی ہیں:

وَكُنۡتُمۡ عَلٰى شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ النَّارِ (۳:۱۰۳)	اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ گئے تھے
مذقة الشارب	تم (اپنے دشمنوں کے مقابلے میں) پینے والے کے لیے گھونٹ بھر پانی،
و نهزة الطامع	ایک تر نوالہ،
و قبسة العجلان	تیز چنگاری
و موطئ الاقدام	اور قدموں کے نیچے پامال ہونے والے خس وخاشاک تھے۔
تُشربون الطرق وتقتاتون الورق اذلةً خاسئين	تم بدبو دار کیچڑ والے پانی سے پیاس بجھاتے تھے اور گھاس پھونس سے بھوک مٹاتے تھے۔ تم اس طرح ذلت وخواری کی زندگی بسر کرتے تھے۔
تَخَافُوۡنَ اَنۡ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ من حولكم	تمہیں ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا تھا آس پاس کے لوگ تمہیں کہیں اچک نہ لیں۔
فانقذكم اللّٰه تبارك و تعالی بمحمّد صلی اللّٰه علیه و آله.[1]	ایسے حالات میں اللہ نے تمہیں محمد صلی اللّٰه علیه و آله کے ذریعے نجات دی۔

---

[1] بحار الانوار ۲۹: ۲۲۳

اہم نکات

۱۔ سرکشی کا انجام نابودی و ہلاکت ہے۔

۲۔ وقتی خوشحالی اور مال و دولت کی فراوانی آزمائش ہے۔ اس سے غلط فہمی نہ ہو کہ یورپ ناز و نعمت میں ہے۔

وَلَوۡ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ کِتٰبًا فِیۡ قِرۡطَاسٍ فَلَمَسُوۡہُ بِاَیۡدِیۡہِمۡ لَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ ھٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ۝۷

۷۔ اور (اے رسول) اگر ہم کاغذوں پر لکھی ہوئی کوئی کتاب (بھی) آپ پر نازل کرتے اور یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے اسے چھو بھی لیتے تب بھی کافر یہی کہتے کہ یہ ایک صریح جادو کے سوا کچھ نہیں۔

تفسیر آیات

مشرکین کی طرف سے کفر و انکار، قرآنی دلیل و برہان کی کمزوری کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے کہ اگر آسمان سے کاغذوں پر لکھی ہوئی کتاب بھی نازل ہو جائے، جیسا کہ بعض مشرکین کا مطالبہ تھا اور یہ لوگ حس بصارت و سماعت کے ساتھ حس لامسہ یعنی چھو کر بھی دیکھ لیں، پھر بھی یہ اس دین پر ایمان نہیں لائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ معاند کے انکار کی صورت میں قوت دلیل فائدہ مند نہیں ہوتی: وَلَوۡ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ کِتٰبًا...

۲۔ سطحی فکر رکھنے والے محسوس پرست ہونے کے باوجود حسی دلیل کو بھی نہیں مانتے: فَلَمَسُوۡہُ بِاَیۡدِیۡہِمۡ۔

وَقَالُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡہِ مَلَکٌ ؕ وَلَوۡ اَنۡزَلۡنَا مَلَکًا لَّقُضِیَ الۡاَمۡرُ ثُمَّ لَا یُنۡظَرُوۡنَ ۝۸

۸۔ اور کہتے ہیں: اس (پیغمبر) پر فرشتہ کیوں نازل نہیں کیا گیا اور اگر ہم نے فرشتہ نازل کر دیا دیا ہوتا تو (اب تک) فیصلہ بھی ہو چکا ہوتا پھر انہیں (ذرا) مہلت نہ دی جاتی۔

وَلَوۡ جَعَلۡنٰہُ مَلَکًا لَّجَعَلۡنٰہُ رَجُلًا وَّلَلَبَسۡنَا عَلَیۡہِمۡ مَّا یَلۡبِسُوۡنَ ۝۹

۹۔ اور اگر ہم اسے فرشتہ قرار دیتے بھی تو مردانہ (شکل میں) قرار دیتے اور ہم انہیں اسی شبہ میں مبتلا کرتے جس میں وہ اب مبتلا ہیں۔

تفسیر آیات

مشرکین ایک بہانہ یہ تراشتے تھے کہ اگر یہ شخص اللہ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوتا تو اس کے ساتھ ایک فرشتہ بھی ہوتا جو اس کی تائید کرے، دشمنوں کی اذیت سے محفوظ رکھے اور پیغام رسانی میں اس رسول کا ساتھ دے۔ چنانچہ سورہ فرقان آیت ۷ میں اس مطالبے کا ذکر آیا ہے:

... لَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مَلَکٌ فَیَکُوۡنَ مَعَہٗ نَذِیۡرًا ۙ	اس پر کوئی فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوتا؟ تا کہ اس کے ساتھ تنبیہ کر دیا کرے۔

جواب میں فرمایا:

اولاً: اگر ہم نے فرشتہ نازل کر دیا ہوتا تو اب تک فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ کیونکہ سنت الٰہی یہ ہے کہ جب اس قسم کے معجزات کا مطالبہ قبول ہوتا ہے، پھر بھی کفار ایمان نہیں لاتے ہیں تو پھر مہلت کا امکان ختم ہو جاتا ہے اور فوری عذاب نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ نزول مائدہ کے بارے میں فرمایا:

اِنِّیۡ مُنَزِّلُہَا عَلَیۡکُمۡ ۚ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بَعۡدُ مِنۡکُمۡ فَاِنِّیۡۤ اُعَذِّبُہٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُہٗۤ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ ۠	... میں یہ خوان تم پر نازل کرنے والا ہوں، لیکن اگر اس کے بعد تم میں سے کوئی کفر اختیار کرے گا تو اسے میں ایسا عذاب دوں گا کہ اس جیسا عذاب عالمین میں سے کسی کو نہ دیا ہو گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک ایمان بالغیب ہے اور تعقل و تفکر کے ذریعے ایمان کی دعوت دی جاتی ہے تو مہلت بھی مل جاتی ہے لیکن جب یہ ایمان شہود میں آ گیا اور تعقل و تفکر سے گزر کر مرحلہ مشہودات اور محسوسات میں داخل ہوگیا تو پھر مہلت کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ امتحان و آزمائش کی مزید گنجائش نہیں رہتی۔ اب نتیجہ آزمائش اور عذاب کا مرحلہ آ جاتا ہے۔

وَلَوۡ جَعَلۡنٰہُ: ثانیاً اگر ہم فرشتے بھیج دیں تو تمہیں وہی اشتباہ پیش آئے گا جواب پیش آ رہا ہے۔ کیونکہ اگر ہم فرشتے کو انسانوں کو پیغام دینے اور ان کی ہدایت کے لیے بھیجتے تو لازماً لوگ انہیں دیکھتے، ان سے ہم کلام ہوتے۔ اطاعت الٰہی کے لیے وہ فرشتہ نمونہ ہوتا تو وہ بھی انسانوں کی طرح مکلّف ہوتا۔ وہ انسانوں جیسی تکالیف اٹھائے تو نمونہ بنے۔ اس صورت میں وہی ساری بشری خاصیتیں اس میں ہوتیں تو پھر وہی اشتباہ پیش آتا جواب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے سلسلے میں پیش آ رہا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کفر و عناد کے باوجود اللہ اپنی رحمت واسعة سے عذاب نازل کرنے میں جلدی نہیں کرتا۔

۲۔ انسان کو خودمختارانہ طور پر آزمائش میں ڈالنے کے لیے ضروری ہے کہ فرشتے بھیج کر فوق الفطرت

طاقت استعمال نہ کی جائے۔

۳۔ انتہائی مرحلے کی حجت پوری ہونے کے بعد آزمائش کا دور ختم اور عذاب کا دور شروع ہو جاتا ہے. لَّقُضِیَ....

وَ لَقَدِ اسۡتُہۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ فَحَاقَ بِالَّذِیۡنَ سَخِرُوۡا مِنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ اور آپ سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ تمسخر ہوتا رہا ہے آخرکار تمسخر کرنے والوں کو اسی بات نے گرفت میں لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

تشریح کلمات

حاق: (ح ی ق) الحیوق و الحیقان کے معنی کسی چیز کو گھیرنے اور اس پر نازل ہونے کے ہیں۔ وَلَا یَحِیۡقُ الۡمَکۡرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَہۡلِہٖ ...[1] بری چال کا وبال اس کے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے.

تفسیر آیات

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیابی اور فتح کی خوش خبری ہے کہ تمسخر کرنے والوں کا انجام کیا ہوگا اور ساتھ ہی تمسخر کرنے والوں کے لیے بھی ان کے انجام بد کی خبر دے دی گئی ہے۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مکہ میں دی جانے والی یہ خبر سو فیصد صحیح ثابت ہوئی۔

اہم نکات

۱ سنت الٰہی ہے کہ تمسخر کرنے والے اسی بات کی گرفت میں آئے، جس کا وہ تمسخر کرتے تھے۔

۲۔ تمسخر خود دلیل اور منطق کے فقدان کی علامت ہے۔

قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ ثُمَّ انۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ (ان سے) کہد یجیے: زمین میں چلو پھرو پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے؟

تفسیر آیات

عربوں کی نقل و حرکت صرف تجارتی مقاصد کے لیے تھی۔ مطالعۂ تاریخ کی غرض سے سیر فی الارض ایک جدید طریقہ تحقیق ہے، جس کا عربوں کو علم ہی نہ تھا۔ اس طرز فکر سے انہیں معلوم ہوجاتا ہے کہ

----

[1] ۳۵ فاطر: ۴۳

باطل پرست قوموں کے آثار قدیمہ اور بڑی تہذیبوں اور بڑی سلطنتوں کے باقی ماندہ کھنڈرات ان کے انجام بد کی گواہی دے رہے ہیں۔ اس طریقہ فکر سے انسانی تاریخ کو نئی جہت مل گئی۔ آل عمران آیت ۱۳۷ میں مزید تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

اہم نکات

۱۔ جغرافیہ، تاریخ اور اثریات کا مطالعہ مسلم طالب علم کے لیے ضروری ہے۔

۲۔ عبرت پذیری کی غرض سے سفر کرو۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

۱۲۔ان سے پوچھ لیجیے: آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ کہد یجیے: (سب کچھ) اللہ ہی کا ہے، اس نے رحمت کو اپنے پر لازم کر دیا ہے، وہ تم سب کو قیامت کے دن جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ضرور بہ ضرور جمع کرے گا جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال رکھا ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلْ لِّمَنْ : مشرکین جب اس بات کو تسلیم کر لیتے تھے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس کا مالک اللہ ہے تو ان پر حجت قائم ہوگئی کہ پھر اللہ کو چھوڑ کر تم بتوں سے کیا لینا چاہتے ہو۔

۲۔ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ : اللہ تعالیٰ نے خود رحمت کو اپنے پر لازم کر دیا ہے۔ واضح رہے رحمت، ذات الٰہی کا لازمۂ ذات ہے۔ ممکن نہیں ذات الٰہی ہو اور اس سے رحمت کا فیض جاری نہ ہو۔ اللہ کے بارے میں اہل علم میں یہ مقولہ مشہور ہے: لا انقطاع فی الفیض۔ لہٰذا یہ بات ناقابل تصور ہے کہ ذات خداوندی سے فیض رحمت کا سلسلہ ایک لمحے کے لیے بھی بند ہو۔ لہٰذا كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قرارداد کے ذریعے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے۔ وہ ارحم الراحمین ہے۔ وہ انسان کی تخلیق میں رحیم ہے کہ انسان کو احسن تقویم کے سانچے میں ڈھالا۔ وہ انسان کے لیے تسخیر کائنات میں رحیم ہے۔ وہ انسان کی تعلیم و تربیت میں رحیم ہے۔ اس کی ہدایت و رہنمائی میں رحیم ہے۔ عفو و درگزر میں رحیم ہے۔ قیامت کے دن قائم ہونے والی عدالت گاہ میں بھی رحیم و کریم ہے۔ اس رحیم و کریم رب کو چھوڑ کر بتوں کے سامنے کس لیے جھکتے ہو؟ جاہلیت جدید میں دولت و اقتدار والوں کے سامنے

کس لیے جھکتے ہو؟

رحمت اللہ پر واجب ہے: خود اللہ نے اپنے ذمے رحمت کو واجب و لازم گردانا ہے، کسی اور کی طرف سے نہیں۔ لہٰذا اشعریہ کا یہ عقیدہ قطعاً فاسد ہے، جو کہتے ہیں: اللہ پر کوئی شے واجب نہیں ہے۔ اللہ جو چاہے کرسکتا ہے، مؤمنین کو جہنم اور کفار کو جنت بھیج سکتا ہے، البتہ ایسا کرنے کا اللہ عادی نہیں ہے۔

لَیَجۡمَعَنَّکُمۡ : اس رحمت الٰہی کا لازمہ ہے کہ اپنے بندوں کے نیک اعمال کا ثواب دینے کے لیے قیامت کے دن سب کو جمع کرتا ہے، پھر ان پر اپنی رحمتوں کا نزول فرماتا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ : اس وقت معلوم ہو جائے گا کہ ایمان نہ لانے والے اس رحمت سے محروم رہ کر کس قدر خسارے میں ہوں گے۔

رسول کریمؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ رَحْمَتِی سَبَقَتْ غَضَبِی۔[1]　　میری رحمت میرے غضب سے پہلے ہے۔

اہم نکات

انسان کو اس رب سے ساری امیدیں رکھنی چاہئیں جو:

i۔ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے،

ii۔ جس نے رحمت کو اپنے ذمے لازم قرار دے دیا ہے۔ یہ رحمت، ذات الٰہی کا لازمہ ہے۔

iii۔ قیامت کے دن اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔

وَ لَہٗ مَا سَکَنَ فِی الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ ؕ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ اور جو (مخلوق) رات اور دن میں بستی ہے وہ سب اللہ کی ہے اور وہ بڑا سننے والا جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَہٗ مَا سَکَنَ : ہر وہ موجود اللہ تعالیٰ کے قبضۂ ملکیت میں ہے، جو رات اور دن میں سکونت اختیار کیے ہوئے ہے۔ دن کو اپنی بقا کے لیے سعی کرتے ہیں، رات کو خرچ شدہ توانائی، انرجی کا اعادہ اور تلافی کرتے ہیں۔ اس طرح گردش لیل و نہار میں ان کی بقا و ارتقا کا راز مضمر ہے۔ ان سب کے امور حیات کی تدبیر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ : رات کی تاریکی میں اٹھنے والی آوازیں ہوں یا دن کی شورش، پردۂ شب میں ہونے والی جنبش ہو یا دن کی روشنی، سب یکساں طور پر اللہ کے سامنے ہیں۔

---

[1] اصول الکافی ۲: ۲۷۴۔ باب الذنوب

اہم نکات

۱۔ لیل و نہار کی گردش کے ذریعے تدبیر امور اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

قُلۡ اَغَیۡرَ اللّٰہِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ ہُوَ یُطۡعِمُ وَ لَا یُطۡعَمُ ؕ قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَکُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَسۡلَمَ وَ لَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ کہد یجیے: کیا میں آسمانوں اور زمین کے خالق اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا آقا بناؤں؟ جب کہ وہی کھلاتا ہے اور اسے کھلایا نہیں جاتا، کہد یجیے: مجھے یہی حکم ہے کہ سب سے پہلے اس کے آگے سر تسلیم خم کروں اور یہ (بھی کہا گیا ہے) کہ تم ہرگز مشرکین میں سے نہ ہونا۔

تشریح کلمات

فَاطِرِ: (ف ط ر) الفطر۔ شق ہونے کے معنوں میں ہیں جیسے میں شق ہونے کے معنوں میں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اَغَیۡرَ اللّٰہِ: اگر کسی کی عبادت اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ خالق ہے تو آسمان اور زمین کا خالق اللہ ہے۔ اگر عبادت کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہماری جانوں کا مالک ہے تو اللہ ہی ہر مخلوق کا مالک ہے۔

۲۔ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ: میرا آقا وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا ایجاد کرنے والا ہے۔ فَطَرَ کے لغوی معنی شق کرنے کے ہیں اور یہ ایجاد کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو عدم کی تاریکی کو شق کر کے وجود کی روشنی عنایت فرمائی۔

۳۔ وَ ہُوَ یُطۡعِمُ: اگر عبادت کے سامنے یہ محرک موجود ہے کہ وہ منعم ہے، اس کی طرف سے نعمت کی فراوانی ہے، تو وہ ذات بھی اللہ ہی ہے۔ لہٰذا تمام جدید و قدیم بتوں کو چھوڑ کر اسی کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہوگا اور اسی کو اپنا آقا اور مولا بنانا ہوگا۔

۴۔ قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ: رسول (ص) کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ تسلیم و رضا میں اول درجہ پر فائز رہیں۔

۵۔ وَ لَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ: اور آپ ہرگز مشرکین میں سے نہ ہونا۔ اس خطاب میں یہ مطلب

ہرگز نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی قسم کا شرک سرزد ہونے کا خطرہ تھا، بلکہ یہ بتانے کے لیے کہ شرک ایک ہلاکت ہے اور ابدی زندگی کی تباہی ہے۔

اہم نکات

۱۔ کائنات میں حق ولایت صرف اللہ کے پاس ہے یا اس کے پاس جسے وہ ولایت عطا کرے۔

۲۔ رازق وہ ہے جو خود رزق کا محتاج نہ ہو۔

۳۔ رسول کریم (ص) بلحاظ درجہ و رتبہ اول المسلمین ہیں اور بلحاظ زمان بھی۔

۴۔ بت پرستی خواہ جس شکل و صورت میں ہو، مسلم کو ہمیشہ یہ حکم ہے: قُلۡ اَغَیۡرَ اللّٰہِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا ۔۔۔۔

قُلۡ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ (یہ بھی) کہدیجیے: اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

مَنۡ یُّصۡرَفۡ عَنۡہُ یَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمَہٗ ؕ وَ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ جس شخص سے اس روز یہ (عذاب) ٹال دیا گیا اس پر اللہ نے (بڑا ہی) رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔

وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ہُوَ ؕ وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ بِخَیۡرٍ فَہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ اور اگر اللہ تمہیں ضرر پہنچائے تو خود اس کے سوا اسے دور کرنے والا کوئی نہیں اور اگر وہ تمہیں کوئی بھلائی عطا کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَ ہُوَ الۡقَاہِرُ فَوۡقَ عِبَادِہٖ ؕ وَ ہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور وہی بڑا حکمت والا، باخبر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اِنِّیۡۤ اَخَافُ: مجھے خوف ہے۔ مشرکین عذاب کے خوف سے بچنے کے لیے بتوں کو شفیع بناتے تھے۔ اس آیت میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس تصور کو رد کیا ہے کہ معصیت کی صورت میں کوئی فرد یا کوئی قوم یا کوئی نژاد عذاب سے بچ سکتی ہے۔ یہاں حکم ہوا ہے کہ حضور ؐ اپنی ذات کو پیش کریں کہ اگر میں خود اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے عذاب کا خوف ہے۔ معصیت کی صورت میں اللہ کے عدل سے خوف آنا چاہیے۔

۲۔ مَنۡ یُّصۡرَفۡ عَنۡہُ: اگر کوئی اس یوم عظیم کے خوف سے بچا سکتا ہے تو وہ صرف اللہ ہے، بت

نہیں۔ اسی طرح اگر کسی خطرے سے بچانے والا کوئی ہے تو بھی وہی ذات ہے۔ اگر کوئی نعمت عطا کرنے والا ہے تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ اگر تمام بندوں پر کامل اختیار رکھنے والا کوئی ہے تو وہ ذات بھی صرف اللہ ہی ہے۔

۳۔ فَقَدۡ رَحِمَہٗ: اس جملے سے واضح ہوا کہ معصیت کی صورت میں بھی عذاب ٹل سکتا ہے۔ اس کے لیے اللہ کی رحمت کا قائل ہونا چاہیے۔ بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی رحمت کے لیے اہل بنائے تو یہ عذاب ٹل سکتا ہے۔ چونکہ رحمت الٰہی کا اہل ہونے کے بعد رحمت کا شامل حال ہونا لازمی ہے۔

۴۔ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡمُبِیۡنُ: اللہ کی رحمت کے حصول میں کامیابی سے زیادہ کوئی کامیابی نہیں ہے۔ لہٰذا اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ قدیم و جدید بتوں کی چوکھٹ پر دستک دینے کی بجائے اللہ کی بارگاہ کی طرف رجوع کریں۔

۵۔ وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ: اگر اللہ کے وضع کردہ نظام کے تحت آپ کو کوئی ضرر پہنچ جائے، کوئی مرض یا فقر لاحق ہو جائے، کوئی طوفان آ جائے تو اس سے بچانے کے لیے خود اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم (ص) سے مروی دعا میں آیا ہے:

لَا مَلْجَأً وَ لَا مُنْجَی وَ لَا مَفَرَّ مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ۔[1]

خود تیری جانب کے سوا نہ کوئی پناہ ہے، نہ جائے نجات، نہ جائے فرار ہے۔

۶۔ وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ بِخَیۡرٍ: اگر اللہ کی طرف سے صحت، مال و دولت اور آسائش میسر آ جائے تو ان سب چیزوں پر اللہ کو قدرت حاصل ہے۔ فقر و تنگدستی سے دوچار کرنے اور مال و دولت سے مالا مال کرنے پر اللہ کو قدرت حاصل ہے۔

۷۔ وَ ہُوَ الۡقَاہِرُ فَوۡقَ عِبَادِہٖ: اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں پر ایسا غلبہ حاصل ہے کہ اس کی مشیت کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ اس جگہ روح المعانی کی تفسیر قابل مطالعہ ہے، جو کہتے ہیں:

ان اللّٰه ذات قائم بنفسه غير لخالط للعالم۔

اللہ بذات خود قائم ہے۔ عالم کے ساتھ مخلوط نہیں ہے۔

پھر آگے وہ حدیث نقل کرتے ہیں، جس میں رسول اللہؐ نے فرمایا:

ان اللّٰه فوق عرشه و عرشه فوق سماواته و قال باصابعه مثل القبة و انه ليئط به اطيط الرحل الجديد براكبه.

اللہ اپنے عرش پر ہے۔ اس کا عرش اس کے آسمانوں کے اوپر ہے۔ پھر اپنی انگلیوں کے اشارے سے بتایا: گنبد کی طرح اور اللہ (کے بیٹھنے) سے عرش میں چڑچڑاہٹ ہوتی جس طرح نئی زین پر سوار کے بیٹھنے سے ہوتی ہے۔

---

[1] الفقیه ۱: ۳۰۳ باب وصف الصلاة عن فاتحتها الى خاتمة

اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے لیے فوق مکانی کے قائل ہیں، جب کہ یہاں فوق سے مراد قوت و غلبہ ہے۔ جیسا کہ فرعون نے کہا تھا: وَ اِنَّا فَوۡقَہُمۡ قٰہِرُوۡنَ[1] اور سورہ آل عمران میں فرمایا: وَ جَاعِلُ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡکَ فَوۡقَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا ...[2]

۸۔ وَ ہُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ: اس قوت و غلبہ کے باوجود اللہ جو بھی عمل انجام دیتا ہے، وہ حکمت و دانائی کی بنیاد پر انجام دیتا ہے۔ کسی کو مال و دولت سے مالا مال کرنا یا کسی کو فقیر و تنگدست بنانا، اپنے حکیمانہ عمل کے تحت ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ معصیت کی صورت میں اللہ کے عدل سے خوف رکھنا چاہیے: اِنِّیۡۤ اَخَافُ ...۔

۲۔ ہمیشہ اللہ کی رحمت سے امیدیں وابستہ رکھنی چاہئیں: فَقَدۡ رَحِمَہٗ ...۔

۳۔ دفع بلا و جذب عطا کے سلسلے میں کامل اختیار اسی کو حاصل ہے۔

قُلۡ اَیُّ شَیۡءٍ اَکۡبَرُ شَہَادَۃً ؕ قُلِ اللّٰہُ ۟ۙ شَہِیۡدٌۢ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ ۟ وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّکُمۡ لَتَشۡہَدُوۡنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِہَۃً اُخۡرٰی ؕ قُلۡ لَّاۤ اَشۡہَدُ ۚ قُلۡ اِنَّمَا ہُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ کہد یجیے: گواہی کے لحاظ سے کون سی چیز سب سے بڑی ہے؟ کہد یجیے: اللہ ہی میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور جس تک یہ پیغام پہنچے سب کو تنبیہ کروں، کیا تم یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ کہد یجیے: میں تو ایسی گواہی نہیں دیتا، کہد یجیے: معبود تو صرف وہی ایک ہے اور جو شرک تم کرتے ہو میں اس سے بیزار ہوں۔

تفسیر آیات

قُلۡ اَیُّ شَیۡءٍ: سوال گواہ کی بڑائی کے بارے میں ہوا کہ کون سب سے بڑا گواہ ہے؟ جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ اللہ سب سے بڑا گواہ ہے، بلکہ فرمایا: اللہ ہی گواہ ہے۔ اللہ کی گواہی کا کسی دوسرے کی گواہی کے ساتھ موازنہ کر کے اس کے مقابلے میں اللہ کی گواہی کو سب سے بڑی گواہی قرار دینا صحیح نہیں، کیونکہ حقیقی گواہ صرف اللہ ہے۔

---

[1] ۷ اعراف: ۱۲۷ [2] ۳ آل عمران: ۵۵

وَاُوۡحِیَ اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ: اللہ کی طرف سے بڑی گواہی اس قرآن کی وحی ہے۔ یہ قرآن ایک ایسا معجزہ ہونے کے اعتبار سے گواہی ہے، جس کا مقابلہ کرنے سے لوگ عاجز آ گئے۔

۱۔ گواہی یا شہادت شہود و حضور سے ہے کہ کسی چیز کی شہادت اس وقت دی جا سکتی ہے کہ اس پر علم و آگہی میں مقام شہود و حضور پر فائز ہو۔ لہٰذا جس کا احاطہ علم سب سے زیادہ ہوگا اس کی گواہی بھی سب سے بڑی ہو گی۔ لہٰذا اللہ جو اس کائنات کے ذرے ذرے پر اس کے وجود میں آنے سے بھی پہلے علم رکھتا ہے، اس کی گواہی سب سے بڑی ہے، بلکہ گواہی صرف اسی کی گواہی ہے۔

۲۔ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِہٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ: تا کہ میں تمہاری اور جس جس تک یہ پیغام پہنچے، سب کی تنبیہ کروں۔ اس جملے سے قرآن کا ایک دائمی منشور ہونا ثابت ہوتا ہے کہ تا قیامت جن جن لوگوں تک یہ الٰہی پیغام پہنچے، ان سب کے لیے یہ قرآن دستور حیات ہے اور خاتم ادیان بھی ہے۔

۳۔ قرآن کا ایک دائمی منشور اور جامع نظام حیات ہونا خود اپنی جگہ ایک چیلنج ہے، ان لوگوں کے لیے جو اس قرآن اور قرآنی نظریہ توحید پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس چیلنج کے بعد ایک قوت، منطق اور طاقت دلیل کے لہجے میں سوال فرماتا ہے: اَئِنَّکُمۡ لَتَشۡہَدُوۡنَ.... کیا اس کے باوجود تم یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ اور معبود ہیں؟ یقیناً کائنات کا نظام وحدت، وحدت خالق کی گواہی دیتا ہے اور کائنات کا ہر ذرہ یہ گواہی دیتا ہے کہ اس کی خلقت میں ایک ہی خالق کا ہاتھ ہے اور وحدت فطرت، وحدت جبلت، وحدت خلقت، کی طرف سے یہ صدا ہے: اِنَّمَا ہُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ....

اہم نکات

۱۔ اس دین کی پائداری، جامعیت اور ہر دور کے انسانوں کے لیے ایک چیلنج کے ذریعے اللہ نے اپنے رسول کی حقانیت پر ہر زمانے میں گواہی دی ہے۔

۲۔ قرآن قیامت تک کے لوگوں کے لیے دائمی منشور ہے، خواہ انسان جتنی بھی ترقی کر لے: وَ مَنۡۢ بَلَغَ....

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَہُمۡ ۘ اَلَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ فَہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ﴿۲۰﴾

۲۰۔ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اس (رسول) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال رکھا ہے، پس وہی ایمان نہیں لائیں گے۔

وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوۡ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ ؕ اِنَّہٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۱﴾	۲۱۔ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ افترا کرے یا اس کی آیات کو جھٹلائے؟ یقیناً ایسے ظالم کبھی نجات نہیں پائیں گے۔

تفسیر آیات

اہل کتاب پر نازل ہونے والی کتابوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف و شمائل ایسے بیان ہوئے تھے کہ وہ ان کو پہچاننے میں کسی اشتباہ یا دقت کا شکار نہ ہوتے تھے، بلکہ ایک باپ اپنے بیٹے کو ہزاروں میں سے بلاتردد جس طرح پہچان لیتا ہے، اسی طرح وہ رسول کریمؐ کو بھی پہچانتے تھے۔ چنانچہ تفسیر قمی میں آیا ہے:

> حضرت عمر نے عبد اللہ بن سلام (نومسلم) سے پوچھا: کیا آپ لوگ اپنی کتاب میں محمد (ص) کو پہچانتے تھے؟
> کہا: قسم بخدا ہم نے محمد (ص) کو آپ لوگوں کے درمیان دیکھا تو انہیں انہی صفات کا حامل پایا جو ہمارے ہاں بیان ہوئی تھیں۔ ان کو بالکل اسی طرح پہچانا جس طرح ہم اپنے بیٹے کو دوسرے لڑکوں کے درمیان پہچان لیتے ہیں۔[1]

لہٰذا اہل کتاب کسی اشتباہ یا غلط فہمی کی وجہ سے اس رسولؐ کے منکر نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ ان کو رسول برحق جاننے کے باوجود نہیں مانتے:

اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَہٗ مَکۡتُوۡبًا عِنۡدَہُمۡ فِی التَّوۡرٰىۃِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ ...[2]	جو لوگ اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جو نبی امی کہلاتے ہیں جن کا ذکر وہ اپنے ہاں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

اَلَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا: وہ رسول (ص) کی تکذیب کر کے پہلے ہی اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈال چکے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے اٹل فیصلے کی زد میں آ چکے ہیں، اس کے بعد ایمان نہیں لائیں گے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ حَقَّتۡ عَلَیۡہِمۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ اِنَّ الَّذِیۡنَ حَقَّ[3]	جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا فیصلہ قرار پا چکا ہے، وہ یقیناً ایمان نہیں لائیں گے۔

وَمَنۡ اَظۡلَمُ: ظلم و زیادتی کی نوعیت کو پرکھنے کے لیے اگر کوئی پیمانہ ہے تو اس ظلم سے زیادہ کون سا ظلم ہو سکتا ہے، جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی قدسیت سے ہو۔ واضح رہے کہ افتراء ایک ایسا جرم ہے کہ

---

[1] تفسیر القمی ۱: ۱۹۵ سورۃ الانعام [2] ۷ اعراف: ۱۵۷ [3] ۱۰ یونس: ۹۶

اگر کسی مؤمن یا مؤمنہ پر زنا کی تہمت لگائی جائے تو اسّی کوڑوں کی سزا ہے۔ اگر رسول اللہ (ص) کی طرف کوئی بات جھوٹی منسوب کی جائے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ رسول اللہ (ص) سے روایت ہے:

فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔[1] جو میری طرف جھوٹی نسبت دے، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے۔

اگر یہ جھوٹی نسبت اللہ کی طرف ہو تو جرم انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔

لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ: فلاح سے مراد سعادت ہے۔ یہ ایک کلیہ ہے کہ جو ظلم کی اس سطح کو پہنچ جائے گا، اس کے لیے کوئی سعادت نہیں ہے۔

اہم نکات

کل کے اہل کتاب رسول (ص) کی شخصیت کو ایسے پہچانتے تھے، جیسے اپنے بیٹوں کو۔ آج کے اہل کتاب اس دین کی حقانیت کو بھی ایسے ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ اور جس دن ہم تمام لوگوں کو جمع کریں گے پھر ہم مشرکوں سے پوچھیں گے: تمہارے وہ شریک اب کہاں ہیں جن کا تمہیں زعم تھا؟

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ پھر ان سے اور کوئی عذر بن نہ سکے گا سوائے اس کے کہ وہ کہیں: اپنے رب اللہ کی قسم ہم مشرک نہیں تھے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

۲۴۔ دیکھیں: انہوں نے اپنے آپ پر کیسا جھوٹ بولا اور جو کچھ وہ افترا کرتے تھے کس طرح بے حقیقت ثابت ہوا؟

تفسیر آیات

۱۔ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ: بروز قیامت مشرکین کے لیے یہ خطاب ہوگا کہ وہ اپنے ان دیوتاؤں کو تلاش کریں، جن سے انہوں نے ساری امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں کہ وہ ان کی شفاعت کریں گے اور ان کو نجات دلائیں گے۔

مشرکین جواب میں یہ عذر پیش کریں گے اور قسم کھائیں گے کہ ہم مشرک نہ تھے:

---

[1] الکافی ۱: ۶۲ صحیح البخاری، کتاب الجنائز، ۵: ۳۷ باب ۳۳

يَوۡمَ يَبۡعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيۡعًا فَيَحۡلِفُوۡنَ لَهٗ كَمَا يَحۡلِفُوۡنَ لَكُمۡ ....[1]

جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ اسی طرح اللہ کے سامنے قسمیں اٹھائیں گے جس طرح تمہارے سامنے قسمیں اٹھاتے ہیں۔

اگرچہ آخرت میں حقائق کا مشاہدہ کرنے اور يَوۡمَ تُبۡلَى السَّرَآئِرُ اس دن تمام راز فاش ہو جائیں گے، کی وجہ سے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تاہم وہی طرز قسم جو دنیا میں کھایا کرتے تھے۔ جو لوگ دنیا میں جس خلق وخو کے مالک رہے ہیں روز قیامت عیناً اسی خلق وخو کے ساتھ محشور ہوں گے۔ چنانچہ دنیا میں مشرکین کا خلق وخو حقائق سے انکار کرنا تھا، عیناً اسی خلق وخو کے کے ساتھ محشور ہوں گے۔

۲۔ لَمۡ تَكُنۡ فِتۡنَتُهُمۡ: یہاں فتنہ سے مراد عذر خواہی ہے۔ مجمع البیان میں آیا ہے کہ اس معنی کی روایت حضرت امام صادق علیہ السلام سے بھی ہے۔[2]

۳۔ كَذَبُوۡا عَلٰۤى اَنۡفُسِهِمۡ: دنیا میں شرک پر ڈٹے رہنے کے بعد روز قیامت ان کا یہ کہنا: مَا كُنَّا مُشۡرِكِيۡنَ ہم مشرک نہ تھے، اپنے آپ کو جھٹلانا ہے۔

۴۔ ضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ: قیامت کے روز حقائق سامنے آئے تو ان دیوتاؤں کی حقیقت فاش ہوگئی کہ وہ ایک واہمہ کے سوا کچھ نہ تھے۔

اہم نکات

۱۔ غیر اللہ سے لو لگانے والوں کو قیامت کے دن انہی سے پناہ لینا ہوگی۔ وہ تو ایک واہمہ ہوگا۔

۲۔ جو خلق وخو دنیا میں اپنایا ہوگا، اسی خلق وخو میں محشور ہوں گے۔

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُ اِلَيۡكَ ۚ وَجَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَفِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا ؕ وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوۡكَ يُجَادِلُوۡنَكَ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر آپ کی باتیں سنتے ہیں لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ انہیں سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی (بہرہ پن) ہے اور اگر وہ تمام نشانیاں دیکھ لیں پھر بھی ان پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ یہ (کافر) آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ سے جھگڑتے ہیں، کفار کہتے ہیں: یہ تو بس قصہ ہائے پارینہ ہیں۔

---

[1] ۵۸ مجادلہ: ۱۸ [2] تفسیر مجمع البیان ۴: ۲۱، سورۃ الانعام، ثم لم تکن فتنتھم...، المعنی۔

تشریح کلمات

اَکِنَّۃً: (ک ن ن) مفرد الکنان۔ جیسے سنان کی جمع اسنۃ ہے۔ پردہ، غلاف جس میں کوئی چیز چھپائی جائے.

وَقۡرًا: (و ق ر) کان میں بھاری پن۔ گدھے، خچر پر لدے بوجھ کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن میں آیا ہے: فَالۡحٰمِلٰتِ وِقۡرًا۔[1]

تفسیر آیات

۱۔ وَجَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ اَکِنَّۃً: اس سے پہلے بھی کئی بار ذکر آیا ہے کہ جو لوگ قابل ہدایت نہیں رہتے، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت و شفقت کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ اسی کو دلوں پر پردہ ڈالنے اور مہر لگانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ کا طریقہ کار اور سنت یہ ہے کہ جو اس کی ہدایت کو قبول اور حاصل کرنے کے لیے سعی کرتے ہیں، ان کو ہدایت سے نوازتا ہے:

وَالَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا لَنَہۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا ....[2] — اور جو ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انہیں ضرور اپنے راستے کی ہدایت کریں گے....

اور تزکیہ نفس کے ساتھ نجات و کامیابی ممکن ہے:

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىہَا ۪ۙ[3] — بتحقیق جس نے اسے پاک رکھا کامیاب ہوا۔

۲۔ وَاِنۡ یَّرَوۡا کُلَّ اٰیَۃٍ: اس کے برخلاف جن لوگوں نے انکار اور عصبیت کا تہیہ کر رکھا ہے، وہ تمام نشانیاں دیکھ بھی لیں لیکن ایمان نہیں لاتے۔ ان کا ایمان نہ لانا معجزات کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے۔

۳۔ حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوۡکَ: یہ لوگ آپؐ کے پاس آتے ہیں تو کسی بات کو سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ آپؐ کے پیغام کو مسترد کرنے کی غرض سے آتے ہیں۔ جس نے کسی بات کو رد کرنے کا پہلے سے تہیہ کیا ہو، وہ اس بات کی حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔

واضح رہے یَّسۡتَمِعُ مفرد، آگے قُلُوۡبِہِمۡ جمع ہے۔ اس کی وجہ لفظ مَنۡ ہے جو لفظ کے اعتبار سے مفرد اور معنی کے اعتبار سے جمع ہے۔ اس لیے یَّسۡتَمِعُ مفرد لفظ مَنۡ کے اعتبار سے ہے۔ آگے قُلُوۡبِہِمۡ جمع مَنۡ کے اعتبار سے ہے۔

اہم نکات

۱۔ جیسا کہ انسان اپنے نا قابل ہدایت بیٹے کو عاق کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی ایسے لوگوں کو اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے۔

---

[1] ۵۱ ذاریات: ۲ [2] ۲۹ عنکبوت: ۶۹ [3] ۹۱ شمس: ۹

وَهُمۡ يَنۡهَوۡنَ عَنۡهُ وَيَنۡـَٔوۡنَ عَنۡهُ ۚ وَاِنۡ يُّهۡلِكُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اور یہ لوگوں کو (اس سے) روکتے ہیں اور (خود بھی) اس سے دور رہتے ہیں اور وہ صرف اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں مگر اس کا شعور نہیں رکھتے۔

تشریح کلمات

يَنۡـَٔوۡنَ: (ن و ء) ینوء، یناء کے معنی پہلو پھیر لینے کے ہیں۔ کہتے ہیں۔ ناء بجانبه

تفسیر آیات

مکہ کے مشرکین کو علم تھا کہ اگر قرآن کے حقائق سے لوگ آگاہ ہو جائیں تو وہ متاثر ہوں گے اور ایمان لائیں گے اور خود اپنے بارے میں بھی خطرہ لاحق تھا کہ اگر خود ہم نے بھی قرآن سنا تو کہیں اسلام قبول نہ کر لیں۔ اس لیے وہ دوسروں کو بھی روکتے اور خود بھی دور رہتے تھے۔

چنانچہ مالك بن نضر فارس کی داستانیں عین اس جگہ کے قریب سنایا کرتا تھا، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قرآن سناتے تھے اور کہتا تھا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم داستان پارینہ سناتے ہیں تو میں اس سے بہتر داستانیں سناتا ہوں۔

نیز اخنس، ابوسفیان اور عمرو بن ھشام نے قرآن کی جاذبیت کے خلاف جو تدبیریں اور سازشیں کیں، وہ بھی کتب سیرت میں موجود ہیں۔

لیکن قرطبی نے اپنی تفسیر میں، صاحب تفسیر منیر معاصر اور اردو تفسیر معارف کے مؤلف وغیرہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت حضرت ابوطالب کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ وہ رسولؐ کو اذیت دینے سے لوگوں کو روکتے ہیں اور خود ایمان لانے سے دوری اختیار کرتے ہیں۔

یہ روایت، کئی اعتبار سے ناقابل اعتبار ہے اور نواصب کی ساختہ و بافتہ ہے۔ کیونکہ:

i۔ خود آیت کی تصریح کے خلاف ہے۔ آیت کی صراحت یہ ہے کہ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوۡكَ يُجَادِلُوۡنَكَ ... جب یہ مشرکین آپؐ کے پاس آتے ہیں تو آپؐ سے جھگڑتے ہیں۔ وَهُمۡ یہ لوگ، مشرکین، جو آپؐ سے جھگڑنے آتے ہیں، يَنۡهَوۡنَ عَنۡهُ وَيَنۡـَٔوۡنَ عَنۡهُ ... لوگوں کو قرآن سے روکتے ہیں اور خود بھی اس قرآن سے دور رہتے ہیں۔ چنانچہ سب جانتے ہیں وَهُمۡ کی ضمیر ان مشرکین کی طرف ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس صرف جھگڑنے کے لیے آتے تھے۔ اس صراحت کے باوجود وَهُمۡ کی ضمیر کو حضرت ابوطالب کی طرف سمجھنا، قرآن کی معنوی تحریف ہے۔

ii۔ یہ عبارت تضاد پر مشتمل ہے۔ کیونکہ حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہونے والی آیت:

تمہارا ولی تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔	اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ ہُمۡ رٰکِعُوۡنَ ﴿۵۵﴾ [1]

کے بارے میں یہ مؤلفین فرماتے ہیں:

جمع کا صیغہ مفرد کے لیے استعمال نہیں ہوتا لیکن اس آیت میں یَنۡھَوۡنَ اور یَنۡـَٔوۡنَ جمع کا صیغہ مفرد کے لیے استعمال ہوسکتا ہے۔

فرق باپ بیٹے کا تو نہیں ہوسکتا کہ بیٹے کے لیے جمع کا صیغہ استعمال نہیں ہوسکتا اور باپ کے لیے ہوسکتا ہے بلکہ فرق یہ ہے کہ آیہ اِنَّمَا سے بیٹے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور اس آیت سے باپ کا عدم ایمان ثابت ہوتا ہے، جو ان صاحبان کی دلچسپی کی اصل وجہ ہے۔

iii۔ شواہد و دلائل کے مطابق سورہ انعام حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد مکہ میں نازل ہوا ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے الاتقان ۱: ۲۶ میں لکھا ہے کہ سورہ انعام سورہ قصص سے سات سوروں کے بعد نازل ہوا ہے اور بروایت بخاری سورہ قصص کی آیت۵۶ : اِنَّکَ لَا تَہۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ ...۔ حضرت ابو طالب کی وفات کے بعد نازل ہوئی ہے، لہٰذا سورہ انعام حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد نازل ہونے والا آٹھواں سورہ ہے۔

iv۔ یہ روایت کہ آیت حضرت ابوطالبؑ کے عدم ایمان کے بارے میں نازل ہوئی ہے، حبیب بن ابی ثابت نے ایک مجہول شخص سے روایت کی ہے۔ اس نے ابن عباس سے، تو ایک نامعلوم اور مجہول راوی کی روایت سے بھی مطلب ثابت ہوجاتا ہے، اگر اس سے علی علیہ السلام کے والد کی قدح مقصود ہو۔

v۔ خود حبیب بن ابی ثابت غیر ثقہ اور تدلیس سے متہم ہے۔[2]

vi۔ خود ابن عباس سے متعدد روایات سے ثابت ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ یہ آیت مشرکین کے بارے میں ہے جو لوگوں کو قرآن سننے سے روکتے تھے اور خود بھی دوری اختیار کرتے تھے۔[3]

vii۔ سیاق و سباق کے خلاف ہے کہ مشرکین کے جرائم کے ذکر کے عین اثنا میں ایک دفاع کرنے والے کا ذکر آئے اور سب کے ساتھ یکساں سرزنش کی جائے۔

viii۔ ائمہ اہل بیت علیہ السلام کی طرف سے اجماع ہے کہ حضرت ابو طالب علیہ السلام مؤمن تھے۔ اہل بیت (ع) کا اجماع حجت ہے کیونکہ یہ قرآن کے ہم پلہ ہیں۔ جیسا کہ رسول اسلامؐ نے فرمایا: انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ و عترتی اھل بیتی۔ حدیث ثقلین ۳۵ اصحاب کی روایت سے ثابت ہے۔

---

[1] ۵ مائدہ: ۵۵		[2] تہذیب ۲: ۱۷۹		[3] تفسیر طبری، الدرالمنشور، البحر المحیط ۴: ۴۷۲

وَ لَوۡ تَرٰۤی اِذۡ وُقِفُوۡا عَلَی النَّارِ فَقَالُوۡا یٰلَیۡتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُکَذِّبَ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَ نَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۷﴾	۲۷۔ اور اگر آپ (وہ منظر) دیکھیں جب وہ جہنم کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے: کاش ہم پھر (دنیا میں) لوٹا دیے جائیں اور ہم اپنے رب کی آیات کی تکذیب نہ کریں اور ہم ایمان والوں میں شامل ہو جائیں۔
بَلۡ بَدَا لَہُمۡ مَّا کَانُوۡا یُخۡفُوۡنَ مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَ لَوۡ رُدُّوۡا لَعَادُوۡا لِمَا نُہُوۡا عَنۡہُ وَ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ﴿۲۸﴾	۲۸۔ بلکہ ان پر وہ سب کچھ واضح ہو گیا جسے یہ پہلے چھپا رکھتے تھے اور اگر انہیں واپس بھیج بھی دیا جائے تو یہ پھر وہی کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے اور یقیناً یہ جھوٹے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَوۡ تَرٰۤی: عالم آخرت کے مشاہدے کے بعد مشرکین یہ آرزو کریں گے کہ کاش ہمیں ایک موقع اور مل جائے تو ہم ایمان والوں میں شامل ہو جائیں۔ اگرچہ واپس دنیا میں جانا ممکن نہیں ہے لیکن انسان ناممکنات کی بھی آرزو کرتا ہے کہ کاش جوانی لوٹ آتی۔

۲۔ بَلۡ بَدَا لَہُمۡ: یہ آرزو وہ اس وقت کریں گے، جب ان پر وہ بات واضح ہو جائے گی، جسے یہ دنیا میں چھپاتے تھے۔ اپنے جن اعمال بد کو وہ چھپاتے تھے، آج وہ آتش جہنم کے مشاہدے سے ظاہر ہو گئے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

وَ بَدَا لَہُمۡ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوۡا...[1] اور ان کی بری کمائی بھی ان پر ظاہر ہو جائے گی۔

یا یہ کہ جنت و نار کی حقانیت کو وہ دنیا میں چھپاتے تھے، آج آتش جہنم کے مشاہدے سے وہ بات عیاں ہو گئی۔

۳۔ وَلَوۡ رُدُّوۡا لَعَادُوۡا: اگر انہیں دنیا میں واپس بھی کیا جائے تو وہی کفر اختیار کریں گے۔ چنانچہ جو لوگ جرائم پیشہ ہوتے ہیں، جب وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو بڑے خلوص سے اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جب عافیت مل جاتی ہے تو پھر اسی گندی زندگی میں مگن ہو جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ آخرت میں مؤمنین کی زندگی قابل رشک ہوگی: وَ نَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۔

۲۔ ناقابل ہدایت لوگ پردہ اٹھنے اور حقائق کا مشاہدہ کرنے پر بھی ہدایت نہیں پاتے: لَعَادُوۡا لِمَا

---

[1] ۳۹ زمر: ۴۸

نُهُوْا ....

وَقَالُوْۤا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ اور کہتے ہیں: ہماری اس دنیاوی زندگی کے سوا کچھ بھی نہیں اور ہم (مرنے کے بعد دوبارہ) زندہ نہیں کیے جائیں گے۔

وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾

۳۰۔ اور اگر آپ (وہ منظر) دیکھ لیں جب یہ لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو وہ فرمائے گا: کیا یہ (دوبارہ زندہ ہونا) حق نہیں ہے؟ وہ کہیں گے: کیوں نہیں؟ ہمارے رب کی قسم (یہ حق ہے) وہ فرمائے گا: پھر اپنے کفر کے بدلے عذاب چکھو۔

تفسیر آیات

بت پرست اخروی زندگی کے قائل نہ تھے۔ وہ بتوں کی پرستش کرتے اور ان کو شفیع بناتے تھے تو صرف دنیاوی مفادات ومضرات کے لیے۔

بت پرستوں کو براہ راست جواب دینے کی بجائے اپنے رسولؐ سے خطاب کر کے فرمایا: بت پرست آج قیامت اور حشر کا انکار کر رہے ہیں لیکن وہ منظر دیکھنے کا ہے، جب یہ اللہ کے سامنے کھڑے قسم کھا کر قیامت کو برحق تسلیم اور اپنے آپ کو حوالہ عذاب کر رہے ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ قدیم بت پرستوں اور جدید مادہ پرستوں، دونوں کا یہی موقف ہے کہ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔

۲۔ دنیاوی زندگی کی محبت، انکار معاد کا سبب ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا

۳۱۔ وہ لوگ گھاٹے میں رہ گئے جو اللہ سے ملاقات کو جھٹلاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان پر اچانک قیامت آجائے گی تو (یہی لوگ) کہیں گے:

فِيۡهَا ۙ وَهُمۡ يَحۡمِلُوۡنَ اَوۡزَارَهُمۡ عَلٰى ظُهُوۡرِهِمۡ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوۡنَ ﴿۳۱﴾

افسوس ہم نے اس میں کتنی کوتاہی کی اور اس وقت وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اپنی پیٹھوں پر لادے ہوئے ہوں گے، دیکھو کتنا برا ہے یہ بوجھ جو یہ اٹھائے ہوئے ہیں۔

تشریح کلمات

بَغۡتَةً: (ب غ ت) ناگہاں۔

اَوۡزَارَ: (و ز ر) مفرد وِزر۔ بوجھ کو کہتے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ وَزَرٌ سے لیا گیا ہے جو پہاڑ کے دامن میں جائے پناہ کے معنوں میں آتا ہے (المفردات)

تفسیر آیات

قَدۡ خَسِرَ: یہ گھاٹا مومنین کو ملنے والی جنت کی نعمتوں کے مقابلے میں ہے کہ مؤمنین کو آخرت میں عبادتوں اور مصائب میں صبر و حوصلہ وغیرہ کے عوض میں ایسا اجر عظیم ملے گا جو کسی کے وہم و گمان میں نہ آیا ہو گا۔ اس کے مقابلے میں کافروں کے لیے جب ناگہاں قیامت برپا ہو گی اور وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں گے تو اس وقت وہ افسوس کریں گے کہ ہم نے کتنی کوتاہی کی یا یہ کہ انسان کو اللہ نے جو زندگی عنایت فرمائی، وہ بہت قیمتی تھی۔ اس زندگی کے عوض میں تباہی خریدنا انتہائی گھاٹے کا سودا ہے۔

اِذَا جَآءَتۡهُمُ السَّاعَةُ: قیامت کب آئے گی؟ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ لہٰذا قیامت جب آئے گی، اچانک آئے گی۔

يٰحَسۡرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطۡنَا فِيۡهَا: حسرت و افسوس اس کوتاہی پر ہو گا جو دنیا میں ہو گی۔ فِيۡهَا دنیا کی زندگی کے بارے میں کوتاہی ہوئی، اس کو صحیح مصرف میں نہیں لایا گیا۔

وَهُمۡ يَحۡمِلُوۡنَ اَوۡزَارَهُمۡ: یہ حسرت اس وقت ہو رہی ہو گی، جب وہ اپنی پیٹھ پر گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

وَ مَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهۡوٌ ؕ وَ لَلدَّارُ الۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ اور دنیا کی زندگی ایک کھیل اور تماشے کے سوا کچھ نہیں اور اہل تقویٰ کے لیے دار آخرت ہی بہترین ہے، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

تشریح کلمات

لَهۡوٌ: (ل ہ و) ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو اہم کاموں سے ہٹائے اور باز رکھے۔

تفسیر آیات

جو حیات اخروی کے قائل نہیں ہیں، ان کی دنیا صرف لہو و لعب اور کھیل تماشا ہے۔ وہ صرف اسی دنیا کی زندگی کے لیے جی رہے ہیں، اس لیے اس زندگی کو کھیل اور لھو سے تشبیہ دی ہے۔ کیونکہ لھو اس کام کو کہتے ہیں جو انسان کو اہم کاموں سے باز رکھے۔ ورنہ مؤمن کی دنیاوی زندگی، آخرت کے لیے مزرعہ ہے اور جتنی فصل مقدس ہے، اتنی ہی کھیتی مقدس ہے۔

دنیا کو کھیل تماشا کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس زندگی کی اسلام کی نظر میں سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اخروی ابدی زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی کھیل تماشا ہے۔ دنیا کی زندگی اگر آخرت کی زندگی کے خلاف گزاری جاتی ہے تو اس کی مذمت ہے، ورنہ اس زندگی کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے۔

چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّ الدُّنْیَا دَارُ صِدْقٍ لِمَنْ صَدَقَھَا	یہ دنیا اسے سچ سمجھنے والوں کے لیے سچائی کا گھر ہے،
وَ دَارُ عَافِیَۃٍ لِمَنْ فَھِمَ عَنْھَا	جو اس دنیا سے سمجھے اس کے لیے عافیت کا گھر ہے،
	جو اس سے زاد راہ حاصل کرے اس کے لیے دولت کدہ ہے،
وَ دَارُ غِنًی لِمَنْ تَزَوَّدَ مِنْھَا	جو اس سے نصیحت حاصل کرے اس کے لیے نصیحت کا گھر ہے،
مَسْجِدُ اَحِبَّآءِ اللّٰہِ	اللہ کے دوستوں کی عبادت گاہ،
وَ مُصَلّٰی مَلَائِکَۃِ اللّٰہِ	اللہ کے فرشتوں کی جائے نماز،
وَ مَھْبِطُ وَحْیِ اللّٰہِ	اللہ کی طرف سے وحی نازل ہونے کی بارگاہ،
وَ مَتْجَرُ اَوْلِیَاءِ اللّٰہِ...[1]	اولیاء اللہ کی تجارت گاہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ اخروی زندگی کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی کرنا ایک لھو ہے۔

۲۔ اخروی زندگی کے لیے دنیا کی زندگی کرنا ہی مقصد زندگی ہے۔

قَدۡ نَعۡلَمُ اِنَّہٗ لَیَحۡزُنُکَ الَّذِیۡ　　۳۳۔ ہمیں علم ہے کہ ان کی باتیں یقیناً آپ کے

---

[1] نہج البلاغۃ حکمت: ۱۳۱

يَقُوۡلُوۡنَ فَاِنَّهُمۡ لَا يُكَذِّبُوۡنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ ﴿۳۳﴾

لیے رنج کا باعث ہیں، پس یہ صرف آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ یہ ظالم لوگ درحقیقت اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

قَدۡ نَعۡلَمُ: رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی مل رہی ہے کہ مکہ کے بت پرستوں کی طرف سے آپؐ کی اہانت ہو رہی ہے، آپؐ کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، آپؐ کی تضحیک کر رہے ہیں، یہ دراصل آپؐ کی نہیں، یہ اللہ کی تکذیب ہے۔ آپؐ تو اللہ کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔ پیغام اللہ کا ہے۔ یہ لوگ آپؐ کی ذات کی نہیں بلکہ اس پیغام کی تکذیب کر رہے ہیں۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ مشرکین مکہ میں سب سے زیادہ رسولؐ کے جانی دشمن بھی آپؐ کے امین اور صادق القول ہونے کے معترف تھے۔ وہ اپنی خلوتوں میں محمدؐ کی صداقت کا اعتراف کرتے اور تکذیب رسولؐ کی یہ توجیہ پیش کرتے تھے کہ اگر لواء، سقایت الحاج اور نبوت سب بنی قصی کو مل گئے تو قریش کے لیے باقی کیا رہ گیا۔

لَيَحۡزُنُكَ: تکذیب کی وجہ سے رنجیدہ خاطر ہونا اول تو ایک قدرتی بات ہے، دوسری بات، یہ رسولؐ کی صداقت کی دلیل ہے کہ سچے کی تکذیب ہو جائے تو سچا رنجیدہ ہوتا ہے، جب کہ جھوٹے کی تکذیب ہو جائے تو وہ شرمندہ ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ جس طرح فعل رسولؐ بھی فعل خدا قرار پاتا ہے: وَمَا رَمَيۡتَ اِذۡ رَمَيۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ... [۱]
اسی طرح تکذیب رسولؐ تکذیب خدا قرار پاتی ہے۔

وَ لَقَدۡ كُذِّبَتۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَصَبَرُوۡا عَلٰى مَا كُذِّبُوۡا وَ اُوۡذُوۡا حَتّٰۤى اَتٰىهُمۡ نَصۡرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدۡ جَآءَكَ مِنۡ نَّبَاِى الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور بتحقیق آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جاتے رہے اور تکذیب و ایذا پر صبر کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی اور اللہ کے کلمات تو کوئی بدل نہیں سکتا چنانچہ سابقہ پیغمبروں کی خبریں آپ تک پہنچ چکی ہیں۔

---

[۱] ۸ انفال: ۱۷ اور (اے رسول) جب آپ کنکریاں پھینک رہے تھے اس وقت آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے کنکریاں پھینکی تھیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ کُذِّبَتۡ: اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توجہ اس الٰہی دعوت کی تاریخ اور اس میں رائج سنت الٰہیہ کی طرف دلائی کہ تاریخ انبیاء میں آپؐ کی تکذیب پہلا واقعہ نہیں ہے، دیگر رسولوں کی بھی تکذیب ہوئی ہے۔

۲۔ فَصَبَرُوۡا: اس تکذیب پر صبر سے کام لیا۔ جو لوگ صداقت و اخلاص کی آخری منزل پر فائز ہوں، ان کو جھٹلایا جائے تو یہ بات نہایت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ رسولوں نے اس تکلیف کا صبر سے مقابلہ کیا۔

۳۔ وَ اُوۡذُوۡا: صرف تکذیب نہیں، اس کے بعد اذیت بھی دی گئی۔ یہاں صبر کا دوبارہ ذکر نہیں کیا، چونکہ صبر کی منزل پر اذیت پہنچنے سے پہلے فائز تھے۔

۴۔ اَتٰىہُمۡ نَصۡرُنَا: اب اللہ کی نصرت کا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی اللہ کی نصرت تکذیب، صبر اور اذیت کے تحمل کے بعد آتی ہے۔ مزید تشریح کے لیے البقرۃ: ۲۱۴، یوسف: ۱۱۰ ملاحظہ فرمائیں۔

۵۔ وَلَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ: اللہ کے فیصلے کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے۔ یعنی تکذیب اور اذیت اور صبر کے بعد اللہ کی نصرت کا آنا حتمی فیصلہ ہے، جس میں کسی قسم کی تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

وَ لَقَدۡ سَبَقَتۡ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿ۚۖ﴾ اِنَّہُمۡ لَہُمُ الۡمَنۡصُوۡرُوۡنَ ﴿۪﴾	اور بتحقیق ہمارے بندگان مرسل سے ہمارا یہ وعدہ ہو چکا ہے۔ یقیناً وہ مدد کیے جانے والے ہیں۔[1]

وَلَقَدۡ جَآءَکَ: مرسلین کی تاریخ اور سرگزشت، آپؐ کے سامنے ہے کہ ان کو کن صبر آزما مراحل سے گزارا گیا اور آخر میں ہمیشہ وہی فاتح رہے، اسی طرح آپ بھی فتحیاب ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ تمام رسولوں کی سرگزشت ایک جیسی رہی ہے: کُذِّبَتۡ رُسُلٌ ....

۲۔ اللہ کی نصرت صبر و اذیت کے بعد آتی ہے: اَتٰىہُمۡ نَصۡرُنَا ....

۳۔ مرسلین کے لیے اللہ کی نصرت، اللہ کا ایک حتمی فیصلہ ہے: لَا مُبَدِّلَ ....

وَ اِنۡ کَانَ کَبُرَ عَلَیۡکَ اِعۡرَاضُہُمۡ فَاِنِ اسۡتَطَعۡتَ اَنۡ تَبۡتَغِیَ نَفَقًا فِی الۡاَرۡضِ اَوۡ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ	۳۵۔ اور ان لوگوں کی بے رخی اگر آپ پر گراں گزرتی ہے تو آپ سے ہو سکے تو زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی تلاش کریں

---

[1] ۳۷ صافات: ۱۷۱۔۱۷۲

فَتَاۡتِیَہُمۡ بِاٰیَۃٍ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ	پھر ان کے پاس کوئی نشانی لے کر آئیں اور
لَجَمَعَہُمۡ عَلَی الۡہُدٰی فَلَا تَکُوۡنَنَّ	اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا
مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ ﴿۳۵﴾	پس آپ نادانوں میں سے ہرگز نہ ہوں۔

تشریح کلمات

نَفَقًا: (ن ف ق) ہاتھ سے نکل جانے، خرچ ہونے کے معنوں میں بیشتر استعمال ہوتا ہے نیز النفق آر پار ہونے والا کوچہ یا سرنگ کو بھی کہتے ہیں، جس کے دونوں منہ کھلے ہوں۔

سُلَّمًا: (س ل م) السلم ہر اس چیز کو کہتے ہیں، جس کے ذریعے بلند مقامات پر چڑھا جاتا ہے تاکہ سلامتی حاصل ہو۔

تفسیر آیات

اگر ان کافروں کی بے رخی آپؐ کے لیے بارگراں ہے اور اس بے رخی کے لیے کوئی حل تلاش کر سکتے ہیں تو کر لیں۔ کیا اس کا حل یہ ہے کہ ان کافروں کا مجوزہ معجزہ پیش کیا جائے؟ ان کا مجوزہ معجزہ یہ تھا:

وَقَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ الۡاَرۡضِ یَنۡۢبُوۡعًا ۙ[1]	اور کہنے لگے: ہم آپ پر ایمان نہیں لاتے جب تک آپ ہمارے لیے زمین کو شگافتہ کر کے ایک چشمہ جاری نہ کریں۔

دوسرا مجوزہ معجزہ یہ تھا:

اَوۡ تَرۡقٰی فِی السَّمَآءِ ....[2]	یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں ....

شاید انہی معجزوں کی طرف اشارہ ہے۔

فَاِنِ اسۡتَطَعۡتَ: اگر آپؐ کے لیے زمین میں سرنگ بنانا ممکن ہے تو یہ کر گزریں اور آسمان پر چڑھنا ممکن ہے تو آسمان پر چڑھ کر ان کا مجوزہ معجزہ پورا کر کے دیکھ لیں، کیا یہ لوگ ایمان لائیں گے؟ اس تعبیر میں اس تصور کو شدت کے ساتھ رد کیا گیا ہے کہ لوگوں کی توجہ مبذول کرانے اور ان کو ایمان پر آمادہ کرنے کے لیے طاقت استعمال کرنی چاہیے۔

اس آیت میں ایک اہم اصول، ایک الٰہی روش اور طریق دعوت کی طرف اشارہ ہے۔ لوگوں کا ایمان لانا جیسا بھی ہو، مطلوب نہیں، بلکہ ایسا ایمان مطلوب ہے، جسے قلب اپنے ہاں جگہ دے۔ جس کے سامنے ضمیر جھک جائے۔ ایمان لانے والا منطق اور دلیل کے سامنے ہتھیار ڈالے، طاقت اور شمشیر کے سامنے نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اللہ کو وہ ایمان منظور ہے جو انسان اپنی خود مختاری سے قبول کرے کیونکہ آزمائش

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۹۰　[2] ۱۷ بنی اسرائیل: ۹۳

و امتحان ایک آزاد فضا میں ممکن اور معقول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے کوئی ایسا معجزہ پیش نہیں فرمایا، جس سے لوگ ایمان لانے پر مجبور ہو جائیں۔

وَلَوۡشَآءَاللّٰهُ لَجَمَعَهُمۡ : اگر اللہ اپنی قوت قاہرہ سے ان سب کو ایمان لانے پر مجبور کرنا چاہتا تو ایسا کرنا اللہ کے لیے نہایت آسان تھا لیکن ایسے جبری ایمان کی کوئی قیمت نہیں۔ اس قسم کا جبری ایمان تو وہ قیامت کے دن لائیں گے۔ مگر اس کا کوئی اثر اور فائدہ نہیں ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ اسلام بزور شمشیر نہیں، قوت و دلیل سے پھیلا ہے۔

۲۔ کسی عقیدے کو مسلط کرنے کے لیے طاقت کا استعمال ممنوع ہے۔

اِنَّمَا یَسۡتَجِیۡبُ الَّذِیۡنَ یَسۡمَعُوۡنَ ؕ وَالۡمَوۡتٰی یَبۡعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَیۡهِ یُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ یقیناً مانتے وہی ہیں جو سنتے ہیں اور مردوں کو تو اللہ (قبروں سے) اٹھائے گا پھر وہ اسی کی طرف پلٹائے جائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَایَسۡتَجِیۡبُ : جی ہاں! وہی مان سکتے ہیں، جو سنتے ہیں۔ چونکہ سمجھتے وہی ہیں جو سنتے ہیں۔ ایمان بھی وہی لوگ لائیں گے جو سمجھتے ہیں۔

نفس میں آمادگی ہو تو سنائی دیتا ہے۔ آپ ایسے دوست کے پہلو میں بیٹھے ہیں، جو کسی حیرت انگیز منظر کا تماشا کر رہا ہے۔ آپ اس سے کہیں گے: بھائی صاحب! بات سنیے۔ آپ کی آواز کا ارتعاش اس کے کانوں کے پردے سے ٹکرایا ہو گا اور دماغ تک اس کی رسائی ہوئی ہو گی لیکن دماغ نے آپ کی آواز وصول نہیں کی۔ آواز نے اپنا کام کر دیا لیکن نفس نے یہ آواز وصول نہیں کی۔ اسی لیے اس کو آپ کی آواز سنائی نہیں دی۔ جب آپ کی بات سنائی نہیں دی تو وہ آپ کی آواز پر لبیک کیسے کہے گا۔ اس کے نفس میں وہ زندگی نہیں ہے جو سننے کے لیے ہونی چاہیے۔ یعنی یہ لوگ فی الواقع مردہ ہیں۔

۲۔ وَالۡمَوۡتٰی یَبۡعَثُهُمُ : کل بروز قیامت جب ان مردوں کو اٹھایا جائے گا تو اس وقت انہیں سننا پڑے گا۔

اہم نکات

۱۔ ایمان کی توفیق ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو کسی بات کو سننے کی آمادگی رکھتے ہیں۔

وَ قَالُوۡا لَوۡ لَا نُزِّلَ عَلَیۡہِ اٰیَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ قُلۡ اِنَّ اللّٰہَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنۡ یُّنَزِّلَ اٰیَۃً وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ اور وہ کہتے ہیں: اس نبی پر اس کے رب کی طرف سے کوئی معجزہ نازل کیوں نہیں ہوا؟ کہد یجیے: اللہ معجزہ نازل کرنے پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

یہاں اٰیَۃٌ سے معجزہ مراد ہے۔ مشرکین کا یہ کہنا ہے کہ جس معجزے کا ہم مطالبہ کر رہے ہیں، وہ کیوں نہیں لاتے۔

معجزہ اگر اللہ کی طرف سے ہو تو اس سے صرف رسول کی حقانیت ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ لوگ اگر اسے قبول نہ کریں تو فوری عذاب ان پر نازل نہیں ہوتا لیکن اگر معجزہ لوگوں کے مطالبے پر پیش ہو جائے تو اس کے بعد ایمان نہ لانے کی صورت میں فوری عذاب نازل ہو جاتا ہے اور مہلت نہیں ملتی۔ جیسا کہ ناقہ صالح کا معجزہ لوگوں کے مطالبے پر پیش کیا اور انکار پر قوم صالح پر فوری عذاب نازل ہوا۔

وَّلٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ: اس آیت میں اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے۔ اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اس قسم کے معجزات پیش کرنے میں خود ان کافروں کے لیے فوری عذاب کے سوا کچھ نہیں ہے۔

وَ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ یَّطِیۡرُ بِجَنَاحَیۡہِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمۡثَالُکُمۡ ؕ مَا فَرَّطۡنَا فِی الۡکِتٰبِ مِنۡ شَیۡءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّہِمۡ یُحۡشَرُوۡنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اور زمین پر چلنے والے تمام جانور اور ہوا میں اپنے دو پروں سے اڑنے والے سارے پرندے بس تمہاری طرح کی امتیں ہیں، ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی پھر (سب) اپنے رب کی طرف جمع کیے جائیں گے۔

تشریح کلمات

فَرَّطۡنَا: (ف ر ط) الافراط کے معنی حد سے زیادہ تجاوز کر جانے کے ہیں اور تفریط کے معنی کوتاہی کرنے کے ہیں۔ افراط، تفریط کے معنی زیادتی، کوتاہی کے ہیں کہ جب کوئی معاملہ اعتدال سے نکلتا ہے تو افراط، تفریط کہا جاتا ہے۔ جسے اردو میں افراتفری کر دیا گیا ہے۔

تفسیر آیات

وَمَامِنۡ دَآبَّۃٍ: ہر جاندار جو زمین پر رینگتا ہے، دابّہ ہے۔ طائر، پرندہ۔ مچھلی کا ذکر اس لیے نہیں ہے کیونکہ یہ پرندے میں شامل ہے۔

اُمَمٌ: امت کی جمع۔ امت: ایک نسل، ایک جنس جو ایک نظریہ یا ایک زمان و مکان یا ایک نوع خلقت وطریقۂ زیست پر مشتمل ہو۔

اَمۡثَالُکُمۡ: یہ تمام جاندار تمہاری طرح کی امتیں ہیں۔ یعنی ہر جاندار انسان کی طرح امت ہے جو ایک ایسی چیز پر مجتمع ہے جس سے ایک امت کی تشکیل ہو جاتی ہے۔ صرف انسان نہیں، جس کے تمام افراد ایک انسانی وحدت میں منسلک ہیں بلکہ تمام جاندار بھی اسی طرح ایک وحدت میں منسلک ہیں۔ مثلاً i۔ تولید نسل، ii۔ اپنی ذات سے محبت، iii۔ دشمن کی شناخت، iv۔ حصول رزق کے ذرائع کی شناخت، v۔ اولاد سے محبت، vi۔ اجتماعی زندگی۔ مثلاً چونٹیوں میں اجتماعی زندگی ہے، vii۔ تنظیم در زندگی۔ چیونٹیوں میں یہ تنظیم اعلیٰ درجے کی ہے، viii۔ قانون زندگی۔ شہید کی مکھیوں میں قانون نافذ ہے کہ کوئی شہد کی مکھی گندی جگہ بیٹھ جائے تو اسے سخت سزا ملتی ہے، ix۔ جانوروں کی تسخیر۔ چونٹیاں، دیگر حشرات کو اسی طرح اپنی ضروریات کے لیے تسخیر کرتی ہیں، جیسے ہم بھینس، گائے کو تسخیر کرتے ہیں۔

لیکن کیا اَمۡثَالُکُمۡ ''تمہاری طرح'' سے مراد یہی چیزیں ہیں، جن کا اوپر ذکر ہوا ہے؟ کیا پوری آیت کے سیاق میں اَمۡثَالُکُمۡ کی نوعیت پر کوئی قرینہ موجود ہے؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ آیت میں دو قرینے ایسے ہیں جن سے اَمۡثَالُکُمۡ کی نوعیت کا تعین ہو سکتا ہے۔ پہلے ہم اس نوعیت کا ذکر کرتے ہیں، بعد میں قرائن کا۔

نوعیت، احساس مسئولیت اور جوابدہی کا شعور ہے۔ اس شعور کے تحت حیوانات بھی انسانوں کی طرح جوابدہ ہیں اور اس جوابدہی کی بنیاد پر سزا اور جزا مترتب ہوتی ہے۔ البتہ یہ شعور، یہ جوابدہی اور سزا و جزا حیوانات کے شعور کی حد تک ہے۔ انسان کے شعور اور جوابدہی کے درجے کی نہیں ہے۔

قرائن: اس پر پہلا قرینہ مَا فَرَّطۡنَا فِی الۡکِتٰبِ ہے۔ اس جگہ کتاب سے مراد لوح محفوظ ہو سکتی ہے جو کتاب تکوین سے عبارت ہے۔ یعنی ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ اس نظام تکوین میں کوئی نقص نہیں ہے بلکہ تمام جاندار تم انسانوں کی طرح ایک قانون، ایک مقصد کے تحت ہیں۔ ان جانوروں کی خلقت اور مقصد خلقت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی گئی۔ اس سے یہ قرینہ مل سکتا ہے کہ ذمے داری کے شعور، حسن و قبح اور عدل وظلم کے تصور میں جانور بھی تمہاری طرح ہیں کیونکہ ان چیزوں کا فقدان، کمی اور نقص ہے۔ ہر قسم کے شعور اور احساس ذمے داری سے عاری مخلوق بنانا عبث ہو جاتا ہے، جس کی قرآن نے نفی کی ہے۔

اگر اَلۡکِتٰبِ سے مراد قرآن لیا جائے تو شاید یہ قرینہ ثابت نہ ہو بلکہ انسانی ہدایت کے لیے قرآن کی جامعیت کی طرف اشارہ ہے:

وَ نَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ وَّ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً وَّ بُشۡرٰی لِلۡمُسۡلِمِیۡنَ ۔[1]

اور ہم نے آپ پر یہ کتاب ہر چیز کو بڑی وضاحت سے بیان کرنے والی اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت اور بشارت بنا کر نازل کی ہے۔

لیکن ہمارے نزدیک ربط کلام کے تحت الکتاب سے مراد لوح محفوظ اور کتاب تکوین زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس صورت میں یہ جملہ معترضہ بھی نہیں بنتا اور بزرگ مفسر کا یہ مؤقف قرین واقع معلوم نہیں ہوتا کہ یہ جملہ معترضہ ہے۔

دوسرا قرینہ۔ ثُمَّ اِلٰی رَبِّہِمۡ یُحۡشَرُوۡنَ: پھر سب اپنے رب کی طرف جمع کیے جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ یُحۡشَرُوۡنَ میں انسان کے ساتھ حیوانات بھی شریک ہیں، جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ تم انسان، زمین پر چلنے والے جانور اور ہوا میں اڑنے والے پرندے سب اللہ کے سامنے جمع کیے جائیں گے۔ اس میں صراحت موجود ہے کہ ان جانوروں کو بھی اللہ کے سامنے جواب دینا ہے، جیسا کہ انسان کو جواب دینا ہے۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ کے سامنے آنے کے بعد ثواب و عقاب کا ان کو سامنا کرنا پڑے گا۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

وَ اِذَا الۡوُحُوۡشُ حُشِرَتۡ ۔[2]

اور جب وحشی جانور اکٹھے کر دیے جائیں گے۔

حیوانات کی شعوری حیثیت: اس سلسلے میں بہت سے شواہد موجود ہیں۔ چنانچہ چیونٹی کا یہ کہنا:

قَالَتۡ نَمۡلَۃٌ یّٰۤاَیُّہَا النَّمۡلُ ادۡخُلُوۡا مَسٰکِنَکُمۡ ۚ لَا یَحۡطِمَنَّکُمۡ سُلَیۡمٰنُ وَ جُنُوۡدُہٗ ۙ وَ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ۔[3]

ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ، کہیں سلیمان اور ان کا لشکر تمہیں کچل نہ ڈالے اور انہیں پتہ بھی نہ چلے۔

یہ چیونٹی حضرت سلیمان (ع) کی شناخت رکھتی ہے۔ اس ہجوم کو لشکر کے طور پر جانتی ہے اور چیونٹیوں کو روندنے کے سلسلے میں انسانوں کے عدم شعور کا ادراک رکھتی ہے۔

اسی سورہ میں ھُدۡھُدۡ کا شعور واضح طریقے سے بیان ہوا ہے اور ہجرت کے موقع پر ناقۂ رسولؐ کا واقعہ مشہور ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا:

خلوا سبیلها فانها مأمورة۔[4]

اسے اپنے حال پر چھوڑ دو، اس کو حکم ملا ہوا ہے۔

ممکن ہے حیوانات کا حشر حیوانات کی سزا و جزا کے لیے نہ ہو، بلکہ انسانوں نے جن حیوانات پر ناحق ظلم کیا ہے، اس کا بدلہ دلانے کے لیے ہو۔ حدیث میں آیا ہے:

---

[1] ۱۶ نحل: ۸۹ [2] ۸۱ تکویر: ۵ [3] ۲۷ نمل: ۱۸

[4] الکافی ۸: ۳۲۸۔ بحار الانوار ۱۹: ۱۰۸۔ دلائل النبوۃ للبیہقی ۲: ۳۶۱، باب من استقبل رسول اللّٰہ ص، حدیث سعد بن معاذ۔ و البدایۃ والنہایۃ والکامل، امتاع الاسماع ۔۔۔

ما من انسان یقتل عصفورا فما فوقھا بغیر حقھا الا سألہ اللہ عنھا یوم القیٰمۃ۔[1] کوئی انسان ایسا نہ ہو گا جس نے کسی چڑیا یا اس سے کم تر کسی جانور کو ناحق قتل کیا ہو، مگر اللہ قیامت کے دن اس سے سوال کرے گا۔

یہاں مولائے متقیان امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے منقول فرمان نہایت قابل توجہ ہے:

وَ اللّٰہِ لَوْ اَعْطِیتُ الْاَقَالِیمَ السَّبْعَۃَ بِمَا تَحْتَ اَفْلَاکِھَا عَلَی اَنْ اَعْصِیَ اللّٰہَ فِیْ نَمْلَۃٍ اَسْلُبُھَا۔[2] قسم بخدا اگر مجھے ہفت اقلیم کی ملکیت زیر آسمان تمام دولت کے ساتھ دے دی جائے، اس بات کے عوض کہ میں کسی چیونٹی پر اس مقدار ظلم کر کے اللہ کی نافرمانی کروں کہ اس کے منہ سے جو کے چھلکے کو چھین لوں تو ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔

راقم اسی مؤقف کو ترجیح دیتا ہے کہ حیوانات اس لیے محشور ہوں گے کہ ان پر ظلم کرنے والوں سے بدلہ لیا جائے۔ اس صورت میں اَمۡثَالُکُمۡ کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ حیوانات بھی تمہاری طرح شعور رکھتے ہیں۔ ظلم اور انصاف کو سمجھتے ہیں۔ اپنے خالق کی معرفت رکھتے ہیں:

وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَ لٰکِنۡ لَّا تَفۡقَہُوۡنَ تَسۡبِیۡحَہُمۡ ...۔[3] اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی ثنا میں تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو....

احساس مسئولیت و ذمہ داری رکھتے ہیں۔ اپنی مسئولیت پر عمل کرتے ہیں۔ ہمارے مؤقف سے وہ سوالات نہیں اٹھائے جا سکتے جو اس سلسلے میں پیدا ہوئے ہیں:

اگر حیوانات بھی مکلّف اور ذمہ دار ہیں اور انہوں نے جوابدہی کا سامنا کرنا ہے تو ان پر حجت کس طرح پوری ہو گئی ہو گی؟ کیا ان کی طرف خود ان میں سے کوئی پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں یا ان میں موجود فطرت کی بنیاد پر بازپرس ہو گی وغیرہ۔

وَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُکۡمٌ فِی الظُّلُمٰتِ ؕ مَنۡ یَّشَاِ اللّٰہُ یُضۡلِلۡہُ ؕ وَ مَنۡ یَّشَاۡ یَجۡعَلۡہُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں جو تاریکیوں میں (پڑے ہوئے) ہیں، اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا: آیات الٰہی کی تکذیب وہ لوگ کرتے ہیں، جن میں کسی بات کے سمجھنے کے

---

[1] بحار الانوار ۶۱: ۳۰۶ و نسائی۔ المستدرک للحاکم ۴: ۲۶۱، کتاب الذبائح، صححہ الذہبی [2] نہج البلاغۃ خ ۲۲۴۔
[3] ۱۷ بنی اسرائیل: ۴۴

لیے آمادگی نہیں ہے۔

۲۔ بُکۡمٌ : یہ آمادگی دل و دماغ کی طرف سے ہوتی ہے۔ آمادگی نہ ہونے کی صورت میں مضمون دل نشین نہیں ہوتا۔ خود بخود تکذیب کی نوبت آ جاتی ہے۔ بُکۡمٌ : جب حق کا مضمون دل میں اترتا نہیں ہے تو اس دل سے کیا نکلے گا، نتیجتاً گونگے ہوتے ہیں۔

۳۔ فِی الظُّلُمٰتِ: روشنی آنے کے راستوں کو جب ان لوگوں نے اپنے اوپر بند کر دیا تو نتیجتاً تاریکی ہی رہ جاتی ہے۔

۴۔ مَنۡ یَّشَاِ اللّٰہُ یُضۡلِلۡہُ : یہ بات ہمیں بار بار کرنی پڑتی ہے کہ اللہ کی مشیت اور چاہت اندھی بانٹ نہیں ہوتی۔ جس شخص میں ہدایت کی روشنی پانے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ پھر وہ ضلالت کی تاریکی میں ڈوب جاتا ہے۔ یُضۡلِلۡہُ کا مطلب یہی ہے اور جس میں ہدایت قبول کرنے کی آمادگی ہے، اللہ اسے سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق دیتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ جس میں آمادگی نہ ہو اس کے حواس کام نہیں کرتے۔

۲۔ جو ہدایت کی طرف آنا نہیں چاہتا اس کو اللہ اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے

۳۔ جو ہدایت کی اہلیت رکھتا ہے، اللہ اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور راہ راست پر لگا دیتا ہے۔

قُلۡ اَرَءَیۡتَکُمۡ اِنۡ اَتٰىکُمۡ عَذَابُ اللّٰہِ اَوۡ اَتَتۡکُمُ السَّاعَۃُ اَغَیۡرَ اللّٰہِ تَدۡعُوۡنَ ۚ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۴۰﴾

۴۰۔ کہد یجیے: یہ تو بتاؤ کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آ جائے یا قیامت آ جائے تو کیا تم (اس وقت) اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو۔

بَلۡ اِیَّاہُ تَدۡعُوۡنَ فَیَکۡشِفُ مَا تَدۡعُوۡنَ اِلَیۡہِ اِنۡ شَآءَ وَ تَنۡسَوۡنَ مَا تُشۡرِکُوۡنَ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ بلکہ (اس وقت) تم اللہ ہی کو پکارو گے اور اگر اللہ چاہے تو یہ مصیبت تم سے ٹال دے گا جس کے لیے تم اسے پکارتے تھے اور جنہیں تم نے شریک بنا رکھا ہے اس وقت انہیں تم بھول جاؤ گے۔

تشریح کلمات

اَرَءَیۡتَکُمۡ : (ر ء ی) اخبرنی کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اگر اس میں ''کاف'' (ضمیر خطاب) داخل ہو تو حالت تثنیہ جمع اور تانیث میں تاء کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان حالتوں میں قاء

کی جگہ کاف میں حسب مقام تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ جیسے ارائیتك هذا الذی۔ (راغب)

تفسیر آیات

اس آیت میں توحید پر فطری اور جبلتی دلیل پیش کی گئی ہے کہ اللہ کے وجود پر دلیل اور نشان خود تمہارے وجود کے اندر ہے کہ انسان کی فطرت اور جبلت میں یکتا پرستی ودیعت ہوئی ہے کہ اگر انسان پر بیرونی منفی اثرات نہ ہوں، خواہشات، برے ماحول اور منفی تربیت وغیرہ نے ضمیر کو نہ دبا رکھا ہو، تعصب اور جمود نے اس پر تعقل و تفکر کا دروازہ بند نہ کیا ہو، صرف انسان ہو اور اس کی فطرت تو انسان فطرۃً یکتا پرست رہتا ہے۔ اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب انسان پر کوئی ناگہانی آفت آ جاتی ہے۔ مثلاً کوئی مسافر کشتی پر سوار ہو اور وہ طوفان میں گھر جائے اور موت اپنی بھیانک صورت کے ساتھ سامنے آ جائے تو اس وقت انسان سے تمام غیر فطری عوامل دور ہو جاتے ہیں اور انسان اپنی خالص فطرت کی زندگی میں آ جاتا ہے اور دبا ہوا ضمیر بھی زندہ ہو جاتا ہے۔

بَلۡ اِیَّاہُ تَدۡعُوۡنَ: اس وقت دیو، دیوتا یاد نہیں آتے بلکہ خدائے واحد کے سوا کوئی پناہ دہندہ اسے نظر نہیں آتا۔ بڑا مشرک جو اپنے بتوں کے لیے سخت ترین تعصب رکھتا ہو، اس موقع پر انہیں فراموش کر دیتا ہے اور اس خدائے حقیقی کے آگے دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے جو اس کی جبلت کے اندر ہے۔ یہ دلیل ہے کہ یکتا پرستی خود انسان کے نفس میں موجود ہے۔

فَیَکۡشِفُ مَا تَدۡعُوۡنَ اِلَیۡہِ اِنۡ شَآءَ: اللہ کی بارگاہ میں رجوع کرنے کے بعد اللہ مشرک کی بھی دعا سنتا ہے۔ ہمیشہ اور ہر وقت نہیں۔ اِنۡ شَآءَ اگر اللہ کی مشیت میں آئے تو اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ شرک چھوڑ دے۔

اہم نکات

۱۔ خواہشات اور تعصّبات انسان کے ضمیر و وجدان پر غالب آ جائیں تو اللہ کا وجود اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

۲۔ ہر انسان کے لیے ایسا وقت ضرور آتا ہے جب تمام غیر فطری عوامل دور ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اللہ کے سوا سب کچھ فراموش ہو جائے گا جب کہ اس سے پہلے اللہ کے سوا اسے سب کچھ یاد تھا۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ فَاَخَذۡنٰہُمۡ بِالۡبَاۡسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ

۴۲۔ اور بے شک آپ سے پہلے (بھی) بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے پھر ہم نے انہیں سختیوں اور تکالیف میں مبتلا کیا تاکہ

لَعَلَّہُمۡ یَتَضَرَّعُوۡنَ﴿۴۲﴾	وہ عاجزی کا اظہار کریں۔
فَلَوۡ لَاۤ اِذۡ جَآءَہُمۡ بَاۡسُنَا تَضَرَّعُوۡا وَ لٰکِنۡ قَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ وَ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ﴿۴۳﴾	۴۳۔ پھر جب ہماری طرف سے سختیاں آئیں تو انہوں نے عاجزی کا اظہار کیوں نہ کیا؟ بلکہ ان کے دل اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے اعمال انہیں آراستہ کر کے دکھائے۔

تشریح کلمات

بِالۡبَاۡسَآءِ: (ب ء س) البؤس، البأس، البأساء، تینوں میں سختی اور ناگواری کے معنی پائے جاتے ہیں۔ مگر بؤس کا لفظ زیادہ تر فقر و فاقہ اور لڑائی کی سختی پر بولا جاتا ہے اور البأس و البأساء جسمانی زخم اور نقصان کے لیے آتا ہے (الراغب)

الضَّرَّآءِ: (ض ر ر) کے معنی بدحالی کے ہیں۔ خواہ اس کا تعلق انسان کے نفس سے ہو، جیسے علم و فضل اور عفت میں کمی اور خواہ بدن سے ہو، جیسے کسی عضو کا ناقص ہونا یا قلت مال و جاہ کے سبب۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ: اللہ تعالیٰ اس آیت میں کائنات کے قانون کی دفعات بیان فرما رہا ہے، جو اس سے پہلے کی تمام قوموں پر حاکم رہی ہیں کہ اللہ نے مختلف قوموں کی طرف رسول بھیجے اور ان کو توحید کی طرف دعوت دی اور اللہ کی نشانیاں بھی دکھائیں۔

۲۔ فَاَخَذۡنٰہُمۡ: ان قوموں کو اللہ کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ان پر کچھ سختیاں بھی نازل فرمائیں، ایسی سختیاں جو انسان ساز ہوتی ہیں لیکن ان میں نرمی آنے کی بجائے یہ لوگ اور سخت ہوگئے اور ان کے خرافاتی مراسم اور اعمال بد کو شیطان نے مزید زیبائش دی۔[1] جیسا کہ قوم موسیٰ (ع) کے فرعونیوں کو مختلف آفتوں میں مبتلا کیا:

وَ لَقَدۡ اَخَذۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ بِالسِّنِیۡنَ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ۔[2]	اور بتحقیق ہم نے آل فرعون کو قحط سالی اور پیداوار کی قلت میں مبتلا کیا، شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔

۳۔ لَعَلَّہُمۡ یَتَضَرَّعُوۡنَ: ان کو مشکلات میں ڈالنے کا مقصد یہ تھا کہ ان کے دل ٹوٹ جائیں، اللہ کی طرف رجوع کریں، چونکہ مصیبتوں سے انسان کا غرور ٹوٹ جاتا ہے اور اپنی فطرت کی طرف رجوع کرتا ہے، جہاں اسے اللہ مل جاتا ہے، جس میں اس کی کامیابی ہے۔

---

[1] اس کی مثال ہماری معاصر دنیا میں، یورپ میں ایڈز کی بیماری ہے۔ شیطان اس بیماری کے محرک اور عمل بد کو آراستہ کر کے دکھاتا ہے۔

[2] ۷ اعراف: ۱۳۰

۴۔ فَلَوۡلَاۤ اِذۡ جَآءَہُمۡ بَاۡسُنَا تَضَرَّعُوۡا: ان سختیوں پر بھی عاجزی کا اظہار نہیں کیا۔

۵۔ وَ لٰکِنۡ قَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ: اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دل جرائم میں گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے سخت ہو گئے تھے۔

۶۔ وَ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ: شیطان پہلے مرحلہ میں انسان سے گناہ کا شعور چھین لیتا ہے۔ بعد میں گناہ کو زیبا بناتا ہے۔ اب وہ اس گناہ کے ارتکاب پر فخر کرنے لگتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مصائب اور سختیاں انسان ساز ہوتی ہیں، جب کہ عیش و عشرت سے انسانی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

۲۔ اعمال بد کا مرتکب ایک توجیہ ضرور پیش کرتا ہے۔ مثلاً تارك الصلوة کہتا ہے: دل صاف ہونا چاہیے۔ یہ توجیہ شیطان کی طرف سے اس عمل بد کی آرائش ہے۔

فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُکِّرُوۡا بِہٖ فَتَحۡنَا عَلَیۡہِمۡ اَبۡوَابَ کُلِّ شَیۡءٍ ؕ حَتّٰۤی اِذَا فَرِحُوۡا بِمَاۤ اُوۡتُوۡۤا اَخَذۡنٰہُمۡ بَغۡتَۃً فَاِذَا ہُمۡ مُّبۡلِسُوۡنَ ﴿۴۴﴾

فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ؕ وَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۵﴾

۴۴۔ پھر جب انہوں نے وہ نصیحت فراموش کر دی جو انہیں کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر طرح (کی خوشحالی) کے دروازے کھول دیے یہاں تک کہ وہ ان بخششوں پر خوب خوش ہو رہے تھے ہم نے اچانک انہیں اپنی گرفت میں لے لیا پھر وہ مایوس ہو کر رہ گئے۔

۴۵۔ اس طرح ظالموں کی جڑ کاٹ دی گئی اور ثنائے کامل اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

تشریح کلمات

مبلس: (ب ل س) البلاس کے معنی سخت ناامیدی کے باعث غمگین ہونے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَتَحۡنَا عَلَیۡہِمۡ اَبۡوَابَ کُلِّ شَیۡءٍ: جب ان سختیوں اور مصیبتوں سے بھی ان کی فطرت بیدار نہ ہوئی تو ہم نے ان کو نعمتوں سے مالا مال کر دیا۔ اس مرتبہ مضمون بدل جاتا ہے۔ سختی کی جگہ آسائش آ جاتی ہے، جس سے ان کے غرور میں اور اضافہ ہو جاتا اور سرکشی بڑھ جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آسائش انہیں جہنم کی

طرف لے جانے کا پیش خیمہ ہے۔

۲۔ اَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً : اچانک ان کو اللہ اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس صورت میں پتہ چلتا ہے کہ خوشحالی کی آزمائش، بدحالی کی آزمائش سے زیادہ سنگین ہوتی ہے اور یہ آخری آزمائش ہوتی ہے۔

چنانچہ ان آزمائشوں میں مؤمن خوشحالی میں شکر اور بدحالی میں صبر کرتا ہے اور غیر مؤمن خوشحالی میں اتراتا ہے اور بدحالی میں صبر نہیں کرتا:

ذٰلِكَ وَ بَلَوۡنٰهُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ وَ السَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ○[1]	اور ہم نے آسائشوں اور تکلیفوں کے ذریعے انہیں آزمایا کہ شاید وہ باز آ جائیں۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ : آسائش کی آزمائش میں ناکامی کے بعد اس مجرم قوم کو نابود کر دیا۔

اہم نکات

۱۔ کوئی مجرم و بدکار اگر ناز و نعمت میں ہے تو یہ اس کے لیے عذاب الیم کا پیش خیمہ ہے۔[2]

۲۔ کوئی مؤمن ناز و نعمت میں ہے تو یہ اس کی شکرگزاری کا دنیا میں صلہ ہے۔

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ اَخَذَ اللّٰهُ سَمۡعَكُمۡ وَ اَبۡصَارَكُمۡ وَ خَتَمَ عَلٰی قُلُوۡبِكُمۡ مَّنۡ اِلٰهٌ غَیۡرُ اللّٰهِ یَاۡتِیۡكُمۡ بِهٖ ؕ اُنۡظُرۡ كَیۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ ثُمَّ هُمۡ یَصۡدِفُوۡنَ ﴿۴۶﴾	۴۶۔ کہد یجیے: (کافرو) تم یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تمہاری سماعت اور تمہاری بصارت تم سے چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمہیں یہ (چیزیں) عطا کرے؟ دیکھو ہم کس طرح اپنی آیات بیان کرتے ہیں، پھر بھی یہ لوگ منہ موڑ لیتے ہیں۔
قُلۡ اَرَءَیۡتَكُمۡ اِنۡ اَتٰىكُمۡ عَذَابُ اللّٰهِ بَغۡتَةً اَوۡ جَهۡرَةً هَلۡ یُهۡلَكُ اِلَّا الۡقَوۡمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۷﴾	۴۷۔ کہد یجیے: بھلا تم یہ تو بتلاؤ اگر اللہ کا عذاب تم پر اچانک یا اعلانیہ طور پر آ جائے تو کیا ظالموں کے سوا کوئی ہلاک ہو گا؟

تشریح کلمات

اَرَءَیۡتَكُمۡ : ارأیت۔ اخبرنی کے معنوں میں آتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنۡ اَخَذَ اللّٰهُ سَمۡعَكُمۡ : نفی شریک پر ایک اور دلیل: یہ کہ اگر اللہ کے علاوہ کوئی اور ذات بھی

---

[1] ۷ اعراف: ۱۶۸ [2] حدیث رسولؐ

موجود ہو جو اللہ کے ساتھ دفع ضرر اور جذب منفعت میں مؤثر ہو تو یہ دیکھ لو کہ تمہاری آنکھوں اور کان کی قوت بصارت و سماعت اگر اللہ چھین لے تو پتھر کے یہ بت تمہیں یہ چیزیں واپس دلا سکیں گے؟ اگر نہیں دلا سکتے تو اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے ان پتھروں کو کیوں شفیع اور مؤثر سمجھتے ہو اور اپنے آپ کو ظالموں میں شامل کر کے ہر آنے والے عذاب کا نشانہ کیوں بنتے ہو۔

۲۔ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ: تصریف کا مطلب یہ ہے کہ مطلب کو ایسے قالب میں ڈھالنا کہ سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ یَصۡدِفُوۡنَ: الصدوف منہ موڑنے کو کہتے ہیں۔

۳۔ اِنۡ اَتٰىکُمۡ عَذَابُ: یہ تو بتلاؤ! عذاب اچانک آئے یا اعلانیہ، ہر صورت میں اس عذاب میں مبتلا ہونے والے، ظالم لوگ ہی ہوں گے۔

۴۔ ھَلۡ یُھۡلَکُ: عذاب جرم کی سزا ہے اور جرم کا جامع لفظ ظلم ہے۔ پس سزا اسی کو ملے گی جس نے جرم کیا ہے۔ یعنی ظالمین کو۔

اہم نکات

۱۔ جو ذات مؤثر فی الوجود نہ ہو، باذن اللہ نہ ہو، اس سے لو لگانا شرک ہے۔

۲۔ ظالم کا انجام ہمیشہ عبرتناک ہوتا ہے۔

وَمَا نُرۡسِلُ الۡمُرۡسَلِیۡنَ اِلَّا مُبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ ۚ فَمَنۡ اٰمَنَ وَاَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور ہم تو رسولوں کو صرف بشارت دینے والے اور تنبیہ کرنے والے بنا کر بھیجتے ہیں پھر جو ایمان لے آئے اور اصلاح کر لے تو ایسے لوگوں کے لیے نہ تو کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی وہ محزون ہوں گے۔

وَالَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَمَسُّهُمُ الۡعَذَابُ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ﴿۴۹﴾

۴۹۔ اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا وہ اپنی نافرمانیوں کی پاداش میں عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا نُرۡسِلُ: لہجہ کلام میں ایک قسم کی تبدیلی کے ساتھ ظالموں کو تنبیہ کی جا رہی ہے۔ اللہ کا یہ طریقہ عمل رہا ہے کہ وہ انبیاء کو اس لیے بھیجتا ہے کہ وہ ایمان والوں کو بشارت دیں کہ انہیں کوئی خوف ہے نہ رنج۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ دنیا میں ایمان و عمل صالح کی وجہ سے اطمینان قلب اور آخرت میں جوار رحمت کی وجہ سے امن و سکون ہو گا۔

۲۔ وَالَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا: جب کہ تکذیب رسل کرنے والوں کے لیے تنبیہ ہے کہ ان کے فسق و فجور کی پاداش میں عذاب ہو گا۔

۳۔ یَفۡسُقُوۡنَ: تکذیب انبیاء کے بعد ہدایت سے محروم ہونے کی وجہ سے فسق و فجور کے علاوہ کسی نیکی کا امکان باقی نہیں رہتا۔

اہم نکات

۱۔ ایمان و عمل صالح والے دونوں جہاں میں بے خوف اور امن و سکون میں ہوتے ہیں۔

۲۔ فاسق اور کافر خوف و اضطرار کی زندگی گزارتے ہیں۔

قُلۡ لَّاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ عِنۡدِیۡ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ وَلَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ اِنِّیۡ مَلَکٌ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ؕ قُلۡ ہَلۡ یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَالۡبَصِیۡرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَکَّرُوۡنَ﴿۵۰﴾

۵۰۔ کہدیجیے: میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ ہی میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی ہوتی ہے، کہدیجیے: کیا اندھا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟

تفسیر آیات

۱۔ خَزَآئِنُ اللّٰہِ: خزانہ الٰہی سے ممکن ہے وہ منبع فیض مراد ہو جس سے تمام موجودات اپنے وجود سمیت بے شمار نعمتوں سے مستفیض ہو رہی ہیں۔ اسی کو خزائن رحمت سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی مصدر فیض سے پوری کائنات وجود میں آئی ہے: وَلِلّٰہِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ...[۱] آسمانوں اور زمین کے خزانوں کا مالک اللہ ہی ہے۔ اللہ کے اس خزانہ کی کلید گویا کلمہ کُن ہے، جس سے اشیاء کو وجود کا فیض ملتا ہے اور دیگر نعمتوں کا بھی سرچشمہ یہی خزانہ ہے۔

لہٰذا جس کے پاس یہ خزانہ ہو گا، وہ کائنات میں جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے۔ اس تصرف کے لیے کوئی حد بندی نہیں ہو گی۔

مشرکین کا یہ خیال تھا کہ اگر اللہ کی طرف سے کوئی رسول آتا ہے تو اسے انسانوں کی طرح بھوک، پیاس سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ اسے بیوی بچوں کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ وہ رسول ایسا ہونا چاہیے کہ وہ جب حکم دے تو پہاڑ سونے کا بن جائے۔ اس کے ایک اشارے سے دنیا کی ساری نعمتیں سمٹ کر اس کے

سامنے آ جائیں۔ یہ کیسا رسول ہوا کہ اس کو اپنی ضرورتوں کے لیے لوگوں سے قرض لینے تک کی نوبت آ جائے:

وَقَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ الۡاَرۡضِ یَنۡۢبُوۡعًا ﴿ۙ۹۰﴾ اَوۡ تَکُوۡنَ لَکَ جَنَّۃٌ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الۡاَنۡہٰرَ خِلٰلَہَا تَفۡجِیۡرًا ﴿ۙ۹۱﴾ اَوۡ تُسۡقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمۡتَ عَلَیۡنَا کِسَفًا اَوۡ تَاۡتِیَ بِاللّٰہِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ قَبِیۡلًا ﴿ۙ۹۲﴾ اَوۡ یَکُوۡنَ لَکَ بَیۡتٌ مِّنۡ زُخۡرُفٍ اَوۡ تَرۡقٰی فِی السَّمَآءِ ...[۲]

اور کہنے لگے: ہم آپ پر ایمان نہیں لاتے جب تک آپ ہمارے لیے زمین کو شگافتہ کر کے ایک چشمہ جاری نہ کریں یا آپ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایسا باغ ہو جس کے درمیان آپ نہریں جاری کریں یا آپ آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دیں جیسا کہ خود آپ کا زعم ہے یا خود اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئیں یا آپ کے لیے سونے کا ایک گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں....

اس قسم کی نامعقول باتوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔

۲۔ وَلَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ: اور نہ میں غیب جانتا ہوں۔ علم غیب کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ علم غیب جو بغیر کسی وحی اور تعلیم کے بطور استقلال ذاتی طور پر جاننا ہے۔ یہ علم غیب، ذات الٰہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسرا وہ علم غیب جو وحی اور تعلیم کے ذریعے کسی ذات میں آ جائے۔ اس قسم کا علم غیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بصریح قرآن ثابت ہے:

عٰلِمُ الۡغَیۡبِ فَلَا یُظۡہِرُ عَلٰی غَیۡبِہٖۤ اَحَدًا ﴿ۙ﴾ اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ ...[۲]

وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنے غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا، سوائے اس رسول کے جسے اس نے برگزیدہ کیا ہو.

چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡہِ اِلَیۡکَ ...[۳]

یہ غیب کی خبریں ہم آپ کو وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں ....

۳۔ وَلَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ اِنِّیۡ مَلَکٌ: نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، مادی لوازم حیات سے بے نیاز ہوں۔ میں تو ہمیشہ یہی کہتا رہا ہوں کہ میں انسان ہوں۔ لہٰذا تم یہ نہیں کہہ سکتے:

مَالِ ہٰذَا الرَّسُوۡلِ یَاۡکُلُ الطَّعَامَ وَ یَمۡشِیۡ فِی الۡاَسۡوَاقِ ...[۴]

یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے....

۴۔ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ: جو کچھ میرے پاس ہے، وہ وحی کے ذریعے ہے۔ بذات خود نہیں ہے۔

۵۔ ہَلۡ یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَ الۡبَصِیۡرُ: کیا اندھا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں؟ جس کو وحی سے بینائی

---

۱ ۶۳ منافقون: ۷ ۲ ۱۷ الاسراء: ۹۰ تا ۹۳ ۲ ۷۲ جن: ۲۶ ۳ ۳ آل عمران: ۴۴ ۴ ۲۵ فرقان: ۷

ملی ہو، جس کی وجہ سے کل آفاق اس کے سامنے ہو، وہ تم جیسے اندھوں کی طرح ہو سکتا ہے، جنہیں اپنے سامنے کی چیز کا بھی علم نہیں ہوتا۔

۲۔ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ: یہ نہیں سوچتے ہو کہ میں وحی کی روشنی میں بینا ہوں۔ نابیناؤں کو بیناؤں کی پیروی کرنا چاہیے۔

اہم نکات

ا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی کے علاوہ اپنے اجتہاد سے کوئی بات نہیں کرتے تھے: اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ....

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ اور آپ اس (قرآن) کے ذریعے ان لوگوں کو متنبہ کریں جو اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے سامنے ایسی حالت میں جمع کیے جائیں گے کہ اللہ کے سوا ان کا نہ کوئی کارساز ہوگا اور نہ شفاعت کنندہ، شاید وہ تقویٰ اختیار کریں۔

تفسیر آیات

قرآن عامۃ الناس کی ہدایت و انذار کے لیے ہے، کسی خاص گروہ کے ساتھ تخصیص نہیں ہے۔ تاہم اس قرآن سے استفادہ کرنے اور ہدایت لینے والے تو یہی خوف خدا دل میں رکھنے والے اہل تقویٰ ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے قرآن کو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ [1] تقویٰ والوں کے لیے ہدایت قرار دے دیا ہے کیونکہ قرآنی تعلیمات کا محور قیامت، سزا و جزا ہے۔

لَيْسَ لَهُمْ: اس قرآن سے فائدہ وہ اٹھائیں گے، جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں: صرف اللہ کارساز اور شفیع ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۔[2] کہد یجیے: ساری شفاعت اللہ کے اختیار میں ہے۔

آگے وہ جسے شفاعت کا حق دے، وہ شفاعت کر سکتا ہے:

مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ....[3] اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔

اہم نکات

ا۔ قرآنی دعوت عام ہے لیکن اس کے اہل خاص لوگ ہیں۔

---

[1] ۲ بقرۃ: ۲ [2] ۳۹ زمر: ۴۴ [3] ۱۰ یونس: ۳

۲۔　خوف محشر، کردار ساز ہے۔

وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَ الۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ ؕ مَا عَلَیۡکَ مِنۡ حِسَابِہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّ مَا مِنۡ حِسَابِکَ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَتَطۡرُدَہُمۡ فَتَکُوۡنَ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ اور جو لوگ صبح و شام اپنے رب سے دعا کرتے ہیں اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ کریں نہ آپ پر ان کا کوئی بار حساب ہے اور نہ ہی ان پر آپ کا کوئی بار حساب ہے کہ آپ انہیں (اپنے سے) دور کر دیں پس (اگر ایسا کیا تو) آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

تفسیر آیات

ابن مسعود راوی ہیں کہ قریش کی ایک جماعت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب سے گزر ہوا۔ آپؐ کے پاس صہیب، عمار، بلال، خباب اور اس قسم کے دیگر لوگ بیٹھے تھے، تو انہوں نے کہا: اے محمدؐ! کیا آپؐ اپنی قوم کی جگہ ایسے لوگوں کو پسند کرتے ہیں۔ کیا اللہ نے ہم کو چھوڑ کر ان لوگوں پر احسان کیا ہے تو کیا ہم ان لوگوں کے تابع ہو جائیں؟ ان کو اپنے سے دور کریں۔ اگر آپؐ ایسا کریں تو شاید ہم آپؐ کے تابع ہو جائیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض اصحاب نے اس جگہ رسول اللہؐ کی خدمت میں اپنا اجتہاد پیش کیا: لو فعلت لك اگر آپؐ اس تجویز پر عمل کر کے دیکھ لیتے؟ لکھتے ہیں: اس آیت کے نزول کے بعد انہوں نے معذرت کی۔[1]

جب کہ قوم نوح نے بھی یہی طنز کیا تھا:

مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیۡنَ هُمۡ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاۡیِ ...[2]　اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہم میں سے ادنیٰ درجے کے لوگ سطحی سوچ سے تمہاری پیروی کر رہے ہیں۔

اس پر حضرت نوح (ع) کا موقف بھی قرآن بیان فرماتا: وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۔[3] میں مؤمنوں کو اپنے سے دور کرنے والا نہیں ہوں۔

جن اصحاب کو اپنے سے دور نہ کرنے کا حکم آیا، وہ مفلوک الحال ضرور تھے، مگر اللہ نے ان کے یہ اوصاف بیان کیے ہیں:

یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ: یہ لوگ اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں۔ اس سے دعا یا نماز مراد ہو سکتی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر الجواهر ۴: ۲ ۔مجمع البیان ۴: ۴۷۳۔ النزول وتفسیر ابن کثیر ۳: ۲۳۲۔ تفسیر ثعلبی ۴: ۱۵۰، الانعام آیت ۴۹

[2] ۱۱ ہود: ۲۷　[3] ۲۶ شعراء: ۱۱۴

يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ: وہ اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں، جو بہت بڑی فضیلت ہے، چونکہ اس سے ان کا اخلاص در عمل ثابت ہوتا ہے۔ وجھہ میں سے مراد ذات خدا ہے۔ لفظ وجہ ذات کے لیے قرآن میں بہت جگہ ذکر ہوا ہے۔

مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ: آپؐ کے گرد و پیش میں جو لوگ موجود ہوتے ہیں، وہ اگر اپنے اعمال میں مخلص ہیں تو اور اگر ان کا باطن پاکیزہ نہیں ہے تو دونوں صورتوں میں ان کے اعمال کا حساب خود ان کو دینا ہے۔ آپؐ ان کو کس بنیاد پر اپنے سے دور کریں گے۔

فَتَطْرُدَهُمْ: اس کے باوجود اگر ان کو اپنے دور کریں گے تو یہ زیادتی ہوگی۔

مسئلہ کی اہمیت کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرمایا: اگر ایک مؤمن کو مادی قدروں کی بنیاد پر کہ وہ غریب ہے، اپنے سے دور کر دیں تو آپؐ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔ اس طرح اسلام قدروں کا انقلاب لے کر آیا کہ قریش کے مقتدر افراد اور سرداروں پر ایسے اشخاص کو ترجیح مل رہی ہے، جو مادی اعتبار سے نہایت مفلوک الحال ہیں۔ ان کے جسموں سے بو آتی ہے۔ تن پر کپڑے بھی قاعدے کے نہیں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اس قسم کی مادی قدروں اور روحانی وانسانی قدروں کی جنگ تمام انبیاء نے لڑی ہے۔

۲۔ اسلام طبقاتی امتیاز مٹانے کے لیے آیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ۝۵۳

۵۳۔ اور اس طرح ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے (یوں) آزمائش میں ڈالا کہ وہ یہ کہدیں کہ کیا ہم میں سے یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے فضل و کرم کیا ہے؟ (کہدیجیے) کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو بہتر نہیں جانتا؟

تفسیر آیات

ابتدائے اسلام میں چند ایک غریب اور مفلوک الحال افراد نے ہی اسلام قبول کیا تھا اور قریش کے رؤساء اور امیر لوگ اسلام کے سخت ترین دشمن تھے۔ وہ از روئے طنز و تمسخر کہتے ہیں کہ کیا اللہ نے ہم میں سے صہیب، عمار، بلال، خباب جیسوں کو اپنے فضل و کرم کے لیے انتخاب کیا ہے؟ جن کے جسم سے بدبو آتی ہے۔ ہم اسلام قبول کر بھی لیں تو کیا ان کی مجلس و محفل میں ہم ساتھ بیٹھ جائیں؟ اس آیت میں جواب دیا جا

رہا ہے کہ یہی اصل آزمائش ہے کہ کون انسانی، روحانی، الٰہی اور اخلاقی اقدار کو مانتا ہے اور کون مادی اور نفسانی خواہشوں کی قدروں کو مانتا ہے۔ یہ اقدار کا امتحان ہے۔ ہم آج بھی بہت سے لوگوں کو اس امتحان میں ناکام دیکھتے ہیں۔ لوگوں کی قیمت لگاتے ہوئے مادی قدروں کو سامنے رکھتے ہیں اور دیگر انسانی اور اخلاقی قدروں کو اعتنا میں نہیں لاتے۔

اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَعۡلَمَ بِالشّٰكِرِيۡنَ: شاکرین کے مقام پر وہ قلیل جماعت قائم ہے جو ہمیشہ حق پر قائم رہتی ہے۔ ملاحظہ ہو آل عمران آیت ۱۴۴۔

اہم نکات

۱۔ یہ آیت عمار، صہیب اور خباب کے بارے میں نازل ہوئی۔[۱]

۲۔ جو شخص مالدار کا اس کی دولت کی خاطر احترام کرے تو اس کے دین کے دو حصے ختم ہو جاتے ہیں۔ (حضرت علی علیہ السلام)

۳۔ اسلام انسانی، اخلاقی اور روحانی قدروں کا مذہب ہے۔ اقدار والا انسان شاکر ہوتا ہے۔

وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلۡ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ كَتَبَ رَبُّكُمۡ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنۡ عَمِلَ مِنۡكُمۡ سُوۡٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۢ بَعۡدِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ اور جب آپ کے پاس ہماری آیات پر ایمان لانے والے لوگ آ جائیں تو ان سے کہیے: سلام علیکم تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے کہ تم میں سے جو نادانی سے کوئی گناہ کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح کر لے تو وہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ وَلِتَسۡتَبِيۡنَ سَبِيۡلُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۵۵﴾

۵۵۔ اور اسی طرح آیات کو ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ مجرموں کا راستہ نمایاں ہو جائے.

تفسیر آیات

جاہلیت کی اقدار کے مطابق جن افراد کے ساتھ بیٹھنے میں عار محسوس کیا جاتا تھا، انہی افراد کو اسلامی قدروں کے مطابق یہ مقام ملتا ہے کہ اللہ کے رسولؐ کو یہ حکم ملتا ہے کہ جب یہ لوگ آپؐ کے پاس آ جائیں، انہیں سلام علیکم کہیں، ان پر سلام کریں، انہیں انسانی حقوق اور احترام آدمیت سے نوازیں۔

۱۔ مجمع البیان ۴: ۴۷۳۔ النزول وتفسیر طبری ۷: ۱۲۷

رسول رحمتؐ کو یہ حکم ملتا ہے ان کو عزت و اکرام دیں۔

کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ: تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے۔ (اس جملے کی تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں انعام: ۱۲) اس رحمت کی ایک صورت اگلے جملے میں بیان فرمائی ہے:

بِجَهَالَۃٍ: اگر زمان جاہلیت میں نہ جاننے کی وجہ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے تو اللہ اسے معاف کر دے گا۔ آیت کا اطلاق ان تمام گناہوں کو شامل کرتا ہے جو انسان سے از روئے غفلت سرزد ہو جاتے ہیں، پھر توبہ کرتے ہیں۔ بِجَهَالَۃٍ کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ النساء آیت ۱۷۔

وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ یَظۡلِمۡ نَفۡسَہٗ ثُمَّ یَسۡتَغۡفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ۝[1]

اور جو برائی کا ارتکاب کرے یا اپنے نفس پر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے تو وہ اللہ کو درگزر کرنے والا، رحم کرنے والا پائے گا۔

لِتَسۡتَبِیۡنَ سَبِیۡلُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ: قرآن میں ہدایت پانے والوں اور گمراہ ہونے والوں کے لیے بیان حق و باطل میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اس آیت میں فرمایا کہ ہم آیات کو مفصل طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ مجرموں کا راستہ، باطل ہونے کی حیثیت نمایاں ہو جائے۔

اہم نکات

۱۔ رسول اسلامؐ پر واجب ہے کہ مؤمنین کو احترام آدمیت سے نوازیں۔

۲۔ رحیم ذات کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر رحمت عام کرے۔

قُلۡ اِنِّیۡ نُهِیۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ قُلۡ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهۡوَآءَکُمۡ ۙ قَدۡ ضَلَلۡتُ اِذًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُهۡتَدِیۡنَ ۝۵۶

۵۶۔ کہہ دیجیے: اللہ کے سوا تم جنہیں پکارتے ہو ان کی بندگی سے مجھے منع کیا گیا ہے، کہہ دیجیے: میں تمہاری خواہشات کی اتباع نہیں کروں گا اور اگر ایسا کروں تو میں گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت یافتہ افراد میں شامل نہیں رہوں گا۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اِنِّیۡ نُهِیۡتُ: کہہ دیجیے: غیر اللہ کی پرستش سے مجھے روکا گیا ہے۔ میرے اللہ نے روکا ہے۔ میری فطرت اور وجدان نے روکا ہے۔ دونوں باتیں قرین واقع ہیں۔

---

[1] ۴ نساء: ۱۱۰

۲۔ قُلۡ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهۡوَآءَكُمۡ : کہد یجیے: بت پرستی، خواہش پرستی ہے اور حق، خواہش پرستی کی اجازت نہیں دیتا:

وَلَوِ اتَّبَعَ الۡحَقُّ اَهۡوَآءَهُمۡ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهِنَّ ....[1]

اور اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کے مطابق چلتا تو آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب تباہ ہو جاتے....

۳۔ قَدۡ ضَلَلۡتُ اِذًا: خواہش پرستی دینداری نہیں ہے، گمراہی ہے۔ چونکہ دینی تعلیمات کا تعلق اس ذات سے ہوتا ہے جس نے دین دیا ہے اور اگر دین کو دین دینے والے سے نہ لیں بلکہ ذاتی رائے اور خواہش سے لیں تو یہ خود پرستی ہے، خدا پرستی نہیں ہے۔

قُلۡ اِنِّیۡ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ وَکَذَّبۡتُمۡ بِہٖ ؕ مَا عِنۡدِیۡ مَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِہٖ ؕ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ یَقُصُّ الۡحَقَّ وَ ہُوَ خَیۡرُ الۡفٰصِلِیۡنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ کہد یجیے: میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر (قائم) ہوں اور تم اس کی تکذیب کر چکے ہو، جس چیز کی تم جلدی کر رہے ہو وہ میرے پاس نہیں ہے، فیصلہ تو صرف اللہ ہی کرتا ہے، وہ حقیقت بیان فرماتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

قُلۡ لَّوۡ اَنَّ عِنۡدِیۡ مَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِہٖ لَقُضِیَ الۡاَمۡرُ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ کہد یجیے: جس چیز کی تم جلدی کر رہے ہو اگر وہ میرے پاس موجود ہوتی تو میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اِنِّیۡ عَلٰی بَیِّنَۃٍ : بینہ اس دلیل کو کہتے ہیں جس میں حق کو باطل سے جدا کر کے دکھایا جاتا ہے۔ یہاں اس سے مراد قرآن ہے۔

۲۔ کَذَّبۡتُمۡ بِہٖ : میں بِہٖ قرآن کی طرف راجع ہے۔ یعنی تم نے اس دلیل کی تکذیب کی ہے۔ اس کے باوجود تمہاری تباہی میں اللہ تعالیٰ عجلت سے کام نہیں لیتا بلکہ تمہیں مہلت دے رہا ہے۔

۳۔ مَا عِنۡدِیۡ مَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِہٖ : جو عذاب تم جلدی طلب کر رہے ہو، وہ میرے پاس نہیں ہے۔ مشرکین کو جب اپنے جرائم کی وجہ سے سابقہ امتوں کی طرح کے عذاب سے ڈرایا جاتا تھا تو وہ کہتے تھے:

---

[1] ۲۳ مؤمنون: ۷۱

کہاں ہے وہ عذاب؟ اگر آپ سچے ہیں تو وہ عذاب کب آئے گا۔ فرمایا: وہ عذاب میرے پاس نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ اللہ نے کرنا ہے۔

ہر امت اپنے نبی سے فیصلہ کن معجزے طلب کرتی رہی ہے کہ اگر آپ برحق رسول ہیں تو ہم پر عذاب نازل کریں۔ نوح (ع) کی امت نے کہا:

فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ... [1]　اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لے آؤ جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔

قوم صالح نے کہا:

فَاۡتِ بِاٰیَۃٍ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ... [2]　پس اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی (معجزہ) پیش کرو۔

قوم شعیب نے کہا:

فَاَسۡقِطۡ عَلَیۡنَا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ... [3]　آسمان کا کوئی ٹکڑا ہم پر گرا دو۔

اور یہی مطالبہ رسول اسلامؐ کی امت نے بھی کر دیا:

اَوۡ تُسۡقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمۡتَ عَلَیۡنَا کِسَفًا ... [4]　یا آپ آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دیں جیسا کہ خود آپ کا زعم ہے۔

جواب میں فرمایا: جس چیز کی تمہیں جلدی ہے، وہ میرے پاس نہیں ہے۔ فیصلہ تو صرف اللہ ہی کرتا ہے۔ وہ اگر چاہے تو تم پر عذاب نازل کرے اور قوم عاد و ثمود کی طرح تم کو ایک آن میں ہلاک کر دے۔

۴۔ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ: فیصلے کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔ وہ چاہے تاخیر کرے، چاہے تعجیل کرے۔ جی ہاں! فیصلہ خواہ تکوینی ہو یا تشریعی صرف اللہ کرتا ہے۔ اگر کسی اور کی طرف کوئی فیصلہ منسوب ہوتو وہ اس لیے ہوتا ہے، چونکہ اللہ کی طرف منتہی ہوتا ہے۔

۵۔ یَقُصُّ الۡحَقَّ: حق بیان کرنے کے بعد مہلت دی جاتی ہے۔ یَقُصُّ کے ایک معنی اتباع سے بھی کیا ہے، چونکہ قص کے معنی پیچھا کرنے کے بھی ہیں۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ غیر اللہ کی بندگی، خواہشات کی بندگی ہے اور خواہشات کی بندگی گمراہی ہے۔

۶۔ لَقُضِیَ الۡاَمۡرُ: جس عذاب کی تمہیں جلدی ہے، اس کا فیصلہ اگر میرے پاس آ جاتا تو فوری نفاذ کے لیے آ جاتا اور میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا۔

اہم نکات

۱۔ اللہ خود بہتر جانتا ہے کہ کس وقت عذاب دینا ہے۔

---

[1] ۱۱ھود: ۳۲　[2] ۲۶شعراء: ۱۵۴　[3] ۲۶شعراء: ۱۸۷　[4] ۱۷اسراء: ۹۲

۲۔ یہ اللہ کا مقام رحمانیت ہے کہ کفار عذاب کے مستحق بھی ہیں اور خود مطالبہ کرتے ہیں، پھر بھی عذاب نہیں بھیجتا۔

وَعِنۡدَهٗ مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ لَا يَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعۡلَمُ مَا فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ ؕ وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعۡلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۵۹﴾

۵۹۔ اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ خشکی اور سمندر کی ہر چیز سے واقف ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس سے آگاہ ہوتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ اور خشک و تر ایسا نہیں ہے جو کتاب مبین میں موجود نہ ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَعِنۡدَهٗ مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ: مَفَاتِحُ کو اگر مَفتح (بفتح میم) کی جمع مان لیا جائے تو اس کے معنی خزانے کے ہوں گے اور اگر اس کو مِفتح (بکسر میم) کی جمع مان لیا جائے تو اس کے معنی مفتاح کے ہوں گے یعنی چابیاں۔ ہم نے یہی معنی اختیار کیا ہے چونکہ دیگر قرآنی آیات، النور آیت ۶۱، قصص آیت ۷۶ میں مفاتحہ چابیوں کے معنی میں ہیں۔

غیبی علوم کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ غیبی علوم جو عالم شہود میں آ سکتے ہیں اور غیر خدا بھی اس پر باذن خدا آگاہ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً وہ غیبی علوم جن کا اس آیت میں ذکر آیا۔ صحراؤں کے ذرات، دریاؤں اور سمندروں کے حیوانات، درختوں سے گرنے والے پتے جیسی معمولی جزئیات، زمین کی تاریک تہوں میں پوشیدہ دانوں کی خصوصیات وغیرہ۔

دوسرے وہ غیبی علوم جو عالم شہود میں نہیں آ سکتے۔ یہ علوم کسی زمانے کی حدود و قیود میں نہیں آتے۔ یہ اللہ کے لامحدود علم سے مربوط ہیں۔ چونکہ جیسا کہ خود ذات الٰہی لا محدود ہے، اس کا علم بھی لامحدود ہے اور جو عالم شہود میں آتا ہے، وہ محدود ہو جاتا ہے۔

یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات یا اپنی قدرت کے اسرار میں سے جو مقدار انسان کو دکھائی ہے، وہی سمجھ سکتا ہے۔ اس سے آگے انسانی ذہن کسی ایسی چیز کے سمجھنے پر قادر نہیں ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے ہمارے علم میں نہ ڈالا ہو۔ مثلاً اگر اللہ نے آتش کو خلق نہ فرمایا ہوتا تو انسان اسے نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لہٰذا انسانی ذہن میں صرف وہ معلومات آ سکتی ہیں جو وجود میں ہوں اور منصۂ شہود میں آ چکی

ہوں: سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ....[1]

علامہ طباطبائی فرماتے ہیں:

ان المراد لمفاتح الغیب الخزائن الالٰھیۃالتی تشتمل علی الاشیاء قبل تفریغھا فی قالب الاقدار۔[2]	مَفَاتِحُ الۡغَیۡبِ سے مراد وہ الٰہی خزانے ہیں جو ان اشیاء پر مشتمل ہیں جو ابھی مقدرات کے قالب میں نہیں آئیں۔

یہ غیبی علوم کا وہ حصہ ہے جو ذات الٰہی کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا۔ لَا یَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ۔

۲۔ وَیَعۡلَمُ مَا فِی الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ : انسان کے محدود حس وشعور کے لیے محدود محسوسات کی دو مثالیں: دریائی وخشکی کی موجودات، کل کائنات میں موجود دریاؤں کی موجودات، کائنات کے وجود سے پہلے جب عرش الٰہی پانی پر تھا۔ وَّکَانَ عَرۡشُهٗ عَلَی الۡمَآءِ[3] ۔ اس زمانے کی آبی مخلوقات بلکہ ان کے وجود میں آنے سے پہلے اللہ ان سب کو جانتا ہے۔ البر میں وہ تمام کرات جو کل کائنات میں ہیں، ان سب کی موجودات کو ان کے وجود سے پہلے جانتا ہے۔

۳۔ وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَۃٍ اِلَّا یَعۡلَمُهَا : پتوں کا گرنا۔ بقول فی ظلال القرآن بلندی سے نیچے کی طرف اور حیات سے نابودی کی طرف، یہ امور موت وفنا اور سقوط وانحطاط کی حرکت ہیں۔

اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے، خواہ ایک چھوٹا پتہ گرنے کا ہی کیوں نہ ہو، جو کسی کے لیے قابل توجہ نہیں ہے۔ البتہ واقع میں یہ صعود کے بعد نزول ہے۔ عروج کے بعد زوال ہے۔ بہار کے بعد خزاں ہے۔ ایک دورانیہ کا اختتام ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ وَلَا حَبَّۃٍ فِیۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ : یہ صرف اللہ جانتا ہے کہ زیر زمین کی تاریکیوں میں دانے کس خاصیت کے ہیں؟ کس تعداد میں ہیں؟ کس کس جگہ ہیں؟ ان کو ایک جگہ سے دوسرے مقامات کی طرف کن ذرائع سے منتقل کیا جاتا ہے؟ ان میں نشو ونما کی کیا کیا قوتیں پنہاں ہیں؟ زمین کی تاریکیوں سے نکل کر یہ دانے (بیج) کیا کیا رعنائیاں دکھاتے اور اہل ارض کے لیے متعدد اور متنوع نعمتیں فراہم کرتے ہیں؟

۵۔ وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا یَابِسٍ : کائنات کی ہر چیز کو شامل کرنے کے لیے ایک جامع تعبیر ہے۔ انسان کے لیے جو قابل تصور ہے، وہ یہ ہے کہ مادی چیزیں یا خشک ہوتی ہیں یا تر اور ایسی شے قابل تصور نہیں ہے جو مادی ہو اور خشک بھی نہ ہو اور تر بھی نہ ہو۔

۶۔ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ : اللہ تعالیٰ اس کائنات میں موجود ہر شے اور یہاں رونما ہونے والے ہر واقعہ کے ماوراء ایک ایسی اہم ترین شے کا ذکر فرماتا ہے جسے ایک نظام کے لیے، ایک آئین کی حیثیت حاصل ہے کہ اس عالم شہود وعیاں میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب ان دفعات یا آرٹیکلز کے مطابق ہے جو اس بنیادی

---

[1] ۲ بقرہ: ۳۲　[2] المیزان ۷: ۱۲۸　[3] ۱۱ ہود: ۷

آئین میں لکھا ہوا ہے۔ اس آئین کو کتاب مبین، ام الکتاب، کتاب حفیظ، کتاب مکنون، الزبر وغیرہ کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ چنانچہ سورہ حدید میں فرمایا:

مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَہَا ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ۞ [1]	کوئی مصیبت زمین پر اور تم پر نہیں پڑتی مگر یہ کہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے وہ ایک کتاب میں لکھی ہوتی ہے اللہ کے لیے یقیناً یہ نہایت آسان ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَ مَا یُعَمَّرُ مِنۡ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا یُنۡقَصُ مِنۡ عُمُرِہٖۤ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ۞ [2]	اور نہ کسی زیادہ عمر والے کو عمر دی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی عمر میں کمی کی جاتی ہے، مگر یہ کہ کتاب میں (ثبت) ہے یقیناً یہ سب کچھ اللہ کے لیے آسان ہے۔

نیز ارشاد فرمایا:

وَ کُلُّ صَغِیۡرٍ وَّ کَبِیۡرٍ مُّسۡتَطَرٌ ۔ [3]	اور ہر چھوٹی اور بڑی بات لکھی ہوئی ہے۔
وَ مَا یَعۡزُبُ عَنۡ رَّبِّکَ مِنۡ مِّثۡقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ وَ لَاۤ اَصۡغَرَ مِنۡ ذٰلِکَ وَ لَاۤ اَکۡبَرَ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ۞ [4]	اور زمین و آسمان کی ذرہ برابر اور اس سے چھوٹی یا بڑی کوئی چیز ایسی نہیں جو آپ کے رب سے پوشیدہ ہو اور روشن کتاب میں درج نہ ہو۔

آنے والے حوادث وقوع میں آنے سے پہلے اللہ کے علم میں ہوتے ہیں۔ ان میں انسان سے سرزد ہونے والے اعمال بھی شامل ہیں کہ اللہ کے علم میں ہے یا لوح محفوظ یا کتاب مبین میں ہے کہ فلاں بندہ اپنے اختیار اور پوری آزادی و خودمختاری سے کون سا عمل بجا لانے والا ہے۔

وَ کُلُّ شَیۡءٍ فَعَلُوۡہُ فِی الزُّبُرِ ۔ [5]	اور جو کچھ انہوں نے کیا ہے، سب نامہ اعمال میں درج ہے۔

یہ نکتہ نہایت قابل توجہ ہے کہ اللہ کے علم ازلی سے جبر لازم نہیں آتا کیونکہ اللہ کے علم کا موضوع یہ ہے کہ خودمختار بندہ اپنی پوری خودمختاری کے ساتھ کیا کچھ کرنے والا ہے۔ جیسا کہ استاد کے علم میں آتا ہے کہ کاہل مزاج شاگرد اپنی خودمختاری سے ناکامی کا منہ دیکھے گا۔ استاد کے علم سے لازم نہیں آتا کہ شاگرد ناکام ہونے پر مجبور ہے۔

اہم نکات

۱۔ لامحدود غیبی علوم پر صرف اللہ کو احاطہ ہے۔

۲۔ خشکی اور دریاؤں کی موجودات کا حقیقی علم اللہ کو حاصل ہے، دوسروں کا علم ظاہری اور سطحی ہے۔

---

[1] ۵۷ حدید: ۲۲ [2] ۳۵ فاطر: ۱۱ [3] ۵۴ قمر: ۵۳ [4] ۱۰ یونس: ۶۱ [5] ۵۴ قمر: ۵۲

۳۔ گرنے والے پتوں کا تنزل اور دانے کا ارتقا اسی کے علم میں ہے۔
۴۔ اللہ کی طرف سے اذن یافتہ ذوات کے علاوہ تمام کی غیب گوئیاں باطل ہیں۔
۵۔ اللہ کا علم جزئیات پر محیط ہے: وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَۃٍ ...۔
۶۔ اس کائنات کے نظام کے ماوراء ایک آئین ہے، جسے کتاب مبین کہتے ہیں۔
۷۔ غیب پر ایمان، تحقیق اور انکشاف ہی علمی پیشرفت کے زینے ہیں۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡ یَتَوَفّٰىکُمۡ بِالَّیۡلِ وَ یَعۡلَمُ مَا جَرَحۡتُمۡ بِالنَّہَارِ ثُمَّ یَبۡعَثُکُمۡ فِیۡہِ لِیُقۡضٰۤی اَجَلٌ مُّسَمًّی ۚ ثُمَّ اِلَیۡہِ مَرۡجِعُکُمۡ ثُمَّ یُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۰﴾

۶۰۔ اور وہی تو ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور دن میں تم جو کچھ کرتے ہو اس کا علم رکھتا ہے، پھر وہ دن میں تمہیں اٹھا دیتا ہے تاکہ معینہ مدت پوری کی جائے، پھر تم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

تشریح کلمات

جَرَحۡتُمۡ: (ج ر ح) جرح۔ اس جگہ عمل کے معنوں میں ہے، جو اعضاء و جوارح کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے۔ اسی سے اعضاء کو جوارح کہتے ہیں، چونکہ یہ کسب و کار کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ توفیٰ، وفا، پورا کرنے کے معنوں میں ہے۔ یہ لفظ موت کے لیے استعمال ہوا ہے اور نیند کے لیے بھی۔ فرق یہ ہے کہ موت سے انسانی دماغ مکمل ختم ہو جاتا ہے، نیند میں دماغ کا ایک حصہ معطل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مرنے کے بعد اٹھانے کو بعث کہتے ہیں۔ اس آیت میں نیند کے بعد اٹھنے کو بھی بعث کہا ہے۔

۲۔ یَبۡعَثُکُمۡ ۔ کیونکہ موت اور نیند دونوں حالتوں میں انسان میں تحرک نہیں رہتا اور جیسا کہ مرنے کے بعد زندہ ہونے سے پھر تحرک شروع ہوتا ہے، نیند سے بیدار ہونے کے بعد بھی تحرک پیدا ہوتا ہے۔ لیل و نہار کی اس عارضی موت و حیات سے انسان اپنی زندگی پوری کرتا ہے اور اللہ کی بارگاہ میں حاضری دینی ہوتی ہے.

۳۔ وَ یَعۡلَمُ مَا جَرَحۡتُمۡ بِالنَّہَارِ: جو ذات کائنات کے ہر ذرے ذرے پر آگاہی رکھتی ہے، وہ تمہاری تمام تر حرکتوں کو خوب جانتی ہے۔ نہ صرف جانتی ہے بلکہ ان حرکتوں کو ضبط اور محفوظ کر لیتی ہے اور قیامت کے دن ان کو دکھا دیتی ہے: فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ ۔[1]

---

[1] ۹۹ الزلزلۃ: ۷

۴۔ ثُمَّ یَبۡعَثُکُمۡ فِیۡہِ: پھر نیند کی اس عارضی اور جزئی موت کے بعد تم کو اٹھاتا ہے۔

۵۔ لِیُقۡضٰۤی اَجَلٌ مُّسَمًّی: تا کہ ایک معینہ مدت پوری کی جائے۔ اس پوری مدت میں تم کو روزانہ موت و حیات کی ایک مشق کرائی جاتی ہے۔ پھر بھی تم کہتے ہو ہم دوبارہ کیسے اٹھائے جائیں گے؟

اہم نکات

۱۔ انسان اگر متحرک نہیں ہے تو وہ اس کی موت ہے: یَتَوَفّٰکُمۡ بِالَّیۡلِ ....

۲۔ انسان روح سے عبارت ہے۔ بدن صرف ایک وقتی ظرف ہے: یَتَوَفّٰکُمۡ ....

۳۔ یہ عارضی موت و حیات ایک نمونہ ہے، موت کے بعد کی ابدی زندگی کا۔

وَ ہُوَ الۡقَاہِرُ فَوۡقَ عِبَادِہٖ وَ یُرۡسِلُ عَلَیۡکُمۡ حَفَظَۃً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡہُ رُسُلُنَا وَ ہُمۡ لَا یُفَرِّطُوۡنَ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے اور تم پر نگہبانی کرنے والے بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی ایک کو موت آ جائے تو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔

ثُمَّ رُدُّوۡۤا اِلَی اللّٰہِ مَوۡلٰىہُمُ الۡحَقِّ ؕ اَلَا لَہُ الۡحُکۡمُ ۟ وَ ہُوَ اَسۡرَعُ الۡحٰسِبِیۡنَ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ پھر وہ اپنے مالک حقیقی اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے، آگاہ رہو فیصلہ کرنے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے اور وہ نہایت سرعت سے حساب لینے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَہُوَ الۡقَاہِرُ: اس جملے کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو اسی سورت کی آیت ۱۸، جس میں فرمایا کہ اللہ اپنی قہاریت و غلبہ کی بنا پر انسانوں کی نگہبانی کے لیے فرشتے بھیجتا ہے۔

۲۔ وَیُرۡسِلُ عَلَیۡکُمۡ حَفَظَۃً: یہ فرشتے کس چیز کی حفاظت کرتے ہیں؟ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اعمال کی کتابت و حفاظت کرتے ہیں۔ جب کہ دوسری جگہ فرمایا:

وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ۙ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ۙ یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ۱

اور یقیناً تم پر نگران مقرر ہیں۔ ایسے معزز لکھنے والے، جو تمہارے اعمال کو جانتے ہیں۔

جب کہ بعض مفسرین فرماتے ہیں: یہ فرشتے انسانوں کی مقررہ اجل تک ان کی جان کی حفاظت کرنے والے

---

۱ ۸۲ انفطار ۱۰ تا ۱۲

ہیں۔ اس کے ساتھ موت کا ذکر اس مطلب پر قرینہ قرار دیتے ہیں۔

میرے نزدیک آیت کے اطلاق میں دونوں مفہوم کا شامل ہونا ممکن ہے۔ اعمال کی محافظت اور جان کی بھی محافظت۔ موت کا ذکر جان کی حفاظت کا قرینہ نہیں بن سکتا، کیونکہ اعمال بھی موت سے منقطع ہوتے ہیں۔ لہٰذا جیسے موت تک جان کی حفاظت کی جاتی ہے، ایسے ہی موت تک کے اعمال کی بھی حفاظت کی جاتی ہے۔

۳۔ تَوَفَّتۡہُ رُسُلُنَا: موت پر مقرر فرشتے، جو اللہ کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں، انسانوں کی روح قبض کرتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا:

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ ....[1] موت کے وقت اللہ روحوں کو قبض کرتا ہے....

اس کو تضاد نہیں کہتے بلکہ اس امر کے سلسلہ اسباب و علل کا ذکر ہے۔ چنانچہ مثال دی جاتی ہے، خط، قلم، ہاتھ اور انسان کے ارادے سے کہ خط قلم کے ذریعے، اس کے پیچھے ہاتھ، اس کے پیچھے انسان کا ارادہ کارفرما ہے۔[2]

اسی طرح ہے کہ کسی کو ناحق قتل کیا ہے تو سربراہ مملکت، قاضی اور جلاد سب کی طرف نسبت دینا صحیح ہے۔

۴۔ رُسُلُنَا: رسل سے مراد ملک الموت کے کارندے ہوسکتے ہیں۔ جیسا کہ بعض روایات میں وارد ہے۔

ان اللّٰه تبارك و تعالیٰ جعل لملك الموت اعوانا من الملائكة۔[3] اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کے لیے کارندے مقرر فرمائے ہیں۔

مَوۡلٰىہُمُ الۡحَقِّ: ان کے مولائے برحق کی طرف لائے جائیں گے۔ اس میں لفظ مولا کی بڑی وضاحت آ گئی کہ مولا وہ ہے جو ہرگونہ تصرف کا حق رکھتا ہو، خواہ یہ تصرف ایجاد سے متعلق ہو یا تدبیر سے۔ البتہ جن ذوات کو باذن خدا ولایت کا حق ملتا ہے وہ بقدر اذن ہے۔

۵۔ اَلَا لَہُ الۡحُکۡمُ: انسانی زندگی سے مربوط تمام فیصلے اور موت کا فیصلہ اور موت کے بعد اس انسان کی قسمت کا فیصلہ، سب اللہ کے پاس ہے۔ کسی غیر اللہ کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ وہ قیامت کے دن حساب اس طرح لے گا جس طرح دنیا میں روزی دیتا ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا۔ (حدیث)

۲۔ اس زمین میں تمام اعمال کے انضباط کا قدرتی نظام ہے۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے: میری اجل ہی میری محافظ ہے۔

قُلۡ مَنۡ یُّنَجِّیۡکُمۡ مِّنۡ ظُلُمٰتِ ۶۳۔ کہدیجیے: کون ہے جو تمہیں صحراؤں اور

---

[1] ۳۹ زمر: ۴۲ [2] المیزان ۷: ۱۳۲ [3] البرھان، ۲: ۴۲۷

الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾	دریاؤں کی تاریکیوں میں نجات دیتا ہے؟ جس سے تم گڑگڑا کر اور چپکے چپکے التجا کرتے ہو، اگر اس (بلا) سے ہمیں بچا لیا تو ہم شکر گزاروں میں سے ہوں گے۔
قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾	۶۴۔ کہدیجیے: تمہیں اس سے اور ہر مصیبت سے اللہ ہی نجات دیتا ہے پھر بھی تم شرک کرتے ہو۔

تشریح کلمات

كَرْبٍ: (ك ر ب) کے معنی سخت غم کے ہیں۔ بقول راغب یہ اصل میں کرب الارض سے مشتق ہے، جس کے معنی زمین میں قلبہ رانی کے ہیں اور غم سے بھی چونکہ طبیعت الٹ پلٹ جاتی ہے، اسی لیے اسے كَرْبٍ کہا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

انسان سخت مصیبت و شدید اضطراب کی حالت میں سارے مادی و دنیوی سہاروں سے مایوس ہو جاتا ہے تو انسان کے وجود میں جو وجدانی اور ضمیری انسان ہے، اس کے سامنے سے ساری رکاوٹیں ہٹ جاتی ہیں اور وہ اپنی فطرت کے عین مطابق اپنے خالق حقیقی ہی کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اللہ کے ساتھ عہد کرتا ہے کہ آئندہ زندگی شکر گزاروں کی طرح گزاروں گا۔

لیکن وہ مادی دنیاوی عوامل دوبارہ اس کے اور اس کے وجدان و فطرت کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں۔ پھر مشرکانہ حرکتیں شروع کر دیتا ہے۔ اس آیت میں ایسے مشرکوں کی تنبیہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کے اندر ایک پاک انسان ہے۔ اوپر کا انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اس کا گلا دبا دیتا ہے۔

۲۔ شدید اضطراب کی حالت میں اوپر کا درندہ ہٹ جاتا ہے تو اس انسان کو موقع ملتا ہے: تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا...۔

۳۔ بعد میں اوپر والا انسان پھر غالب آتا ہے۔ یہ بہت بدبختی ہوگی: ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ۔

۴۔ ہر شخص کو یہ محاسبہ کرنا چاہیے کہ یہ دونوں انسان ہم آہنگ ہیں یا جنگ کی حالت میں ہیں۔ اگر ہم آہنگ ہیں تو سکون حاصل ہوگا۔ جنگ ہے تو داخلی بے سکونی و پریشانی ہوگی۔

قُلۡ ہُوَ الۡقَادِرُ عَلٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَ عَلَیۡکُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ اَوۡ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِکُمۡ اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا وَّ یُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ؕ اُنۡظُرۡ کَیۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَفۡقَہُوۡنَ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ کہد یجیے: اللہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ تمہارے اوپر سے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے تم پر کوئی عذاب بھیج دے یا تمہیں فرقوں میں الجھا کر ایک دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھا دے، دیکھو ہم اپنی آیات کو کس طرح مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ جائیں۔

تشریح کلمات

شِیَعًا: (ش ی ع) جوہری صحاح میں لکھتے ہیں: شیعۃ الرجل اتباعہ۔ کسی کا شیعہ ہونے کا مطلب ہے اس کے پیروکاروں میں سے ہونا۔ چنانچہ شایعہ کہتے ہیں، جیسا کہ والاہ کہتے ہیں، جس کے معنی اتباع و موالات کے ہیں۔

تفسیر آیات

امت اسلامیہ کو مستقبل میں پیش آنے والے داخلی انتشار و افتراق کی طرف اشارہ ہے۔

۱۔ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ: اوپر سے آنے والے اور قدموں کے نیچے سے آنے والے عذاب کے بارے میں مختلف تاویلات ہیں کہ اوپر سے آنے والا عذاب طوفان و سنگ باری ہے اور نیچے سے پھوٹنے والا عذاب زمین میں دھنس جانا ہے، جیسے قارون کے لیے ہوا۔ بعض فرماتے ہیں، اوپر سے آنے والا عذاب، حکمرانوں کی طرف سے آنے والا عذاب ہے اور نوکروں کی طرف سے آنے والا عذاب قدموں کے نیچے والا ہے۔ ہمارے بعض معاصر تو جنگوں میں اوپر سے ہونے والی بمباری اور نیچے سے پھٹنے والی مائنز (mines) بھی مراد لیتے ہیں لیکن ان مجموع اقوال سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اوپر نیچے ایک تعبیر ہے۔ اصل مراد یہ ہے کہ اللہ تم کو ہر طرف سے آنے والے عذاب سے گھیر سکتا ہے۔ ساتھ اس میں اس بات کا اشارہ بھی ہے کہ ایسے عذاب کے تم مستحق بھی ہو۔

۲۔ اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا: عذاب کی دوسری صورت یہ بتائی کہ داخلی طور پر بدامنی کا شکار کر کے ایک گروہ کو دوسرے پر مسلط کیا جائے۔ چنانچہ یہ امت ہمیشہ داخلی بدامنی کا شکار رہی ہے۔ یَلۡبِسَکُمۡ میں لَبۡس کے معنی ہیں الجھانا۔

۳۔ لَعَلَّہُمۡ یَفۡقَہُوۡنَ: آخر میں فرمایا: ''شاید کہ وہ سمجھ جائیں۔'' اس قسم کی داخلی بدامنی اور عدم تحفظ سے یہ شعور آ جائے کہ اللہ کی نافرمانی اور اسلامی تعلیمات سے دوری سے باز آ جائیں۔

اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا کے ذیل میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

هُوَ اخْتِلَافٌ فِي الدِّيْنِ وَطَعْنٍ بَعْضِكُمْ عَلَى بَعْضٍ، وَيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ وَهُوَ أَنْ يَقْتُلَ بَعْضُكُمْ بَعْضاً.[1]

لوگوں کا دین میں اختلاف اور ایک دوسرے پر الزام تراشی کرنا اور وَیُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ سے ایک دوسرے کو قتل کرنا مراد ہے۔

اہم نکات

۱۔ اس امت کا داخلی بدامنی کا شکار ہونا ہے: یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا....

۲۔ ہر طرف سے گھیرنے والے عذاب سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

۳۔ داخلی بدامنی کو عذاب الٰہی تصور کر لیں تو ہمزیستی کا شعور بیدار ہو سکتا ہے: لَعَلَّهُمۡ یَفۡقَهُوۡنَ۔

وَ کَذَّبَ بِهٖ قَوۡمُکَ وَ هُوَ الۡحَقُّ ؕ قُلۡ لَّسۡتُ عَلَیۡکُمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ اور آپ کی قوم نے اس (قرآن) کی تکذیب کی ہے حالانکہ یہ حق ہے، کہدیجیے: میں تمہارا نگہبان نہیں ہوں۔

تفسیر آیات

سابقہ آیات کی تمہید کے بعد فرمایا: (یا محمدؐ) آپ کی قوم نے بھی تکذیب کی ہے، لہٰذا یہ قوم مذکورہ عذاب کی مستحق بن گئی ہے۔ اس عذاب سے بچنے کے لیے آپؐ صرف حق و باطل میں امتیاز کو نمایاں کر سکتے ہیں۔ آپؐ ان سے کہدیں کہ میں تم پر حوالدار نہیں بنایا گیا ہوں اور تم کو عذاب سے بچانا ممکن نہ ہو گا۔ اس وقت عذاب کو اپنے سے دور پا کر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ ہر خبر کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ اپنے مقررہ وقت پر وہ عذاب آنے والا ہے۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

وَ کَذَّبَ بِهٖ میں بہ کی ضمیر عذاب کی طرف راجع ہے، بعض کے نزدیک قرآن کی طرف ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے رسولؐ دستور حیات عطا کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اس پر عمل کر کے ترقی ہم نے خود حاصل کرنی ہے: لَسۡتُ عَلَیۡکُمۡ بِوَکِیۡلٍ۔

لِکُلِّ نَبَاٍ مُّسۡتَقَرٌّ ۫ وَّ سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ اور ہر خبر کے لیے ایک وقت مقرر ہے، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

---

[1] تفسیر القمی ۱: ۲۰۴، سورۃ الانعام۔ المیزان ۷: ۱۴۹

تشریح کلمات

نَبَاٍ: اس خبر کو کہتے ہیں جو بڑے فائدے پر مشتمل اور یقین اور ظن غالب کی موجب ہو اور خبر کو نباء نہیں کہتے، جب تک یہ تین باتیں اس میں پائی نہ جائیں: جس خبر کو نباء کہا جائے گا، اس کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کذب کا شائبہ نہ ہو۔ جیسے متواتر اور اللہ و رسولؐ کی خبر۔ (راغب) لیکن قرآن میں فاسق کی خبر کو بھی نباء کہا ہے: اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ... [1]

مُّسۡتَقَرٌّ: جائے قرار۔ ٹھکانا۔ انجام کی منزل: حَسُنَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّ مُقَامًا۔ [2] یہ اسم زمان و مکان ہے تاہم اس آیت میں اسم زمان مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔

تفسیر آیات

لِکُلِّ نَبَاٍ مُّسۡتَقَرٌّ: ہر خبر کی تحقق کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں روایت ہے:

لِکُلِّ نَبأٍ حَقِیقَةٌ۔ [3] — ہر خبر کے لیے ایک حقیقت اور واقعیت ہے۔

ہر پیشگوئی جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے صادر ہوتی ہے، اپنے مقررہ وقت پر یقیناً وقوع پذیر ہونے والی ہے۔ چنانچہ گزرے ہوئے واقعات کو خبر اور آنے والے کو اکثر نبأ کہتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث رسولؐ میں قرآن کریم کے بارے میں آیا ہے:

فِیهِ خَبَرُ مَنۡ قَبۡلَکُمۡ وَ نَبأُ بَعۡدَکُمۡ۔ [4] — اس میں تم سے پہلے والوں اور تمہارے بعد والوں کی خبریں ہیں۔

لِکُلِّ نَبَاٍ: اس میں وہ تمام پیشگوئیاں شامل ہیں جو قرآن نے فرمائی ہیں۔ مثلاً:

i۔ سَنُرِیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ ... [5] — ہم عنقریب انہیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ یقیناً وہی (اللہ) حق ہے۔

ii۔ سَیُهۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَ یُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ ○ [6] — (قریش کی) یہ جماعت عنقریب شکست کھائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گی۔

iii۔ وَ اِنَّ جُنۡدَنَا لَهُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ○ [7] — اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب آ کر رہے گا۔

---

[1] ۴۹ حجرات: ۶ [2] ۲۵ فرقان: ۷۶ [3] تفسیر قمی ۱: ۲۰۴۔ تفسیر طبری ۱۱: ۴۳۵، باب ۶۶۔ تفسیر ابن کثیر ۳: ۲۷۷، باب ۶۹۔

[4] الکافی ۲: ۵۹۹ کتاب فضل القرآن، ح ۳۔ تفسیر عیاشی ۱: ۸ ح ۱۸۔ سنن دارمی ۲: ۵۲۷، باب فضل من قرأ

[5] ۴۱ حمٓ السّجدہ: ۵۳ [6] ۵۴ قمر: ۴۵ [7] ۳۷ صافات: ۱۷۳

iv۔ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیۡ ...[1] اللہ نے لکھ دیا ہے: میں اور میرے رسول ہی غالب آ کر رہیں گے...۔

اور وہ پیشگوئیاں بھی شامل ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں خود بیان فرمائیں اور رسول اللہ (ص) کے بعد ان کی طرف سے ان کے اوصیاء (ع) نے بیان کیں۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام نے خوارج کے بارے میں پیشگوئیاں بیان کرنے کے بعد اسی آیت کی تلاوت فرمائی۔[2]

وَّ سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ: اس آیت کی روشنی میں ایک وقت ایسا ضرور آنے والا ہے، جس میں قرآنی حقائق مجسم ہو کر سامنے آ جائیں گے اور وہ تمام حقائق بھی سامنے آ جائیں گے، جن کی خبر رسولؐ اور اوصیاءؑ نے دی ہے۔

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا۔ اس وقت غلبہ اسلام کا تصور عام لوگوں کے لیے باعث تمسخر تھا۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے: ''عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔'' اگرچہ نزول سورہ کے وقت کوئی جنگ تھی نہ فتوحات، نہ لشکر، نہ ملت، نہ تعداد۔ جو کچھ آیا، وہ اس سورہ کے نزول کے بعد آیا۔ مکہ میں تو ''عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا...'' کی آواز پر آوازیں کسنے کے سوا کوئی علامت بھی نظر نہیں آتی تھی۔ قرآن کی اس پیشگوئی پر فتح مکہ کے بعد یقین ہونے لگا۔ یہ قرآن مجید کا ایک زندہ معجزہ ہے۔

و لم اراحداً استوفی البحث حول ھذہ الایۃ.

اہم نکات

۱۔ وہ وقت یقیناً آنے والا ہے، جس میں قرآنی حقائق کھل کر سامنے آئیں گے: وَّ سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ.

۲۔ اللہ اور رسولؐ نے جب خبر دی ہے تو انتظار کرنا ہوگا، شک نہیں: لِکُلِّ نَبَاٍ مُّسۡتَقَرٌّ۔

وَ اِذَا رَاَیۡتَ الَّذِیۡنَ یَخُوۡضُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِہٖ ؕ وَ اِمَّا یُنۡسِیَنَّکَ الشَّیۡطٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّکۡرٰی مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ اور جب آپ دیکھیں کہ لوگ ہماری آیات کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں تو آپ وہاں سے ہٹ جائیں، یہاں تک کہ وہ کسی دوسری گفتگو میں لگ جائیں اور اگر کبھی شیطان آپ کو بھلا دے تو یاد آنے پر آپ ظالموں کے ساتھ ساتھ نہ بیٹھیں۔

وَ مَا عَلَی الَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ مِنۡ

۶۹۔ اور اہل تقویٰ پر ان (ظالموں) کا کچھ بار

---

[1] ۵۸ مجادلہ: ۲۱ [2] الوسائل ۱۱: ۶۵

حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ وَّلٰكِنۡ ذِكۡرٰی	حساب نہیں، تاہم نصیحت کرنا چاہیے، شاید وہ
لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۶۹﴾	اپنے آپ کو بچا لیں۔

تشریح کلمات

يَخُوۡضُوۡنَ: الخوض کے معنی پانی میں اترنے اور اس کے اندر چلے جانے کے ہیں۔ بطور استعارہ کسی کام میں مشغول رہنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں اس کا زیادہ تر استعمال فضول کاموں میں لگے رہنے پر ہوا ہے۔ (راغب)

تفسیر آیات

اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ جو لوگ ہماری آیات میں چہ میگوئیاں کرتے ہیں، ان کے ساتھ نہ بیٹھو بلکہ یہ فرمایا: جب چہ میگوئیاں ہو رہی ہوں، اس وقت ان کی محفلوں میں نہ بیٹھو۔ یہ حکم مکہ کے زمانے کا ہے، جہاں رسول اللہؐ کی ذمہ داری صرف دعوت تک محدود تھی، جنگ و قتال کی ابھی نوبت نہیں آئی تھی۔

واضح رہے یہاں خطاب اگرچہ رسول اللہؐ کے لیے ہے، مگر سمجھانا مسلمانوں کو مقصود ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں بھی آیا ہے کہ قرآن کا اسلوب سخن یہ ہے:

اِيَّاكِ أَعۡنِي وَ اسۡمَعِي يَا جَارَةُ۔[1]	روئے سخن خواہ کسی کی طرف ہے لیکن سمجھانا کسی اور کو مقصود ہوتا ہے۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ نساء آیت ۱۴۰۔

وَ اِمَّا يُنۡسِيَنَّكَ: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو نسیان لاحق ہوتا تھا، خصوصاً احکام شرعی میں؟ امامیہ کا اجماعاً مؤقف یہ ہے کہ نسیان لاحق نہیں ہوتا تھا۔ عقلاً ایسا ممکن نہیں ہے کہ اللہ اپنی رسالت کو ایسی جگہ رکھے جو نسیان کے ذریعے ضیاع کے خطرے سے خالی نہ ہو نیز قرآن کی متعدد آیات سے بھی ثابت ہے کہ آپؐ کو تبلیغ احکام میں نسیان لاحق نہیں ہوتا تھا:

پہلی آیت: سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰۤی ۔[2] اللہ کی طرف سے اقراء کا مطلب وحی ہے اور وحی قلب رسولؐ پر نقش ہونے سے عبارت ہے۔ یہاں فراموشی ممکن نہیں ہے، تاہم خود اللہ نے اس اقراء کا نتیجہ بیان فرمایا: فَلَا تَنۡسٰۤی، ہمارے اقراء کے بعد آپ نہیں بھولیں گے۔

دوسری آیت: وَلَئِنۡ شِئۡنَا لَنَذۡهَبَنَّ بِالَّذِیۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ ....[3] اور اگر ہم چاہیں تو ہم نے جو کچھ آپ کی طرف وحی کی ہے وہ سلب کر لیں۔ اگلی آیت کے آخر میں فرمایا: اِنَّ فَضۡلَهٗ كَانَ عَلَيۡكَ كَبِيۡرًا ۔[4] آپؐ

---

[1] الکافی ۲: ۶۳۰ باب النوادر۔ عیون أخبار الرضا ۱: ۲ باب ۱۵۔ بحار الانوار ۱۷: ۱۷ باب ۱۵۔ عصمته و تاویل بعض ما یوهم خلاف ذلك۔
[2] ۸۷ اعلی: ۶　[3] ۱۷ بنی اسرائیل: ۸۶　[4] ۱۷ بنی اسرائیل: ۸۷

پر یقیناً اس کا بڑا فضل ہے۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہوا کہ وحی کا کوئی حصہ سلب نہیں ہوا۔ بِالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ میں تمام وحی شامل ہیں، خواہ قرآن ہو یا غیر قرآن۔ نسیان ایک قسم کا سلب ہے، خواہ وقتی کیوں نہ ہو۔ آیت کے اطلاق میں ہر قسم کے سلب کی نفی ہے۔

تیسری آیت: اللہ تعالیٰ کا ابلیس سے یہ ارشاد: اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ ....[1] میرے بندوں پر تیری کوئی بالا دستی نہیں ہے۔ رسول اللہؐ کو بیان احکام سے از راہ فراموشی باز رکھنا، شیطان کی بالادستی ہے، جس سے انبیاء (ع) بری ہیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس آیت اور دوسری آیات سے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھول اور نسیان لاحق ہوتا تھا۔ حد یہ کہ صحیح مسلم کتاب المساجد، باب ۲۰ السھو فی الصلاۃ والسجود لہ کی حدیث:

وَلَكِنْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ أَنْسَى كَمَا تَنْسَوْنَ، فَإِذَا نَسِيتُ فَذَكِّرُونِي۔

لیکن میں بھی ایک بشر ہوں، جس طرح تم بھولتے ہو میں بھی بھول جاتا ہے، چنانچہ اگر میں بھولوں تو تم لوگ مجھے یاد دلاؤ۔

کے ذیل میں شارح صحیح مسلم امام نووی جمہور اہل سنت کے مذہب کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فِيهِ: دَلِيلٌ عَلَى جَوَازِ النِّسْيَانِ عَلَيْهِ- صَلَى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - فِي أَحْكَامِ الشَّرْعِ وَهُوَ مَذْهَبُ جَمْهُورِ الْعُلَمَاءِ... ۔[2]

اس روایت میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ رسول خداؐ پر شریعت کے احکام بیان کرنے میں بھی نسیان لاحق ہوسکتا ہے اور یہی جمہور علماء کا موقف ہے....

وَمَا عَلَى الَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ: اگر کوئی مؤمن دین کا مذاق اڑانے والوں کے اس عمل زشت پر راضی نہیں ہے اور بوجہ فراموشی اور عدم توجہ ان کے درمیان بیٹھا رہتا ہے تو ان مذاق اڑانے والوں کا بار گناہ اس پر نہیں آئے گا تاہم اس مؤمن کو چاہیے کہ وہ مذاق اڑانے والوں کو نصیحت کرے۔ وَّلٰکِنۡ ذِکۡرٰی میں ذِکۡرٰی مفعول مطلق ہے۔ اصل کلام ہے: و لکن ذکروھم ذکری۔ (مجمع البیان)

اہم نکات

۱۔ اسلام کا مذاق اڑانے والی محفلوں میں بیٹھنا دینی حمیت و غیرت کے فقدان کی علامت ہے۔

۲۔ اپنے نظریے کا دفاع ممکن یا مؤثر نہ ہونے کی صورت میں بائیکاٹ ہی ایمان کا تقاضا ہے۔

۳۔ نصیحت یا دفاع کی غرض سے ایسی محفلوں میں بیٹھنے میں حرج نہیں: وَلٰکِنۡ ذِکۡرٰی ...۔

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۶۵ [2] شرح النووي علی مسلم، ۲: ۳۴۲، باب السھو فی الصلاۃ

وَذَرِ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا دِیۡنَہُمۡ لَعِبًا وَّ لَہۡوًا وَّغَرَّتۡہُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا وَ ذَکِّرۡ بِہٖۤ اَنۡ تُبۡسَلَ نَفۡسٌۢ بِمَا کَسَبَتۡ ٭ۖ لَیۡسَ لَہَا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیۡعٌ ۚ وَ اِنۡ تَعۡدِلۡ کُلَّ عَدۡلٍ لَّا یُؤۡخَذۡ مِنۡہَا ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اُبۡسِلُوۡا بِمَا کَسَبُوۡا ۚ لَہُمۡ شَرَابٌ مِّنۡ حَمِیۡمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیۡمٌۢ بِمَا کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ ﴿۷۰﴾

۷۰۔ اور (اے رسول) جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنایا ہوا ہے اور دنیا کی زندگی نے انہیں فریب دے رکھا ہے آپ انہیں چھوڑ دیں البتہ اس (قرآن) کے ذریعے انہیں نصیحت ضرور کریں مبادا کوئی شخص اپنے کیے کے بدلے پھنس جائے کہ اللہ کے سوا اس کا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ ہی شفاعت کنندہ اور اگر وہ ہر ممکن معاوضہ دینا چاہے تب بھی اس سے قبول نہ ہو گا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی کرتوتوں کی وجہ سے گرفتار بلا ہوئے، ان کے کفر کے عوض ان کے پینے کے لیے کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہے۔

تشریح کلمات

تُبۡسَلَ: (ب س ل) البسل۔ ترشرو، روکنے، محروم رکھنے اور اردگرد رکھنے کے معنوں میں آتا ہے۔ بہادر کو باسل اس کی ترش روئی کی وجہ سے کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَذَرِ: چھوڑیے۔ ان کی محافل میں بیٹھنا، ان سے میل جول چھوڑ دیجیے۔ اس چھوڑنے کا مطلب ان سے بالکل لاتعلق ہو کر ان کو ان کے حال پر چھوڑنا نہیں چونکہ اس کے بعد حکم آتا ہے: وَذَکِّرۡ بِہٖۤ، ان کو نصیحت ضرور کریں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ وَعِظۡہُمۡ ...[۱] آپ انہیں خاطر میں نہ لائیے اور انہیں نصیحت کیجیے۔ یعنی ان کا تعاقب نہ کرو، صرف نصیحت کرنے پر اکتفا کرو۔

۲۔ دِیۡنَہُمۡ لَعِبًا وَّلَہۡوًا: جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنایا ہوا ہے۔ ان کا کوئی دین تھا، اس کو لہو ولعب میں بدل دیا یا لہو ولعب کو دین بنایا۔ دونوں صورتوں میں ایسے مراسم و عادات کو دین قرار دیا، جس کا نہ ان کی دنیا کے لیے کوئی فائدہ، نہ آخرت کے لیے۔

۳۔ وَّغَرَّتۡہُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا: اس قسم کی بیہودگیوں کو دین بنانے یا دین کو بیہودگیوں میں بدلنے کا اصل محرک خواہشات پرستی ہے۔ جس طرح کسی کھلونے سے کھیلنے والا، کھلونے کو اپنی مرضی اور خواہشات کے مطابق الٹ پلٹ کرتا ہے، خواہش پرست، دین کو بھی اپنے دنیاوی مفادات کے مطابق الٹ پھیر کرتا ہے۔

---

[۱] ۴ نساء: ۶۳

۴۔ وَذَکِّرۡ بِہٖۤ: ان کو قرآن کے ذریعے نصیحت کریں۔ یہ نصیحت رحمت علی الخلق کی بنیاد ہے کہ اَنۡ تُبۡسَلَ یہ خواہش پرست لوگ اپنی بدکرداری کے گرداب میں پھنس کر نہ رہ جائیں۔ اس صورت میں واحد ذریعۂ نجات، نصیحت قرآنی پر عمل کرنا ہے۔ دوسرے تمام ذرائع سے اس کو فائدہ نہیں ملے گا۔ نہ کوئی کارساز نہ، شفاعت کنندہ، نہ کوئی معاوضہ۔

۵۔ لَیۡسَ لَہَا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ: دین کو لہولعب بنانے والے اس لیے گرداب میں پھنس جائیں گے کہ ان کی فریاد کو پہنچنے والا کوئی نہ ہو گا۔ ان کے لیے نجات کا راستہ اللہ کی ولایت اور شفاعت میں تھا۔ سو اس کو ان لوگوں نے مسترد کر دیا تھا۔

۶۔ وَاِنۡ تَعۡدِلۡ کُلَّ عَدۡلٍ لَّا یُؤۡخَذۡ مِنۡہَا: نجات کے لیے ایک راستہ تصور ہو سکتا ہے کہ فدیہ اور معاوضہ دے کر جان چھڑائی جائے۔ وہ ہر ممکن معاوضہ دے، پھر بھی یہ نجات کا راستہ نہ ہو گا۔

۷۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اُبۡسِلُوۡا بِمَا کَسَبُوۡا: جو لوگ اپنی ہی کرتوتوں کی وجہ سے گرفتار بلا ہوتے ہیں، ان کے لیے نجات کا کوئی راستہ نہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ اور رسولؐ لوگوں کی ہدایت کے خواہاں خود مخلوق پر رحمت و شفقت کی وجہ سے ہیں، نہ کہ احتیاج اور ضرورت کی وجہ سے۔

۲۔ خواہش پرست دین کو اپنی خواہشات کے تابع بناتا ہے، جب کہ توحید پرست اپنے آپ کو دین کے تابع بناتا ہے۔

قُلۡ اَنَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنۡفَعُنَا وَ لَا یَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰۤی اَعۡقَابِنَا بَعۡدَ اِذۡ ہَدٰىنَا اللّٰہُ کَالَّذِی اسۡتَہۡوَتۡہُ الشَّیٰطِیۡنُ فِی الۡاَرۡضِ حَیۡرَانَ ۪ لَہٗۤ اَصۡحٰبٌ یَّدۡعُوۡنَہٗۤ اِلَی الۡہُدَی ائۡتِنَا ؕ قُلۡ اِنَّ ہُدَی اللّٰہِ ہُوَ الۡہُدٰی ؕ وَ اُمِرۡنَا لِنُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۷۱﴾

۷۱۔ کہد یجیے: کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر انہیں پکاریں جو نہ ہمارا بھلا کر سکتے ہیں اور نہ برا؟ اور کیا اللہ کی طرف سے ہدایت ملنے کے بعد ہم اس شخص کی طرح الٹے پاؤں پھر جائیں جسے شیاطین نے بیابانوں میں راستہ بھلا دیا ہو اور وہ سرگرداں ہو؟ جب کہ اس کے ساتھی اسے بلا رہے ہوں کہ سیدھے راستے کی طرف ہمارے پاس چلا آ، کہد یجیے: ہدایت تو صرف اللہ کی ہدایت ہے اور ہمیں حکم ملا ہے کہ ہم رب العالمین کے آگے سر تسلیم خم کر دیں۔

وَ اَنۡ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اتَّقُوۡہُ ؕ وَ ھُوَ الَّذِیۡۤ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۷۲﴾	۷۲۔اور یہ کہ نماز قائم کرواور تقوائے الٰہی اختیار کرو اور وہی تو ہے جس کی بارگاہ میں تم جمع کیے جاؤ گے.

تشریح کلمات

استھوی: (ہ و ی) اوپر سے نیچے گرنے کو کہتے ہیں۔ راہ راست سے پھسلنے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اَنَدۡعُوۡا: کہد یجیے: کیا ہم اس چیز کی عبادت کریں، جس کی عبادت میں کوئی فائدہ ہے نہ عبادت نہ کرنے میں کوئی ضرر ہے۔

۲۔ وَنُرَدُّ: اس صورت میں ہم مقصد زندگی کے حصول میں ناکام و نامراد ہو جائیں گے۔ اس شخص کی طرح ہو جائیں گے جسے شیاطین گمراہ کر دیں۔

۳۔ لَہٗۤ اَصۡحٰبٌ: شیاطین جہاں اس کو گمراہی کی طرف بلاتے ہیں، ایسے ساتھی بھی ہوتے ہیں جو اس کو راہ راست کی طرف بلاتے ہیں۔ یہ شخص حق اور باطل کی طرف بلانے والوں کے درمیان کھڑا ہوتا ہے لیکن یہ باطل کی طرف جاتا ہے۔

۴۔ قُلۡ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الۡھُدٰی: ہدایت وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ہو۔ فطرت و جبلت کی ہدایت، ملائکہ کی ہدایت، انبیاء کی ہدایت۔ یہ سب ہدایات اللہ کی طرف سے ہیں۔ جو ہدایت اس تسلسل میں نہ آئے، وہ ضلالت ہے۔

۵۔ وَاُمِرۡنَا لِنُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ: کہد یجیے: ہمیں حکم ملا ہے کہ رب العالمین کے احکام کی تعمیل کریں۔ جب وہ ذات، عالمین کا رب ہے اور تمام عالمین اس کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں تو ایک انسان کیوں اس کائناتی نظام سے سرکشی کرے؟ البتہ انسان کو حکم شرعی ملا ہے، باقی کائنات کو حکم تکوینی۔ باقی کائنات اس حکم سے سرکشی نہیں کر سکتی، البتہ انسان سرکشی کر سکتا ہے۔

۶۔ وَاَنۡ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّقُوۡہُ: اور یہ حکم بھی ملا ہے کہ نماز قائم کریں اور اللہ کی مخالفت سے بچیں۔

۷۔ ھُوَ الَّذِیۡۤ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ: عدل الٰہی سے بچنے کی ضرورت اس لیے پیش آ رہی ہے کہ اس انسان کو اللہ کی عدالت گاہ میں پیش ہونا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان فطرتاً اس ذات کو پکارتا ہے، جس کے ہاتھ میں اس کا نفع و نقصان ہو۔ مؤمن کو یقین

ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کسی کے پاس بھلائی یا برائی کا اختیار نہیں ہے۔ لہٰذا وہ مؤمن کبھی بھی اس شخص کی مانند نہیں ہو سکتا جو ہادی کی موجودگی کے باجود بیابانوں میں حیران وسرگرداں پھرتا رہے۔

۲۔ کوئی عاقل، صحیح راستہ دکھانے والے کے ہونے کے باوجود سرگرداں نہیں پھرتا۔

وَهُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ وَیَوۡمَ یَقُوۡلُ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ۬ؕ قَوۡلُهُ الۡحَقُّ ؕ وَلَهُ الۡمُلۡكُ یَوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ ؕ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا اور جس دن وہ کہے گا: ہو جا! تو ہو جائے گا، اس کا قول حق پر مبنی ہے اور اس دن بادشاہی اسی کی ہو گی جس دن صور پھونکا جائے گا، وہ پوشیدہ اور ظاہری باتوں کا جاننے والا ہے اور وہی باحکمت خوب باخبر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَهُوَ الَّذِیۡ: اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ یہاں عبث اور لایعنی کا تصور نہیں ہے کہ ان چیزوں کو بے مقصد محض ایک کھلونے کے طور پر پیدا کیا ہو:

وَمَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَهُمَا لٰعِبِیۡنَ ۝ [۱]

اور ہم نے اس آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، کو بیہودہ خلق نہیں کیا۔

دوسری آیت میں بیان فرماتا ہے:

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ۝ [۲]

کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تمہیں عبث خلق کیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹائے نہیں جاؤ گے؟

۲۔ وَیَوۡمَ یَقُوۡلُ کُنۡ فَیَکُوۡنُ: یہ قیامت کے دن کے وقوع کے سلسلے میں ہے کہ اللہ کی طرف سے حکم ملتے ہی قیامت واقع ہو گی۔

۳۔ وَلَهُ الۡمُلۡكُ: قیامت کے دن اسی کی بادشاہی ہو گی۔ دنیا میں تو از روئے آزمائش و امتحان لوگوں کو ڈھیل دے رکھی ہے لیکن قیامت کے روز حساب لینا ہے۔ وہاں صرف اور صرف اللہ کا حکم چلے گا۔

۴۔ یَوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ: صور پھونکنے کا واقعہ دو بار ہو گا۔ ایک صور سے سب مر جائیں گے اور

---

[۱] ۲۱ انبیاء: ۱۶ [۲] ۲۳ مومنون: ۱۱۵

دوسرے سے سب زندہ ہو جائیں گے۔

۵۔ عٰلِمُ الۡغَیۡبِ وَالشَّھَادَۃِ: وہ تمام اشیاء کے باطن کو بھی جانتا ہے اور ظاہر کو بھی۔ اس کائنات میں کوئی ذرہ ایسا نہیں جو اللہ کے علم سے پوشیدہ ہو۔

۶۔ وَھُوَالۡحَکِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ: کائنات کی کوئی شئ، کوئی قانون، حکمت سے خالی نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کو اپنی علمی پیشرفت سے یہ تو معلوم ہو رہا ہے کہ اس کائنات کا کوئی ذرہ بے مقصد نہیں ہے، تو کیا کل کائنات کے بارے میں سوچنا نہیں چاہیے کہ یہ کس لیے پیدا ہوئی ہے؟

وَ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہِیۡمُ لِاَبِیۡہِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصۡنَامًا اٰلِہَۃً ۚ اِنِّیۡۤ اَرٰىکَ وَ قَوۡمَکَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ﴿۷۴﴾

۷۴۔ اور جب ابراہیم نے اپنے باپ (چچا) آزر سے کہا: کیا تم بتوں کو معبود بناتے ہو؟ میں تمہیں اور تمہاری قوم کو صریح گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔

تشریح کلمات

اٰزَرَ: توریت میں یہ نام تارخ آیا ہے۔ اس کا انگلش تلفظ TERAH ہے۔ آزر کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ آزر، نمرود کے بتوں کے خزانے کا انچارج تھا اور ماہرین کے مطابق فینق Phoenic زبان میں بعل بت کے مجاور کو آزر بعل کہتے تھے۔ آزر کو شاہی دربار میں اہم مقام حاصل ہونے، خصوصاً بتوں کی ذمے داری ان پر عائد ہونے اور اپنا رشتہ دار ہونے کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے بت پرستی کے خلاف جہاد کا آغاز انہی سے کیا۔ چنانچہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے بھی روایت ہے کہ آزر، نمرود کا وزیر اور دارالاصنام (بتکدہ) کا انچارج تھا۔[۱]

بہر حال اس لفظ کے بارے میں درج ذیل اقوال ہیں:

i۔ حضرت ابراہیم خلیلؑ کے باپ کا نام ہے یا ان کا لقب ہے۔

ii۔ حضرت ابراہیمؑ کے چچا کا نام ہے۔

iii۔ حضرت ابراہیمؑ کے نانا کا نام ہے۔

iv۔ ایک بت کا نام ہے۔

---

۱ تفسیر قمی ۱: ۲۰۷، ولادۃ ابراھیمؑ۔ نور الثقلین ۱: ۷۳۶

v۔ آزر کا لفظ ایک قسم کا سب و شتم ہے۔ اس کے معنی ہوں گے: اے کج سلیقہ یا اے نافرمان۔

vi۔ یہ فارسی کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں عمر رسیدہ بوڑھا۔

vii۔ ابراہیمؑ کے دادا کا نام ہے۔[1]

تفسیر آیات

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم (ع)، جو توحیدی تحریکوں کے قافلہ سالار ہیں، کا واقعہ اس لیے بیان ہو رہا ہے کہ اس تحریک کے مکّی ارکان اور ان کے قافلہ سالار کو یہ باور کرایا جائے کہ جن حالات میں آج مشرکوں، بت پرستوں اور جاہلوں کے ساتھ آپ کا مقابلہ ہے، اس سے سخت تر حالات میں حضرت ابراہیم (ع) نے یہ جہاد شروع کیا اور بالآخر کامیابی حاصل ہو گئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ عرب مشرکین حضرت ابراہیمؑ کو اپنا جد اعلیٰ ہونے کے حوالے سے اپنا پیشوا مانتے تھے اور اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا وارث تصور کرتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کا عقیدہ توحید بیان کر کے ان کے اس خیال کو باطل ثابت کرنا مقصود ہے۔ دین خلیل کے وارث محمد مصطفیٰؐ ہیں، نہ کہ مشرکین۔ حضرت ابراہیمؑ نے تبلیغ کی ابتدا اپنے باپ آزر سے کی اور نہایت تحقیری انداز میں فرمایا: کیا تم بتوں کو اپنا معبود بناتے ہو؟ اس انداز گفتگو میں اس بات پر طنز و تمسخر ہے کہ جس بت کو تم خود تراشتے ہو، اس کو معبود بناتے ہو یا دوسرے لفظوں میں تم اپنی اس مخلوق کی پوجا کرتے ہو؟

آزر کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا باپ تھا یا چچا۔ قرآن نے یہاں لفظ اَبْ استعمال فرمایا ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنے اَبْ (باپ) سے کہا۔ باپ کے لیے عربی میں دو الفاظ استعمال ہوتے ہیں:

i۔ اَبْ، جو حقیقی باپ، چچا اور نانا کے لیے استعمال کرتے ہیں، جو ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔

چنانچہ چچا کے لیے لفظ اَبْ کا استعمال قرآن میں موجود ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے اپنی اولاد سے کہا: تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے؟ اولاد یعقوبؑ نے جواب میں کہا: نَعۡبُدُ اِلٰـہَکَ وَ اِلٰـہَ اٰبَآئِکَ اِبۡرٰہٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ اِلٰـہًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ ۔[2] اس آیت میں حضرت اسماعیلؑ کو آباء میں شامل کیا گیا ہے جو اولاد یعقوب کے چچا ہیں۔ اس آیت میں دادا کے لیے بھی لفظ اَبُ استعمال ہوا ہے۔ رسول اللہؐ کا یہ فرمان بھی مشہور ہے: رُدُّوا عَلَيَّ أَبِي الْعَبَّاسِ۔[3] میرے باپ عباس کو میرے پاس واپس لے آؤ۔ یعنی

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی ۷:۲۲۔ سورہ انعام: ۷۵۔ عمدۃ القاری فی شرح صحیح البخاری ۱۵:۲۴۰ کتاب احادیث الانبیاء علیہم السلام، باب قول اللّٰہ تعالی واتخذ...،۔ فتح القدیر ۲: ۱۳۳

[2] بقرہ: ۱۳۳

[3] متشابہ القرآن لابن شہر آشوب ا: ۲۲۳۔ تفسیر الآلوسی ۴: ۱۸۵، باب ۴۷۔ سورہ بقرۃ آیت ۱۳۳ کے ذیل میں آلوسی رقمطراز ہیں: ”محمد بن کعب قرظی سے منقول ہے کہ ماموں اور چچا کو بھی والد کہتے ہیں جس پر دلیل سورہ بقرۃ کی آیت ۱۳۳ ہے۔“ مندرج بالا حدیث بھی ان افراد کے دعویٰ کی تقویت کا باعث ہے جن کا نظریہ ہے کہ ابراہیمؑ کے والد کافر نہ تھے بلکہ ان کے چچا کافر تھے۔

حضورؐ نے اپنے چچا عباس کو باپ کہا ہے۔

ii۔ والد، جو صرف حقیقی باپ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس آیت میں اَبْ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو حقیقی باپ بھی ہو سکتا ہے، چچا وغیرہ بھی۔ خود اس آیت میں ایسی کوئی دلیل یا قرائن نہیں ہیں جن سے ہم یہ سمجھ سکیں کہ اس اَبْ سے مراد چچا ہے لیکن القرآن یفسر بعضه بعضاً۔ قرآن اپنی تفسیر خود کرتا ہے، اس لیے ہم خود قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں:

۱۔ قرآن مشرکین کے لیے استغفار سے منع فرماتا ہے۔ چنانچہ سورہ توبہ میں فرمایا:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ○ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ○ [1]

نبی اور ایمان والوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت طلب کریں خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں جب کہ یہ بات ان پر عیاں ہو چکی ہے کہ وہ جہنم والے ہیں اور (وہاں) ابراہیم کا اپنے باپ (چچا) کے لیے مغفرت طلب کرنا اس وعدے کی وجہ سے تھا جو انہوں نے اس کے ساتھ کر رکھا تھا لیکن جب ان پر یہ بات کھل گئی کہ وہ دشمن خدا ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گئے، ابراہیم یقیناً نرم دل اور بردبار تھے۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ [2]

اللہ اس بات کو یقیناً معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ دیگر گناہوں کو جس کے بارے میں وہ چاہے گا معاف کر دے گا۔

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کی وفات کے بعد مصر گئے۔ حضرت ہاجرہ سے عقد ہوا۔ پھر اس کے بعد جب اسماعیل و اسحاق علیہما السلام پیدا ہوئے تو آپؑ عمر رسیدہ ہو چکے تھے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ [3]

ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جس نے عالم پیری میں مجھے اسماعیل اور اسحاق عنایت کیے۔

اس کے بعد اسماعیل جوان ہوئے اور تعمیر کعبہ میں حضرت ابراہیمؑ کا ہاتھ بٹانے لگے تو اس وقت حضرت ابراہیم (ع) نے اپنے ماں باپ کے لیے لفظ والدین کے ساتھ دعا کی اور فرمایا:

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ○ [4]

اے ہمارے رب! مجھے اور میرے والدین اور ایمان والوں کو بروز حساب مغفرت سے نواز۔

---

[1] ۹ توبہ: ۱۱۳۔ ۱۱۴　[2] ۴ نساء: ۴۸　[3] ۱۴ ابراھیم: ۳۹　[4] ۱۴ ابراھیم: ۴۱

اس میں شک و تردد کی گنجائش نہیں کہ یہ دعا ان کے والدین کی وفات کے بعد کی گئی ہے۔ تعجب کا مقام یہ ہے کہ کچھ مفسرین کو حضرت ابراہیمؑ کے والد کو کافر و مشرک ثابت کرنے کے لیے اَبْ سے مراد حقیقی باپ ہونے پر اصرار ہے، جب کہ اگر اس آیت میں لفظ والدین سے ان کا ایمان ثابت ہوتا ہے تو تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یہاں والدین سے مراد حضرت نوح (ع) یا حضرت آدم (ع) وحوا ہیں۔[1]

جناب دریابادی صاحب اس آیت کی اس طرح توجیہ کرتے ہیں:

> حضرت کا اپنے لیے اور مؤمنین کے حق میں دعا کرنا تو ایک صاف اور سیدھی سی بات ہے۔ البتہ شبہ اس میں پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے کافر والد کے حق میں دعائے مغفرت کیسے کر دی؟ سو اگر یہ دعا آپ نے ان کی زندگی ہی میں کی تھی، جب تو آپ کی مراد یہی ہو گی کہ انہیں توفیق ہدایت دے کر ان کی مغفرت کا سامان کر دیا جائے اور اگر بعد وفات یہ دعا کی تھی تو یہ دعا ان کے ایمان کے ساتھ (علم الٰہی میں) مشروط ہو گی۔ یعنی اے پروردگار اگر تیرے علم میں ان کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہے تو ان کی مغفرت کر دے۔

آپ نے دیکھا اس آیت سے والد خلیل کا ایمان ثابت ہوتا دیکھ کر گھبرا گئے کیونکہ وہ اس سے پہلے زیر بحث آیت کے ذیل میں یہ عبارت لکھ چکے تھے:

> ایک گمراہ فرقہ اپنے مخصوص عقائد کے تحفظ و پشت پناہی کی خاطر شروع سے یہ کہتا آ رہا ہے کہ آزر حضرت ابراہیم خلیلؑ کے والد نہیں چچا کا نام تھا اور حال کے ایک آدھ جدید گمراہ فرقے بھی یہی کہہ رہے ہیں لیکن ان میں سے کسی کے پاس بھی دلیل کے نام سے کوئی چیز نہیں۔ رہے بعض احتمالات و امکانات، یہ تو قطعی سے قطعی مسئلہ میں بھی پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ اَبْ کو اس کے بالکل کھلے ہوئے ظاہری معنی سے ہٹا کر مجازی استعمال کی طرف لے جانے کے لیے آخر کوئی معقول وجہ بھی تو ہو۔

معقول وجہ تو آپ نے اوپر کی تاویل میں ملاحظہ فرمائی۔ نہ معلوم کن عقائد کے تحفظ و پشت پناہی کی خاطر حضرت خلیلؑ کے والد کو کافر بناتے ہیں بلکہ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ رسول خداؐ نے کسی کے سوال کے جواب میں فرمایا:

ان ابی و اباك فی النار۔[2] میرا باپ اور تیرا باپ دونوں جہنم میں ہیں۔

---

[1] روح المعانی ۱۳: ۲۴۳

[2] صحیح مسلم ۱: ۱۳۲ کتاب الایمان، باب ۹۰ بیان أن من مات علی الکفر ...۔

جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

لم أزل أنقل من أصلاب الطاهرين إلى أرحام المطهرات۔[1]　　میں پاکیزہ صلبوں سے پاکیزہ رحموں کی طرف منتقل ہوتا رہا ہوں۔

حضرت خلیلؑ کے والد کے کافر نہ ہونے پر تو آئمہ اہل بیت علیہم السلام کا اجماع ہے۔ بعض اہل سنت علماء بھی اس مسئلہ میں ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے ہم خیال ہیں۔ مفتی محمد شفیع صاحب اپنی تفسیر معارف القرآن میں لکھتے ہیں:

> امام رازی اور علمائے سلف میں سے ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ اور چچا کا نام آزر ہے۔ ان کا چچا آزر، نمرود کی وزارت کے بعد شرک میں مبتلا ہوگیا تھا اور چچا کو اَبْ کہنا عربی محاورات میں عام ہے۔ اسی محاورہ کے تحت آیت میں آزر کو حضرت ابراہیمؑ کا اَبْ فرمایا گیا.

زرقانی نے شرح مواهب میں اس کے کئی شواہد بھی نقل کیے ہیں اور روح المعانی میں آلوسی نے سورہ انعام آیت ۷۴ کے ذیل میں اس مسئلہ میں مذکورہ تمام دلائل کو ذکر کرتے ہوئے اجماعِ اہل بیتؑ سے اتفاق کیا ہے اور رازی کے اس قول کو عدم دقت کا نتیجہ قرار دیا ہے کہ آزر کو حضرت ابراہیمؑ کا چچا کہنا شیعوں کا نظریہ ہے بلکہ یہ ثابت کیا ہے اہل سنت میں ایک جم غفیر ابراہیمؑ کے والد کو مومن اور چچا آزر کو کافر جانتا ہے جس پر قرآنی کریم کی آیات دلالت کرتی ہیں۔[2]

اَتَتَّخِذُ اَصۡنَامًا اٰلِهَةً : کیا تو ایک شعور و ارادے کا مالک انسان بے حس بتوں کو معبود بناتا ہے؟ حضرت ابراہیمؑ کے ایک سوالیہ جملے میں بت پرستی کو ایک طعنہ ایک ننگ و عار قرار دیا گیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ تحریک انبیاء میں تبلیغ کا سلسلہ قریبی رشتہ داروں سے شروع ہوتا ہے: لِاَبِیۡهِ اٰزَرَ...

۲۔ عقیدے و نظریے کا رشتہ دوسرے تمام رشتوں پر مقدم ہے: اِنِّیۡۤ اَرٰىكَ وَ قَوۡمَكَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ.

۳۔ بت پرستی کا نام لینا ہی اس کی نامعقولیت کے لیے کافی ہے: اَتَتَّخِذُ اَصۡنَامًا اٰلِهَةً ...

وَ كَذٰلِكَ نُرِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ مَلَكُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لِیَكُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِیۡنَ ﴿۷۵﴾

۷۵۔ اور اس طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کا (نظام) حکومت دکھاتے تھے تاکہ وہ اہل یقین میں سے ہو جائیں۔

---

[1] بحار الانوار ۱۵: ۱۱۷۔ ایمان ابی طالب للفخار، ص ۵۷　[2] روح المعانی ۴: ۱۸۵۔ انعام: ۷۴

تشریح کلمات

مَلَکُوۡتَ: (م ل ك) مُلك سے ہے۔ جیسے رھبہ سے رھبوت، جبر سے جبروت۔ اس میں تازائدہ ہے. یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی سلطنت کے ساتھ مخصوص ہے۔

تفسیر آیات

ا۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کا نظارہ کیا جاتا ہے، قطع نظر اس سے کہ آسمان و زمین کس کی مملکت و سلطنت کا حصہ اور کس کی ملکیت ہیں۔ مثلاً کوئی شخص وسیع و عریض باغات کا نظارہ کرتا ہے اور ان کے حسن و وسعت سے متعجب اور محفوظ ہوتا ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ یہ باغات کس کے ہیں اور ان باغات کے حسن و خوبی میں کس کی کرشمہ سازی ہے۔ آسمان و زمین اس قسم کے نظارے ہر بصارت رکھنے والا کرتا ہے۔

۲۔ ایک نظارہ اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ یہ آسمان و زمین کس کی ملکیت اور کس کی سلطنت کا حصہ ہیں۔ اس مالک اور اس حاکم کی طرف توجہ جاتی ہے جس کی مملکت کا یہ حصہ اور جس کی کرشمہ سازی سے اس مملکت میں یہ رعنائیاں نظر آ رہی ہیں۔ اس صورت میں جیسے جیسے اس مملکت کی وسعت، حسن اور رعنائی نظر آئے گی، اس ذات کی امیری، بے نیازی اور حاکمیت اس کے ذہن پر منقش ہوتی جائے گی۔

۳۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صرف آسمانوں اور زمین کا نظارہ نہیں کرایا بلکہ ان کا ملکوتی نظارہ کرایا کہ یہ سب کس کی ملکیت ہے، ان پر کس کی سلطنت ہے اور یہ سب کس کی کرشمہ سازی ہے۔

۴۔ وَلِيَكُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِيۡنَ: اولوالعزم انبیاء کو اللہ تعالیٰ ایمان بالغیب کے ساتھ ایمان بالشہود کے درجہ پر فائز فرماتا ہے تاکہ ان کا ایمان ایسا ہو، جیسا اپنے وجود پر ایمان ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو ملکوتی سیر کرائی اور آسمانوں اور زمین میں اللہ کی سلطنت کا مشاہدہ کرایا تو یہ مشاہدہ سمعی و بصری نہیں ہے کہ جس میں کسی غلطی کا ایک فیصد بھی احتمال آ سکتا ہو، بلکہ شہود کے اس مقام پر پہنچانا مقصود تھا کہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اللہ کی سلطنت کو ذہن میں راسخ کیا جائے تاکہ یقین کے اس مقام پر فائز ہو جائے کہ آتش نمرود میں جاتے ہوئے جبرئیل امین جیسے مقتدر فرشتے کی مدد کو ناقابل اعتنا سمجھے۔

چنانچہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی افق اعلیٰ کی سیر کرائی اور اللہ کی بڑی سے بڑی نشانیاں دکھائیں۔ یہ نشانیاں کسی حواس کے ذریعہ نہیں بلکہ اپنے پورے وجود کے ساتھ دیکھ لیں کہ عقل و مشاہدہ دونوں سے بھی بالاتر مرتبہ ایقان پر فائز ہو جائیں۔

مَا كَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝[1]　　جو کچھ (نظروں نے) دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا۔

---

[1] ۵۳ نجم: ۱۱

مزید تفصیل کے لیے سورہ بقرہ آیت ۲۶۰ ملاحظہ فرمائیں۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيۡهِ الَّيۡلُ رَاٰ كَوۡكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّىۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِيۡنَ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ چنانچہ جب ابراہیم پر رات کی تاریکی چھائی تو ایک ستارہ دیکھا، کہنے لگے: یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غروب ہو گیا تو کہنے لگے: میں غروب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فَلَمَّا رَاَ الۡقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّىۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَئِنۡ لَّمۡ يَهۡدِنِىۡ رَبِّىۡ لَاَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡقَوۡمِ الضَّآلِّيۡنَ ﴿۷۷﴾

۷۷۔ پھر جب چمکتا چاند دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے اور جب چاند چھپ گیا تو بولے: اگر میرا رب میری رہنمائی نہ فرماتا تو میں بھی ضرور گمراہوں میں سے ہو جاتا۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمۡسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّىۡ هٰذَاۤ اَكۡبَرُ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَتۡ قَالَ يٰقَوۡمِ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ پھر جب سورج کو جگمگاتے ہوئے دیکھا تو بولے: یہ میرا رب ہے یہ سب سے بڑا ہے پھر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہنے لگے: اے میری قوم! جن چیزوں کو تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔

اِنِّىۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِىَ لِلَّذِىۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِيۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۷۹﴾

۷۹۔ میں نے تو اپنا رخ پوری یکسوئی سے اس ذات کی طرف کیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

تشریح کلمات

جَنَّ: (ج ن ن) کے اصل معنی کسی چیز کو حواس سے پوشیدہ کرنے کے ہیں۔ جنه اللیل اسے رات نے چھپا لیا۔

الافول: (ا ف ل) کے معنی ماہتاب اور نجوم وغیرہ کے غروب ہونے کے ہیں۔ بزغ الشمس کے معنی سورج کا طلوع ہونا ہے، جب کہ اس کی روشنی پھیل رہی ہو۔

تفسیر آیات

هٰذَا رَبِّىۡ: عصر ابراہیم علیہ السلام کے مشرکین کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ نے کائنات کی تدبیر مختلف

دیوتاؤں کے سپرد کر رکھی ہے۔ لہٰذا بندے کو چاہیے کہ وہ ان دیوتاؤں کے ذریعے اللہ تک رسائی اور اللہ کی قربت حاصل کرے۔ تازہ ترین کھدائیوں سے جو کتبے ملے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں ہر شہر کا دیوتا جدا ہوتا تھا اور اس کو رب البلد کہتے تھے۔ یہ دیوتا کسی ستارے یا چاند، سورج سے مربوط سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً چاند دیوتا کو ننّار اور سورج دیوتا کو شماش کہتے تھے۔ اس طرح ہر قوم ہر قبیلہ کا اپنا دیوتا ہوتا تھا۔ لوگ انہی سے اپنی تقدیر وابستہ سمجھتے تھے۔ لہٰذا انہی سے اپنی حاجتیں مانگتے اور تمام مراسم عبادات انہی کے آگے بجالاتے تھے۔ ان کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں ان کے چھوٹے دیوتا ہوتے تھے۔ اب تک پانچ ہزار خداؤں کے نام ملے ہیں۔

کلدانیوں کے آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سب سے بڑے رب کو ایل یا اِل کہتے تھے اور یہ ان کا رب الارباب ہوتا تھا، جس کی کوئی تصویر یا مجسمہ نہیں بناتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ رب صفاتِ مخلوق اور ان کے تخیلات سے بالاتر تھا۔ بظاہر یہ عقیدہ انہیں حضرت نوح (ع) سے وراثت میں ملا ہے۔

قوم ابراہیمؑ کی ستارہ پرستی کا تصور کچھ اس طرح تھا کہ سورج بادشاہوں کی تدبیر امور کرنے والا، ان میں شجاعت اور پیش قدمی کی روح پھونکنے والا ہے۔ شاہوں کے لشکر کو فتح، ان کے دشمنوں کو شکست دینے والا رب ہے۔ ستارہ زحل کو بینی کا نام دیتے تھے۔ اس کی خاصیت بھی تقریباً یہی تھی۔ ستارہ مشتری کو مرداخ کہتے تھے اور اسے بڑا رب کہتے تھے، جو عدل و انصاف کا رب ہے۔ ستارہ مریخ کو انکال کہتے تھے۔ یہ شکار اور جنگوں کا رب ہے۔ ستارہ زہرہ کو عشتار کہتے تھے اور یہ سعادت و خوشحالی کا رب ہے۔ آثار قدیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زہرہ سے منسوب بت ایک برہنہ عورت کی شکل میں ہے اور عطارد کو نبو کہتے تھے اور یہ علم و حکمت کا رب ہے۔

علم نجوم کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان جامع و قاطع ہے:

ایھا الناس ایاکم و تعلم النجوم الا مایھتدی بہ فی بر او بحر فانھا تدعو الی الکھانۃ والمنجم کالکاھن و الکاھن کالساحر والساحر کالکافر والکافر فی النار...۔[1]

اے لوگو! نجوم کے سیکھنے سے پرہیز کرو مگر اتنا کہ جس سے خشکی اور تری میں راستے معلوم کر سکو۔ اس لیے کہ نجوم کا سیکھنا کہانت اور غیب گوئی کی طرف لے جاتا ہے اور منجم حکم میں مثل کاہن کے ہے اور کاہن مثل ساحر کے ہے اور ساحر مثل کافر کے ہے اور کافر کا ٹھکانا جہنم ہے...

ایسے ماحول میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک بے مثال عقلی و فکری صلاحیت کے ساتھ توحید کی دعوت شروع کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

---

[1] نہج البلاغۃ خ ۷۹

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اِبۡرٰہِیۡمَ رُشۡدَہٗ مِنۡ قَبۡلُ وَ کُنَّا بِہٖ عٰلِمِیۡنَ ۝ۚ[1]　　اور بتحقیق ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے عقل کامل عطا کی اور ہم اس کے حال سے باخبر تھے۔

اسی رشد و فہم کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کے لیے ایسے بت پرستانہ ماحول میں توحید کا پرچم بلند کرنا ممکن ہوا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس دعوت میں حکیمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے لوگوں کے اس عقیدہ سے فائدہ اٹھایا کہ انسانی امور کی تدبیر کسی طاقت کے ہاتھ میں ہے اور اسی کو رب تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس رب کی تلاش اور تشخیص میں فوراً اپنا مؤقف بیان نہیں فرماتے بلکہ چند قدم ان سادہ لوح بت پرستوں کے ساتھ چلتے ہیں اور انہی کے ایک بلند رتبہ رب، ایک ستارے، زھرہ یا مشتری کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں: ھٰذَا رَبِّیۡ اس وقتی مؤقف اور فرضی نظریے سے بت پرستوں کی مذہبی حمیت اور نظریاتی تعصب کو چھیڑے بغیر ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔

فَلَمَّاۤ اَفَلَ: جب یہ ستارہ ڈوب جاتا اور نظروں سے غائب ہو جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں مزعومہ رب اپنے بندوں کو بے سہارا چھوڑ کر پس پردہ چلا جاتا ہے، حضرت ابراہیمؑ لوگوں کو اس رب کی بے مہری کی طرف متوجہ کرتے ہیں: لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِیۡنَ۔ مجھے غائب ہونے والے پسند نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس بارے میں لوگوں کا یہ نظریہ تھا کہ جب ستارے طلوع ہوتے ہیں تو طاقتور ہوتے ہیں اور جب غروب ہوتے ہیں تو کمزور ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے اسی نظریے کے مطابق فرمایا ہو کہ میں کمزوروں سے محبت نہیں کرتا۔ ایسا رب مجھے پسند نہیں ہے، جو کمزوری کی وجہ سے چھپ جاتا ہے کیونکہ رب اور مربوب کے درمیان محبت ہی کا رشتہ ہوتا ہے:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَہُمۡ کَحُبِّ اللّٰہِ ...[2]　　اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا مدمقابل قرار دیتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنی چاہیے۔

امام جعفر صادق (ع) سے روایت ہے:

وَ ہَلِ الدِّیۡنُ اِلَّا الۡحُبُّ۔[3]　　کیا دین محبت کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام براہ راست اس محبت کو نشانہ بناتے ہیں جس پر یہ عقیدہ قائم ہے اور فرماتے ہیں: لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِیۡنَ میں غائب ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

جب چاند طلوع ہوتا ہے تو پھر اسی استدراجی طرز استدلال کو اختیار فرماتے ہیں کہ ستارہ نہ سہی، چمکتا چاند میرا رب ہے۔ جب چاند بھی اپنے بندوں کو بے سہارا چھوڑ کر ڈوب جاتا ہے اور وہی بے رخی اختیار کرتا ہے تو اس بار حضرت ابراہیمؑ نے اپنے حقیقی رب کی اس طرح نشاندہی کی: لَئِنۡ لَّمۡ یَہۡدِنِیۡ رَبِّیۡ

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۱　　[2] ۲ بقرہ: ۱۶۵　　[3] اصول الکافی ۸: ۷۹۔ المستدرک للحاکم ۲: ۳۱۹ تفسیر سورۃ آل عمران

لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۔ اگر میرا رب میری رہنمائی نہ فرماتا تو میں بھی گمراہوں میں سے ہو جاتا۔

جب سورج نے طلوع کیا تو وہی طرز استدلال اختیار کیا اور فرمایا: یہ تو کافی بڑا ہے، یہی میرا رب ہے۔ جب سورج نے بھی بے اعتنائی برتی اور ڈوب گیا۔ ڈوب جانے اور غائب ہو جانے کے امر میں ستارہ چاند اور سورج سب کو یکساں پایا تو دیکھا ان میں سے کوئی ایک بھی رب بننے کے قابل نہیں ہے۔ یہاں پر آمدم برسر مطلب کے طور پر کہا: اے قوم جن چیزوں کو تم اللہ کے شریک بناتے ہو، ان سے میں بیزار ہوں۔ اب حضرت ابراہیمؑ نے ان ارباب کو اس مقام پر پہنچایا کہ ان سے اعلان برائت کیا جائے۔

سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ کیا اس خاص واقعہ سے پہلے ان چیزوں کے طلوع و غروب دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا؟ جواب یہ ہے کہ ان چیزوں کے طلوع و غروب کا مشاہدہ تو روز کرتے تھے، مگر ان باتوں سے استدلال کسی مناسب موقع پر کیا ہے۔

دوسرا سوال یہ اٹھاتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے ان چیزوں کے رب ہونے کا اقرار، خواہ وقتی ہی کیوں نہ ہو، کیسے کر لیا؟

جواب: اسے اقرار نہیں کہتے بلکہ یہ بات ستارہ پرستی کی رد کے لیے ایک تمہید ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ حضور کے لیے حکم ہوا:

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ○[1]	کہدیجیے: اگر رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے (اس کی) عبادت کرنے والا ہوتا۔

آخر میں بتایا کہ ساری امیدیں صرف خالق ارض و سما کے ساتھ وابستہ کرنی چاہئیں، نہ ستاروں اور بتوں کے ساتھ۔

تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ راوی کہتا ہے: میں نے امامؑ سے پوچھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے هٰذَا رَبِّيْ کیسے کہدیا؟ فرمایا:

لم يبلغ به شيئا اراد غير الذى قال۔[2]	اس سے کوئی امر واقع بیان کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد کچھ اور تھا۔

اہم نکات

۱۔ رب وہ ہوتا جو ہمیشہ حاضر و ناظر ہو: لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ....۔

۲۔ دین ابراہیمی دلیل و استدلال کا دین ہے۔ اندھی تقلید کا نہیں۔

۳۔ تعقل و تدبر ہی سے حق طلبی ہوتی ہے، تعصب و تنگ نظری سے نہیں۔

---

[1] ۴۳ زخرف: ۸۱ [2] بحار الانوار ۱۱: ۸۸

۴۔ دعوت انبیاء میں مخالف کی دل آزاری نہیں ہوتی، بلکہ اس کو قریب لانے کی کوشش ہوتی ہے: هٰذَا رَبِّیۡ هٰذَاۤ اَکۡبَرُ۔

وَ حَآجَّهٗ قَوۡمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوۡٓنِّیۡ فِی اللّٰهِ وَ قَدۡ هَدٰىنِ ؕ وَ لَاۤ اَخَافُ مَا تُشۡرِکُوۡنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ رَبِّیۡ شَیۡئًا ؕ وَسِعَ رَبِّیۡ کُلَّ شَیۡءٍ عِلۡمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَکَّرُوۡنَ ﴿۸۰﴾

۸۰۔ اور ابراہیم کی قوم نے ان سے بحث کی تو انہوں نے کہا: کیا تم مجھ سے اس اللہ کے بارے میں بحث کرتے ہو جس نے مجھے سیدھا راستہ دکھایا ہے؟ اور جن چیزوں کو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو ان سے مجھے کوئی خوف نہیں مگر یہ کہ میرا پروردگار کوئی امر چاہے، میرے پروردگار کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے، کیا تم سوچتے نہیں ہو؟

وَ کَیۡفَ اَخَافُ مَاۤ اَشۡرَکۡتُمۡ وَ لَا تَخَافُوۡنَ اَنَّکُمۡ اَشۡرَکۡتُمۡ بِاللّٰهِ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِهٖ عَلَیۡکُمۡ سُلۡطٰنًا ؕ فَاَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ اَحَقُّ بِالۡاَمۡنِ ۚ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ اور میں تمہارے بنائے ہوئے شریکوں سے کیونکر ڈروں جب کہ تم ان چیزوں کو اللہ کا شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کی کوئی دلیل اس نے تم پر نازل نہیں کی؟ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو تو بتاؤ کہ کون سا فریق امن و اطمینان کا زیادہ مستحق ہے۔

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الۡاَمۡنُ وَ هُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ﴿۸۲﴾

۸۲۔ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے ملوث نہیں کیا، یہی لوگ امن میں ہیں اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

تفسیر آیات

سیاق و سباق آیت سے موضوع بحث کا عندیہ ملتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم ان کو دو باتوں میں قابل گرفت قرار دیتی تھی:

ا۔ ابراہیمؑ نے ہمارے آبا و اجداد کے خداؤں سے انحراف کر کے گمراہی اختیار کی ہے۔ اس کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اَتُحَآجُّوۡٓنِّیۡ فِی اللّٰهِ وَ قَدۡ هَدٰىنِ ... کیا تم اللہ کے بارے میں مجھ سے بحث کرتے ہو جس نے مجھے ہدایت سے نوازا ہے۔ یعنی گمراہی میں تم ہو، مجھے تو اپنے اللہ کی طرف سے صحیح راستہ کی ہدایت ملی ہے۔ یہ ایک نہایت فکر انگیز جواب ہے کہ میرا اللہ مجھے ہدایت دیتا ہے۔ میری رہنمائی کرتا

ہے۔ جب کہ تم جن چیزوں کو اپنا رب اور خدا بناتے ہو، وہ تو اس قابل ہی نہیں کہ تمہیں ہدایت دے سکیں، لہٰذا گمراہ تم ہو، نہ کہ میں۔

۲۔ ابراہیمؑ نے ان خداؤں کو مسترد کر کے ان کے قہر و غضب کا خطرہ مول لیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اس کے جواب میں فرماتے ہیں: وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشۡرِکُوۡنَ ۔ مجھے ان خود ساختہ خداؤں سے کوئی خطرہ نہیں ہے:

قَالَ هَلۡ یَسۡمَعُوۡنَکُمۡ اِذۡ تَدۡعُوۡنَ ۙ اَوۡ یَنۡفَعُوۡنَکُمۡ اَوۡ یَضُرُّوۡنَ ۞ [1]	ابراہیم نے کہا: جب تم انہیں پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری سنتے ہیں؟ یا تمہیں فائدہ یا ضرر دیتے ہیں؟

تمہارے ان بے شعور بتوں سے خوف لاحق ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ رَبِّیۡ خوف کا سوال میرے رب کی نافرمانی سے ہو سکتا ہے، جس کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ وہ میری آواز سنتا ہے، وہ مجھے فائدہ دے سکتا ہے۔ اس کی نافرمانی سے مجھے ضرر پہنچتا ہے۔ اس سے اس کائنات میں کوئی شے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کی نافرمانی سے خوف کرنا چاہیے: وَسِعَ رَبِّیۡ کُلَّ شَیۡءٍ عِلۡمًا ...۔

وَکَیۡفَ اَخَافُ: میں تمہارے شریکوں سے کیونکر خوف کروں۔ یہ شریک نہ شعور و ادراک رکھتے ہیں، نہ نفع و ضرر میں کوئی دخل رکھتے ہیں۔ خوف تمہیں لاحق ہونا چاہیے تھا کہ تم نے بغیر کسی حجت و دلیل کے چند ایک جامد اور خود ساختہ چیزوں کو اللہ کا شریک بنایا ہے۔

وَکَیۡفَ اَخَافُ مَاۤ اَشۡرَکۡتُمۡ: توحید پرست اور بت پرستوں میں موازنہ فرمایا کہ ان دونوں میں سے کون امن و سکون کا مستحق ہے۔ توحید پرست اپنے مؤقف پر دلیل و برہان رکھتے ہیں۔ انہیں اپنے مؤقف پر یقین کامل ہے۔ جب کہ بت پرست اپنے مؤقف پر کوئی دلیل و برہان نہیں رکھتے، نہ یقین رکھتے ہیں بلکہ وہ آبا و اجداد کی اندھی تقلید میں یہ دین اپناتے ہیں۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ نے ان کو یہاں دعوت فکر دی اور فرمایا: فَاَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ اَحَقُّ بِالۡاَمۡنِ ... بتاؤ کون سا فریق امن و اطمینان کا مستحق ہے؟

لوگوں کے وجدان اور ضمیر کو جھنجوڑنے اور ضمیر کی عدالت عظمیٰ میں مقدمہ پیش کرنے کے بعد ایک ابدی فیصلہ سنایا گیا۔ وہ ہے:

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الۡاَمۡنُ وَهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ۞	جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے ملوث نہیں کیا یہی لوگ امن میں ہیں اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

وَلَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا: اپنے ایمان کو ایسے ظلم سے ملوث نہ کریں جس سے ایمان غیر مؤثر ہو کر رہ جائے۔ اس میں شرک بھی شامل ہے اور غیر شرک اور ہر وہ گناہ جو اپنے ایمان کے تقاضوں کے منافی ہو۔ جیسے سورہ حجرات، آیت ۲ میں فرمایا:

---

[1] ۲۶ شعراء: ۷۳

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَكُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِىِّ وَلَا تَجۡهَرُوۡا لَهٗ بِالۡقَوۡلِ كَجَهۡرِ بَعۡضِكُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ○	اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نبی کے ساتھ اونچی آواز میں بات نہ کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات کرتے ہو، کہیں تمہارے اعمال حبط ہو جائیں تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

انسان سے ایسا ظلم سرزد ہو سکتا ہے جس سے اس کے سارے اعمال حبط اور ضائع ہو جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ صرف ایمان کا اظہار کافی نہیں ہے، جب تک اس کے آثار کردار پر ظاہر نہ ہوں۔ یعنی انسان کو وہ ایمان امن دے سکتا ہے، جو اس کے کردار پر مؤثر رہے اور ظلم بہ نفس نہ کرے۔

ایمان والے ہی دنیا و آخرت میں امن و سکون میں ہوتے ہیں۔ دنیا میں بھی وہ لوگ جو ایمان کی دولت سے محروم ہیں، قلبی سکون اور نفسیاتی اطمینان سے محروم ہوتے ہیں:

وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا ...[1]	اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اسے یقیناً ایک تنگ زندگی نصیب ہو گی...۔
اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِىۡ مَقَامٍ اَمِيۡنٍ○ [2]	اہل تقویٰ یقیناً امن کی جگہ میں ہوں گے۔

البتہ دارین کے اس امن و سکون کے لیے ضروری ہے کہ اس ایمان کو ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے پاک رکھا جائے۔ نہ اپنے نفس پر ظلم کریں، نہ دوسروں پر۔ ایسا ظلم جو ایمان کے منافی ہو، ایمان کے آثار کے خلاف ہو۔ مثلاً گناہان کبیرہ کے اس طرح مرتکب ہوں کہ ان گناہوں سے رکنے کے لیے ان کے باطن میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ دوسروں پر اس طرح ظلم کریں کہ ضمیر اور وجدان ان کے آڑے نہ آئے، ایسے حالات میں ان پر یہ فرمان صادق آئے گا:

فَيَوۡمَئِذٍ لَّا يَنۡفَعُ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مَعۡذِرَتُهُمۡ وَلَا هُمۡ يُسۡتَعۡتَبُوۡنَ○ [3]	پس اس دن ظالموں کو ان کی معذرت کوئی فائدہ نہ دے گی اور نہ ان سے معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا.

اہم نکات

۱۔ ہدایت و رہنمائی اس ذات کی طرف سے آ سکتی ہے، جس کا علم ہر چیز پر محیط ہو: وَسِعَ رَبِّىۡ كُلَّ شَىۡءٍ عِلۡمًا ...۔

۲۔ غیر اللہ سے لو لگانے والے دنیا و آخرت دونوں میں خوف و اضطراب سے دو چار ہوں گے۔

۳۔ ایمان کا ہونا اور ظلم کا نہ ہونا، دو ایسے ستون ہیں جن پر امن و سکون قائم ہے: وَلَمۡ يَلۡبِسُوۡۤا اِيۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ ...۔

---

[1] ۲۰ طٰہ: ۱۲۴ [2] ۴۴ دخان: ۵۱ [3] ۳۰ روم: ۵۷

وَ تِلۡکَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَیۡنٰہَاۤ اِبۡرٰہِیۡمَ عَلٰی قَوۡمِہٖ ؕ نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ حَکِیۡمٌ عَلِیۡمٌ ﴿۸۳﴾

۸۳۔اور یہ ہماری وہ دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں عنایت فرمائی، جس کے ہم چاہتے ہیں درجات بلند کرتے ہیں بے شک آپ کا رب بڑی حکمت والا، خوب علم والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ تِلۡکَ حُجَّتُنَاۤ : حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید پر جو دلائل اپنی قوم کے مقابلے میں پیش کیے، وہ سب اللہ کی طرف سے عطیہ ہیں۔ ان دلائل کے لیے علم و حکمت، ایمان و کرامت درکار ہوتی ہے۔ جسے یہ چیزیں حاصل ہیں، وہ علم و کمال کے ایک بلند درجہ پر فائز ہوتا ہے۔ یہاں حضرت ابراہیمؑ کو دلائل عطا کر فرمایا:

۲۔ نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ : ہم جس کے چاہتے ہیں بلند درجات عطا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو دلائل عطا کرنا، بلند درجات عطا کرنے کے مترادف ہے اور یہ مشیت الٰہی پر موقوف ہے۔ واضح رہے، اللہ کی مشیت اس کی حکمت اور اس کے علم کے مطابق ہوتی ہے۔ بلا حکمت و بلا استحقاق کسی کے درجات بلند نہیں فرماتا۔

اہم نکات

۱۔ توحید پر استدلال اور منکرین کے مقابلے میں دندان شکن دلیل پیش کرنا سنت انبیاء ہے۔

۲۔ اثبات توحید کے لیے ضروری علوم کا ہونا، اللہ کا عطیہ اور بلندی درجات کا سبب ہو گا۔

وَ وَہَبۡنَا لَہٗۤ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ ؕ کُلًّا ہَدَیۡنَا ۚ وَ نُوۡحًا ہَدَیۡنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِہٖ دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ وَ اَیُّوۡبَ وَ یُوۡسُفَ وَ مُوۡسٰی وَ ہٰرُوۡنَ ؕ وَ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۸۴﴾

۸۴۔ اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب عنایت کیے، سب کی رہنمائی بھی کی اور اس سے قبل ہم نے نوح کی رہنمائی کی تھی اور ان کی اولاد میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کی بھی اور نیک لوگوں کو ہم اسی طرح جزا دیتے ہیں۔

وَ زَکَرِیَّا وَ یَحۡیٰی وَ عِیۡسٰی وَ اِلۡیَاسَ ؕ کُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۸۵﴾

۸۵۔ اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس (یہ) سب صالحین میں سے تھے۔

وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ الۡیَسَعَ وَ یُوۡنُسَ وَلُوۡطًا ؕ وَ کُلًّا فَضَّلۡنَا عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۸۶﴾

۸۶۔ اور اسماعیل، یسع، یونس اور لوط (کی رہنمائی کی) اور سب کو عالمین پر فضیلت ہم نے عطا کی۔

تفسیر آیات

اِسۡحٰقَ: حضرت ابراہیمؑ کے صاحبزادے، جو ان کے بڑھاپے میں پیدا ہوئے۔ بقول بعض جب اسحاق (ع) پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کی عمر ایک سو بارہ سال تھی اور ان کی والدہ حضرت سارہ کی عمر ننانوے سال تھی۔

یَعۡقُوۡبَ: حضرت ابراہیمؑ کے پوتے، حضرت اسحاقؑ کے صاحبزادے۔ آپؑ کو اسرائیل بھی کہتے ہیں اور بنی اسرائیل آپؑ کی طرف منسوب ہیں۔

نُوۡحًا: آپؑ پہلے صاحب شریعت نبی ہیں۔ توریت کے مطابق حضرت ابراہیمؑ سے گیارہ پشتوں کا فاصلہ ہے۔ آپؑ کا وطن عراق کی سرزمین تھا۔ تخمیناً آپؑ کا زمانہ ۱۹۹۸ سے ۲۹۴۸ قبل مسیح تک سمجھا گیا ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت کے مفسر حضرات نہایت اطمینان سے لکھتے ہیں کہ یہاں حضرت نوحؑ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ حضرت ابراہیمؑ کی نسبی شرافت و طہارت کا بیان ہو جائے:

فهو لبيان نعم اللّٰه عليه فى افضل اصوله تمهيداً لبيان نعمه عليه من فروعه۔[1]

اللہ کی ان نعمتوں کا بیان، جو ان کے افضل ترین آبا و اجداد کی وجہ سے انہیں حاصل ہے، اولاد کی نعمتوں کے بیان کی تمہید کے طور پر ہو رہا ہے۔

تفسیر مراغی میں اس جگہ لکھا ہے:

واخرجه من اصلاب اباء طاهرين كنوح و ادريس و شيث فهو كريم الاباء شريف الابناء۔[2]

حضرت ابراہیمؑ کو پاکیزہ آبا و اجداد سے پیدا کیا، جیسے نوح، ادریس اور شیث علیہم السلام۔ لہٰذا آپ باکرامت آبا و اجداد کے فرزند اور باشرافت اولاد کے باپ ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ گیارہویں پشت کے جد اعلیٰ کی طہارت قابل فخر ہے لیکن معاذ اللہ ایک کافر باپ کی صلب سے پیدا ہونا طہارت کے منافی نہیں ہے۔

امامیہ کا مؤقف ہمیشہ یہ رہا ہے کہ تمام انبیاء، کریم الآباء و شریف الابناء ہیں۔

دَاوٗدَ: آپؑ کے والد کا نام یسی بتاتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے ایک متوسط خاندان سے ابھرے، جالوت پر فتح حاصل کرنے کے بعد اپنی قوم میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ بعد میں تخت بادشاہی پر متمکن ہوئے۔

---

[1] المنار ۷:۵۷۶ [2] تفسیر مراغی ۷:۱۸۱

تقریباً ۹۶۲ء قبل مسیح وفات پائی۔

سُلَیۡمٰنَ: انبیاء میں سب سے عظیم الشان بادشاہ، جن کے دور میں بنی اسرائیل تانبے کی صنعت میں داخل ہوئے، جب کہ حضرت داؤدؑ کے دور میں لوہے اور زرہ سازی کے دور میں داخل ہو چکے تھے۔ چنانچہ خلیج عقبہ کے شمال میں تل الحلیفضہ کی کھدائی میں وہ بھٹیاں نکلی ہیں جو لوہے اور تانبے کی ڈھلائی کے لیے بنائی گئی تھیں، جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے:

وَاَسَلۡنَا لَہٗ عَیۡنَ الۡقِطۡرِ ....[1]　　اور ہم نے اس کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا....

اَیُّوۡبَ: آپؑ عرب قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ آپؑ صبر کے لیے مثال بن گئے۔ آپؑ کے زمانے کا اندازہ پندرہ یا سولہ صدی قبل مسیح کا لگایا گیا ہے۔

یُوۡسُفَ: آپؑ کنعان یعنی فلسطین میں پیدا ہوئے۔ بعد مصر کے بادشاہ ہوئے۔ آپؑ کے زمانے کا ۱۷۰۰ تا ۱۹۱۰ قبل مسیح کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

زَکَرِیَّا: بنی اسرائیل کے نبی، حضرت مسیح (ع) کے خالو۔ انہوں نے بڑھاپے میں بیٹے کے لیے دعا کی اور قبول ہوئی اور حضرت یحییٰ (ع) پیدا ہوئے۔

یَحۡیٰی: انجیل میں ان کا نام یوحنا آیا ہے۔ ۳۰ء میں وفات پا گئے۔

اِلۡیَاسَ: ان کو توریت میں ایلیاہ کا نام دیا گیا ہے۔

اَلۡیَسَعَ: الیشع کی تعریب ہے۔ قاعدۃً عبرانی شین کو عربی میں سین سے تبدیل کرتے ہیں۔

یُوۡنُسَ: نینوا یعنی موجودہ عراقی موصل کے پیغمبر۔ آپؑ کا زمانہ ۷۸۱ تا ۷۴۱ قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔

لُوۡطًا: لوط بن هاران۔ آپ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔ بحر لوط یا بحر مردار کے کنارے آپؑ کی امت آباد تھی، جو عذاب الٰہی سے ہلاک ہوگئی۔ کہتے ہیں یہ ۲۰۶۱ء قبل مسیح کا واقعہ ہے۔

مباحث:

۱۔ ذُرِّیَّتِہٖ کی ضمیر نوح (ع) کی طرف ہے یا ابراہیمؑ کی طرف، اس میں تردد ہے۔ قریب ہونے اور بعض مذکورہ انبیاء کے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ممکن ہے یہ ضمیر نوح (ع) کی طرف جائے اور چونکہ سلسلہ کلام حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ہے، لہٰذا ان کی اولاد کا ذکر ہے تو ضمیر کا ابراہیمؑ کی طرف جانا زیادہ مناسب ہے۔

۲۔ ان ذریتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی ذکر ہے، خواہ ضمیر نوح طرف جائے یا ابراہیم علیہما السلام کی طرف جائے۔ یہ بات اس امر پر دلیل ہے کہ دختر کی اولاد کو بھی ذریت کہنا صحیح ہے۔ یعنی نواسے بھی

----

[1] ۳۴ سبا: ۱۲

ذریت میں شمار ہوئے ہیں۔

چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے حجاج بن یوسف کے سامنے اس آیت اور آیہ مباہلہ سے حسنین علیہم السلام کے ذریت رسولؐ ہونے پر استدلال کیا اور اس طرح امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے بھی ہارون رشید کے سامنے اس آیت سے استدلال کیا کہ ہم ذریت رسول ہیں۔ سنن ترمذی کتاب المناقب میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسنین علیہما السلام کے بارے میں فرمایا:

هَذَانِ ابْنَایَ وَابْنَا ابْنَتِی، اللّٰهُمَّ إِنِّی أُحِبُّهُمَا فَأَحِبَّهُمَا وَأَحِبَّ مَنْ یُحِبُّهُمَا۔ [1]

یہ دونوں میرے بیٹے اور میری بیٹی کے بیٹے ہیں۔ خدایا میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں پس تم بھی ان دونوں سے محبت کر اور جو ان دونوں سے محبت کرے، اس سے محبت کرتا ہوں۔

المنار میں آیا ہے کہ بخاری نے حضرت ابوبکر کی یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ نے حضرت حسن کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ان ابنی هذا سید۔ میرا یہ بیٹا سید و سردار ہے۔ ابونعیم کی روایت کتاب معرفة الصحابة میں مذکور ہے:

و کل ولد آدم فان عصبتهم لابیهم خلا ولد فاطمة فانی انا ابوهم و عصبتهم۔ [2]

تمام اولادِ آدم کی رشتہ داری باپ کی طرف سے ہے، سوائے اولاد فاطمہ کے کہ میں ان کا باپ ہوں۔

علامہ طباطبائی رضوان اللہ علیہ المیزان میں اس آیت کی بحث روایت میں فرماتے ہیں:

یہاں لفظی بحث نہیں ہے کہ لفظ ذریت، دختر کی اولاد کو بھی شامل ہے یا نہیں بلکہ یہ تو ایک قانونی مسئلہ ہے، جس میں مختلف اقوام، مختلف مؤقف رکھتی ہیں۔ مثلاً زمان جاہلیت میں منہ بولے کو قرابتدار سمجھتے تھے اور بیٹی کی اولاد کو صرف خونی رشتہ دار سمجھتے تھے۔ قانونی نہیں سمجھتے تھے۔ [3]

اسلام نے منہ بولے بیٹے کو قانونی حیثیت نہیں دی اور فرمایا:

وَ مَا جَعَلَ اَدۡعِیَآءَکُمۡ اَبۡنَآءَکُمۡ ...۔ [4]

اور نہ ہی تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے (حقیقی) بیٹے بنایا...۔

اور عورت کو قرابتداروں میں داخل کیا اور اسے قانونی حیثیت دی اور بیٹیوں کی اولاد کو بھی ان کی اولاد قرار دیا

---

[1] سنن ترمذی ۱۲: ۲۳۹، مناقب الحسن و الحسین علیهما السلام۔ مسند طیالسی ۱: ۳۳۲۔ حدیث نافع بن جبیر بن مطعم...۔ ناصر الدین البانی نے صحیح ترمذی میں اسے حدیث حسن قرار دیا ہے۔

[2] معرفة الصحابة ۱: ۲۳۱، باب کل سبب ونسب ....۔ المعجم الکبیر للطبراني ۳: ۴۴، باب حسن بن علی بن أبی طالب علیهم السلام

[3] المیزان ۷: ۲۶۳ [4] ۳۳ احزاب: ۴

اور فرمایا:

يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِىۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ‌ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ ...[3]

اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں ہدایت فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔

اور فرمایا:

لِلرِّجَالِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا تَرَكَ الۡوَالِدٰنِ وَالۡاَقۡرَبُوۡنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا تَرَكَ الۡوَالِدٰنِ وَالۡاَقۡرَبُوۡنَ ...[4]

جو مال ماں باپ اور قریبی رشتے دار چھوڑ جائیں اس میں مردوں کا ایک حصہ ہے اور (ایسا ہی) جو مال ماں باپ اور قریبی رشتے دار چھوڑ جائیں اس میں تھوڑا ہو یا بہت عورتوں کا بھی ایک حصہ ہے۔

اور محرمات نکاح کے سلسلہ میں فرمایا:

حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمۡ اُمَّهٰتُكُمۡ وَبَنٰتُكُمۡ ...[5]

تم پر حرام کر دی گئی ہیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں ....

اس آیت میں بَنٰتُكُمۡ میں نواسی کو بھی بیٹی کہا ہے اور بیٹیوں کی اولاد کو اولاد کہا گیا ہے۔ یہ قانونِ وارثت میں ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔[6]

اہم نکات

۱۔ نوح (ع) پہلے صاحب شریعت نبی ہیں۔

۲۔ ان آیات میں ہدایت کے اہم ارکان کا ذکر آیا۔

وَمِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ وَاِخۡوَانِهِمۡ‌ۚ وَاجۡتَبَيۡنٰهُمۡ وَهَدَيۡنٰهُمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۸۷﴾

۸۷۔ اور اسی طرح ان کے آبا اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں کو بھی (ہدایت دی) اور ہم نے انہیں منتخب کر لیا اور ہم نے راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کی۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ‌ؕ وَلَوۡ اَشۡرَكُوۡا لَحَبِطَ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۸﴾

۸۸۔ یہ ہے اللہ کی ہدایت جس سے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے نوازے اور اگر وہ لوگ شرک کرتے تو ان کے کیے ہوئے تمام اعمال برباد ہو جاتے۔

---

[3] ۴ نساء: ۱۱ [4] ۴ نساء: ۷ [5] ۴ نساء: ۲۳ [6] المیزان: ۷: ۲۶۳

تفسیر آیات

اس سلسلۂ ہدایت کا ذکر جاری ہے کہ یہ سلسلہ ان مذکورہ انبیاء علیہم السلام کے آبا و اجداد، ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں کے ذریعے جاری رہا ہے، جن کو اس عظیم مقصد کے لیے برگزیدہ کیا اور ہدایت سے نوازا ہے۔

۱۔ آبا کے بارے میں فرمایا: وَ اتَّبَعۡتُ مِلَّۃَ اٰبَآءِیۡۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ ...[1]

۲۔ اولاد کے بارے میں فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ۝[2]

۳۔ بھائی کے بارے میں فرمایا: ہٰرُوۡنَ اَخِی ۝ اشۡدُدۡ بِہٖۤ اَزۡرِیۡ ۝[3]

یہاں قابل توجہ نکتہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت و رہبری کی مسئولیت کو ایک خاص سلسلہ نسب میں رکھا ہے۔ یہ سلسلہ نسل ابراہیمؑ سے خارج نہیں رکھا۔ ان کے بارے میں فرمایا:

وَ جَعَلۡنَا فِیۡ ذُرِّیَّتِہِ النُّبُوَّۃَ وَ الۡکِتٰبَ ..[4]　　اور ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی....

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بار امانت کو اٹھانے کے لیے وراثتی اور تربیتی اثرات کو دخل حاصل ہے۔ اسی وجہ سے سلسلہ امامت و رہبری، انہی کے آبا و اجداد، اولاد و ذریت اور بھائی بندی سے باہر نہیں ہے۔

اَللّٰہُ اَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَہٗ ...[5]　　اللہ (ہی) بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں رکھے.

ذٰلِکَ ہُدَی اللّٰہِ: دوسری آیت میں فرمایا: یہ ہے اللہ کی ہدایت، جس سے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے نوازے۔

وَ لَوۡ اَشۡرَکُوۡا: ہدایت و رہنمائی اور امامت و رہبری کے اس منصب پر فائز رہنا، توحید پرستی کے ساتھ مشروط ہے۔ اس لیے آیت کے آخر میں فرمایا: اگر یہ لوگ شرک کا ارتکاب کریں گے تو ان کے تمام اعمال حبط اور ضائع ہو جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء و رہبران دین آپس میں قریبی رشتہ دار ہوتے ہیں: وَ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِہِمۡ ....

۲۔ منصب الٰہی کے لیے موحد ہونا ضروری ہے، موروثی نہیں ہے: وَ لَوۡ اَشۡرَکُوۡا لَحَبِطَ ....

۳۔ منصب الٰہی توحید پرستوں میں موروثی ہے: وَ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِہِمۡ وَ اِخۡوَانِہِمۡ ....

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ وَ　　۸۹۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکمت

---

[1] ۱۲ یوسف: ۳۸　[2] ۳ آل عمران: ۳۳　[3] ۲۰ طٰہٰ: ۳۰۔۳۱　[4] ۲۹ عنکبوت: ۲۷　[5] ۶ انعام: ۱۲۴

الۡحُکۡمَ وَ النُّبُوَّۃَ ۚ فَاِنۡ یَّکۡفُرۡ بِہَا ہٰۤؤُلَآءِ فَقَدۡ وَکَّلۡنَا بِہَا قَوۡمًا لَّیۡسُوۡا بِہَا بِکٰفِرِیۡنَ ﴿۸۹﴾

اور نبوت عطا کی، اب اگر یہ لوگ ان کا انکار کریں تو ہم نے ان پر ایسے لوگ مقرر کر رکھے ہیں جو ان کے منکر نہیں ہیں۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ ہَدَی اللّٰہُ فَبِہُدٰىہُمُ اقۡتَدِہۡ ؕ قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا ؕ اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٰی لِلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۹۰﴾

۹۰۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت سے نوازا ہے تو آپ بھی انہی کی ہدایت کی اقتدا کریں، کہدیجیے: میں اس (تبلیغ قرآن) پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، یہ تو عالمین کے لیے فقط ایک نصیحت ہے۔

تفسیر آیات

کتاب: ان انبیاء میں سے اگرچہ سب پر کتاب نازل نہیں ہوئی، تاہم ہر نبی پر بذریعہ وحی جو احکام نازل ہوئے تھے، ان کو صحائف انبیاء کہتے ہیں۔

حکم: اس سے مراد شریعت اور اس کے مطابق صادر ہونے والے فیصلے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

وَاَنۡزَلَ مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ فِیۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ ....[1]

اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان امور کا فیصلہ کریں جن میں وہ اختلاف کرتے تھے....

چنانچہ کتاب نازل کرنے کا مقصد انسانوں کو ایک دستور اور آئین دینا ہے اور انبیاء علیہم السلام اس کے نفاذ کے لیے آئے ہیں:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىۃَ فِیۡہَا ہُدًی وَّ نُوۡرٌ ۚ یَحۡکُمُ بِہَا النَّبِیُّوۡنَ الَّذِیۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِیۡنَ ہَادُوۡا ....[2]

ہم نے توریت نازل کی جس میں ہدایت اور نور تھا، اطاعت گزار انبیاء اس کے مطابق یہودیوں کے فیصلے کرتے تھے....

لہٰذا اگرچہ کتاب و شریعت بعض انبیاء کو دی ہیں، لیکن نبوت کے ساتھ حکم، یعنی نفاذ شریعت اور لوگوں میں فیصلہ صادر کرنے کا حق تمام انبیاء کو دیا ہے:

وَ کُلًّا اٰتَیۡنَا حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ....[3] اور ہم نے دونوں کو حکمت اور علم عطا کیا....

وَ لُوۡطًا اٰتَیۡنٰہُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ....[4] اور لوط کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا....

اس کے بعد فرمایا: اگر یہ لوگ، مشرکین مکہ، انکار کریں تو ہم نے ایسے لوگوں کو مقرر کر رکھا ہے جو

---

[1] ۲ بقرہ: ۲۱۳ [2] ۵ مائدہ: ۴۴ [3] ۲۱ انبیاء: ۷۹ [4] ۲۱ انبیاء: ۷۴

ان کا انکار نہیں کریں گے۔ اس جملے میں رسول خداؐ کو یہ بشارت دی جا رہی ہے کہ کفار مکہ کی طرف سے ایمان نہ لانے پر آزردہ خاطر نہ ہوں۔ آپؐ کی یہ زحمتیں بارآور ثابت ہوں گی۔ ہم نے اس دین کو قائم رکھنے کے لیے ایسی قوم اور ایسی جماعت تیار کر رکھی ہے جس سے کفر صادر ہونے کا تصور نہیں ہوسکتا۔

۱۔ لَّيۡسُوۡا بِهَا بِكٰفِرِيۡنَ: مفسرین نے اس قوم کے بارے میں مختلف مؤقف اختیار کیا ہے۔ مگر سیاق آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں وہ سب اہل ایمان شامل ہیں جو رسالتمآبؐ کی نبوت پر من حیث المجموع ایمان لانے والے ہیں، جو کہ کفر کے مقابلے میں مذکور ہونے کی وجہ سے بظاہر یہی معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ لَّيۡسُوۡا بِهَا بِكٰفِرِيۡنَ سے اس قوم کے ایمان کامل کا عندیہ ملتا ہے۔ لہٰذا وہ لوگ اس آیت میں شامل ہو سکتے ہیں جو اس رسالت کی محافظت اور شریعت کے امین ہیں۔

۲۔ فَبِهُدٰىهُمُ اقۡتَدِهۡ: اس کے بعد حضورؐ کے لیے حکم ہوتا ہے کہ وہ ان انبیاء کی راہ پر چلیں، ان کی اقتدا کریں۔ یعنی تبلیغ رسالت، منکرین سے جہاد، مصائب و آلام میں صبر وغیرہ میں اقتدا کریں، نہ ان انبیاء پر نازل ہونے والے ہر حکم کی اقتداء، جیسا کہ کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

۳۔ قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا: آخر میں اپنی بے غرضی کے اعلان کا حکم ہوا کہ کہد یجیے میں اس تبلیغ و ہدایت پر کوئی اجر نہیں مانگتا۔ یہ تو ایک الٰہی نعمت اور انسانی نصیحت ہے، خود تمہاری اور اہل عالم کی نجات کے لیے۔

اہم نکات

۱۔ پیغام قرآن کی حفاظت کے لیے ایک امین جماعت موجود ہے جو ہر قسم کے کفر سے پاک ہے: قَوۡمًا لَّيۡسُوۡا بِهَا بِكٰفِرِيۡنَ ....

۲۔ اسلام کا پیغام عالمین پر محیط ہے: اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٰى لِلۡعٰلَمِيۡنَ ....

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ اِذۡ قَالُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنۡ شَىۡءٍ ؕ قُلۡ مَنۡ اَنۡزَلَ الۡكِتٰبَ الَّذِىۡ جَآءَ بِهٖ مُوۡسٰى نُوۡرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ تَجۡعَلُوۡنَهٗ قَرَاطِيۡسَ تُبۡدُوۡنَهَا وَتُخۡفُوۡنَ كَثِيۡرًا ۚ وَ

۹۱۔ اور انہوں نے اللہ کو ایسے نہیں پہچانا جیسے اسے پہچاننے کا حق تھا، جب انہوں نے کہا: اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا، ان سے پوچھیں: پھر وہ کتاب جو موسیٰ لے کر آئے تھے کس نے نازل کی جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی؟ اس کا کچھ حصہ ورق ورق کر کے دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھپا لیتے ہو اور تمہیں وہ علم سکھا دیا تھا

عُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَ لَاۤ اٰبَآؤُکُمۡ ؕ قُلِ اللّٰہُ ۙ ثُمَّ ذَرۡہُمۡ فِیۡ خَوۡضِہِمۡ یَلۡعَبُوۡنَ ﴿۹۱﴾	جو نہ تم جانتے ہو نہ تمہارے باپ دادا، کہد یجیے: اللہ ہی نے (اسے نازل کیا تھا)، پھر انہیں ان کی بیہودگیوں میں کھیلتے چھوڑ دیں۔

تشریح کلمات

قَرَاطِیۡسَ: (ق ر ط س) القرطاس ہر وہ چیز جس پر لکھا جائے۔

خَوۡضِہِمۡ: (خ و ض) الخوض کے معنی پانی میں اترنے اور اس کے اندر چلے جانے کے ہیں۔ قرآن میں زیادہ استعمال فضول کاموں میں لگے رہنے کے لیے ہوا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ: جو لوگ رسالت کے منکر ہیں، ان لوگوں کو اللہ کی قدر و معرفت نہیں ہے۔ انکار رسالت، اللہ کی ناقدری ہے کیونکہ اگر اللہ انسانوں کی ہدایت کے لیے کسی رسول کو نہیں بھیجتا ہے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اللہ انسانوں کی ہدایت نہیں کرنا چاہتا۔ اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ انسانوں کو پیدا کرنے کی کوئی معقول وجہ اور مقصد سامنے نہیں ہے اور اللہ نے انسانوں اور پوری کائنات کو عبث خلق کیا ہے۔ یہ اللہ کی نہایت ناقدری ہے کہ اللہ کو عبث کار فرض کیا جائے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلۡ مَنۡ اَنۡزَلَ الۡکِتٰبَ الَّذِیۡ جَآءَ بِہٖ مُوۡسٰی: کہد یجیے: پھر وہ کتاب کس نے نازل کی جو موسیٰ لے کر آئے تھے۔ اس جملے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ خطاب مشرکین سے ہے جو مطلق رسالت کے منکر ہیں تو ان کے لیے موسیٰ (ع) کی نظیر پیش کرنا درست نہیں ہے اور اگر یہ خطاب یہود سے ہے تو یہ مطلق رسالت کے منکر نہیں ہیں۔ یہود یہ تو نہیں کہتے کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا۔

جواب یہ دیا گیا ہے کہ ممکن ہے خطاب یہود سے ہو اور مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنۡ شَیۡءٍ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا، سے یہود کی مراد یہ ہو: مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلٰی بَشَرٍ (مثل محمدؐ) مِّنۡ شَیۡءٍ۔ محمدؐ جیسے انسان پر کچھ نازل نہیں کیا۔ جس کے جواب میں فرمایا کہ موسیٰ (ع) بھی تو ایک بشر ہی تھے پھر ان پر کتاب کیسے نازل کی گئی۔

یہی جواب صائب معلوم ہوتا ہے کیونکہ کتاب کا کچھ حصہ دکھانا اور کچھ چھپانا، یہود ہی کرتے تھے۔ مشرکین کے پاس تو کوئی کتاب نہ تھی، نہ ہی مشرکین کو کوئی علم سکھایا گیا ہے۔

۲۔ تَجۡعَلُوۡنَہٗ قَرَاطِیۡسَ تُبۡدُوۡنَہَا: دوسری طرف تم اس کتاب کو، جو موسیٰ (ع) جیسے بشر پر نازل کی گئی ہے، ورق ورق کر کے دکھاتے ہو۔ قَرَاطِیۡسَ تم نے توریت کو کتاب کی جگہ قرطاس، ورق میں تبدیل کیا۔ اس کتاب خدا کو جزء، جزء میں تقسیم کر کے کچھ کو ظاہر کیا اور کچھ کو پوشیدہ رکھا۔

۳۔ عُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا: توریت کے ذریعے کس نے تمہیں ان عقائد و احکام کی تعلیم دی، جن کو تم نہیں جانتے تھے۔ آپ خود جواب دیجیے۔ یہ سب اللہ نے کیا۔ فرمایا: پھر تمہارا یہ کہنا کہ اللہ نے کسی بشر و انسان پر کوئی نازل نہیں کی کس قدر مضحکہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ رسولوں کا بھیجنا شان خداوندی کے مطابق ہے کہ وہ فیض ہدایت بندوں پر جاری رکھے۔

۲۔ انکار رسالت، شان خداوندی میں گستاخی ہے۔ یعنی ذات فیاض سے فیض کی بندش کا تصور، گستاخی ہے۔

۳۔ پس سلسلۂ ہدایت کے تا قیامت جاری رہنے کا انکار بھی اللہ کی شان میں گستاخی ہے۔

وَ ہٰذَا کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰہُ مُبٰرَکٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیۡ بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَ لِتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی وَ مَنۡ حَوۡلَہَا ؕ وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ وَ ہُمۡ عَلٰی صَلَاتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ﴿۹۲﴾

۹۲۔ اور یہ کتاب جو ہم نے نازل کی ہے بڑی بابرکت ہے جو اس سے پہلے آنے والی کی تصدیق کرتی ہے اور تاکہ آپ ام القریٰ (اہل مکہ) اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو تنبیہ کریں اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی اس (قرآن) پر بھی ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ ہٰذَا کِتٰبٌ: جیسا کہ دوسری کتابیں اللہ نے نازل فرمائی ہیں، یہ قرآن بھی اسی طرح کی ایک بابرکت کتاب ہے۔ اس کتاب کا پر برکت ہونا خود اس کی حقانیت کی دلیل ہے۔ اس کتاب کی برکتوں سے انسانیت نے جہل و نادانی اور غربت و افلاس کی اتھاہ گہرائیوں سے نکل کر ایک تمدن و خوشحالی اور علم کی روشنی میں قدم رکھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان نے اس نعمت کی بھی ناشکری کی اور خود اپنے ہاتھوں مادیت کی اتھاہ اور تاریک گہرائیوں میں جا پہنچا۔

۲۔ وَ لِتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی: ام القریٰ مکہ ہے، جس کا لفظی ترجمہ ہے: بستیوں کا مرکز۔ یہ وہ مرکز ہے جہاں سے اسلامی انقلاب برپا ہوا۔ جہاں پر وحی الٰہی کا نزول شروع ہوا۔ جہاں سے اسلامی دعوت پھیلی۔ جہاں بیت اللہ، دنیا کا پہلا خانہ خدا موجود ہے۔ جس کی طرف دنیا کی ساری بستیوں سے لوگ نماز کے لیے رخ کرتے ہیں۔ جہاں حج کے لیے دنیا کے تمام مسلمان رجوع کرتے ہیں۔ ممکن ہے مکہ کو مرکزی حیثیت جغرافیہ

کی حیثیت سے حاصل نہ ہو کیونکہ قرآن کا جغرافیائی موضوعات سے ربط نہیں ہے بلکہ مکہ کی مرکزی حیثیت روحانی حوالوں سے ہے کہ یہ تمام اقلیموں کی روحانی تربیت اور ہدایت کا مرکز ہے۔ مزید تفصیل کے لیے سورہ بقرہ آیت ۱۴۲ ملاحظہ فرمائیں۔

دعوت اسلام کی آفاقیت: بعض مستشرقین جو ہمیشہ اسلام کے خلاف کسی کمزوری کی تلاش میں ہوتے ہیں، اس آیت سے اپنے مطلب کی بات ثابت کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں: مکہ والے اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کی تنبیہ وَلِتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی وَمَنۡ حَوۡلَهَا سے معلوم ہوتا ہے کہ محمدؐ شروع میں اپنی دعوت کو صرف مکہ اور اس کے اطراف کی بستیوں تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔اس کے بعد اپنی توقعات کے برخلاف اس دعوت کو جزیرہ عرب تک پھیلا دیا اور ایسے اتفاقات سامنے آئے جن کا پہلے اندازہ نہیں تھا، جن کی بنا پر اس دعوت کو مزید وسعت دے دی گئی۔ مثلاً مدینہ کی طرف ہجرت اور وہاں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد رسول نے اسلامی دعوت کا دائرہ پھیلا دیا۔

جب کہ اسلامی دعوت کی آفاقیت کی بات تو اس وقت بھی ہوتی رہی، جب یہ دعوت ابھی مکہ کی وادیوں کے اندر ہی تھی۔ شعب ابو طالب میں اس دعوت کو سخت ترین اور حوصلہ شکن حالات کا سامنا تھا۔ اس وقت مکہ میں نازل ہونے والے سورہ سبا میں فرمایا:

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا وَّ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ○ [1]

اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے فقط بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اس مکی سورہ میں چند آیات پہلے فرمایا:

اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِکۡرٰی لِلۡعٰلَمِیۡنَ [2]

یہ تو عالمین کے لیے فقط ایک نصیحت ہے۔

مکی سورہ الانبیاء میں فرمایا:

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ○ [3]

اور (اے رسول!) ہم نے آپ کو بس عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اس سے معلوم ہوا، مکہ کے اطراف سے مراد وہ تمام آبادیاں ہیں جہاں جہاں اس مرکز سے اٹھنے والی دعوت پہنچ جاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَکُمۡ بِهٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ ... [4]

اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی نازل کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور جس تک یہ پیغام پہنچے سب کو تنبیہ کروں۔

---

[1] ۳۴ سبا: ۲۸　[2] ۶ انعام: ۹۰　[3] ۲۱ انبیاء: ۱۰۷　[4] ۶ انعام: ۱۹

۳۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ: اس قرآن پر وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جو آخرت پر ایمان لاتے ہیں کیونکہ یہ قرآن سعادت اخروی کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ آخرت کی سعادت کی طرف قرآن کی اہم ترین ہدایت یہ ہے: عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۔ وہ اپنی نمازوں کی پابندی کریں۔

اہم نکات

۱۔ قرآن کی حقانیت پر اس کی برکتیں اور سابقہ کتب کی تصدیق دلیل ہے۔

۲۔ ایمان بالقرآن اور نماز کی پابندی، ابدی زندگی (آخرت) پر ایمان کا لازمہ ہے: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾

۹۳۔ اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے یا یہ دعویٰ کرے کہ مجھ پر وحی ہوئی ہے حالانکہ اس پر کوئی وحی نہیں ہوئی اور جو یہ کہے کہ جیسا اللہ نے نازل کیا ہے ویسا میں بھی نازل کر سکتا ہوں اور کاش آپ ظالموں کو سکرات موت کی حالت میں دیکھ لیتے جب فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے کہ رہے ہوں: نکالو اپنی جان آج تمہیں ذلت آمیز عذاب دیا جائے گا کیونکہ تم اللہ پر ناحق باتوں کی تہمت لگایا کرتے تھے اور اور اللہ کی نشانیوں کے مقابلے میں تکبر کیا کرتے تھے۔

تشریح کلمات

غَمَرٰتِ: (غ م ر) الغمر کسی چیز کے اثر کو زائل کرنے کے معنوں میں ہے۔ غفلت اور شدائد کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ آیت میں غمرات، سکرات اور شدائد کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں ظلم کی تین بدترین صورتوں کا بیان ہے:

i۔ اللہ کے ساتھ دوسری چیزوں کو شریک بنا کر اللہ پر بہتان باندھا جائے۔ یہ عمل مشرکین انجام دے رہے ہیں۔

ii۔ کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ مجھ پر وحی ہوئی ہے جب کہ اس پر کوئی وحی نہ ہوئی ہو، کی یہ بات حضورؐ کی طرف سے اس مفروضے کی بنا پر ہے کہ اگر مجھ پر وحی نہیں ہوئی اور پھر بھی میں وحی کا دعویٰ کرتا ہوں تو یہ بھی اتنا ہی بدترین ظلم ہوگا جتنا تمہارا شرک والا جرم۔

iii۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں بھی ایسا ہی نازل کر سکتا ہوں جیسا کہ اللہ نے نازل کیا ہے، یہ خود اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمسخر ہے جو بعض مشرکین کی طرف سے واقع ہوا ہے۔

یہ تمسخر کس نے کیا تھا؟

شیعہ سنی حدیث اور سیرت کی کتابوں میں آیا ہے کہ یہ تمسخر کرنے والا، عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح ہے جو حضرت عثمان کا رضاعی بھائی اور کاتب وحی تھا، پھر مرتد ہو گیا۔ فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ کی طرف سے واجب القتل ہونے کی خبر سن کر روپوش ہو گیا۔ بعد میں حضرت عثمان کی سفارش پر یہ بھی آزاد کردہ طلقاء میں شامل ہو گیا۔

مگر یہ واقعہ تو مدینہ میں پیش آیا ہے، جب کہ یہ سورہ مکی ہے۔ اس کے جواب میں بعض کہتے ہیں: یہ چند آیات مدنی ہیں، جو اس مکی سورے میں شامل کی گئی ہیں۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب۔

۱۔ وَلَوۡ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ فِیۡ غَمَرٰتِ الۡمَوۡتِ : کاش آپ ظالموں کو سکرات الموت کی حالت میں دیکھ لیتے کہ فرشتے ان سے کہہ رہے ہوں، اَلۡیَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡہُوۡنِ ...آج تمہیں ذلت آمیز عذاب دیا جائے گا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کافروں کے لیے عذاب، موت سے شروع ہو جاتا ہے۔ مِنۡ وَّرَآئِہِمۡ بَرۡزَخٌ [1] اس کے بعد برزخ کا عذاب ہے۔

۲۔ فِیۡ غَمَرٰتِ الۡمَوۡتِ : جب کافر موت کے عذاب میں ڈوبا ہوا ہو گا۔ چونکہ الغمر کسی چیز میں ڈوبنے کو کہتے ہیں۔

۳۔ وَالۡمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوۡۤا اَیۡدِیۡہِمۡ : فرشتوں کا ہاتھ پھیلانا، جان کنی کے عذاب کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ اس کے بعد فرشتوں کی طرف سے یہ حکم ملتا ہے: اَخۡرِجُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ، نکالو اپنی جان۔ دوسرے لفظوں میں مرنے کا تکوینی حکم ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ ہر وہ بات جو اللہ اور رسولؐ نے نہ کہی ہو، اس کا اللہ و رسولؐ کی طرف نسبت دینا بہتان ہے۔

۲۔ کوئی منصب اللہ کی طرف سے نہ ہو مگر دعویٰ یہ کرے کہ اللہ نے یہ منصب مجھے دیا ہے، عظیم ظلم ہے۔

---

[1] ۲۳ مومنون: ۱۰۰

وَ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقۡنٰکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّ تَرَکۡتُمۡ مَّا خَوَّلۡنٰکُمۡ وَرَآءَ ظُہُوۡرِکُمۡ ۚ وَ مَا نَرٰی مَعَکُمۡ شُفَعَآءَکُمُ الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ اَنَّہُمۡ فِیۡکُمۡ شُرَکٰٓؤُا ؕ لَقَدۡ تَّقَطَّعَ بَیۡنَکُمۡ وَ ضَلَّ عَنۡکُمۡ مَّا کُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ ﴿۹۴﴾

۹۴۔اور لو آج تم ہمارے پاس اسی طرح تنہا آ گئے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تمہیں عطا کیا تھا وہ سب اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے وہ سفارشی نہیں دیکھ رہے ہیں جن کے بارے میں تمہارا یہ خیال تھا کہ وہ تمہارے کام بنانے میں تمہارے شریک ہوں گے، آج تمہارے باہمی تعلقات منقطع ہو گئے اور تم جو دعوے کیا کرتے تھے وہ سب ناپید ہو گئے۔

تشریح کلمات

خَوَّلۡ: (خ و ل) التخویل۔ اس کے اصل معنی حشم و خدم عطا کرنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ جِئۡتُمُوۡنَا فُرَادٰی: اس آیت میں دنیاوی زندگی کی ایک نہایت ہی فکر انگیز تصویر کشی کی گئی ہے کہ یہ انسان اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو عریاں، محروم، بے بس، ناتواں اور خالی ہاتھ قدم رکھتا ہے اور جب اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو بھی محروم، بے بس، ناتواں اور خالی ہاتھ اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ درمیان میں کچھ دیر کے لیے مال و دولت، جاہ و سلطنت، خواہشات و لذت کے سراب میں مگن رہتا ہے اور یہ خیال ذہن میں آتا ہی نہیں کہ آخر میں یہاں کس لیے آیا تھا، کس لیے یہاں موجود ہوں اور کہاں جانا ہے۔ اس زندگی کی چھوٹی اور حقیر چیز بھی اس کے لیے قابل توجہ ہو گی، مگر اصل مقصد حیات سے غافل۔ حدیث میں آیا:

الناس نیام فاذا ماتوا انتبھوا۔[1] لوگ خواب غفلت میں ہوتے ہیں۔ جب مر جاتے ہیں تو بیدار ہو جاتے ہیں۔

۲۔ وَّ تَرَکۡتُمۡ مَّا خَوَّلۡنٰکُمۡ: جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں مال و دولت، اولاد، حشم دیا تھا، وہ ساتھ نہیں ہے۔

۳۔ وَ مَا نَرٰی مَعَکُمۡ شُفَعَآءَکُمۡ: جن معبودوں کو تم نے اپنے لیے شفیع بنایا تھا۔ اَنَّہُمۡ فِیۡکُمۡ شُرَکٰٓؤُا یعنی فی ربوبیتکم شرکاء اللّٰہ۔ جن کو تم نے رب ہونے میں اللہ کے ساتھ شریک بنایا تا کہ وہ تمہاری سفارش کریں، وہ آج نظر نہیں آتے۔

---

[1] بحار الانوار ۴: ۴۳۔ تفسیر ثعلبی ۴: ۱۹۸، التسہیل لعلوم التنزیل لابن جزی ۳: ۷۷ اور دیگر کتب تفاسیر میں اس حدیث کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دی گئی ہے جب کہ روح المعانی ۲۷: ۱۶۲، الواقعۃ: ۹۶ میں اس حدیث کی نسبت امام علی علیہ السلام کی طرف دی گئی ہے۔ حلیۃ الاولیاء ۷: ۵۲ میں ابو نعیم اصفہانی نے اسے سفیان ثوری کی طرف منسوب کیا ہے۔ ظاہراً ایسا لگتا ہے کہ سفیان ثوری نے امام علی علیہ السلام سے اسے حاصل کیا ہے کیونکہ سفیان ثوری کا شمار زہاد و متصوفہ میں ہوتا ہے جو اپنے طرق کو امام علی علیہ السلام تک پہنچاتے ہیں۔

۴۔ لَقَدۡ تَّقَطَّعَ: تمام وسائل منقطع ہو جاتے ہیں اور جن جن کو شفیع اور وسیلہ سمجھتے تھے، وہ بھی ایک خیال و وہم سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہوتے۔ دنیا میں جو زعم اور خود ساختہ نظریات قائم کر رکھے تھے، وہ یہاں بے بنیاد ثابت ہوئے۔

یہ آیت اگرچہ مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مگر اس کی تعبیر عام ہے کہ دنیاوی زندگی اگر آخرت کی ابدی زندگی کے لیے مزرعہ نہ بنائی جائے تو سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔

اہم نکات

۱۔ دنیا برائے دنیا سراب ہے، جب کہ دنیا برائے آخرت نجات ہے۔

۲۔ آغاز و انجام، زندگی میں مقصد زندگی کا ایک اہم درس ہے: وَ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا...۔

اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الۡحَبِّ وَ النَّوٰی ؕ یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَ مُخۡرِجُ الۡمَیِّتِ مِنَ الۡحَیِّ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ﴿۹۵﴾

۹۵۔ بے شک اللہ دانے اور گٹھلی کا شگافتہ کرنے والا ہے، وہی مردے سے زندہ کو اور زندہ سے مردے کو نکالنے والا ہے، یہ ہے اللہ، پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو۔

تشریح کلمات

فَالِقُ: (ف ل ق) الفلق کے معنی کسی چیز کو پھاڑنے اور اس کے ایک ٹکڑے کو دوسرے سے الگ کرنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الۡحَبِّ وَ النَّوٰی: شگاف، اللہ تعالیٰ کا طریقہ تخلیق ہے۔ اللہ تخم اور دانے کو چیرتا ہے۔ دانے سے تنا، اس سے شاخ، اس سے پتے، اس سے پھول، پھر اس سے میوے کو چیر کر نکالتا ہے۔ دانے کو چیر کر سبزہ اور گٹھلی کو چیر کر درخت بناتا ہے۔

۲۔ یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ: مردہ سے زندہ کو نکالنا صرف اسی کا کام ہے۔ اس کے علاوہ تمام کوششیں آج تک بارآور ثابت نہیں ہوئیں کہ زندگی اور حیات کی کوئی فزیکل توجیہ کی جائے۔ آخر جب ہماری معلومات کے مطابق زندگی کا وجود زندگی سے ہی ہو سکتا ہے تو زندگی کی ابتدا کیسے اور کس چیز سے ہوئی؟ اللہ ہی ہے جو مردہ مادے کی گود میں زندگی کی پرورش کرتا ہے اور مردہ مواد سے زندہ خلیہ بناتا ہے اور اس زندہ

خلیے کو مردہ مادے کی آغوش میں پالتا ہے اور مقررہ مدت تک زندہ رکھنے کے بعد اس خلیے کو ملک عدم و عالم اموات کی طرف روانہ کر دیتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بقرہ آیت ۲۸

۳۔ وَمُخۡرِجُ الۡمَیِّتِ مِنَ الۡحَیِّ: بہت سے مردہ مواد ایسے ہیں جو زندہ نامی اجسام کی پیداوار ہیں۔ ان زندہ نامی مواد کی طبیعی تحلیل سے حاصل شدہ غذا سے ہی تو زندگی برقرار رہتی ہے۔ جیسا کہ اسی زندگی کی برقراری سے یہ طبیعی مواد (غذا) حاصل ہوتے ہیں۔ اس موت و حیات کے دورانیہ پر اس نظام کو قائم رکھنے والا اللہ ہی ہے۔

۴۔ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ: یہ ہے اللہ، پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو۔ حقیقی رب وہ ہے جو دانے کو چیر کر تمہارے لیے غذا فراہم کرتا ہے۔ مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ چیزوں کو پیدا کر کے اس موت و حیات کے دورانیہ میں تم کو پالتا ہے۔ اس رب کو چھوڑ کر ایک واہمہ سے اپنی امیدیں وابستہ کرتے ہو؟

اہم نکات

۱۔ نظام حیات کی بقا اور اس کی آب و تاب، دانوں کی شگافتگی میں ہے۔

۲۔ نظام کائنات زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ، سے عبارت ہے۔

۳۔ کائنات کا نظام وہی ذات چلا رہی ہے جس کے ہاتھ میں موت و حیات ہے۔

۴۔ رب وہی ہے جس کے قبضہ قدرت میں موت و حیات کا نظام ہو۔

فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّیۡلَ سَکَنًا وَّالشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ حُسۡبَانًا ؕ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۹۶﴾

۹۶۔ وہ صبح کا شگافتہ کرنے والا ہے اور اس نے رات کو (باعث) سکون اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا ہے، یہ سب غالب آنے والے دانا کی بنائی ہوئی تقدیر ہے۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ النُّجُوۡمَ لِتَہۡتَدُوۡا بِہَا فِیۡ ظُلُمٰتِ الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۷﴾

۹۷۔ اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم ان کے ذریعے خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرو، اہل علم کے لیے ہم نے اپنی آیات کھول کر بیان کی ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ تدبیر کائنات اور ربوبیت کے باہمی ربط کے سلسلے میں یہ استدلال جاری ہے۔ رات کی تاریکی

کو شگافتہ کر کے صبح کی روشنی نکالنا بالکل اسی طرح ہے جس طرح زمین کی تہوں میں دانے کو پھاڑ کر درخت نکالنا ہے اور مردہ سے زندہ نکالنا ہے۔ چونکہ صبح، نور اور حیات ہے، جنبش ہے۔ صبح سے پھوٹنے والی روشنی اور سورج کی شعاع کو دانے کی شگفتگی اور حیات و زندگی میں بنیادی دخل ہے۔ یعنی نبات و حیات کا مدار صباح مساء یعنی صبح و شام پر ہے۔

۲۔ اس نے رات کو سکون کے لیے بنایا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

وَّجَعَلۡنَا الَّيۡلَ لِبَاسًا ۙ وَّجَعَلۡنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝[۱]

اور رات کو ہم نے پردہ قرار دیا اور دن کو ہم نے معاش (کا ذریعہ) بنایا۔

دن کی حرکت اور جنبش سے اعصاب بدن تھکے ہوئے ہوتے ہیں اور فکری و ذہنی پریشانیوں سے دماغ تھکا ہوا ہوتا ہے۔ رات کے پرسکون ماحول میں انسان اور بہت سے جاندار آرام کے لیے اپنی طاقت دوسرے دن کے لیے چارج کرتے ہیں۔ یہ اللہ کی عظیم رحمت ہے۔ اس سلسلے میں قرآن فرماتا ہے:

وَمِنۡ رَّحۡمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ لِتَسۡكُنُوۡا فِيۡهِ وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۝[۲]

اور یہ اللہ کی رحمت ہی تو ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن کو (یکے بعد دیگرے) بنایا تاکہ تم (رات میں) سکون حاصل کر سکو اور (دن میں) اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرو اور شاید کہ تم شکر بجا لاؤ۔

۳۔ وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ حُسۡبَانًا: سورج اور چاند کو حساب کے لیے بنایا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

هُوَ الَّذِيۡ جَعَلَ الشَّمۡسَ ضِيَآءً وَّالۡقَمَرَ نُوۡرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِيۡنَ وَالۡحِسَابَ ....[۳]

وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن کیا اور چاند کو چمک دی اور اس کی منزلیں بنائیں تاکہ تم برسوں کی تعداد اور حساب معلوم کر سکو....

انسان کی زندگی میں اوقات و زمان کو بڑا دخل ہے۔ اس الٰہی تقویم سے انسان اپنی زندگی کے امور منظم کر لیتا ہے۔ سورج اور چاند پر مشتمل اللہ کی یہ تقویم اس قدر دقیق اور منظم ہے کہ اربوں سال میں بھی ایک سیکنڈ کا فرق نہیں ہوتا۔

۴۔ آخر میں فرمایا: یہ عزیز و علیم کی تقدیر سازی ہے: ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ ۔ اس تعبیر سے تقدیر الٰہی کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نظام معین فرمایا ہے اور اس نظام میں ہر چھوٹی بڑی چیز کا طریقہ عمل مقرر ہے۔ اس کائنات پر ایک نہایت محکم اور مضبوط قانون حاکم ہے۔ اسی وضع کردہ قانون کو سنت الٰہی بھی کہتے ہیں۔ یہی تقدیر ہے۔ انسان کسی پیش بند تقدیر کا پابند اور مجبور نہیں ہے بلکہ وہ اس تکوینی قانون اور سنت الٰہی کے دائرے میں اپنی تقدیر کا خود فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل کسی مناسب موقع پر بیان کریں گے۔ انشاء اللہ۔

۱۔ ۷۸ نباء: ۱۰۔ ۱۱ ۲۔ ۲۸ قصص: ۷۳ ۳۔ ۱۰ یونس: ۵

۵۔ جَعَلَ لَکُمُ النُّجُوۡمَ: ستاروں کا اگرچہ اپنی جگہ ایک مستقل نظام ہے، اس کے ساتھ اہل ارض کے لیے یہ رہنما کا کام بھی دیتے ہیں۔ یہاں خطاب اہل ارض سے ہے، اس لیے ستاروں کی اس افادیت کا ذکر ہوا۔ سمندروں اور بیابانوں میں ستاروں کی گردش سے زمانہ قدیم سے کلدانیوں اور مصریوں نے بھی مشرق و مغرب، شمال و جنوب کا تعین کر لیا تھا، جس سے وہ اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے رہنمائی لیتے تھے۔ حدیث میں ہے:

تعلموا من النجوم ما تهتدون به في ظلمات البر و البحر ثم انتهوا۔[1]

علم نجوم صرف اس قدر سیکھو جس سے سمندروں اور بیابانوں کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کی جا سکے۔ پھر رک جاؤ۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے دن اور رات کے بارے میں فرمایا:

لو كان واحد منهما سرمداً على العباد لما قامت لهم معايش۔[2]

اگر دن اور رات میں سے کسی ایک کو ہمیشہ رکھا جاتا تو زندگی ناممکن ہو جاتی۔

اہم نکات

۱۔ رات کے سکون و سکوت کو صبح نور، صبح قیام، صبح نشاط کے ساتھ شگافتہ کرنے سے انسان کی زندگی فعال اور پرنم ہو جاتی ہے۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ فَمُسۡتَقَرٌّ وَّ مُسۡتَوۡدَعٌ ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّفۡقَہُوۡنَ﴿۹۸﴾

۹۸۔ اور وہی ہے جس نے تم سب کو ایک ہی ذات سے پیدا کیا، پھر ایک جائے استقرار ہے اور جائے ودیعت، ہم نے صاحبان فہم کے لیے آیات کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ آیات آفاق کے ذکر کے بعد آیات انفس کا ذکر ہے کہ تمام انسانوں کو ایک ہی ذات، ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے۔ اس نفس واحد سے مراد حضرت آدمؑ کی ذات بھی ہو سکتی ہے، جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے اور وہ اکائی بھی ہو سکتی ہے جس سے خود حضرت آدم و حوا کی خلقت ہوئی ہے۔ یعنی وہ ابتدائی خلیہ (Cell) جس سے حیات کی ابتدا ہوئی۔

---

[1] الدر المنثور ۳: ۳۲۸۔ بحار الانوار ۵۵: ۲۷۵۔ بحار میں یہ روایت اہل سنت کے طریق سے ابن عمر سے نقل کی گئی ہے۔ اہل سنت کتب احادیث میں اس قول کی نسبت عمر بن خطاب کی طرف دی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: الدر المنثور ۳: ۳۲۸۔ جامع الاحادیث ۲۷: ۹۔ جب کہ آلوسی نے روح المعانی میں ابن عمر کے طرق سے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نقل کیا ہے ۷: ۲۳۴

[2] بحار الانوار ۳: ۱۹۱

۲۔ فَمُسۡتَقَرٌّ وَّ مُسۡتَوۡدَعٌ: نفس واحد سے پیدا ہونے والے انسان کے لیے ایک مستقر ہے، جائے استقرار اور ایک مستودع ودیعت اور امانت۔ یعنی ایک موقت زندگی ہے اور ایک ہمیشہ کی زندگی ہے۔ ممکن ہے مستقر سے مراد آخرت کی حیات ابدی ہو اور مستودع سے مراد دنیا کی وقتی زندگی ہو، جو ایک ودیعت اور امانت ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ نفس واحدہ سے پیدا ہونے کے بعد کے دو مرحلوں کا ذکر ہے: تم میں سے کچھ لوگ مستقر یعنی پیدائش کے بعد زمین میں مستقر ہو چکے ہیں اور کچھ لوگ ہنوز مُسۡتَوۡدَعٌ جائے ودیعت، گزرگاہ صلب پدر یا رحم مادر میں ہیں۔

مستقر سے مراد رحم مادر اور مُسۡتَوۡدَعٌ سے مراد صلب پدر بھی منقول ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

المستقر الایمان الثابت و المستودی المستعار۔[1]		مستقر ثابت ایمان کو اور مستودع وقتی ایمان کو کہتے ہیں۔

میرے نزدیک مستقر سے مراد حیات ابدی اور مستودع سے مراد دنیوی زندگی ہے۔ دیگر موارد پر بھی اس کی تطبیق ہو جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی آیات سے معرفت حاصل کرنا ان لوگوں کے لیے ممکن ہے جو حق کی تلاش میں ہیں اور حق کو سمجھنا چاہتے ہیں: لِقَوۡمٍ یَّفۡقَہُوۡنَ۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖ نَبَاتَ کُلِّ شَیۡءٍ فَاَخۡرَجۡنَا مِنۡہُ خَضِرًا نُّخۡرِجُ مِنۡہُ حَبًّا مُّتَرَاکِبًا ۚ وَ مِنَ النَّخۡلِ مِنۡ طَلۡعِہَا قِنۡوَانٌ دَانِیَۃٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّ الزَّیۡتُوۡنَ وَ الرُّمَّانَ مُشۡتَبِہًا وَّ غَیۡرَ مُتَشَابِہٍ ؕ اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰی ثَمَرِہٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَ	۹۹۔ اور وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا جس سے ہم نے ہر طرح کی روئیدگی نکالی پھر اس سے ہم نے سبزہ نکالا جس سے ہم تہ بہ تہ گھتے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے شگوفوں سے آویزاں گچھے اور انگور، زیتون اور انار کے باغات (جن کے پھل) ایک دوسرے سے مشابہ اور (ذائقے) جدا جدا ہیں، ذرا اس کے پھل کو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو

۱۔ تفسیر العیاشی ۱: ۳۷۲ سورۃ الانعام

یَنۡعِہٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکُمۡ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۹۹﴾	دیکھو، اہل ایمان کے لیے یقیناً ان میں نشانیاں ہیں۔

تشریح کلمات

طلع: (ط ل ع) طلع النخل کے معنی خرما کے درخت کے غلاف کے ہیں جس کے اندر اس کا خوشہ ہوتا ہے۔

قِنۡوَانٌ: (ق ن و) کھجور یا انگور کے خوشے۔

یَنۡعِہٖ: (ی ن ع) ینعت الثمرۃ کے معنی پھل کے پک کر تیار ہو جانے کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖ نَبَاتَ کُلِّ شَیۡءٍ: ہم نے پانی سے ہر شیٔ کی نمو اور روئیدگی نکالی۔ یعنی ہم نے پانی سے ہر نامی کے نمو کو ظاہر کیا (نبات کل شیٔ نام)۔ اس میں نباتات، حیوانات اور انسان سب شامل ہیں لیکن بعد کی تشریح میں نباتات کا ذکر ہے۔ اس لیے نَبَاتَ کُلِّ شَیۡءٍ سے مراد صرف نباتات ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے مراد یہ ہو کہ نَبَاتَ کُلِّ شَیۡءٍ، ہر شے کی ضرورت کے مطابق نبات اگائی۔ چنانچہ تمام جانوروں کے لیے گوارا اور قابل ہضم غذا بہم پہنچائی جاتی ہے، خواہ وہ زمین کی تہوں میں ہوں یا سمندر کی گہرائیوں میں اور ممکن ہے نَبَاتَ کُلِّ شَیۡءٍ سے مراد ہر طرح اور ہر قسم کی نبات ہو۔ چونکہ نبات کی قسم خواہ کچھ بھی ہو، اس کی نشو و نما پانی سے ہوتی ہے۔ چنانچہ بجلی کی چمک کے ساتھ فضا سے نائیٹروجن زمین پر بارش کے پانی کے ذریعے گرتی ہے اور قدرتی کھاد کی صورت میں زمین کو سرسبز بناتی ہے۔

۲۔ فَاَخۡرَجۡنَا مِنۡہُ خَضِرًا: پھر ہم نے اس نبات سے سرسبز کھیتی نکالی۔ نبات میں نمو کی طاقت ودیعت کی اور یہ طاقت پانی سے بروئے کار آتی ہے اور شادابی آ جاتی ہے۔

۳۔ نُّخۡرِجُ مِنۡہُ حَبًّا مُّتَرَاکِبًا: تیسرے مرحلے میں اس نبات سے تہ بہ تہ گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں.

۴۔ مُشۡتَبِہًا وَّ غَیۡرَ مُتَشَابِہٍ: ایک دوسرے کے مشابہ اور جدا جدا ہیں۔ مثلاً انار اور زیتون کے درخت ظاہری شکل و ساخت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں لیکن پھل کی نوعیت میں بڑا فرق ہے۔

۵۔ اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰی ثَمَرِہٖۤ: اس فکر و نظر میں اللہ کی خلاقیت اور تدبیر اور رزق کی فراہمی کے لیے قدرت کا کرشمہ دیکھو اور پھر اس بات کو سمجھو، تمہارا رَبْ اور تمہارا معبود وہی ہے جو درخت کی لکڑی کے اندر سے تمہارے لیے پھل تیار کرتا ہے۔

۶۔ وَ یَنۡعِہٖ: اور اس کے پکنے کو دیکھو۔ پکنے کا مطلب یہ ہے کہ پھل کو تمہارے کھانے کے لیے تیار کر رہا ہے۔ اگر نہ پکتا تو نہ تو تم کھا سکتے تھے، نہ تمہارے لیے گوارا ہوتا۔

واضح رہے کہ یہ دعوت فکر ان مشرکین کے لیے ہے جو غیر اللہ کو رازق سمجھتے ہیں، جس پر اگلی آیت شاہد ہے۔

اہم نکات

۱۔ پھل پکنے اور تیار ہونے کے بارے میں یہ نہیں فرمایا: کھاؤ بلکہ فرمایا: دیکھو۔ کیونکہ ان پھلوں کے کھانے سے ان کے خالق کی معرفت بہت زیادہ اہم ہے۔ اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰی ثَمَرِہٖۤ ...۔

۲۔ غیر مؤمن اللہ کی نعمتوں سے صرف خواہشات پوری کرتا ہے، جب کہ مؤمن ان سے اپنا ایمان پختہ کرتا ہے: اِنَّ فِیۡ ذٰلِکُمۡ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ۔

وَ جَعَلُوۡا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ الۡجِنَّ وَ خَلَقَہُمۡ وَ خَرَقُوۡا لَہٗ بَنِیۡنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

۱۰۰۔ اور ان لوگوں نے جنات کو اللہ کا شریک بنایا حالانکہ اس نے انہیں پیدا کیا ہے اور نادانی سے اللہ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ ڈالیں، جو باتیں یہ لوگ کہتے ہیں اللہ ان سے پاک اور بالاتر ہے۔

بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّ لَمۡ تَکُنۡ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ ؕ وَ خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ ۚ وَ ہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۱۰۱﴾

۱۰۱۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اس کا بیٹا کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ اس کی کوئی شریک زندگی نہیں ہے اور ہر چیز کو اس نے پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا خوب علم رکھتا ہے۔

تشریح کلمات

خرق: (خ ر ق) بے سوچے سمجھے بات کرنا۔

بَدِیۡعُ: (ب د ع) الابداع، کسی کی تقلید اور اقتدا کے بغیر کسی چیز کو ایجاد کرنا۔ جب لفظ اِبداع اللہ عز و جل کے لیے استعمال ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے، بغیر آلہ، بغیر مادہ اور بغیر زمان و مکان کے کسی شے کو ایجاد کرنا اور یہ معنی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے۔(راغب)

تفسیر آیات

جنات کی پرستش قدیم بت پرست اقوام میں مشہور تھی۔ خود عربوں میں سے قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنی ملیح بھی جنات کی پرستش کرتے تھے۔ روم اور یونان کے خرافاتی خداؤں میں کئی ایک کے نام ملتے ہیں

جو جنات سے منسوب ہیں اور جنات کی کئی ایک شکلیں اور سونے کے بت بنائے تھے۔ اس آیت میں فرمایا کہ ان لوگوں نے اللہ کے لیے جنات کو شریک بنایا، حالانکہ ان جنات کا خالق خدا ہے۔ یہ جن اللہ کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں۔ دوسری تفسیر یہ ہو سکتی ہے کہ وَخَلَقَهُمْ کی ضمیر مشرکین کی طرف جائے اور معنی یہ بن سکتے ہیں کہ یہ لوگ جنات کو اللہ کا شریک بناتے ہیں حالانکہ خود ان کا خالق اللہ ہے۔ لہٰذا انہیں اپنے خالق ہی کی پرستش کرنی چاہیے۔

وَخَرَقُوۡا لَهٗ بَنِيۡنَ وَبَنٰتٍۭ: اللہ کے لیے اولاد کا تصور گھڑنے والوں میں تو اہل کتاب بھی شامل ہیں جو عزیر اور مسیح علیہما السلام کو ابن اللہ کہتے ہیں۔ بعض مشرکین فرشتوں کو بنات اللہ یعنی اللہ کی بیٹیاں کہتے ہیں اور کچھ اقوام ایسی بھی ہیں جو اپنے آپ کو فرزندان خدا سمجھتی ہیں۔

بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ: اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس میں کسی اور چیز کی شرکت کا امکان بھی نہیں ہے اور یہ کہ اللہ کے لیے بیٹے بیٹیاں نہیں ہیں کیونکہ اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ اولاد تو دو جفتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اللہ کا کوئی جفت نہیں ہے۔ وہ تو ہر چیز کا خالق ہے۔ شان الٰہی کے لیے خالق ہونے میں عظمت ہے، جب کہ صاحب اولاد ہونا غیر ممکن ہونے کے علاوہ شان خداوندی کے منافی بھی ہے۔

اہم نکات

۱۔ راہ راست سے پھسلنے کے بعد انسان ایسے گہرے کھڈ میں جا گرتا ہے کہ جنات، پتھروں اور جانوروں تک کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے۔

۲۔ یہ بت پرستوں سے مخصوص نہیں، مادہ پرستوں کا بھی یہی حال ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَىۡءٍ فَاعۡبُدُوۡهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ وَّكِيۡلٌ ﴿۱۰۲﴾	۱۰۲۔ یہی اللہ تمہارا پروردگار ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا اس کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز پر نگران ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ: خطاب، مشرکین یا تمام مکلف لوگوں سے ہے کہ پرستش کے لائق وہ ہے جو ہر چیز کا خالق ہے۔ خلقت جس کے ہاتھ میں ہو گی، کائنات کے سارے اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہوں گے اور سارے کمالات کا بھی وہی مالک ہو گا، جس نے ان سب چیزوں کو عدم سے خلق کیا ہے۔

۲۔ فَاعۡبُدُوۡهُ: جب وہ ہر چیز کا خالق ہے، پس تم اس کی عبادت کرو۔ اس آیت سے عبادت کی

تعریف نکل آئی کہ عبادت اس کی ہوتی ہے جو خالق ہے۔ لہٰذا عبادت وہ تعظیم ہے جو کسی کو خالق سمجھ کر بجا لائی جاتی ہے۔ دیگر تعظیمیں جو خالق یا رب سمجھ کر بجا نہیں لائی جاتیں وہ عبادت نہیں ہیں۔

۳۔ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ﴿۱۰۲﴾: اس جملے میں اللہ کے رب ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ اب عبادت کی تعریف مکمل ہو گئی کہ عبادت خالق اور رب کی ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ خلاق ہی کمالیت کا مالک ہے اور کامل مطلق کے سامنے جھکنا خود ایک کمال ہے۔ یعنی کمالیت کی قدروں کا جاننا خود اپنی جگہ کمال اور اللہ کی عبادت اس کے کمال کا اعتراف ہے۔

لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ ۫ وَ هُوَ يُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيۡفُ الۡخَبِيۡرُ ﴿۱۰۳﴾

۱۰۳۔ نگاہیں اسے پا نہیں سکتیں جب کہ وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے اور وہ نہایت باریک بین، بڑا باخبر ہے۔

تشریح کلمات

ادرک: (د ر ك) کسی چیز کی غایت کو پہنچنا، پا لینا۔ جیسے ادرك الصبی لڑکا بچپن کی آخری حد کو پہنچ گیا۔ یعنی بالغ ہو گیا۔

اللَّطِيۡفُ: (ل ط ف) لطائف سے وہ باتیں مراد لی جاتی ہیں جن کا ادراک انسانی حواس نہ کر سکتے ہوں۔

الۡاَبۡصَارَ: (ب ص ر) مفرد بصر کے معنی آنکھ کے ہیں۔

تفسیر آیات

حواس ظاہری و باطنی میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا ادراک ہوتا ہے۔ مثلاً عقل کا ادراک اور ہے اور نظر کا ادراک اور ہے۔ اس آیت میں فرمایا کہ نگاہیں اللہ کا ادراک نہیں کر سکتیں تو معنی یہ ہوئے کہ اللہ کا وجود ایسا نہیں ہے جو نگاہوں کے حس و ادراک کے دائرے میں آ جائے بلکہ ایسا خیال کرنا شان خداوندی کے خلاف ایسی گستاخی ہے، جو فوری سزا کی مستحق ہے۔ چنانچہ فرمایا:

يَسۡـَٔلُكَ اَهۡلُ الۡكِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَيۡهِمۡ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰۤى اَكۡبَرَ

اہل کتاب آپ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے ایک کتاب اتار لائیں جب کہ یہ لوگ

مِنۡ ذٰلِکَ فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰہَ جَہۡرَۃً فَاَخَذَتۡہُمُ الصّٰعِقَۃُ بِظُلۡمِہِمۡ ....[1]	اس سے بڑا مطالبہ موسیٰ سے کر چکے ہیں، چنانچہ انہوں نے کہا: ہمیں علانیہ طور پر اللہ دکھا دو، ان کی اسی زیادتی کی وجہ سے انہیں بجلی نے آ لیا۔

اللہ کے قابل رویئت ہونے اور نگاہوں کی محدودیت میں آنے کے غیر ممکن ہونے پر اسی آیت میں ایک لطیف اشارہ موجود ہے اور وہ ہے: وَ ھُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ۔ لطیف اس وجود کو کہتے ہیں جس کا ادراک انسانی حواس نہ کر سکتے ہوں۔

راغب اصفہانی اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> اکثر علماء نے ابصار کے معنی آنکھ کے کیے ہیں۔ بعض نے کہا: یہ ظاہری آنکھ کے علاوہ اوہام و افہام کی نفی کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ امیر المؤمنین کا قول ہے: التوحید ان لا تتوھمہ۔ حقیقتاً توحید تو یہ ہے جو انسان کے واہمہ میں بھی نہ آ سکے اور فرمایا: جو کچھ انسانی واہمہ ادراک کرتا ہے وہ توحید نہیں ہے۔

واضح ہے کہ اللہ کی ذات غیر محدود اور لامتناہی ہے اور نظر میں آنے کا مطلب محدودیت میں آنا ہے اور محدود خدا نہیں ہو سکتا کیونکہ محدود ہونے کی صورت میں خدا متعدد ہو سکتے ہیں، مکان کا محتاج ہوتا ہے، رنگ و کیفیت کا محتاج ہوتا ہے وغیرہ، جو شان الٰہی کے خلاف ہے۔

روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اسماعیل بن فضل نے پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر آئے گا؟ تو آپؑ نے فرمایا:

سبحان اللّٰہ تعالیٰ عن ذلك علوا كبيراً يا ابن الفضل ان الابصار لا تدرك الا ما له لون و كيفية و اللّٰه خالق الألوان و الكيفية۔[2]	اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک، بلند و بالا ہے۔ اے ابن فضل آنکھیں صرف ان چیزوں کو دیکھ سکتی ہیں جو رنگ اور کیفیت پر مشتمل ہوں۔ اللہ تعالیٰ تو رنگوں اور کیفیت کا خالق ہے۔

اللہ تعالیٰ رنگوں اور کیفیت کا خالق ہے۔ یہ چیزیں خود اللہ تعالیٰ کے اندر نہیں پائی جا سکتیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں ثابت کرنے والوں سے یہی فرمایا کہ اللہ ان سب کا خالق ہے۔
اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّ لَمۡ تَکُنۡ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ ؕ وَ خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ ...۔ پس جن چیزوں کو اللہ نے خلق کیا ہے، وہ اللہ میں نہیں پائی جا سکتیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: مَا وَحَّدَہُ مَنْ کَیَّفَہُ...۔[3] جو اللہ کو کسی کیفیت میں لائے، اس

---

[1] ۴ نساء: ۱۵۳ [2] بحار الانوار ۴: ۳۱۔ الامالی للصدوق ص ۴۱۰ مجلس ۶۴ [3] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۸۶

نے توحید کا اقرار نہیں کیا۔ جن چیزوں کو اللہ نے پیدا کیا ہے، ان چیزوں کا خود اللہ میں پایا جانا ناممکن ہونے کے سلسلے میں اسی خطبے میں آگے فرماتے ہیں:

وَ كَيْفَ يَجْرِیْ عَلَيْهِ مَا هُوَ أَجْرَاهُ وَ يَعُودُ فِيهِ مَا هُوَ أَبْدَاهُ وَ يَحْدُثُ فِيهِ مَا هُوَ اَحْدَثَهُ اِذاً لَتَفَاوَتَتْ ذَاتُهُ وَ لَتَجَزَّأَ كُنْهُهُ وَ لَامْتَنَعَ مِنَ الْاَزَلِ مَعْنَاهُ وَ لَكَانَ لَهُ وَرَاءٌ اِذْ وُجِدَ لَهُ اَمَامٌ...۔[1]

بھلا جو چیز اس نے مخلوقات پر طاری کی ہو، وہ اس پر کیونکر طاری ہو سکتی ہے اور جو چیز پہلے پہل اسی نے پیدا کی ہے، وہ اس کی طرف عائد کیونکر ہو سکتی ہے اور جس چیز کو اس نے پیدا کیا ہو، وہ اس میں کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو اس کی ذات تغیر پذیر قرار پائے گی اور اس کی ہستی قابل تجزیہ ٹھہرے گی اور اس کی حقیقت ہیشگی و دوام سے علیحدہ ہو جائے گی۔ اگر اس کے لیے سامنے کی جہت ہوتی تو پیچھے کی سمت بھی ہوتی...۔

اہم نکات

۱۔ اللہ نگاہوں کے رنگ و کیفیت میں نہیں، عقل و ضمیر میں نظر آتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی لطافت مادی آنکھوں کے مشاہدہ سے بالاتر ہے۔

قَدۡ جَآءَکُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ۚ فَمَنۡ اَبۡصَرَ فَلِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ عَمِیَ فَعَلَیۡہَا ؕ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ ﴿۱۰۴﴾

۱۰۴۔ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بصیرت افروز دلائل آ گئے ہیں، اب جس نے آنکھ کھول کر دیکھا اس نے اپنا بھلا کیا اور جو اندھا بن گیا اس نے اپنا نقصان کیا اور میں تمہارا نگہبان نہیں ہوں۔

تفسیر آیات

قرآن کو انسانی ضمیروں سے کام ہے، گردنوں سے نہیں۔ اسی لیے قرآن منطق و دلیل سے کام لیتا ہے، نہ کہ طاقت سے۔ اسی لیے قرآن توحید پر کئی ایک دلائل دینے کے بعد فرماتا ہے: جس نے ان دلائل پر توجہ دی اور دل نے مان لیا تو اس نے اپنا بھلا کیا، ورنہ اس نے اپنا نقصان کیا۔ رسولوں کا کام صرف تبلیغ و ارشاد ہے۔ رسول کا کام یہ نہیں کہ تمہاری گردنیں پکڑ کر تمہیں ایمان لانے پر مجبور کیا جائے۔

---

[1] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۸۶

اہم نکات

۱۔ اسلام قلب وضمیر کا مذہب ہے، طاقت وشمشیر کا نہیں۔ وَمَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ ۔

وَکَذٰلِکَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ وَلِیَقُوۡلُوۡا دَرَسۡتَ وَلِنُبَیِّنَہٗ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾

وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا ؕ وَمَا جَعَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۱۰۷﴾

۱۰۵۔ اور ہم اس طرح آیات مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں جس سے وہ یہ کہیں گے کہ آپ نے (کسی سے قرآن) پڑھا ہے اور اس لیے بھی کہ ہم یہ بات اہل علم پر واضح کر دیں۔

۱۰۶۔ آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر جو وحی ہوئی ہے اس کی اتباع کریں، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور مشرکین سے کنارہ کش ہو جائیں۔

۱۰۷۔ اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو یہ لوگ شرک کر ہی نہیں سکتے تھے اور ہم نے آپ کو ان پر نگہبان مقرر نہیں کیا اور نہ ہی آپ ان کے ذمے دار ہیں.

تفسیر آیات

وَکَذٰلِکَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ: آیات کو مختلف انداز میں بیان کرنے میں دو مقاصد نظر میں ہیں:

۱۔ وَلِیَقُوۡلُوۡا دَرَسۡتَ: یعنی کراھۃ ان یقولوا درست کہ ہم نے آیات کو مختلف انداز میں بیان کیا تاکہ مشرکین یہ نہ کہیں کہ آپ نے کہیں سے پڑھ لیا ہے۔ جیسا کہ یہ آیت ہے: یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اَنۡ تَضِلُّوۡا[1] یعنی ان لا تضلوا۔ اسی طرح ہے: لِیَقُوۡلُوۡا یعنی لان لا یقولوا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس سطح فکری کے دلائل اس ناخواندہ قوم کے سامنے پیش فرمائے ہیں، وہ نہ صرف اس ناخواندہ قوم کی سطح فکری سے بلند ہیں بلکہ اہل کتاب کی سطح فکری سے بھی بہت ہی بلند ہیں۔ توریت و انجیل کی تعلیمات میں جن خرافات اور توہمات کو شامل کیا گیا ہے، ان کا قرآنی تعلیمات کی شائستگی اور متانت کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ طرز گفتگو اور طرز استدلال عرب جاہلیت کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا تو آخر کوئی یہ کہہ دے کہ محمدؐ نے کسی سے پڑھا ہے تو کون باور کرے گا۔ اگر کوئی جاہل ہٹ دھرم کہدیتا ہے تو کچھ علم رکھنے والے تو جان لیں گے کہ جس ماحول میں محمدؐ نے پرورش پائی ہے، اس کے مطابق ممکن نہیں کہ یہ تعلیمات وحی کے بغیر کسی اور ذریعے سے حاصل کی ہوئی ہوں۔

---

[1] ۴ نساء: ۱۷۶

اس تفسیر کے مطابق آیت کا ترجمہ اس طرح ہوگا: اور ہم اس طرح آیات مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں کہ وہ یہ نہ کہیں آپ نے ....

وَلِيَقُوْلُوْادَرَسْتَ کے لیے ایک اور تفسیر کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے: تا کہ یہ لوگ اس شبہے میں پڑ جائیں کہ آپؐ نے یہ باتیں کہیں سے پڑھ لی ہیں۔ جیسا کہ قرآن کے بارے میں فرمایا:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ○ [1]	اور ہم قرآن میں سے ایسی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے تو شفا اور رحمت ہے لیکن ظالموں کے لیے تو صرف خسارے میں اضافہ کرتی ہے۔

تو قرآن مؤمنین کے لیے رحمت اور ظالموں کے لیے خسارہ ہے۔ اس طرح آیات کو مختلف انداز سے بیان کرنے سے مشرکین مزید گمراہ ہوں گے، جب کہ اہل علم پر حق واضح ہو جائے گا۔

مگر یہ تفسیر دیگر آیات کے ساتھ متصادم ہے جن میں نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ کا مقصد مشرکین کو شبہ میں ڈالنا نہیں بلکہ حق کی وضاحت بیان کرنا ہے:

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ○ [2]	دیکھو ہم اپنی آیات کو کس طرح مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں تا کہ وہ سمجھ جائیں۔
وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۔ [3]	اور ہم نے (اپنی) نشانیوں کو بار بار ظاہر کیا تا کہ وہ باز آ جائیں۔

۲۔ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ: دوسرا مقصد یہ ہے کہ اس انداز بیاں سے اہل علم پر حق واضح ہو جائے گا۔

۳۔ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ: اتباع وحی کرتے جایئے جو کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سے عبارت ہے اور مشرکین سے کنارہ کش ہو جائیں۔ یعنی ان کے ساتھ الجھنے سے کنارہ کش ہو جائیں، نہ تبلیغ سے۔ طاقت استعمال کرنے سے کنارہ کش ہوں گے، نہ منطق استعمال کرنے سے۔

۴۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا: اگر اللہ منطق کی جگہ طاقت استعمال فرماتا تو ان میں سے ایک بھی شرک کرنے پر قادر نہ ہوتا۔ لہٰذا آپ کو بھی ان پر طاقت استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ آپؐ صرف مبلغ ہیں، نہ حفیظ، نہ وکیل۔ حفیظ ضرر سے بچانے والے کو کہتے ہیں اور وکیل بھلائی کے حصول میں ذمہ لینے والے کو کہتے ہیں۔ طاقت سے ان کو عذاب سے بچانے اور نجات دلانے کی ذمہ داری آپؐ پر عائد نہیں کی۔

اہم نکات

۱۔ رسول اللہؐ نے کسی انسانی مکتب میں نہیں پڑھا: وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ ....

۲۔ انسان کو خود مختار چھوڑا ہے۔ اگر اللہ جبر کرتا تو کوئی مشرک نہ ہوتا: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ....

---

[1] ۱۷ اسراء: ۸۲ [2] ۶ انعام: ۶۵ [3] ۴۶ احقاف: ۲۷

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدۡوًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ کَذٰلِکَ زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّۃٍ عَمَلَہُمۡ ۪ ثُمَّ اِلٰی رَبِّہِمۡ مَّرۡجِعُہُمۡ فَیُنَبِّئُہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾

۱۰۸۔ گالی مت دو ان کو جن کو یہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں مبادا وہ عداوت اور نادانی میں اللہ کو برا کہنے لگیں، اس طرح ہم نے ہر قوم کے لیے ان کے اپنے کردار کو دیدہ زیب بنایا ہے، پھر انہیں اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پس وہ انہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔

تفسیر آیت

یہ اسلامی پیروکاروں کے لیے ایک ضابطہ اخلاق ہے کہ جن بتوں یا جن افراد کی یہ لوگ پرستش کرتے ہیں ان کو سَب و شتم نہ کرو۔ کسی بھی شخص کے مقدسات کی توہین نہ کرو کیونکہ ہر شخص کو اپنا عقیدہ عزیز ہوتا ہے۔ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے، اس کی دل آزاری کرنے سے وہ بھی مقابلہ میں یہی عمل انجام دے گا اور اس سَب و شتم کرنے والے کے مقدسات کی توہین کرے گا۔

مؤمنین نے اگر مشرکین کے خداؤں کو دشنام دیا تو وہ جاہلی تعصب اور مقابلے میں آ کر اللہ کی شان میں گستاخی کریں گے۔ لہٰذا اس آیت میں منع کیا گیا کہ اس عمل زشت کا سبب اور محرک نہ بنو۔ دوسری جگہ اسلام نے مخالفین کے ساتھ پیش آنے کے آداب بیان فرمائے:

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ۔۔۔[۱]

حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف دعوت دیں اور ان سے ساتھ بہتر انداز میں بحث کریں۔

نیز فرمایا

وَ لَا تُجَادِلُوۡۤا اَہۡلَ الۡکِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ ۔۔۔[۲]

اور تم اہل کتاب سے مناظرہ نہ کرو، مگر بہتر طریقے سے۔

گالی اور دشنام خود اپنی جگہ ایک زشت عمل ہے۔ اسلامی تعلیمات میں اس عمل زشت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ برائت اور سَب و شتم ایک چیز ہے۔ پاک کردار لوگوں کا بدکرداروں کی بدکرداری سے بیزاری کا اظہار کرنا برائت ہے۔ جب کہ گالی دینا، جو گھٹیا لوگوں کا کام ہے، سَب ہے۔ اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَ اِنَّہُ سَیَأْمُرُکُمْ بِسَبِّي وَ الْبَرَاءَ ۃِ مِنِّي۔ فَاَمَّا السَّبُّ فَسُبُّونِی فَاِنَّہُ لِي زَکَاۃٌ وَ

وہ تمہیں حکم دے گا مجھے برا کہو اور مجھ سے بیزاری کا اظہار کرو۔ جہاں تک برا کہنے کا تعلق ہے، مجھے برا

---

[۱] ۱۶ نحل: ۱۲۵　[۲] ۲۹ عنکبوت: ۴۶

لَکُمْ نَجَاۃٌ وَ اَمَّا الْبَرَاءَ ۃُ فَلَا تَتَبَرَّءُ وا مِنِّی فَاِنِّی وُلِدْتُ عَلَی الْفِطْرَۃِ وَ سَبَقْتُ اِلَی الْاِیْمَانِ وَ الْھِجْرَۃِ ۔[1]

کہ لینا۔ اس لیے کہ یہ میرے لیے پاکیزگی کا سبب اور تمہارے لیے (دشمنوں سے) نجات پانے کا باعث ہے لیکن (دل سے) بیزاری اختیار نہ کرنا، اس لیے کہ میں (دین) فطرت پر پیدا ہوا ہوں اور ایمان و ہجرت میں سابق ہوں۔

نیز جب حضرت علی علیہ السلام کے لشکروں نے لشکر معاویہ پر سب وشتم کیا تو آپؑ نے فرمایا:

اِنِّی اَکْرَہُ لَکُمْ اَنْ تَکُونُوا سَبَّابِینَ۔[2]

مجھے یہ بات پسند نہیں کہ تم سَب وشتم کرنے والے بن جاؤ۔

زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّۃٍ عَمَلَھُمۡ : ہم نے ہر امت کے لیے اس کے اپنے کردار کو دیدہ زیب بنایا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے کفر کو دیدہ زیب بنایا اور مؤمنوں کے لیے ایمان کو۔ اس طرح کافر کفر اختیار کرنے پر اور مومن ایمان اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔ اگر ایسا ہے تو انبیاء بھیجنے اور ان پر کتاب ہدایت نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے تکوینی نظام میں کوئی جانبداری نہیں ہے کہ لقمہ اگر حرام ہے تو حلق میں پھنس جائے، حلال ہے تو خوشگوار ہو جائے۔ جنسی تعلقات اگر جائز اور حلال طریقے سے ہوں تو لذت دیں اور ناجائز طریقوں سے ہوں تو بے لذت اور قابل نفرت ہوں۔ نظریات میں اگر حق پر ہوں تو لذت محسوس کریں اور اگر باطل نظریات اپنائے جائیں تو اذیت ہو۔

اگر باطل کڑوا، ناقابل ہضم اور حق شیریں اور گوارا ہوتا تو آزمائش اور امتحان ممکن نہ ہوتا اور انسان کو مکلّف بنانا اور ثواب وعقاب دنیا بھی نامعقول ہو جاتا۔ چنانچہ فرمایا:

اِنَّا جَعَلۡنَا مَا عَلَی الۡاَرۡضِ زِیۡنَۃً لَّھَا لِنَبۡلُوَھُمۡ اَیُّھُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ۝[3]

روئے زمین پر جو کچھ موجود ہے اسے ہم نے زمین کے لیے زینت بنایا تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سب سے اچھا عمل کرنے والا کون ہے۔

لہٰذا ہر قوم کو اپنا نظریہ، اپنا مذہب اچھا لگے گا۔ اسی میں ان کی آزمائش ہے کہ کون اس کے باوجود حق و ناحق میں تمیز کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کون بے دلیل ایک مذہب کو اختیار کرتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے بعض اصحاب کے بارے میں سنا کہ وہ اہل شام کو سب ولعن کرتے ہیں تو ان سے فرمایا:

کَرِھْتُ لَکُمْ اَنْ تَکُونُوا لَعَّانِینَ شَتَّامِیْنَ۔[4]

میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ تم لعنت اور سَب وشتم کرنے والے بن جاؤ۔

---

[1] نہج البلاغۃ خطبہ۵۷ ترجمہ مفتی جعفر حسینؒ [2] شرح نہج البلاغۃ ۱۱ خطبہ ۱۹۹
[3] ۱۸ کہف : ۷ [4] مستدرک الوسائل ۱۲: ۳۰۶

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

وَ اِيَّاكُمْ وَ سَبَّ اَعْدَاءِ اللّٰهِ حَيْثُ يَسْمَعُونَكُمْ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْواً بِغَيْرِ عِلْمٍ۔[1]

اللہ کے دشمنوں کو، جہاں وہ تمہیں سن رہے ہوں، گالی دینے سے باز رہو کہیں وہ دشمنی اور نادانی میں اللہ کو برا نہ کہ دیں۔

اہم نکات

۱۔ اعلٰی کردار کا مالک برائت کرتا ہے، سَب وشتم نہیں۔

۲۔ مذہبی مقدسات کی توہین کا سبب بننا حرام ہے: وَلَا تَسُبُّوا ....

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

۱۰۹۔ اور یہ لوگ اللہ کی پکی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی معجزہ آئے تو یہ اس پر ضرور ایمان لائیں گے، کہد یجیے: معجزے صرف اللہ کے پاس ہیں لیکن (مسلمانو!) تمہیں کیا معلوم کہ معجزے آ بھی جائیں تب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

۱۱۰۔ اور ہم ان کے دل و نگاہ کو اس طرح پھیر دیں گے جیسا کہ یہ پہلی مرتبہ اس پر ایمان نہیں لائے لائے تھے اور ہم انہیں ان کی سرکشی میں سرگرداں چھوڑے رکھیں گے۔

تفسیر آیات

سیاق و سباق آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہٹ دھرم مشرکوں کی طرف سے معجزہ کے مطالبے پر کچھ اہل ایمان کا بھی یہی خیال تھا کہ مشرکین کا مطالبہ قبول کر لینا چاہیے اور ان کے مطالبے کے مطابق معجزہ دکھانا چاہیے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

۱۔ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ: معجزات صرف اللہ کے پاس ہیں۔ اللہ کے اِذن کے بغیر، میں خود معجزہ نہیں لا سکتا۔ اللہ اپنے علم کے مطابق معجزہ دکھاتا ہے۔

---

[1] اصول الکافی ۸: ۷

۲۔ وَمَا یُشۡعِرُکُمۡ : تمہیں کیا معلوم کہ معجزے آ بھی جائیں تو یہ لوگ ایمان لانے والے ہیں؟ ان کے دل ونگاہ الٹے ہیں۔ ان لوگوں نے جس طرح معجزہ دکھانے سے پہلے ایمان قبول نہیں کیا، معجزہ دکھانے کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

۳۔ وَنُقَلِّبُ اَفۡـِٕدَتَہُمۡ : ان کو مطلوبہ معجزہ دکھا بھی دیا جائے تو ہم ان کی سرکشی کی وجہ سے ان کے دل و نگاہ کو معجزہ دکھانے سے پہلے کی حالت کی طرف پھیر دیں گے۔ یعنی ان کی قلبی حالت وہی رہے گی جو معجزہ دکھانے سے پہلے تھی۔

۴۔ اَوَّلَ مَرَّۃٍ : سے مراد مجوزہ معجزہ سے پہلے کی حالت ہے۔

۵۔ وَّنَذَرُہُمۡ : ہم ان کو اپنے حال پر چھوڑے رکھیں گے۔ اس جملے سے نُقَلِّبُ کا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ اللہ ان کو اپنی حالت پر چھوڑ دیتا ہے تو ان کے دل و نگاہ پھر جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی رحمت و ہدایت سب کے لیے عام ہے مگر اہلیت اور ظرفیت میں فرق ہے۔ لہٰذا اہل نہ ہونے کی صورت میں معجزے اثر نہیں کرتے۔

۲۔ جس کو اللہ اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے اس کے دل و نگاہ پھر جاتے ہیں۔

وَلَوۡ اَنَّنَا نَزَّلۡنَاۤ اِلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ وَ کَلَّمَہُمُ الۡمَوۡتٰی وَحَشَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ کُلَّ شَیۡءٍ قُبُلًا مَّا کَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَہُمۡ یَجۡہَلُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

۱۱۱۔ اور اگر ہم ان پر فرشتے بھی نازل کر دیں اور مردے بھی ان سے باتیں کرنے لگیں اور ہر چیز کو ہم ان کے سامنے جمع کر دیں تب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے مگر اللہ چاہے (تو اور بات ہے) لیکن ان میں سے اکثر لوگ جہالت میں ہیں۔

تفسیر آیات

اگر ان لوگوں کا مطالبہ قبول کر لیں اور ان پر فرشتے نازل کریں، یہاں تک کہ مردے بھی ان سے بات کریں تو بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ جب کہ تاریخ انبیاء شاہد ہے کہ دریا شق ہو جاتا ہے، پہاڑ سے اونٹنی نکالی جاتی ہے، مردے زندہ ہوتے رہے مگر جن لوگوں نے انکار کیا وہ منکر ہی رہے۔ آج بھی یہی ہوگا۔ لاکھ معجزے دکھائے جائیں، یہ لوگ منکر ہی رہیں گے مگر جو اللہ چاہے۔ ان کافروں کے لیے اللہ چاہے گا نہیں کیونکہ یہ لوگ خود ہدایت نہیں چاہتے۔ یہ لوگ اہلیت اور اللہ کی رحمت و ہدایت کا ظرف نہیں رکھتے۔

وَحَشَرۡنَا عَلَیۡہِمۡ : اگر ہم تمام مجوزہ معجزات ان کے سامنے جمع کر دیں یا ان کے تمام مطالبے پورے کر دیں، پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیۡنَ الۡاِنۡسِ وَ الۡجِنِّ یُوۡحِیۡ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ؕ وَ لَوۡ شَآءَ رَبُّکَ مَا فَعَلُوۡہُ فَذَرۡہُمۡ وَ مَا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾

۱۱۲۔ اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے جن و انس کے شیطانوں کو دشمن قرار دیا ہے جو ایک دوسرے کو فریب کے طور پر ملمع آمیز باتوں کا وسوسہ ڈالتے ہیں اور اگر آپ کا رب چاہتا تو یہ ایسا نہ کر سکتے، پس انہیں بہتان تراشی میں چھوڑ دیں۔

تشریح کلمات

زُخۡرُفَ: (ز خ ر ف) اصل میں اس زینت کو کہتے ہیں، جو ملمع آمیز ہو۔ اسی سے سونے کو بھی زخرف کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

تاریخ انبیاء کی اس الٰہی تحریک میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر ہے کہ اے رسول! یہ جن و انس کے شیطان آپؐ کے خلاف ایک دوسرے سے مل کر جو سازشیں کر رہے ہیں، ہر نبی کو ایسے ہی شیاطین سے دوچار کیا گیا ہے۔ ان شیاطین جن و انس کا دعوت انبیاء کے خلاف طریقہ واردات یہ ہو گا کہ یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول۔ وہ پرفریب اور پرکشش نعرے لگاتے ہوں گے، زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ، ملمع آمیز نعرے ایک دوسرے کو سکھاتے ہیں۔ آج بھی ہم ان شیاطین کی ملمع سازیاں روز سنتے رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ غلامی کو آزادی، ظلم و استحصال کو انسانی حقوق اور استعماریت کو جمہوریت کا نام دیتے ہیں۔

۱۔ جَعَلۡنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا: فرمایا کہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ حق و باطل کو اپنا اپنا کردار ادا کرنے دیا جائے۔ اس کے نتیجے میں ہر نبی کے مقابلے میں ایک باطل کھڑا ہوتا رہا۔ یہ نظام ہم نے بنایا: جَعَلۡنَا، ورنہ اگر ہم جبر کا نظام بناتے تو باطل اپنا کردار ادا کرنے پر قادر نہ ہوتا۔ اس صورت میں نہ تو امتحان ہوتا اور نہ کوئی شخص مکلّف ہوتا۔

۲۔ وَلَوۡ شَآءَ رَبُّکَ مَا فَعَلُوۡہُ: اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ ایسا نہ کر سکتے تھے۔ اس موضوع پر پہلے بھی ہم نے ذکر کیا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ رونما ہوتا ہے، وہ اللہ کے وضع کردہ قانون اور سنت الٰہیہ کے مطابق ہی رونما ہوتا ہے، جسے اللہ کی مشیت بھی کہتے ہیں۔ اللہ کی مشیت یہ ہے کہ ابراہیمؑ و نمرود، موسیٰ (ع) و

فرعون، مصطفیؐ و ابوجہل، حسینؑ و یزید میں سے ہر ایک کو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا جائے۔

اہم نکات

۱۔ داعیان حق کے علاوہ دوسروں کے پرکشش نعرے سراسر دھوکہ ہوا کرتے ہیں۔ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ...۔

۲۔ مشیت الٰہی یہ ہے کہ خیر و شر کے عناصر میں سے ہر ایک کو اپنا اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا جائے۔

وَ لِتَصۡغٰۤی اِلَیۡہِ اَفۡـِٕدَۃُ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ وَ لِیَرۡضَوۡہُ وَ لِیَقۡتَرِفُوۡا مَا ہُمۡ مُّقۡتَرِفُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾

۱۱۳۔ اور (شیاطین وسوسہ ڈالتے ہیں) تاکہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل (ملمع آمیز باتوں کی طرف) مائل رہیں اور وہ اس سے راضی رہیں اور جن حرکتوں میں یہ لوگ لگے ہوئے ہیں، انہی میں مصروف رہیں۔

تفسیر آیات

وَ لِتَصۡغٰۤی: اس جملے کا تعلق یُوۡحِیۡ سے ہے۔ یعنی شیاطین آپس میں ایک دوسرے کو ملمع آمیز باتیں سکھاتے ہیں تاکہ منکرین آخرت کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔ وَلِیَرۡضَوۡہُ اسی زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ کو پسند کریں۔ وَلِیَقۡتَرِفُوۡا اس حرکت میں مگن رہیں۔

اگر اللہ چاہتا تو یہ شیاطین پرفریب نعرے نہیں لگا سکتے تھے لیکن اللہ نے ان کو مکمل آزادی دی تاکہ ان کے پرفریب نعروں میں وہ لوگ آ پھنسیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے انجام بد کو پہنچ جائیں۔

اہم نکات

۱۔ گمراہ کن نعروں کے فریب میں آنے والے مخصوص لوگ ہوا کرتے ہیں۔

اَفَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡتَغِیۡ حَکَمًا وَّ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکُمُ الۡکِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ رَّبِّکَ

۱۱۴۔ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو منصف بناؤں؟ حالانکہ اس نے تمہاری طرف مفصل کتاب نازل کی ہے اور جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن آپ کے رب کی طرف سے برحق نازل ہوا ہے، لہٰذا آپ ہرگز شک

بِالۡحَقِّ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ﴿۱۱۴﴾ کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔

تشریح کلمات

حَکَمًا: (ح ك م) حَکَمُ منصف کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حکم اور حاکم میں فرق یہ ہے کہ حاکم ظالم ہوسکتا ہے جب کہ حَکَم منصف ہی ہو گا۔ حَکَم کے اصل معنی کسی چیز کی اصلاح کے لیے اسے روک دینے کے ہیں۔ اسی بنا پر لگام کو حَکَمۃُ الدابۃ کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

کلام بزبان رسولؐ جاری کرایا جا رہا ہے۔ گویا یہ حکم ہو رہا ہے کہ اے رسولؐ! آپ ان منکرین سے کہد یجیے کہ اپنے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو منصف بناؤں؟ جب کہ اللہ نے ہی تمہاری طرف ایک مفصل کتاب نازل کی ہے۔ لہٰذا جس نے رسالت کا کام میرے ذمے لگایا ہے، میرا وہی منصف ہو گا۔ اس کے علاوہ اہل کتاب، یہود و نصاریٰ بھی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ اپنی کتابوں میں پڑھ چکے ہیں کہ محمد نبی آخر الزمانؐ آنے والے ہیں اور ساتھ وہ وحی و غیر وحی میں تمیز بھی کر سکتے ہیں۔ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ لہٰذا آپؐ اس بارے میں شک و تردد نہ کریں کہ نہ معلوم اہل کتاب اس حقیقت سے واقف ہیں یا نہیں۔

فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ: اس جملے کی دوسری تفسیر یہ ہوسکتی ہے: ایاك اعنی فاسمعی یا جارہ کے طور پر خطاب کسی سے اور سمجھانا کسی کو مقصود ہے۔ روئے سخن رسولؐ کی طرف ہو اور سمجھانا دوسروں کو مقصود ہو۔

اہم نکات

۱۔ قرآن کے وحی الٰہی ہونے میں شک و تردد کی گنجائش نہیں ہے۔

۲۔ اہل کتاب کو علم ہے کہ یہ کتاب وحی ہے۔

وَ تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ﴿۱۱۵﴾

۱۱۵۔ اور آپ کے رب کا کلمہ سچائی اور عدل کے اعتبار سے کامل ہے، اس کے کلمات کو تبدیل کرنے والا کوئی نہیں اور وہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

کلمہ اگرچہ مفرد ہے لیکن اس کا اطلاق پورے کلام، خطبے، قصیدے پر ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے اور ایک فیصلہ، پیغام اور وعدہ مراد لیے جاتے ہیں:

وَلَوۡلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيۡنَهُمۡ ....[1]
اور اگر آپ کا پروردگار پہلے طے نہ کر چکا ہوتا تو ان کے درمیان اس بات کا فیصلہ کر دیا جاتا....

وَ تَمَّتۡ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ ۝[2]
اور تیرے رب کا وہ فیصلہ پورا ہو گیا (جس میں فرمایا تھا) کہ میں جہنم کو ضرور بالضرور جنات اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔

اس آیت میں اللہ کے کلمہ سے مراد فیصلہ، وعدہ اور وعید ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے اسلام کی فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے اور اسلام کے غلبہ کا جو فیصلہ اور مشرکین کی شکست وخواری کی جو وعید ہوئی، وہ پوری ہو گئی۔ جیسا کہ فرمایا:

وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوۡرِهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ ۔[3]
اور اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا خواہ کفار برا مانیں۔

صِدۡقًا: یہ وعدہ صادق ثابت ہو گا اور جیسے پہلے خبر دی ہے، اسی کے مطابق واقع ہو گا۔

عَدۡلًا: ہر خبر اور اس کا وقوع عدل و انصاف پر ہو گا۔ اسلام کا غلبہ ہو گا تو اس میں کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہو گی۔

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ: یہ اللہ کا اٹل فیصلہ ہے، جس میں کسی قسم کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے:

وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا ۔[4]
اور اللہ کے دستور میں آپ کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے.

اور آپ اللہ کی سنت یعنی طریقہ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے رسول (ص) کو اطمینان دلا رہا ہے کہ اے رسولؐ! آپؐ کی فتح و نصرت اور آپؐ کے دشمنوں کی شکست و ذلت کا فیصلہ ہو چکا ہے، جس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آ سکتی۔

بعض بزرگ مفسرین کلمہ سے شریعت محمدؐ مراد لیتے ہیں کہ شریعت محمدیؐ آنے سے شریعتوں کا ارتقاء، مرحلہ تکمیل کو پہنچ گیا لیکن استعمالات قرآن میں یہ ترکیب کلام كَلِمَتُ رَبِّكَ شریعت کے لیے استعمال نہیں ہوئی۔ پھر لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ بھی قرینہ ہے کہ اس سے مراد احکام وشریعت نہیں ہیں جو قابل نسخ وتبدیلی ہیں بلکہ اللہ کا وعدۂ برحق ہے جو کسی اعتبار سے بھی اس میں تبدیلی لانے والا نہیں ہے۔ نہ خود اللہ تبدیلی لائے گا، نہ غیر اللہ تبدیلی لا سکتا ہے۔

---

[1] ۱۰ یونس: ۱۹	[2] ۱۱ ھود: ۱۱۹	[3] ۶۱ صف: ۸	[4] ۳۳ احزاب: ۶۲

اہم نکات

۱۔ اس کی سورہ میں ہونے والا وعدۂ فتح ونصرت، قرآن کا معجزہ ہے۔

۲۔ اللہ کا وعدہ اٹل ہوتا ہے، قابل تغیر و تبدیل نہیں ہوتا: لَامُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ....

وَ اِنۡ تُطِعۡ اَکۡثَرَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ یُضِلُّوۡکَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنۡ ہُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾

۱۱۶۔ اور اگر آپ زمین پر بسنے والے لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلیں گے تو وہ آپ کو راہ خدا سے بہکا دیں گے، یہ لوگ تو صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور یہ صرف قیاس آرائیاں ہی کیا کرتے ہیں۔

اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ مَنۡ یَّضِلُّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ۚ وَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ ﴿۱۱۷﴾

۱۱۷۔ بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے بھٹک جائے گا اور ہدایت پانے والوں سے بھی وہ خوب آگاہ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاِنۡ تُطِعۡ: خطاب اگرچہ رسولؐ سے ہے لیکن سب کو سمجھانا مقصود ہے۔

۲۔ اَکۡثَرَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ: اطاعت، حق کی ہوتی ہے۔ اس میں اکثریت کو دخل نہیں ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے اس سلسلے میں روایت ہے:

الحق لا یعرف بالرجال اعرف الحق تعرف اھلہ۔[1] حق لوگوں کے ذریعے نہیں پہچانا جاتا، پہلے حق کو پہچانو، اہل حق کو پہچان لو گے۔

۳۔ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ: دنیاوی معاملات میں لوگوں کا ظن وتخمین شاید قابل عمل ہو جیسا کہ تمام معاشروں میں ظن و گمان پر ہی عمل ہوتا ہے۔ یقینی صورت تو کبھی میسر آتی ہے۔

لیکن الٰہیاتی اور ما بعد الطبیعیاتی معاملات میں لوگوں کے ظن و تخمین گمراہ کن ہوتے ہیں۔ لہٰذا توحید، آخرت اور دینی تعلیمات میں لوگوں کی قیاس آرائیوں پر چلنا کسی صورت درست نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مشرکین اپنے قیاس کے ذریعے مسلمانوں پر طنز کرتے تھے کہ یہ لوگ مردار کو، جسے اللہ نے مارا ہے، نہیں کھاتے اور جسے خود مارتے ہیں، اس کو کھاتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

---

[1] روضۃ الواعظین ۱: ۳۱ باب الکلام فیما ورد من الاخبار فی ...۔ تفسیر القرطبی ۱: ۳۴۰۔ تفسیر البحر المحیط ۸: ۱۲۳

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۔۔۔۔[1] اور اس کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہیں ۔۔۔

ظن: کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی خبر یا واقعہ کے وقوع پذیر ہونے پر آپ کو اطمینان ہوتا ہے لیکن عدم وقوع کے امکان کو آپ رد نہیں کرتے۔ علم کی صورت میں آپ عدم وقوع کے امکان کو رد کرتے ہیں۔ علم بذات خود حجت ہے لیکن ظن اصول دین میں قطعاً حجت نہیں ہے۔ فروعی احکام میں وہ ظن حجت ہے جس کے حجت ہونے پر علم ہو۔ مثلاً عادل کی خبر حجت ہونے پر قرآنی دلیل سے علم حاصل ہو گیا۔ اس پر عمل کیا جائے گا تو درحقیقت یہ علم حجت ہے جس نے کہا عادل کی خبر کو تسلیم کرو۔

اہم نکات

۱۔ دینی تعلیمات میں قیاس آرائی حجت نہیں ہے: اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ ۔۔۔

۲۔ طالبان حق کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ دنیا کی اکثریت کس راستے پر چل رہی ہے۔

۳۔ علم خدا میں ہے کہ کون گمراہ اور کون ہدایت یافتہ ہونے والے ہیں لیکن یہ یاد رکھے کہ علم خدا سے انسان مجبور نہیں ہوتا۔

فَكُلُوۡا مِمَّا ذُكِرَ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ بِاٰيٰتِهٖ مُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا لَكُمۡ اَلَّا تَاۡكُلُوۡا مِمَّا ذُكِرَ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ وَ قَدۡ فَصَّلَ لَكُمۡ مَّا حَرَّمَ عَلَيۡكُمۡ اِلَّا مَا اضۡطُرِرۡتُمۡ اِلَيۡهِ ؕ وَ اِنَّ كَثِيۡرًا لَّيُضِلُّوۡنَ بِاَهۡوَآئِهِمۡ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُعۡتَدِيۡنَ ﴿۱۱۹﴾

۱۱۸۔ لہٰذا اگر تم اللہ کی نشانیوں پر ایمان رکھتے ہو تو وہ (ذبیحہ) کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

۱۱۹۔ اور کیا وجہ ہے کہ تم وہ (ذبیحہ) نہیں کھاتے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو؟ حالانکہ اللہ نے جن چیزوں کو اضطراری حالت کے سوا تم پر حرام قرار دیا ہے، ان کی تفصیل اس نے تمہیں بتا دی ہے اور بے شک اکثر لوگ اپنی خواہشات کی بنا پر نادانی میں گمراہ کرتے ہیں، آپ کا رب حد سے تجاوز کرنے والوں کو یقیناً خوب جانتا ہے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیات میں تمہید باندھنے کے بعد اصل مقصد بیان ہو رہا ہے کہ مشرکین نے جانوروں کے ذبح کے مسئلہ کو اپنے خداؤں کی عبادت کے ساتھ منسلک کر دیا تھا اور ان خداؤں کے نام پر ذبح کرتے تھے۔ اس

---

[1] ۱۷ اسراء: ۳۶

بنا پر ان دو آیات میں ذبیحہ کا حکم عقائد کے ضمن میں بیان فرمایا۔

سیاق آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبیحہ کے بارے میں تفصیل اس سے پہلے بتائی جا چکی ہے۔ وہ یا تو اسی سورہ میں آنے والی ایک آیت مراد ہے، جس میں مردار، خون اور سور کا گوشت حرام ہونے کا ذکر ہے یا سورہ نحل آیت ۱۱۵ میں بھی مردار، خون، سور کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو، کے حرام ہونے کا ذکر ہے۔ سورہ نحل مکی ہے، لہٰذا ممکن ہے کہ سورہ انعام سے پہلے نازل ہوا ہو۔

۱۔ اِلَّا مَا اضۡطُرِرۡتُمۡ : اضطرار یہ ہے کہ ہلاکت کا خطرہ ہو اور بچنے کے لیے مردار کے علاوہ کوئی چیز نہ ملے۔

۲۔ وَ اِنَّ کَثِیۡرًا لَّیُضِلُّوۡنَ بِاَہۡوَآئِہِمۡ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ : اس جملے سے معلوم ہوا کہ گمراہ ہونے کے دو اہم عوامل ہیں: ایک خواہش پرستی اور دوسرا جہالت۔ لہٰذا ہمارے ہاں ''اکثر لوگ کہتے ہیں''، ''اکثر لوگ مانتے ہیں'' کی بنیاد پر دلیل قائم نہیں ہوتی جب کہ عام لوگ کثیراً اور اکثر من فی الارض کو معیار بناتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ گمراہی کے دو اسباب، نادانی اور خواہش پرستی ہیں: لَّیُضِلُّوۡنَ بِاَہۡوَآئِہِمۡ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ....

۲۔ اضطراری حالت میں انسانی خون اور عصمت کے علاوہ تمام احکام میں لچک آ جاتی ہے۔

وَ ذَرُوۡا ظَاہِرَ الۡاِثۡمِ وَ بَاطِنَہٗ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡسِبُوۡنَ الۡاِثۡمَ سَیُجۡزَوۡنَ بِمَا کَانُوۡا یَقۡتَرِفُوۡنَ ﴿۱۲۰﴾

۱۲۰۔ اور تم ظاہری اور پوشیدہ گناہوں کو ترک کر دو، جو لوگ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں بے شک وہ عنقریب اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔

تفسیر آیات

ظاہری اور پوشیدہ گناہوں کے بارے میں مختلف اقوال سامنے آتے ہیں۔ مثلاً ظاہری گناہ وہ ہیں جو اعضا و جوارح سے صادر ہوں۔ پوشیدہ وہ ہیں جو دل میں رکھے جائیں۔ مثلاً حسد وغیرہ۔ مگر آیت کا اطلاق کسی تخصیص کو قبول نہیں کرتا، لہٰذا ہر قسم کا گناہ اس میں شامل ہے۔ مثلاً وہ گناہ، جس کے بارے میں معاشرے میں احساس گناہ ہے، وہ ظاہری ہو گا اور جس کے بارے میں سرے سے احساس گناہ نہیں ہے، وہ پوشیدہ گناہ ہو گا وغیرہ۔ سب گناہوں کی عمومیت کے لیے یہ تعبیر اختیار فرمائی ہے۔

ظاہری گناہوں میں فحش کاری، غیبت، جھوٹ، چوری، خیانت اور قتل وغیرہ شامل ہیں۔

پوشیدہ گناہوں میں نفاق، تکبر، حسد، طمع، حرص، مومن سے بغض، خود پسندی اور حب دنیا وغیرہ شامل

ہیں بلکہ ہر عمل کے دو پہلو اور دو رخ ہوتے ہیں۔ اس کا ظاہری پہلو، جو نمودار ہوتا ہے اور اس کا قلبی اور باطنی پہلو، جو نیت و ارادے سے مربوط ہوتا ہے اور نمودار نہیں ہوتا۔

اہم نکات

۱۔ جس کی نگاہوں کے سامنے اللہ کا وجود حاضر و ناظر ہے، اس کے لیے کوئی گناہ پوشیدہ نہیں۔

وَ لَا تَاۡکُلُوۡا مِمَّا لَمۡ یُذۡکَرِ اسۡمُ اللّٰہِ عَلَیۡہِ وَ اِنَّہٗ لَفِسۡقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ لَیُوۡحُوۡنَ اِلٰۤی اَوۡلِیٰٓئِہِمۡ لِیُجَادِلُوۡکُمۡ ۚ وَ اِنۡ اَطَعۡتُمُوۡہُمۡ اِنَّکُمۡ لَمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾

۱۲۱۔ اور جس (ذبیحہ) پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اسے نہ کھاؤ کیونکہ یہ سنگین گناہ ہے اور شیاطین اپنے دوستوں کو پڑھاتے ہیں کہ وہ تم سے بحث کریں اور اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو یقیناً تم بھی مشرک بن جاؤ گے۔

تفسیر آیات

جانور پر اللہ کا نام نہ لینے کی پانچ صورتیں ہیں:

i۔ ذبح کرنے والا مسلمان ہو لیکن اللہ کا نام لینا بھول جائے۔

ii۔ ذبح کرنے والا مسلم ہے، جان بوجھ کر اللہ کا نام نہیں لیتا۔

iii۔ ذبح کرنے والا غیر مسلم ہے اور اللہ کا نام نہیں لیتا۔

iv۔ ذبح کرنے والا غیر مسلم ہے اور اللہ کا نام نہیں لیتا بلکہ غیر اللہ کے نام سے ذبح کرتا ہے۔

v۔ ذبح سرے سے ہوتا ہی نہیں، جانور مردار ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا تمام صورتوں میں پہلی صورت میں ذبیحہ حلال ہے۔ باقی تمام صورتوں میں ذبیحہ حرام ہو جاتا ہے۔

۱۔ وَ اِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ لَیُوۡحُوۡنَ: مشرکین مسلمانوں سے کہتے تھے: کیا جس جانور کو تم مارتے ہو، وہ حلال ہے اور جس جانور (مردار) کو اللہ مارتا ہے، وہ حرام ہے؟

۲۔ وَ اِنۡ اَطَعۡتُمُوۡہُمۡ اِنَّکُمۡ لَمُشۡرِکُوۡنَ: اگر کسی جانور پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اسے تم نے حلال سمجھا تو ان خود ساختہ خداؤں کا اعتراف بن جاتا ہے اور تم بھی مشرک بن جاتے ہو۔

اس جملے سے معلوم ہوا کہ یہاں ذبیحہ کھانے، نہ کھانے کا مسئلہ فروعی نہیں ہے بلکہ یہ اصول دین، توحید سے مربوط ہے۔ اس لیے دلائل توحید کے ضمن میں اس کا ذکر آیا۔

اہم نکات

۱۔ اسلامی تعلیمات کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنے والے شیاطین ہوتے ہیں۔

۲۔ ایسے شبہات پیدا کرنے والوں کی اطاعت بھی شرک ہے۔

اَوَ مَنۡ کَانَ مَیۡتًا فَاَحۡیَیۡنٰہُ وَ جَعَلۡنَا لَہٗ نُوۡرًا یَّمۡشِیۡ بِہٖ فِی النَّاسِ کَمَنۡ مَّثَلُہٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡہَا ؕ کَذٰلِکَ زُیِّنَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾

۱۲۲۔ کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کر دیا اور ہم نے اسے روشنی بخشی جس کی بدولت وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پھنسا ہوا ہو اور اس سے نکل نہ سکتا ہو؟ یوں کافروں کے لیے ان کے کرتوت خوشنما بنا دیے گئے ہیں۔

شان نزول

اس آیت کے شان نزول میں روایت ہے کہ حضرت حمزہؓ کے ایمان قبول کرنے اور ابوجہل کے کفر پر برقرار رہنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ عمار بن یاسر کے ایمان اور ابوجہل کے کفر کے بارے میں ہے لیکن سورہ انعام کے یک بارگی نازل ہونے کی صورت میں شانِ نزول کی روایت قابل اعتبار نہیں رہتی۔ البتہ ان روایات کا مقصد، مذکورہ موارد میں اس آیت کے مفہوم کی تطبیق، ہو سکتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَوَ مَنۡ کَانَ مَیۡتًا: ہر شخص کی موت و حیات اس سے متوقع آثار و نتائج سے مربوط ہوتی ہے۔ ایک باپ کی فرزند سے امید بر آئے تو وہ اس کے لیے زندہ ہے، ایک بھائی کی بھائی سے وابستہ توقعات پوری ہو جائیں تو وہ اس کے لیے زندہ ہے، ایک زمین سے متوقع فصل حاصل ہو جائے تو وہ زمین زندہ اور آباد ہے۔ دوسرے لفظوں میں جو مال جس مصرف کے لیے ہے اس میں صرف ہو جائے تو اس مال کو دوام ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس انسان کو ایک اعلا غرض کے لیے خلق کیا ہے۔ اگر انسان اس غرض تخلیق میں صرف ہو جائے تو وہ زندہ ہے اور وہ غرض تخلیق یہ ہے کہ انسان اس دنیاوی زندگی کو اپنی ابدی زندگی کے لیے صرف کرے۔ اس وقتی زندگی کا مصرف ابدی زندگی کا حصول ہے تو جس کی زندگی ابدی زندگی کے حصول میں صرف ہو گئی تو اس کو زندہ تصور کیا جائے گا، ورنہ وہ مردہ شمار ہو گا۔ چنانچہ حیوانات کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی تسخیر کے لیے پیدا کیا، پس اگر حیوانات انسان کے لیے مسخر ہیں تو ان کا مقصد حیات پورا ہو جاتا ہے لیکن

اگر انسان اپنی غرض تخلیق کو پورا نہ کرے تو وہ حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتا ہے: اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ... [1]

جو شخص اللہ کی عطا کردہ حیات سے زندہ ہو جاتا ہے اور اپنی غرض تخلیق کے راستے پر چل پڑتا ہے، اسے روشنی میسر آتی ہے اور اس روشنی میں وہ اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے: وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا...

جب کہ جو شخص اس حیات سے اپنے لیے زندگی حاصل نہیں کرتا، وہ تاریکی میں راہ گم کر دیتا ہے۔

یہاں مردہ سے مراد کفر، حیات سے مراد ایمان اور روشنی سے مراد اعمال صالحہ ہو سکتے ہیں۔ اندھیرے سے بھی مراد کفر ہے، لہٰذا مومن ہی حقیقی زندگی سے سرشار ہے کیونکہ زندگی کے آثار مؤمن میں موجود ہیں۔

مؤمن حق و باطل، خیر و شر اور عدل و ظلم میں تمیز کرتا ہے اور مہلکہ سے نکلنے کا راستہ بھی جانتا ہے:

... وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا [2]　اور جو اللہ سے ڈرتا رہے اللہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے۔

اس کے برخلاف کافر زندگی کے آثار نہیں رکھتا، نہ اسے حق و باطل، خوب و بد کی تمیز ہے اور نہ ہی اسے مہلکہ سے نکلنے کا راستہ ملتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن اللہ کے نور سے چلتا ہے۔

۲۔ مؤمن کو مہلکہ سے نکلنے کا راستہ مل جاتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾	۱۲۳۔ اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں وہاں کے بڑے بڑے مجرموں کو پیدا کیا کہ وہاں پر (برے) منصوبے بناتے رہیں (درحقیقت) وہ غیر شعوری طور پر اپنے ہی خلاف منصوبے بناتے ہیں۔

تفسیر آیات

جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ: ہم نے یہ کام کیا کہ مجرموں کو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا۔ جَعَلْنَا کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو نظام ترتیب دیا ہے، اس میں حق اور باطل، دونوں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اسی کو جَعَلْنَا فرمایا ہے کہ جس طرح ہم نے بعض کو زندگی اور روشنی بخشی اور بعض کو اندھیرے میں رکھا، اسی طرح ہم نے ہر بستی، ہر شہر میں بڑے بڑے مجرموں کو پیدا کیا۔ یعنی یہ لوگ ان شہروں کے بڑے لوگ ہوتے ہوتے تھے، جو مجرم ہوتے تھے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت ہمیشہ ان لوگوں کے مفادات کے خلاف ہوتی ہے۔

---

[1] ۷ اعراف: ۱۷۹　[2] ۶۵ طلاق: ۲

ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت ظلم و استحصال کے خلاف ہوتی ہے اور یہ لوگ ظالم ہوتے ہیں اور غریب عوام کا استحصال کرتے ہیں۔ انبیاء (ع) عدل و انصاف کی دعوت دیتے ہیں اور عدل و انصاف سے ہمیشہ ظالم و جابر متاثر ہوتے ہیں اور غریبوں کے فائدے میں ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام انسانوں کو احترام آدمیت اور انسانی حقوق دلانے کے لیے آتے ہیں۔ ان باتوں سے علاقے کے سردارن کی حاکمیت اعلیٰ متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اس الٰہی دعوت کے خلاف سازشوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور اس دعوت کو پھیلنے سے روکنے کے لیے طرح طرح کے مکر و فریب کرتے ہیں۔ جیسے ارشاد ہوا:

وَ اِذَاۤ اَرَدۡنَاۤ اَنۡ نُّہۡلِکَ قَرۡیَۃً اَمَرۡنَا مُتۡرَفِیۡہَا فَفَسَقُوۡا فِیۡہَا فَحَقَّ عَلَیۡہَا الۡقَوۡلُ فَدَمَّرۡنٰہَا تَدۡمِیۡرًا ۝[1]

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاکت میں ڈالنا چاہتے ہیں تو اس کے عیش پرستوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ اس بستی میں فسق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں، تب اس بستی پر فیصلہ عذاب لازم ہوجاتا ہے پھر ہم اسے پوری طرح تباہ کر دیتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

... وَلَوۡ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوۡنَ مَوۡقُوۡفُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚۖ یَرۡجِعُ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضِۣ الۡقَوۡلَ ۚ یَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا لَوۡ لَاۤ اَنۡتُمۡ لَکُنَّا مُؤۡمِنِیۡنَ[2]

اور کاش آپ ان کا وہ حال دیکھ لیتے جب یہ ظالم اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور ایک دوسرے پر الزام عائد کر رہے ہوں گے، (چنانچہ) جو لوگ دبے ہوئے ہوتے تھے، وہ بڑا بننے والوں سے کہیں گے: اگر تم نہ ہوتے تو ہم مؤمن ہوتے۔

تاریخ میں آیا ہے کہ ابوجہل نے کہا: عبد مناف کی اولاد نے شرافت میں ہمارا مقابلہ کیا، جب ہمارا مقابلہ برابر رہا تو ان لوگوں نے کہا: ہمارے درمیان نبی آیا ہے، اس پر وحی ہوتی ہے۔ ہم اسے ہرگز نہیں مانیں گے، جب تک خود ہم پر بھی وحی نازل نہیں ہوتی۔

یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ مکہ کے بڑے سرداروں کی طرف سے سازش، ظلم، دھوکہ دہی اور اذیت دینے جیسے جرائم کا ارتکاب کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر بستی، ہر شہر اور ہر امت کے ساتھ یہی ہوتا رہا ہے۔ یہ الٰہی دعوت کا ایک لازمہ ہے کہ ہر موسیٰ کے مقابلے میں ایک فرعون اور ہر شبیر کے مقابلے میں ایک یزید ہوا کرتا ہے، اس طرح دعوت الی الحق کو مقام ملتا ہے، عند اللّٰہ اہمیت بڑھتی ہے اور امتحان و آزمائش کی شرائط پوری ہو جاتی ہیں اور حکمت الٰہی کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ بیشتر رئیسوں اور سرداروں کی طرف سے اصلاحی تحریک کی مخالفت ہوتی ہے۔

---

[1] ۱۷ اسراء: ۱۶　　[2] ۳۴ سباء: ۳۱

۲۔ مکر و فریب کرنے والے اپنی چالوں کے وبال میں خود پھنس جاتے ہیں۔ وَمَا یَمۡکُرُوۡنَ اِلَّا بِاَنۡفُسِہِمۡ ....

۳۔ قوم کا زوال اس وقت ضرور ہوتا ہے جب اس کے مقدرات چند خوشحال خاندانوں کے ہاتھ میں آ جاتے ہیں۔

وَ اِذَا جَآءَتۡہُمۡ اٰیَۃٌ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ حَتّٰی نُؤۡتٰی مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ رُسُلُ اللّٰہِ ؕۘ اَللّٰہُ اَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَہٗ ؕ سَیُصِیۡبُ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا صَغَارٌ عِنۡدَ اللّٰہِ وَ عَذَابٌ شَدِیۡدٌۢ بِمَا کَانُوۡا یَمۡکُرُوۡنَ ﴿۱۲۴﴾

۱۲۴۔اور جب کوئی آیت ان کے پاس آتی ہے تو کہتے ہیں: ہم اس وقت تک ہرگز نہیں مانیں گے جب تک ہمیں بھی وہ چیز نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے، اللہ (ہی) بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں رکھے، جن لوگوں نے جرم کا ارتکاب کیا انہیں ان کی مکاریوں کی پاداش میں اللہ کے ہاں عنقریب ذلت اور شدید عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔

تفسیر آیت

انہی رئیسوں اور سرداروں کا ذکر ہے کہ وہ اپنے تکبر و نخوت اور حسد کی بنا پر کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو رسالت کا عہدہ مل جائے اور ہم محروم رہ جائیں، کیوں؟ یہ پیغام اگر ہم کو بھی مل جائے تو ہم مان لیں یا ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پیغام ہم ہی کو مل جائے۔ جیسا کہ ولید بن مغیرہ نے کہا: اگر نبوت حق ہے تو اس کا میں زیادہ حقدار ہوں۔ میں تم سے بڑا اور مالدار ہوں۔ ابوجہل نے کہا: ہم ہرگز اس پر راضی نہ ہوں گے، نہ ہم اس کی اتباع کریں گے، مگر یہ کہ ہم پر بھی اسی طرح وحی آ جائے جیسے اس شخص پر آئی ہے۔

جب کہ رسالت الٰہیہ کا عہدہ اس کائنات میں سب سے بڑا منصب اور سب سے سنگین مسئولیت ہے، جسے ہر کس و ناکس نہیں اٹھا سکتا۔ اللہ سب سے بہتر جانتا ہے کہ اس بار سنگین کو کون اٹھا سکتا ہے۔ اس عظیم منصب الٰہیہ کا کون اہل ہے۔ اَللّٰہُ اَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَہٗ ... چنانچہ اللہ کے علم میں تھا کہ اس کائنات میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے افضل کوئی نہیں ہے۔

سَیُصِیۡبُ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا صَغَارٌ : جرم کے ارتکاب کرنے والوں پر وحی کیا نازل ہونا ہے، وہ تو وحی کی دشمنی کی وجہ سے ذلت و خواری سے دوچار ہونے والے ہیں۔ چنانچہ ایک مختصر مدت کے بعد ان لوگوں کا تکبر اور نخوت زمین بوس ہو گئی۔

اہم نکات

۱۔ منصب اگر الٰہی ہے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اہل ہے: اَللّٰہُ اَعۡلَمُ حَیۡثُ یَجۡعَلُ رِسَالَتَہٗ...۔

۲۔ تکبر و نخوت کا انجام ذلت و خواری ہے: سَیُصِیۡبُ الَّذِیۡنَ اَجۡرَمُوۡا صَغَارٌ ....۔

فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یَّہۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَ مَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّہٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ ؕ کَذٰلِکَ یَجۡعَلُ اللّٰہُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾

۱۲۵۔ پس جسے اللہ ہدایت بخشنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان کی طرف چڑھ رہا ہو، ایمان نہ لانے والوں پر اللہ اس طرح ناپاکی مسلط کرتا ہے۔

تفسیر آیات

اگر انسان ہدایت کی اہلیت رکھتا ہے، یعنی وہ فطرت خالص پر قائم ہے اور نفس کی طہارت رکھتا ہے، تکبر و حسد سے پاک، آبائی اندھی تقلید سے دور اور رئیسوں اور سرداروں سے بھی ذہنی طور پر آزاد ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو شرح صدر سے نوازے گا، اب اس کے پاس حق و ہدایت کی باتیں قبول کرنے کے لیے ایک وسیع ظرف اور کھلا سینہ ہو گا۔ پاک طینت ہونے کی وجہ سے وہ اچھی باتوں کا استقبال کرے گا۔ حق کی باتوں سے کیف و سرور حاصل کرے گا۔ نیک اعمال میں سبقت لے جائے گا۔ اسے کار خیر میں حصہ لینے کی توفیق مل جائے گی۔ اس کا قلب ایسا منور ہے کہ حق و باطل میں تمیز کرنے کے ساتھ حقائق کو قبول کرنے کے لیے اس کے پاس ایک وسیع ظرف موجود ہو گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا:

اَفَمَنۡ شَرَحَ اللّٰہُ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ فَہُوَ عَلٰی نُوۡرٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ فَوَیۡلٌ لِّلۡقٰسِیَۃِ قُلُوۡبُہُمۡ مِّنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۝[۱]

کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو اور جسے اپنے رب کی طرف سے روشنی ملی ہو (سخت دل والوں کی طرح ہو سکتا ہے؟) پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل ذکر خدا سے سخت ہو جاتے ہیں یہ لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔

وَمَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّہٗ: چنانچہ شرح صدر کی مزید وضاحت اس کی ضد سے ہوتی ہے، جو ان آیات

---

[۱] ۳۹ زمر: ۲۲

میں مذکور ہے۔ زیر بحث آیت شرح صدر کی ضد، ضیق صدر بتاتی ہے اور مذکورہ آیت میں مذکور شرح صدر جیسا عظیم عطیہ الٰہی جسے حاصل ہو گا، اس کا دل تنگ نہ ہو گا۔ ہدایت کی باتوں اور پاک افکار کے لیے اس کے سینے میں بڑی وسعت ہو گی اور جس کو اللہ خود اس کی شامت اعمال کے نتیجے میں گمراہی میں چھوڑ دینا چاہتا ہے، اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔ جب اسے پاک افکار اور ہدایت کی باتیں بتائی جاتی ہیں تو اچھی باتیں سن کر اس کا دم گھٹتا ہے، گویا کہ وہ بلندی پر چڑھ رہا ہو۔ یہ باتیں اس کے مزاج کے خلاف ہیں۔ ان باتوں سے اسے نفرت ہوتی ہے۔ وہ کہے گا: ان فرسودہ دقیانوسی باتوں کو سننے کا میرے پاس کوئی وقت نہیں ہے۔

یَجۡعَلُ اللّٰہُ الرِّجۡسَ: جب وہ ایمان کی طہارت کو قبول نہیں کرتے تو اللہ ان کو ان کی ناپاکی کی حالت میں چھوڑ دیتا ہے۔

مجمع میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے شرح صدر کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ کیا چیز ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا:

نور يقذفه اللّٰه فى قلب المؤمن فيشرح صدره و ينفسح قالو فهل لذلك امارة يعرف بها؟ فقال نعم: والانابة الى دار الخلود والتَّجَافِى عن دار الغرور و الاستعداد للموت قبل نزوله۔[1]

ایک نور ہے جسے اللہ مؤمن کے دل میں ڈالتا ہے تو اس کا سینہ کشادہ ہوتا ہے اور وسعت آ جاتی ہے۔ پوچھا: اس کی کوئی علامت ہے؟ فرمایا: ہاں! ہمیشہ کے گھر کی طرف متوجہ رہنا، دھوکے کے گھر سے اجتناب کرنا، موت آنے سے پہلے اس کے لیے تیار رہنا۔

اہم نکات

۱۔ اہل حق، پاک افکار سے کیف و سرور میں آتے ہیں۔

۲۔ اہل باطل کے لیے حق کی باتیں گراں اور ناقابل برداشت ہوتی ہیں۔

وَ ہٰذَا صِرَاطُ رَبِّکَ مُسۡتَقِیۡمًا ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّذَّکَّرُوۡنَ ﴿۱۲۶﴾

۱۲۶۔ اور یہ آپ کے رب کا سیدھا راستہ ہے، ہم نے غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں واضح کر دی ہیں۔

لَہُمۡ دَارُ السَّلٰمِ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ وَ ہُوَ وَلِیُّہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾

۱۲۷۔ ان کے پروردگار کے ہاں ان کے لیے سلامتی کا گھر ہے اور ان کے اعمال کے عوض وہی ان کا کارساز ہے۔

---

[1] بحار الانوار ۶۵: ۲۳۶۔ الأمالی للطوسی، ص ۵۳۱ مجلس ۱۹۔ الدر المنثور ۳: ۱۳۰

تفسیر آیات

یہ اسلام، جس کے لیے مؤمن کا سینہ کشادہ اور غیر مؤمن کا سینہ تنگ ہوتا ہے، صراط مستقیم ہے۔ اللہ کی آیات میں غور وفکر وہی لوگ کریں گے جن کے سینے میں ظرفیت ہو۔

روز آخرت اللہ کے امن و سلامتی کے گھر جنت میں یہی لوگ ہوں گے اور اللہ ہی ان کا ولی ہو گا۔ وہاں کسی اور کی حکومت نہیں چلے گی۔

۱۔ صِرَاطُ رَبِّكَ: اپنے رَبْ تک پہنچنے کا راستہ۔ چونکہ تمام مقاصد کا مقصد اعلیٰ رَب تک پہنچنا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۝[1]

اے انسان! تو مشقت اٹھا کر اپنے رب کی طرف جانے والا ہے، پھر اس سے ملنے والا ہے۔

۲۔ مُسْتَقِيْمًا: یہی سیدھا راستہ ہے۔ اسلام دو میں سے ایک حل نہیں، واحد حل ہے۔ دو میں سے ایک راستہ نہیں، واحد راہ مستقیم ہے۔

۳۔ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ: جو لوگ قرآن سے نصیحت حاصل کرتے ہیں، ان کے لیے دَارُ السَّلٰمِ ہے۔ یعنی جنت یا ہر قسم کی آفت سے سلامتی ہے۔

۴۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ: ان کا رب اس کی ضمانت دیتا ہے۔ چونکہ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بما کانوا یعملون وہی ان کے امور کا متولی اور صاحب اختیار ہے۔ ان کے اعمال کا معاوضہ صرف وہی دے سکتا ہے۔ یہ اللہ کی ولایت مطلقہ کا تقاضا ہے۔

اہم نکات

۱۔ عقل و تدبر سے ہی صراط مستقیم اور امن و سلامتی حاصل ہو سکتی ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۭ قَالَ

۱۲۸۔ اور اس دن اللہ سب کو جمع کرے گا (اور فرمائے گا) اے گروہ جنات! تم نے انسانوں (کی گمراہی) میں بڑا حصہ لیا، انسانوں میں سے جنات کے ہمنوا کہیں گے: ہمارے پروردگار! ہم نے ایک دوسرے سے خوب استفادہ کیا ہے اور اب ہم اس وقت کو پہنچ گئے ہیں جو وقت تو نے ہمارے لیے مقرر کر رکھا تھا، اللہ فرمائے گا: اب

---

[1] ۸۴ انشقاق: ٦

النَّارُ مَثۡوٰىكُمۡ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيۡمٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۲۸﴾	آتش جہنم ہی تمہارا ٹھکانا ہے جس میں تم ہمیشہ رہو گے سوائے اس کے جسے اللہ (نجات دینا) چاہے، آپ کا رب یقیناً بڑا حکمت والا، علم والا ہے۔

تفسیر آیات

وَيَوۡمَ يَحۡشُرُهُمۡ جَمِيۡعًا: یعنی جن و انس سب کو ہم جمع کریں گے۔

يٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ: جنوں سے فرمائے گا:

قَدِ اسۡتَكۡثَرۡتُمۡ مِّنَ الۡاِنۡسِ: جنو! تم نے انسانوں کو بہکانے، ان کو راہ راست سے ہٹانے کے لیے خوب کام کیا۔ انسانوں کو گمراہ کرنے والا شیطان، جن ہے، كَانَ مِنَ الۡجِنِّ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهٖ ....[1] تو جنوں کے ہمنوا اور دوست انسانوں کی طرف سے بھی اعتراف ہوگا اور وہ کہیں گے:

رَبَّنَا اسۡتَمۡتَعَ بَعۡضُنَا بِبَعۡضٍ: ہم نے ایک دوسرے سے خوب فائدہ اٹھایا، جنوں کے بہکانے سے انسانوں نے خوب خواہشات سے لذت حاصل کی اور جنوں نے انسانوں کو اپنے پیرو بنا کر خوب مزا اڑایا:

وَّبَلَغۡنَاۤ اَجَلَنَا: اے اللہ تو نے جتنی مہلت ہم کو دے رکھی تھی، اس کے ختم ہونے تک ان جرائم کے ہم مرتکب رہے۔

قَالَ النَّارُ مَثۡوٰىكُمۡ: اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم آتش میں ہمیشہ رہو گے۔

سوال کیا جاتا ہے: ان کے جرائم ایک مدت تک رہے، عذاب ہمیشہ کیوں؟ اس کے کئی جواب ہیں:

i۔ انسانی جرم کا عمل بصورت انرجی ہمیشہ رہتا ہے۔ اس کو اپنا جرم عذاب دے گا، جو ہمیشہ رہے گا۔ اس طرح انسان کا اچھا عمل ساتھ نہیں چھوڑتا اور برا عمل جان نہیں چھوڑتا۔

ii۔ قتل کرنے پر مختصر وقت لگتا ہے، عمر قید کیوں؟

iii۔ مجرم نے جرم کو ختم نہیں کیا بلکہ مجرم خود ختم ہو گیا۔ اگر مجرم جرم کو ختم کر کے توبہ انابت کرتا، سابقہ جرم کو اللہ اس سے ہٹا دیتا۔

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ: صرف اپنی قدرت کی طرف اشارہ ہے کہ سزا ہمیشہ رکھنا اللہ کی قدرت میں ہے یا ان لوگوں کو استثنا کرنا مقصود ہو سکتا ہے، جن کا دائمی نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ اعتراف جرم کا مرحلہ سخت ترین مرحلہ ہوتا ہے: رَبَّنَا اسۡتَمۡتَعَ بَعۡضُنَا بِبَعۡضٍ ....۔

---

[1] ۱۸ کھف: ۵۰ (ترجمہ) وہ (ابلیس) جنات میں سے تھا، پس وہ اپنے رب کی اطاعت سے خارج ہو گیا۔

۲۔ سزا سننے کا مرحلہ اس سے بھی سخت ہوتا ہے: قَالَ النَّارُ مَثۡوٰىكُمۡ ....

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيۡ بَعۡضَ الظّٰلِمِيۡنَ بَعۡضًاۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۱۲۹﴾

۱۲۹۔اور اس طرح ہم ظالموں کو ان کے کرتوتوں کی وجہ سے جو وہ کر رہے ہیں ایک دوسرے پر مسلط کریں گے۔

تفسیر آیات

جب لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں اور شیطان کی اطاعت کرتے ہیں تو اللہ بھی ان میں سے ہر ایک کو دوسرے پر حاکم اور مسلط کر دیتا ہے۔ ایک ظالم دوسرے ظالم پر حاکم اور مسلط ہو گا تو وہ مزید ظلم اور گمراہی میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ سب خود ان کے اعمال کا قدرتی نتیجہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی ولایت اور حاکمیت سے نکلنے کے بعد ظالم کے زیر تسلط جانا ہوگا: نُوَلِّيۡ بَعۡضَ الظّٰلِمِيۡنَ ۔

۲۔ بداعمالیوں کی وجہ سے ظالم حکمران مسلط ہوتا ہے۔ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ۔

يٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ رُسُلٌ مِّنۡكُمۡ يَقُصُّوۡنَ عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِيۡ وَيُنۡذِرُوۡنَكُمۡ لِقَآءَ يَوۡمِكُمۡ هٰذَا ؕ قَالُوۡا شَهِدۡنَا عَلٰۤى اَنۡفُسِنَا وَغَرَّتۡهُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا وَشَهِدُوۡا عَلٰۤى اَنۡفُسِهِمۡ اَنَّهُمۡ كَانُوۡا كٰفِرِيۡنَ ﴿۱۳۰﴾

۱۳۰۔ اے گروہ جن و انس ! کیا تمہارے پاس خود تم میں سے رسول نہیں آئے تھے جو میری آیات تمہیں سناتے تھے اور آج کے دن کے وقوع کے بارے میں تمہیں متنبہ کرتے تھے؟ وہ کہیں گے: ہم اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں اور دنیاوی زندگی نے انہیں دھوکہ دے رکھا تھا اور (آج) وہ اپنے خلاف گواہی دے رہے ہیں کہ وہ کافر تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ رُسُلٌ مِّنۡكُمۡ : اے گروہ جن و انس! تمہارے پاس خود تم میں سے رسول نہیں آئے؟ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جنات میں سے بھی رسول آئے تھے اور یہ ثابت ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جنات کی طرف بھی مبعوث تھے۔ لہٰذا یہاں جن و انس کو مجموعاً مخاطب قرار دے کر مِّنۡكُمۡ فرمایا ہے۔

۲۔ شَہِدۡنَا عَلٰۤی اَنۡفُسِنَا: دوسرا نکتہ یہ ہے کہ بروز قیامت جب اللہ تعالیٰ بندوں سے حساب لے گا اور ان سے جواب طلبی فرمائے گا تو اس بات کا سب لوگ اعتراف کریں گے کہ دین کو قبول نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ دین کی منطق ناقابل فہم تھی، وَّ غَرَّتۡہُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا بلکہ وجہ یہ تھی کہ دنیاوی زندگی کی رعنائیوں نے انہیں دھوکہ دیا اور دعوت دین کو مسترد کر دیا۔

اہم نکات

۱۔ خواہش پرستی، حقائق کو سمجھنے کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

ذٰلِکَ اَنۡ لَّمۡ یَکُنۡ رَّبُّکَ مُہۡلِکَ الۡقُرٰی بِظُلۡمٍ وَّ اَہۡلُہَا غٰفِلُوۡنَ ﴿۱۳۱﴾

۱۳۱۔ وہ اس لیے کہ آپ کا رب بستیوں کو ظلم سے اس حال میں تباہ نہیں کرتا کہ اس کے باشندے بے خبر ہوں۔

تفسیر آیات

اللہ نے فرمایا کہ ہم نے پیغمبروں کو بھیجا اور لوگوں کو تنبیہ کی تا کہ قیامت کے دن سے ڈرایا جائے، وہ سب اس لیے کیا کہ یہ عدل الٰہی کے خلاف ہے کہ حجت تمام کرنے سے پہلے بے خبری میں لوگوں پر عذاب نازل کرے۔ اگر ایسا کرتا تو ظلم ہوتا۔

بِظُلۡمٍ: کی ایک تفسیر یہ ہے کہ ان بستیوں کو ان کے ظلم کی سزا میں ہلاک نہیں کرتے، اگر وہ غافل ہوں اور ان پر حجت پوری نہ ہوئی ہو۔ عذاب صرف اس صورت میں نازل ہوتا ہے جب ہماری حجت ان تک پہنچ جائے اور وہ از روئے عناد اس حجت کو مسترد کر دیں۔

وَ لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا ؕ وَ مَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾

۱۳۲۔ اور ہر شخص کے لیے اس کے اعمال کے مطابق درجات ہوں گے اور آپ کا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا: جن و انس میں سے ہر ایک کو اپنے عمل کے مطابق درجہ ملے گا یا یہ کہ ہر شخص کو اس کے عمل اور عمل کنندہ کے اعتبار سے درجہ ملے گا۔ چونکہ عمل، عمل میں فرق ہوتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

افضل الاعمال احمزھا۔[1] — اعمال میں بہتر وہ ہے جو زیادہ مشقت سے بجالایا جائے.

---

[1] مفتاح الفلاح ص ۴۵ فصل و اذا فرغت ... ۔ بحار الانوار ۶۷: ۱۹۰۔ تفسیر البیضاوی ۱: ۲۷۱۔، تفسیر روح المعانی ۲: ۱۰۵

۲۔ مِّمَّا عَمِلُوۡا: میں عمل خیر اور شر دونوں شامل ہیں۔ اس صورت میں درجات میں درکات بھی شامل ہیں۔ انسانی عمل ہی ہے جس سے درجات کی بلندی مل جاتی ہے یا درکات کی پستی میں چلا جاتا ہے۔ یعنی انسان کی قسمت کا فیصلہ اس کا عمل کرتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ درجات کا استحقاق عمل کی نوعیت اور عمل کنندہ کی حیثیت سے ہوتا ہے: وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا...۔

وَ رَبُّكَ الۡغَنِىُّ ذُو الرَّحۡمَةِ ؕ اِنۡ يَّشَاۡ يُذۡهِبۡكُمۡ وَ يَسۡتَخۡلِفۡ مِنۡۢ بَعۡدِكُمۡ مَّا يَشَآءُ كَمَاۤ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنۡ ذُرِّيَّةِ قَوۡمٍ اٰخَرِيۡنَ ؕ﴿۱۳۳﴾

۱۳۳۔ اور آپ کا رب بے نیاز ہے، رحمت کا مالک ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں ختم کر کے تمہاری جگہ جسے چاہے جانشین بنا دے، جیسا کہ خود تمہیں دوسری قوم کی نسل سے پیدا کیا ہے۔

اِنَّ مَا تُوۡعَدُوۡنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ ﴿۱۳۴﴾

۱۳۴۔ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، بے شک وہ واقع ہونے ہی والا ہے اور تم (اللہ کو) مغلوب نہیں کر سکتے۔

قُلۡ يٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ اِنِّىۡ عَامِلٌ ۚ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۙ مَنۡ تَكُوۡنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾

۱۳۵۔ کہد یجیے: اے میری قوم! تم اپنی جگہ عمل کرتے جاؤ میں بھی عمل کرتا ہوں، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کا انجام کار اچھا ہوتا ہے (بہرحال) ظالموں کے لیے فلاح کی کوئی گنجائش نہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَرَبُّكَ الۡغَنِىُّ ذُو الرَّحۡمَةِ: اللہ تعالیٰ بے نیاز اور رحمت کا مالک ہے لہٰذا وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا کیونکہ کسی پر ظلم و زیادتی وہ کرے گا جو ضرورت مند اور محتاج ہو یا بلا ضرورت بھی ظلم صادر ہو سکتا ہے، اگر اس کے پاس رحم کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ایک طرف تو عالمین سے بے نیاز ہے، اسے کسی چیز کی ضرورت ہے نہ کسی سے کوئی خوف ہے اور دوسری طرف اللہ رحمت کا مالک ہے۔ حدیث کے مطابق اس کی رحمت تو غضب سے پہلے کارفرما ہوتی ہے۔[۱] بے نیازی اور رحمت صرف ذات الٰہی میں مجتمع ہے۔

---

[۱] یا من سبقت رحمته غضبه ۔ بحار الانوار ۸۷: ۱۵۷ ۔ صحیح مسلم کتاب التوبة۔

۲۔ اِنۡ یَّشَاۡ یُذۡہِبۡکُمۡ : اگر اللہ کی مشیت میں آ جائے تو وہ اپنی بے نیازی کے تحت تم مشرکین کو ختم کر کے تمہاری جگہ صالح نسلوں کو پیدا کر سکتا ہے اور ان پر اپنی رحمتیں نازل کر سکتا ہے۔

۳۔ مِّنۡ ذُرِّیَّۃِ قَوۡمٍ اٰخَرِیۡنَ : جس طرح تم مشرکین کو دوسری قوم کی نسل سے پیدا کیا ہے۔ یعنی موجودہ قوم گزشتہ اسلاف سے پیدا ہوئی ہے۔ بعض نے دوسری قوم سے مراد نوح (ع) کی نسل لی ہے، جس پر کوئی قرینہ، دلیل نہیں ہے۔

۴۔ اِنَّ مَا تُوۡعَدُوۡنَ لَاٰتٍ : اس سلسلے میں جو وعید و تنبیہ ہو رہی ہے، اس کے نفاذ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ظالموں کو اپنے انجام تک پہنچانے کا جو فیصلہ ہے، وہ اٹل ہے۔ البتہ توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ اس صورت میں موضوع بدل جانے سے حکم خود بخود بدل جاتا ہے۔

۵۔ قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا : ناقابل ہدایت مشرکین کے لیے آخری حجت یہ ہے کہ اگر تم راہ راست پر نہیں آتے تو اپنی بد اعمالیوں میں مگن رہو، اِنِّیۡ عَامِلٌ میں بھی اپنی تبلیغ رسالت کا کام جاری رکھتا ہوں، فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ عنقریب تمہیں خبر ہوگی کہ کس کا انجام کیا ہوگا۔ بہرحال یہ تو طے ہے کہ ظالموں کا انجام برا ہوگا.

اہم نکات

۱۔ اللہ کی بے نیازی اور رحم بندوں کے لیے مرکز امید ہے۔

۲۔ قرآن ایک بار پھر اسلام کی فتح کی نوید سناتا ہے۔ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ....

وَ جَعَلُوۡا لِلّٰہِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الۡحَرۡثِ وَ الۡاَنۡعَامِ نَصِیۡبًا فَقَالُوۡا ہٰذَا لِلّٰہِ بِزَعۡمِہِمۡ وَ ہٰذَا لِشُرَکَآئِنَا ۚ فَمَا کَانَ لِشُرَکَآئِہِمۡ فَلَا یَصِلُ اِلَی اللّٰہِ ۚ وَ مَا کَانَ لِلّٰہِ فَہُوَ یَصِلُ اِلٰی شُرَکَآئِہِمۡ ؕ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ﴿۱۳۶﴾

۱۳۶۔ اور یہ لوگ اللہ کی پیدا کردہ چیزوں مثلاً کھیتی اور چوپاؤں میں اللہ کا ایک حصہ مقرر کرتے ہیں اور اپنے زعم میں کہتے ہیں: یہ حصہ اللہ کا ہے اور یہ ہمارے شریکوں (بتوں) کا ہے تو جو (حصہ) ان کے شریکوں کے لیے (مخصوص) ہے وہ اللہ کو نہیں پہنچتا، مگر جو (حصہ) اللہ کے لیے (متعین) ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے، یہ لوگ کتنے برے فیصلے کرتے ہیں۔

تشریح کلمات

ذَرَاَ : (ذ ر ء) کے معنی ہیں، اللہ نے جس چیز کا ارادہ کیا اسے ظاہر کر دیا۔ پیدا کرنا۔

تفسیر آیات

مشرکین اپنی نذر و نیاز کے دو حصے کرتے تھے۔ ایک حصہ اللہ کے نام اور دوسرا حصہ ان شریکوں (بتوں) کے نام کرتے تھے تاکہ ان کے طفیل مال و دولت میں برکت آئے۔ اگر کسی وجہ سے ان دونوں حصوں میں سے کسی ایک حصہ میں کوئی کمی بیشی ہو جاتی تو اللہ کے حصے سے شریکوں کے حصے تلافی کرتے تھے لیکن شریکوں (بتوں) کے حصے کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ یعنی اگر کسی وجہ سے شریکوں کے حصے میں کمی ہو جاتی تو اللہ کے حصے سے اس کمی کو پورا کرتے تھے لیکن اگر اللہ کے حصے میں کمی ہو جاتی تو شریکوں کے حصے سے اسے پورا نہیں کرتے تھے۔

اس خرافات کے پیچھے مذہبی استحصالی اور مفاد پرستانہ عوامل کارفرما تھے۔ کیونکہ اللہ کا حصہ تو فقیروں اور مساکین پر صرف کرتے تھے اور شریکوں کا حصہ بتوں کے مجاوروں اور ایک خاص طبقہ کی جیب میں جاتا تھا، اس لیے ان لوگوں نے اپنے زعم باطل کی یہ توجیہ گھڑ دی تھی کہ اللہ تو بے نیاز ہے، اس میں کمی آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اللہ کے ان برگزیدہ بتو ں کے حصوں میں کمی نہیں آنی چاہیے۔ اللہ پر بتوں کو ترجیح دینا، یہ کس قدر برا فیصلہ ہے: سَآءَ مَا يَحۡكُمُوۡنَ ۔

اہم نکات

۱۔ توحید خالص یہ ہے کہ صرف اللہ ہی سے اپنی امیدیں وابستہ رکھے اور وسیلہ بھی صرف انہی کو بنائے جو اللہ کی طرف سے ہوں۔

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيۡرٍ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ قَتۡلَ اَوۡلَادِهِمۡ شُرَكَآؤُهُمۡ لِيُرۡدُوۡهُمۡ وَ لِيَلۡبِسُوۡا عَلَيۡهِمۡ دِيۡنَهُمۡ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوۡهُ فَذَرۡهُمۡ وَمَا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۳۷﴾

۱۳۷۔ اور اسی طرح ان کے شریکوں نے اکثر مشرکوں کی نظر میں انہی کے بچوں کے قتل کو ایک اچھے عمل کے طور پر جلوہ گر کیا ہے تاکہ انہیں ہلاکت میں ڈال دیں اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ بنا دیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر سکتے پس آپ انہیں بہتان تراشی میں چھوڑ دیں۔

تشریح کلمات

اردی: (ر د ی) الارداء ہلاک کر دینا۔

ذَرۡهُمۡ: چھوڑ دو ان کو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَكَذٰلِكَ: جس طرح اللہ پر بتوں کو ترجیح دینا ان کے لیے خوشنما بنا دیا گیا ہے، اسی طرح قتل اولاد بھی ہے۔

۲۔ قَتۡلَ اَوۡلَادِهِمۡ: اولاد کے قتل کو شرک کے عقیدہ نے خوشنما بنا دیا یا شریک سے مراد بتوں کے مجاورین ہوں تو ان لوگوں نے اولاد کے قتل کو ایک احسن عمل کر کے دکھایا۔ چنانچہ عرب جاہلیت کے زمانے میں قتل اولاد کی تین صورتیں رائج تھیں:

i۔ بچوں کو بتوں کی خوشنودی کے لیے قربان کرنا۔ اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت میں اس نوعیت کے قتل کا ذکر ہے۔ باقی قتل کا بتوں سے تعلق نہیں ہے۔

ii۔ لڑکیوں کا زندہ درگور کرنا کہ لڑائیوں میں دشمن کے ہاتھ اسیر نہ بن جائیں یا کسی اور وجہ سے باعث عار و ننگ نہ بن جائیں۔ ایک احتمال کے مطابق ممکن ہے کہ اس قسم کے قتل کا بھی بتوں سے کوئی تعلق ہو۔

iii۔ قحط و افلاس کی وجہ سے بھی بچوں کو قتل کر دیتے تھے۔ جیسا کہ بعض دوسری آیات میں صریحاً اس کا ذکر ہے۔

۳۔ وَلِيَلۡبِسُوۡا عَلَيۡهِمۡ دِيۡنَهُمۡ: قتل اولاد کو خوشنما بنانے والے کے دو مقاصد تھے: ایک تو لِيُرۡدُوۡهُمۡ مشرک اور کافر بنا کر ہلاکت میں ڈال دے۔ دوسرا یہ کہ ان کے دین کو ان کے لیے مشتبہ بنا دے۔ یعنی ان کا دین، اسماعیلی دین برحق تھا، جسے مشتبہ بنا کر اس کی شکل بگاڑ دی۔

۴۔ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ: اگر اللہ طاقت استعمال فرماتا تو یہ لوگ اس جرم کا ارتکاب نہیں کر سکتے تھے مگر اللہ ایسا نہیں کرتا۔

۵۔ فَذَرۡهُمۡ: ان کو ان کے حال پر چھوڑنا، سب سے بڑی سزا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی بارگاہ سے دور ہونے کی صورت میں شیطان ہر عمل زشت کو خوشنما بنا دیتا ہے، ہلاکت میں ڈال دیتا ہے اور دین کو مشتبہ بناتا ہے: وَلِيَلۡبِسُوۡا عَلَيۡهِمۡ دِيۡنَهُمۡ ....

وَقَالُوۡا هٰذِهٖۤ اَنۡعَامٌ وَّحَرۡثٌ حِجۡرٌ ۖ لَّا يَطۡعَمُهَاۤ اِلَّا مَنۡ نَّشَآءُ	۱۳۸۔ اور یہ کہتے ہیں: یہ جانور اور کھیتی ممنوع ہیں انہیں صرف وہی کھا سکتے ہیں جنہیں ان کے زعم

بِزَعۡمِہِمۡ وَ اَنۡعَامٌ حُرِّمَتۡ ظُہُوۡرُہَا وَ اَنۡعَامٌ لَّا یَذۡکُرُوۡنَ اسۡمَ اللّٰہِ عَلَیۡہَا افۡتِرَآءً عَلَیۡہِ ؕ سَیَجۡزِیۡہِمۡ بِمَا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۳۸﴾

میں ہم کھلانا چاہیں اور کچھ جانور ایسے ہیں جن کی پیٹھ (پر سواری یا بار برداری) حرام ہے اور کچھ جانور ایسے ہیں جن پر محض اللہ پر بہتان باندھتے ہوئے اللہ کا نام نہیں لیتے، اللہ عنقریب انہیں ان کی بہتان تراشیوں کا بدلہ دے گا۔

تشریح کلمات

حِجۡرٌ: (ح ج ر) حرام اور ممنوع چیز کو کہتے ہیں۔ اصل میں یہ پتھروں کے احاطے کو کہتے ہیں، جس کے حصار میں آنے والی چیز محفوظ اور دوسروں کے لیے ممنوع ہوتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالُوۡا ہٰذِہٖۤ اَنۡعَامٌ وَّ حَرۡثٌ: وہ جانوروں اور کھیتی کی فصلوں کو اپنے خود ساختہ خداؤں کے نام نذر کرتے تھے اور ان نذرانوں کو صرف ان خداؤں کے خدمت گزار مردوں کو کھانے کی اجازت تھی، عورتوں کے لیے اجازت نہ تھی۔

۲۔ وَاَنۡعَامٌ حُرِّمَتۡ ظُہُوۡرُہَا: کچھ جانور ایسے تھے جن پر سوار ہونا حرام سمجھا جاتا تھا۔ ان جانوروں کا ذکر سورہ مائدہ آیت ۱۰۳ میں گزر چکا ہے۔

۳۔ وَاَنۡعَامٌ: کچھ جانور ایسے بھی تھے جن پر اللہ کا نام لینا ممنوع تھا بلکہ وہ ان پر صرف اپنے بتوں کا نام لیتے تھے۔ ان پر سوار ہو کر حج کرنا ممنوع تھا۔

۴۔ افۡتِرَآءً عَلَیۡہِ: وہ ان خرافات کو اللہ کی طرف نسبت دیتے تھے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اللہ پر افترا باندھنا بہت بڑا جرم ہے۔ اس کا اندازہ اگلے جملے سے ہوتا ہے، جس میں فرمایا:

۵۔ سَیَجۡزِیۡہِمۡ بِمَا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ: اس افتراء کی سزا اللہ ان کو دے گا۔

وَ قَالُوۡا مَا فِیۡ بُطُوۡنِ ہٰذِہِ الۡاَنۡعَامِ خَالِصَۃٌ لِّذُکُوۡرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤی اَزۡوَاجِنَا ۚ وَ اِنۡ یَّکُنۡ مَّیۡتَۃً فَہُمۡ فِیۡہِ شُرَکَآءُ ؕ سَیَجۡزِیۡہِمۡ وَصۡفَہُمۡ ؕ اِنَّہٗ حَکِیۡمٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۳۹﴾

۱۳۹۔ اور کہتے ہیں: جو (بچہ) ان جانوروں کے شکم میں ہے وہ صرف ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری بیویوں پر حرام ہے اور اگر وہ (بچہ) مرا ہوا ہو تو وہ سب اس میں شریک ہیں، اللہ ان کے اس بیان پر انہیں عنقریب سزا دے گا، یقیناً وہ بڑا حکمت والا، دانا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالُوۡامَافِیۡ بُطُوۡنِ: جاہلیت کی خودساختہ شریعت کا ایک حکم یہ تھا کہ بعض مخصوص جانوروں کے بچے اگر زندہ پیدا ہو جاتے تو ان کا گوشت صرف مَردوں پر حلال تھا، اگر مردہ پیدا ہوتے تو مرد و زن سب کھا سکتے تھے۔

۲۔ سَیَجۡزِیۡہِمۡ وَصۡفَہُمۡ: حلال وحرام کا قانون بنانا اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلا میں مداخلت ہے، جو بہت بڑا جرم ہے۔ اس لیے فرمایا: ان کے اس حلال وحرام کے قانون بنانے پر اللہ سخت سزا دے گا۔

واضح رہے مَافِیۡ بُطُوۡنِ میں مَا سے مراد جنین کی جمع اجنّہ ہے۔ اس لیے خالصۃٌ مؤنث ہے اور لفظ کے اعتبار سے مُحَرَّمٌ مذکر آیا ہے۔

قَدۡ خَسِرَ الَّذِیۡنَ قَتَلُوۡۤا اَوۡلَادَہُمۡ سَفَہًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَّ حَرَّمُوۡا مَا رَزَقَہُمُ اللّٰہُ افۡتِرَآءً عَلَی اللّٰہِ ؕ قَدۡ ضَلُّوۡا وَ مَا کَانُوۡا مُہۡتَدِیۡنَ ﴿۱۴۰﴾

۱۴۰۔ وہ لوگ یقیناً خسارے میں ہیں جنہوں نے بیوقوفی سے جہالت کی بنا پر اپنی اولاد کو قتل کیا اور اللہ نے جو رزق انہیں عطا کیا ہے اللہ پر بہتان باندھتے ہوئے اسے حرام کر دیا، بے شک یہ لوگ گمراہ ہو گئے اور ہدایت پانے والے نہ تھے۔

تفسیر آیات

عرب جاہلیت اپنی بے عقلی اور نادانی میں انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ انسان کے لیے دو چیزیں باعث زینت وتقویت ہیں: مال اور اولاد۔ یہ بدو عرب اولاد کو قتل کرتے اور رزق خدا کا ایک حصہ اپنے اوپر حرام کرتے تھے۔ اس طرح وہ دنیا و آخرت دونوں میں خسارے میں رہ گئے تھے۔ اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے۔

افۡتِرَآءً عَلَی اللّٰہِ: پھر اس عقلی بے مائیگی کو اللہ کی طرف نسبت دیتے ہیں۔ اس طرح اس جرم میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَ جَنّٰتٍ مَّعۡرُوۡشٰتٍ وَّ غَیۡرَ مَعۡرُوۡشٰتٍ وَّ النَّخۡلَ وَ الزَّرۡعَ مُخۡتَلِفًا اُکُلُہٗ وَ الزَّیۡتُوۡنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِہًا وَّ

۱۴۱۔ اور وہ وہی ہے جس نے مختلف باغات پیدا کیے کچھ چھتریوں چڑھے ہوئے اور کچھ بغیر چڑھے نیز کھجور اور کھیتوں کی مختلف ماکولات اور زیتون اور انار جو باہم مشابہ بھی ہیں اور غیر

غَيۡرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَاٰتُوۡا حَقَّهٗ يَوۡمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسۡرِفُوۡا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الۡمُسۡرِفِيۡنَ ﴿۱۴۱﴾

مشابہ بھی پیدا کیے، تیار ہونے پر ان پھلوں کو کھاؤ، البتہ ان کی فصل کاٹنے کے دن اس (اللہ) کا حق (غریبوں کو) ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو، بتحقیق اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

تشریح کلمات

مَّعۡرُوۡشٰتٍ: (ع ر ش) العرش اصل میں چھت والی چیز کو کہتے ہیں۔ اسی سے عرشت الکرم و عرشته کا محاورہ ہے، جس کے معنی انگور کی بیلوں کے لیے بانس، ٹٹیاں وغیرہ بنانے کے ہیں۔

حَصَادِهٖ: (ح ص د) الحصاد کھیتی کاٹنے کے معنوں میں ہے۔

الۡمُسۡرِفِيۡنَ: (س ر ف) الاسراف کے معنی انسان کے کسی کام میں حد اعتدال سے تجاوز کر جانے کے ہیں، مگر عام طور پر اس کا استعمال انفاق یعنی خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کرنے پر ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَّعۡرُوۡشٰتٍ وَّغَيۡرَ مَعۡرُوۡشٰتٍ: یہاں دو قسم کے باغوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ باغ جس میں بیلیں چھتریوں پر چڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ مثلاً انگور کے باغات۔ ان کو جَنّٰتٍ مَّعۡرُوۡشٰتٍ کہا ہے اور دوسرا وہ باغ جس کے درخت اپنے تنوں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ ان پھلوں اور فصلوں کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔

۲۔ النَّخۡلَ وَالزَّرۡعَ مُخۡتَلِفًا: کھجور، پھل اور کھیتوں کی فصلیں مختلف ہوتی ہیں۔ اکل، یعنی مأکولات، زراعت کی فصلیں اور دانے مختلف ہوتے ہیں رنگ میں، خاصیت میں، لذت میں۔ اُكُلُهٗ میں ضمیر الزرع کی طرف ہے۔ اگر نخل کے لیے بھی ہوتا تو اکلھا فرماتا۔ اس میں شاید یہ اشارہ ہو کہ کھجور کی بھی اگرچہ قسمیں ہیں لیکن الزَّرۡعَ کی قسمیں بہت زیادہ اور خاصیتیں، لذتیں بھی بے شمار ہیں۔

۳۔ وَالزَّيۡتُوۡنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا: زیتون اور انار کے درخت دیکھنے میں متشابہ ہیں، لذت میں غیر متشابہ ہیں۔

۴۔ كُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ: پھل تیار ہونے پر کھانے کا حکم مباح کے لیے ہے اور اس نعمت کی یاد دہانی بھی ہو سکتی ہے۔

۵۔ وَاٰتُوۡا حَقَّهٗ يَوۡمَ حَصَادِهٖ: فصل کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔ کیا یہ حق زکوٰۃ کے علاوہ ہے؟ کیونکہ زکوٰۃ مدینے میں ہجرت کے دوسرے سال فرض ہوئی تھی اور یہ سورہ مکی ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ فرض زکوٰۃ

سے پہلے ان مذکورہ چیزوں پر صدقہ دینا واجب تھا، بعد میں زکوٰۃ کے حکم سے منسوخ ہو گیا ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ یہ حکم زکوٰۃ ہی سے متعلق ہے مگر مکی سورتوں میں زکوٰۃ کا اجمالی ذکر آیا ہے۔ اس کی تفصیل بعد میں مدنی سورتوں میں آئی۔ جیسا کہ سورہ مزمل جو مکی ہے، میں اجمالی حکم آیا:

اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ اَقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا ....[1] نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو قرض حسنہ دو....

چنانچہ دوسرے بہت سے احکام کا بیان اسی طرح تدریجی مراحل میں ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ امامیہ کتب میں یہ روایت موجود ہے کہ اس حق سے مراد فصل کاٹتے وقت کچھ مقدار غرباء اور مساکین کو دینے کا حکم ہے۔ البتہ یہ زکوٰۃ مستحب ہے، واجب نہیں ہے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ اگر فصل کاٹنے کے وقت غرباء اور مساکین نہ ہوں تو کیا حکم ہے؟ آپؑ نے فرمایا: لیس علیہ شیء۔ اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

اہم نکات

۱۔ تخلیق کائنات میں کسی ارادہ و شعور کو دخل نہ ہوتا تو یہ مختلف میوے بے شعور مادہ نے کیوں پیدا کیے؟

۲۔ قدرت کا مقصد انسان کو صرف زندہ رکھنا ہوتا تو صرف گندم یا جو کا دانہ کافی تھا۔ مختلف لذتوں کے میوے اس کی نعمت ہیں۔

۳۔ پیداوار پر فقراء اور مساکین کا زکوٰۃ و خمس کے علاوہ بھی ایک حق ہے جو انسانی و اخلاقی اعتبار سے ہے۔

وَ مِنَ الۡاَنۡعَامِ حَمُوۡلَۃً وَّ فَرۡشًا ؕ کُلُوۡا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ ؕ اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۴۲﴾

۱۴۲۔ اور مویشیوں میں کچھ بوجھ اٹھانے والے (پیدا کیے) اور کچھ بچھانے (کے وسائل فراہم کرنے) والے، اللہ نے تمہیں جو رزق دیا ہے اس میں سے کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

تفسیر آیات

مختلف جانوروں کا ذکر ہے، جنہیں انسان کے لیے مسخر کیا گیا ہے۔ ان نعمتوں کو تمہارے لیے حلال

---

[1] ۷۳ مزمل: ۲۰

کیا گیا۔ شیطان کی پیروی کر کے ان کو حرام قرار نہ دو۔ حَمُوۡلَۃً وہ جانور ہیں جو بوجھ اٹھانے کے قابل ہیں۔ جیسے اونٹ وغیرہ۔ فَرۡشًا سے مراد چھوٹے جانور ہیں، جیسے بھیڑ بکریاں۔ ان کا وجود تقریباً زمین بوس ہونے کی وجہ سے انہیں فرش کہا گیا ہے یا چونکہ ان کی اون اور کھال بچھانے کے کام آتی ہے، اس لیے انہیں فرش کہا گیا ہو۔

بعض اہل نظر کے نزدیک حَمُوۡلَۃً بوجھ اٹھانے والے جانور ہیں اور فَرۡشًا سواری کے جانور ہیں۔

کُلُوۡا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ: کھانے کا حکم برائے مباح ہے۔ حلال ہونے کا حکم ہے اور نعمت الٰہی کے تذکر کے لیے بھی ہوسکتا ہے۔

خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ: اس حلال کو شیطان کی پیروی کر کے حرام نہ کرو۔

اہم نکات

۱۔ خدا کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دینا کفران نعمت اور شیطان کی پیروی ہے: کُلُوۡا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ ....

ثَمٰنِیَۃَ اَزۡوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاۡنِ اثۡنَیۡنِ وَ مِنَ الۡمَعۡزِ اثۡنَیۡنِ ؕ قُلۡ ءٰٓالذَّکَرَیۡنِ حَرَّمَ اَمِ الۡاُنۡثَیَیۡنِ اَمَّا اشۡتَمَلَتۡ عَلَیۡہِ اَرۡحَامُ الۡاُنۡثَیَیۡنِ ؕ نَبِّـُٔوۡنِیۡ بِعِلۡمٍ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۴۳﴾

۱۴۳۔ (اللہ نے) آٹھ جوڑے (پیدا کیے) ہیں، دو بھیڑ کے اور دو بکری کے، آپ ان سے پوچھ لیجیے: کیا اللہ نے دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادائیں؟ یا وہ (بچے) جو دونوں ماداؤں (بھیڑ یا بکری) کے پیٹ میں ہیں؟ اگر تم لوگ سچے ہو تو مجھے کسی علمی حوالے سے بتاؤ۔

تفسیر آیات

۱۔ ثَمٰنِیَۃَ اَزۡوَاجٍ: آٹھ زوج۔ زوج اس ایک کو کہتے ہیں جو اپنی ہی جنس سے کوئی دوسرا اس کا جفت ہو۔ چنانچہ فرمایا: وَ اَنَّہٗ خَلَقَ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّکَرَ وَ الۡاُنۡثٰی[1] ذکر و انثی کو ایک نہیں، دو زوج فرمایا ہے اور کبھی زوج سے دونوں مراد لیے جاتے ہیں۔

۲۔ قُلۡ ءٰٓالذَّکَرَیۡنِ: مویشیوں میں آٹھ جوڑے ہیں۔ بتاؤ ان میں سے اللہ نے دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادائیں یا دونوں ماداؤں کے پیٹ میں جو بچے ہیں، ان کو حرم کیا ہے۔ اس حرمت پر کوئی علمی سند پیش کرو۔

----

[1] ۵۳ نجم: ۴۵

۳۔ نَبِّئُوۡنِیۡ بِعِلۡمٍ : ان کی حرمت پر علمی دلیل پیش کرو کہ اللہ نے کس آسمانی کتاب میں یا کس نبی پر یہ حکم نازل کیا ہے۔ اندازہ ہو رہا ہے کہ بلاسند اور بلا دلیل کسی حکم کا اللہ کی طرف نسبت دینا کتنا بڑا جرم ہے۔

وَ مِنَ الۡاِبِلِ اثۡنَیۡنِ وَ مِنَ الۡبَقَرِ اثۡنَیۡنِ ؕ قُلۡ ءٰٓالذَّکَرَیۡنِ حَرَّمَ اَمِ الۡاُنۡثَیَیۡنِ اَمَّا اشۡتَمَلَتۡ عَلَیۡہِ اَرۡحَامُ الۡاُنۡثَیَیۡنِ ؕ اَمۡ کُنۡتُمۡ شُہَدَآءَ اِذۡ وَصّٰکُمُ اللّٰہُ بِہٰذَا ۚ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۴۴﴾

۱۴۴۔ اور دو اونٹوں میں سے اور دو گایوں میں سے، (یہ بھی) پوچھ لیں کہ کیا اس نے دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادائیں؟ یا وہ (بچے) جو دونوں ماداؤں کے پیٹ میں ہیں؟ کیا تم اس وقت موجود تھے جب اللہ تمہیں یہ حکم دے رہا تھا؟ پس اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھ تاکہ لوگوں کو بغیر کسی علم کے گمراہ کرے؟ تحقیق اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ ءٰٓالذَّکَرَیۡنِ : چار جانوروں کا ذکر ہے۔ بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے۔ چار نر اور چار مادہ کی مجموعی تعداد آٹھ ہو گئی۔ یہاں جاہلی خرافات کی نامعقولیت بیان ہو رہی ہے کہ ایک ہی جانور کا نر حلال ہو اور مادہ حرام یا جانور خود تو حلال ہو مگر اس کے پیٹ میں موجود بچہ حرام ہو۔ کس قدر نامعقول ہے۔

۲۔ اَمۡ کُنۡتُمۡ شُہَدَآءَ : کیا تم حاضر تھے، جب اللہ ان چیزوں کی حرمت کا حکم دے رہا تھا کہ تم نے براہ راست یہ حکم اللہ سے لیا ہو۔ چونکہ یہ حکم کسی آسمانی کتاب یا کسی نبی کی شریعت میں نہیں ہے تو صرف ایک صورت رہ جاتی ہے کہ تمہارے سامنے اللہ نے یہ حکم صادر فرمایا ہے، جس کا کوئی مدعی بھی نہیں ہے۔

۳۔ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ : اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دینا بہت بڑا ظلم ہے۔ کسی چیز کو حلال حرام کرنا اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلا کا حصہ ہے۔ اس میں مداخلت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت میں مداخلت ہے۔ یہ بہت بڑا جرم ہے۔ اعاذنا اللّٰہ عن ذلك۔

قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطۡعَمُہٗۤ اِلَّاۤ

۱۴۵۔ کہدیجیے: جو وحی میرے پاس آئی ہے، اس میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو کھانے والے پر حرام ہو مگر یہ کہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون ہو یا سور کا

اَنۡ یَّکُوۡنَ مَیۡتَۃً اَوۡ دَمًا مَّسۡفُوۡحًا اَوۡ لَحۡمَ خِنۡزِیۡرٍ فَاِنَّہٗ رِجۡسٌ اَوۡ فِسۡقًا اُہِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰہِ بِہٖ ۚ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَیۡرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّکَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۴۵﴾

گوشت کیونکہ یہ ناپاک ہیں یا ناجائز ذبیحہ جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، پس اگر کوئی مجبور ہوتا ہے (اور ان میں سے کوئی چیز کھا لیتا ہے) نہ (قانون کا) باغی ہو کر اور نہ (ہی ضرورت سے) تجاوز کا مرتکب ہو کر تو آپ کا رب یقیناً بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

اس مضمون کی تفسیر سورۂ بقرہ آیت ۱۷۳ اور سورۂ مائدہ آیت ۳ میں مذکور ہے۔ مناسب ہے کہ فقہ جعفری کے مطابق حیوانات میں حلال و حرام کے بارے میں مختصر احکام کا ذکر ہو جائے:

i۔ پالتو جانوروں میں بھیڑ، گائے اور اونٹ کی تمام اقسام حلال ہیں۔ وحشی چوپاؤں میں ہرن، پہاڑی مینڈھا حلال ہیں۔

ii۔ درندہ جانور جیسے شیر، چیتا اور بھیڑیا حرام ہیں۔ شافعی کے نزدیک صرف وہ درندے حرام ہیں جو انسان پر حملہ کرتے ہیں۔

iii۔ تمام حشرات حرام ہیں۔ امام مالک کے نزدیک سانپ حلال ہے۔

iv۔ شکاری پرندے، پنجہ رکھنے والے پرندے، جیسے باز، عقاب و شاہین حرام ہیں۔

v۔ پرندوں کے بارے میں کچھ کے حلال ہونے پر صراحت موجود ہے، جیسے کبوتر، تیتر وغیرہ اور کچھ کے حرام ہونے پر صراحت موجود ہے، جیسے شکاری پرندے۔ حلال و حرام ہونے کی علامات دو قسم کی ہیں:

i۔ ہر وہ پرندہ حرام ہے جو پرواز کے دوران پر پھڑپھڑانے سے زیادہ پھیلائے رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ پرندہ حلال ہے جو پرواز کے دوران پر پھیلانے سے پھڑپھڑاتا زیادہ ہے۔

ii۔ دوسری علامات یہ ہیں کہ جن پرندوں میں درج ذیل چیزوں میں سے ایک چیز پائی جائے وہ حلال ہیں:

الف۔ پوٹا ہو۔ پوٹا وہ تھیلی ہے جو پرندے کی گردن اور سینے کے درمیان ہوتی ہے اور اس میں اس کی کھائی ہوئی غذا جمع ہوتی ہے۔

ب۔ سنگ دان ہو۔

ج۔ پیر کی پشت پر کانٹا ہو۔
د۔ دریائی حیوانات میں صرف وہ مچھلی حلال ہے جس کے چھوٹے ہوں۔ جھینگا چھوٹے والی مچھلی شمار ہوتی ہے، حلال ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۡ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝۱۴۶

۱۴۶۔اور ہم نے یہود پر ہر ناخن والا جانور حرام کر دیا تھااور بکری اور گائے کی چربی حرام کر دی تھی، سوائے اس چربی کے جو ان کی پشت پر یا آنتوں میں یا ہڈی کے ساتھ لگی ہوئی ہو، ایسا ہم نے ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر کیا اور ہم صادق القول ہیں۔

تشریح کلمات

ظُفُرٍ: (ظ ف ر) یہ لفظ انسان اور دوسرے جانوروں کے ناخن پر بھی بولا جاتا ہے۔ اس آیت میں ظفر سے مراد پنجہ دار شکاری جانور بھی ہے۔ دیگر جانوروں میں سم والے بھی شامل ہیں۔ جیسے گھوڑا، گدھا اور اونٹ وغیرہ۔

الۡحَوَايَآ: (ح و ی) انتڑیوں کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

یہود پر مندرجہ بالا چیزوں کی حرمت کا ثبوت موجودہ تحریف شدہ توریت میں بھی موجود ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حرمت کے احکام کے اسباب کبھی مصلحت و مفسدہ ہوتے ہیں اور کبھی بعنوانِ سزا ہوتے ہیں۔ مثلاً سور کا گوشت اس لیے حرام ہے کہ اس کے کھانے میں مضرات ہیں اور یہاں اس آیت میں فرمایا کہ یہودیوں پر چند چیزیں ہم نے ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر حرام کر دی ہیں ورنہ یہ چیزیں فی نفسہ نہ پہلے حرام تھیں، نہ بعد میں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ ....[1]

یہودیوں کے ظلم کے سبب بہت سی پاک چیزیں جو (پہلے) ان پر حلال تھیں ہم نے ان پر حرام کر دیں.

---

[1] ۴ نساء:۱۶۰

اہم نکات

۱۔ گناہوں کی وجہ سے کبھی بعض نعمتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے: ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ...۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

۱۴۷۔ اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلائیں تو آپ کہدیں: تمہارا پروردگار وسیع رحمتوں کا مالک ہے، تاہم مجرموں سے اس کا عذاب ٹالا (بھی) نہیں جا سکتا ہے۔

تفسیر آیات

یہودیوں کے بارے میں چند ایک حقائق بیان فرمانے کے بعد فرماتا ہے: اگر یہود اس حقیقت کی تکذیب کریں کہ ان پر بعض جانوروں کو سزا اور عقاب کے طور پر حرام کر دیا گیا ہے تو کہد یجیے کہ اگرچہ اللہ وسیع رحمتوں کا مالک ہے، لیکن اس کی وسیع رحمت مجرموں کو سزا دینے سے مانع نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ رحمت کا تقاضا یہ نہیں کہ مؤمن و مجرم کو ایک صف میں رکھے، بلکہ رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ مجرم جرم ترک کر کے رحمت کے دروازے پر آئے تو اسے قبول کرے۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾

۱۴۸۔ مشرکین کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہی ہم کسی چیز کو حرام گردانتے، اسی طرح ان سے پہلے والوں نے بھی تکذیب کی تھی یہاں تک کہ انہوں نے ہمارا عذاب چکھ لیا، کہد یجیے: کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے لا سکو؟ تم تو صرف گمان کے پیچھے چلتے ہو اور یہ کہ تم فقط قیاس آرائیاں کرتے ہو۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ

۱۴۹۔ کہد یجیے: اللہ کے پاس نتیجہ خیز دلائل ہیں، پس اگر وہ چاہتا تو تم سب کو (جبراً) ہدایت

لَهَدٰىكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ۝۱۴۹　　دے دیتا۔

تفسیر آیات

۱۔ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَكۡنَا: مشرکین اپنے شرک و کفر کی توجیہ پیش کریں گے کہ ہم اللہ کی مشیت کے مطابق شرک کر رہے ہیں، ورنہ اگر اللہ ہم سے شرک نہ چاہتا تو ممکن نہ تھا کہ ہم شرک کا عمل انجام دیتے۔ لٰہذا ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہے۔

۲۔ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ تم سے پہلے کفر و شرک کرنے والے یہی طریقہ تکذیب اختیار کرتے رہے ہیں جو سراسر ظن وتخمین پر مبنی ہے۔ تم نے مشیت سے جبر مراد لیا ہے۔ اگر اللہ تربیت و تعلیم، استدلال و تعقل کا راستہ چھوڑ کر جبر کا راستہ اختیار فرماتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا، جیسے تمہارے جسمانی نظام کو قائم رکھنے کے لیے قلب و جگر کو ہدایت دے رکھی ہے لیکن اس مسلوب الاختیار ہدایت سے غرض خلقت اور مقصد شریعت پورا نہیں ہوتا۔

۳۔ قُلۡ هَلۡ عِنۡدَكُمۡ مِّنۡ عِلۡمٍ: اللہ کی مشیت کو اس کی رضا مندی سے تعبیر کرنا ایک نہایت فحش غلطی ہے، جس میں کچھ اسلامی مذاہب بھی مبتلا ہیں۔ مشیت الٰہی یہ ہے کہ انسان خود مختار اور اپنے ارادے میں آزاد ہے تاکہ اسے امتحان میں ڈالنا، مکلّف بنانا اور اس کے اعمال کے لیے ثواب و عقاب مرتب کرنا درست رہ جائے۔ انسان اللہ کی اس عدم جبر کی مشیت کے تحت خود مختار ہے۔ اسی خود مختاری کے تحت گناہ بھی کرتا ہے اور ثواب کا کام بھی کرتا ہے۔ اچھے عمل کو اس نے پسند کیا اور گناہ کو ناپسند کیا ہے۔

انسان کو خود مختار نہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اختیار و انتخاب کا اہل نہیں ہے۔ یعنی اس کی اتنی عقل نہیں ہے کہ اس کو آزادی دی جائے۔ اس طرح یہ انسان نہیں رہتا۔ ہم اس مطلب کے دوسرے لفظوں میں واضح انداز میں بیان کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کے دو ارادے ہیں: ایک تخلیقی و تکوینی ارادہ، دوسرا تشریعی اور تقنینی ارادہ ہے۔ ارادہ تکوینی یعنی عالم خلق و ایجاد میں صرف اللہ کا ارادہ چلتا ہے:

اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ۝[۱]　　جب وہ کسی چیز کا ارادہ کر لیتا ہے تو بس اس کا امر یہ ہوتا ہے ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے۔

کائنات میں جو کچھ وجود میں آتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ کسی غیر خدا سے کوئی چیز وجود میں نہیں آتی۔

ارادہ تشریعی میں ایسا نہیں ہے کہ جو کچھ اللہ نے حکم دیا اس پر ساری دنیا عمل کرے۔ اللہ نے ارادہ تکوین میں فرمایا: كُنۡ فَيَكُوۡنُ ہو جا، بس وہ ہو جاتا ہے۔ نہ ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن ارادہ تشریع میں جب فرمایا: اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ نماز قائم کرو تو کوئی نماز پڑھتا ہے اور کوئی نہیں پڑھتا۔ اس سے واضح ہوا کہ اللہ

---

[۱] ۳۶ یٰس: ۸۲

تعالیٰ کے دونوں ارادے ایک جیسے نہیں ہیں۔ اس بات کے ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ بھی ذہین نشین کر لیں کہ بندے کا تعلق اللہ کے ارادۂ تخلیق اور تشریع دونوں کے ساتھ ہے۔ اللہ کے ارادۂ تخلیق میں بندے کا کوئی ارادہ نہیں چلتا۔ مثلاً قلب و جگر پر اللہ کا حکم چلتا ہے، بندے کا نہیں مگر اللہ کے ارادہ تشریع میں بندے کا ارادہ چلتا ہے۔ اللہ کے حکم تشریع اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ پر کوئی عمل کرتا ہے، کوئی نہیں کرتا۔ یہ اس لیے ہے کہ یہاں انسان اپنے ارادے میں آزاد ہے، اس آزادی سے غلط فائدہ اٹھانے کو گناہ کہتے ہیں۔ یہاں چونکہ انسان مجبور نہیں، خود مختار ہے۔ اللہ کے ارادۂ تشریعی پر عمل کرنا اطاعت ہے اور عمل نہ کرنا معصیت ہے اس لیے اس سے امتحان لینے، مکلّف بنانے اور سزا و جزا کا قانون وضع ہوتا ہے۔

اس جگہ علمی المیہ یہ ہوا کہ ایک مکتب فکر نے اللہ کے ارادۂ تکوینی یعنی تخلیقی اور ارادۂ تشریعی دونوں میں امتیاز نہیں کیا بلکہ دونوں کو ایک جیسے قرار دیا کہ انسان سے جو بھی عمل صادر ہوتا ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ جیسے بارش کا نزول اللہ کی طرف سے ہے۔ اس علمی المیہ کے نتیجے میں اللہ کی شان میں گستاخانہ نظریہ، نظریہ جبر وجود میں آیا جس کے تحت اطاعت بھی اللہ کی طرف سے اور معصیت بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ اس طرح انسان کا کوئی عمل اپنا نہیں ہوتا، اللہ کا ہوتا ہے۔ انسان مجبور ہے۔ اس کا اپنا کوئی ارادہ نافذ نہیں ہے حالانکہ خود مختاری انسان کی ساخت کی بنیادی اینٹ ہے۔ مجبور اور انسان دو متضاد چیزیں۔ مجبور انسان موجود نہیں ہے بلکہ یہ ایک موہومہ اور مفروضہ ہے۔ مشرکین بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ ہم سے جو شرک صادر ہو رہا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے، اگر اللہ نہ چاہتا تو ہم شرک نہ کر پاتے۔

جبر و تفویض: جبر، اشاعرہ کا نظریہ ہے۔ ان کے نزدیک انسان کے افعال کا فاعل، خود انسان نہیں ہے۔ فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان صرف آلہ کار ہے۔ جیسے کاتب انسان ہے، قلم آلۂ کار ہے۔ تفویض، معتزلہ کا نظریہ ہے: اس نظریے کے تحت انسان کا ارادہ علت تامہ ہے۔ اللہ نے یہ قدرت انسان کے سپرد کی ہے۔ اب اللہ روک نہیں سکتا، انسان خود جو چاہے کر سکتا ہے۔ جبر والے کہتے ہیں صرف اللہ کا ارادہ نافذ ہے۔ تفویض والے کہتے ہیں صرف انسان کا خدا داد ارادہ نافذ ہے۔ یہ دونوں مسالک، ارادۂ خالق اور ارادۂ مخلوق کو باہم متضاد سمجھتے ہیں۔ ان دونوں کو یک جا نہیں کر سکے اس لیے ان دونوں نے ایک ارادے کی نفی کی ہے۔ جبر والوں نے انسانی ارادے کی نفی کی ہے اور تفویض والوں نے اللہ کے ارادے کی نفی کی ہے جب کہ قرآن دونوں ارادوں کا قائل ہے۔ البتہ انسان کا ارادہ اللہ کے ارادے کے ذیل میں ہے۔ انسان میں قدرت اللہ کی طرف سے ہے اور اس کا انتخاب بندے کی طرف سے ہے۔ قرآن دونوں نظریوں کو مسترد کرتا ہے اور اپنے کام کو ہدایت کا نام دیتا ہے۔ ہدایت وہاں ہو سکتی ہے جہاں انسان فعل و ترک میں خود مختار ہو۔ جبر کی صورت میں ہدایت نہیں ہوتی۔ ہدایت کا مطلب آزادی ہے۔ قرآن اپنے موقف کو صاف اور واضح لفظوں میں بیان کرتا ہے:

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝[1] اور ہم پر تو فقط واضح طور پر پیغام پہنچانا (فرض) ہے اور بس۔

ہدایت کا مطلب پیغام سمجھانا ہے، آگے آزادی ہے:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝[2] ہم نے اسے راستے کی ہدایت کر دی خواہ شکر گزار بنے اور خواہ ناشکرا۔

جبر کی صورت میں عقل اور قانون کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ حیوانات اور دیوانے کے لیے قانون بے معنی ہے۔ گاڑی اور ڈرائیور میں یہی فرق ہے۔ گاڑی جبر کے تحت چلتی ہے اور ڈرائیور ارادہ رکھتا ہے۔ چنانچہ مکلّف ہونے کے لیے عقل، قدرت اور اختیار شرط ہے۔ عقل اور قدرت کی شرط جبر اور تفویض کے باطل ہونے پر واضح دلیل ہے۔

نظریۂ جبر معاویہ کے دور کی پیداوار اور سیاسی عزائم پر مبنی ہے اور اپنی حکومت کے استحکام کے لیے اس نظریہ کو رواج دیا گیا۔ چونکہ جبر کے تحت حکومت اللہ کی طرف سے ہے اور جو حکومت اللہ کی طرف سے ہے اس کے خلاف قیام کرنا کفر ہے۔ جیسا کہ ابن زیاد نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے کہا: آپ کے بھائی علی اکبر کو اللہ نے قتل کیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: لوگوں نے قتل کیا۔ ملاحظہ بلاذری انساب الاشراف ۲: ۲۰۷۔

اہم نکات

۱۔ علمی و یقینی سند کے بغیر کوئی نظریہ قابل قبول نہیں ہے: قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ ....

۲۔ عقائد میں ظن و تخمین گمراہ کن ہوتا ہے: اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ....

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ۝۱۵۰

۱۵۰۔(ان سے) کہد یجیے: اپنے ان گواہوں کو لے آؤ جو اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ نے اس چیز کو حرام کیا ہے، پھر اگر وہ (خود ساختہ) شہادت دیں بھی تو آپ ان کے ساتھ گواہی نہ دیں اور آپ ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور دوسروں کو اپنے رب کے برابر سمجھتے ہیں۔

---

[1] ۳۶ یٰس: ۱۷ [2] ۷۶ دھر: ۳

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ ہَلُمَّ شُہَدَآءَکُمُ اگر تمہارا یہ دعویٰ درست ہے کہ ان چیزوں کو اللہ نے حرام کیا ہے تو گواہ پیش کرو۔ گواہ وہ ہوتا ہے جس کے سامنے یہ عمل انجام دیا گیا ہو۔ ایسا کرنا ان کے لیے ناممکن ہے۔ اسی لیے اس امر کو امر تعجیزی کہتے ہیں۔ یعنی گواہ پیش کرو کا حکم صرف اس لیے ہو رہا ہے کہ اس عمل کا ناممکن ہونا اور نتیجتاً اس دعویٰ کا باطل ہونا ثابت ہو جائے۔ شُہَدَآءَکُمُ : تم خود مدعی ہو، اپنے علاوہ گواہوں کو پیش کرو۔

۲۔ فَاِنۡ شَہِدُوۡا: اگر ان کو بیرونی گواہی نہیں ملتی اور یہ لوگ کوئی خودساختہ گواہی پیش کرتے ہیں تو یہ گواہی دو باتوں کی وجہ سے مسترد ہو گی: اول یہ کہ یہ لوگ خواہشات کے غلام ہیں، حقائق کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ دوم یہ کہ یہ لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، کیونکہ ایمان بہ آخرت انسان کو جھوٹ بولنے اور گناہ کا ارتکاب کرنے سے روک سکتا ہے۔

۳۔ فَلَا تَشۡہَدۡ مَعَہُمۡ : یعنی آپؐ ان کی گواہی قبول نہ کریں بلکہ اس گواہی کا باطل ہونا واضح کریں۔ یہ تعبیر ان کے کذب کو واضح کرنے کے لیے اختیار کی گئی ورنہ رسول کے لیے ممکن نہیں ان کی تصدیق کریں۔

اہم نکات

۱۔ آخرت پر ایمان انسان کے کردار و سیرت پر اثر انداز ہوتا ہے۔

۲۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دینا کس قدر سنگین جرم ہے کیونکہ یہ تشریع و تقنین میں شرک باللہ ہے۔

قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمۡ عَلَیۡکُمۡ اَلَّا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ۚ وَ لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَکُمۡ مِّنۡ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَ اِیَّاہُمۡ ۚ وَ لَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَہَرَ مِنۡہَا وَ مَا بَطَنَ ۚ وَ لَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ ؕ ذٰلِکُمۡ وَصّٰکُمۡ

۱۵۱۔ کہد یجیے: آؤ میں تمہیں وہ چیزیں بتا دوں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کر دی ہیں، (وہ یہ کہ) تم لوگ کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور والدین پر احسان کرو اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی اور علانیہ اور پوشیدہ (کسی طور پر بھی) بے حیائی کے قریب نہ جاؤ اور جس جان کے قتل کو اللہ نے حرام کیا ہے اسے قتل نہ کرو ہاں مگر حق کے ساتھ، یہ وہ باتیں ہیں جن کی وہ تمہیں

بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ نصیحت فرماتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔

تشریح کلمات

اِمْلَاقٍ: (م ل ق) فقر و تنگدستی کو کہتے ہیں۔ العین کے مطابق اِمْلَاقٍ محتاج ہونے تک کثرت سے مال خرچ کرنے کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

ان چند آیات میں دس ایسی چیزوں کا ذکر ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنا حکم صادر فرمایا ہے:

۱۔ شرک کی ممانعت۔ ۲۔ والدین پر احسان۔ ۳۔ قحط کے خوف سے اولاد کا قتل۔
۴۔ بے حیائی کا ارتکاب۔ ۵۔ ناحق قتل۔ ۶۔ مال یتیم کھانے کی ممانعت۔
۷۔ ناپ تول میں انصاف۔ ۸۔ عدل و انصاف۔ ۹۔ عہد و پیمان کی پابندی۔
۱۰۔ صراط مستقیم کی اتباع۔

۱۔ سب سے پہلے شرک کا ذکر فرمایا، کیونکہ شرک ہی وہ گناہ ہے جو قابل درگزر نہیں ہے۔ اگرچہ ہر جرم اور ہر گناہ ظلم ہے لیکن شرک ظلم عظیم ہے۔ شرک باللہ کی چند صورتیں ہیں: شرک در اعتقاد، شرک در حاکمیت، شرک در تدبیر، شرک در عبادت۔

الف۔ شرک در اعتقاد کے بارے میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ....[۱] اللہ اس بات کو یقیناً معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہرایا جائے اور اس اس کے علاوہ دیگر گناہوں کو جس کے بارے میں وہ چاہے گا معاف کر دے گا۔

اِنَّهٗ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ ....[۲] بے شک جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا، بتحقیق اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا۔

ب۔ شرک در حاکمیت کے بارے میں اسی سورہ کی گزشتہ آیات ۱۳۹ سے ۱۵۰ تک ہیں۔

ج۔ شرک در تدبیر کے بارے میں فرمایا:

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ کہد یجیے: تمہیں آسمان اور زمین سے رزق کون دیتا ہے؟ سماعت اور بصارت کا مالک کون ہے؟ اور کون ہے جو بے جان سے جاندار کو پیدا کرتا ہے اور جاندار

۱؎ ۴ نساء: ۴۸ ۲؎ ۵ مائدہ: ۷۲

مِنَ الۡحَیِّ وَ مَنۡ یُّدَبِّرُ الۡاَمۡرَ ؕ فَسَیَقُوۡلُوۡنَ اللّٰہُ ۚ فَقُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ۝ [1]

جاندار سے بے جان کو پیدا کرتا ہے؟ اور کون امور (عالم) کی تدبیر کر رہا ہے؟ پس وہ کہیں گے: اللہ، پس کہد یجیے: تو پھر تم بچتے کیوں نہیں ہو؟

سب سے زیادہ شرک کا مقام شرک در تدبیر ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو شرک در تدبیر کے ساتھ زیادہ زیادہ واسطہ پڑا ہے۔ چونکہ جن مشرکین سے انبیاء نبرد آزما رہے ہیں، ان کا یہ عقیدہ تھا کہ خالق تو اللہ ضرور ہے مگر خلق کے بعد اللہ نے کائنات کی تدبیر چند ہستیوں کے سپرد کر دی ہے۔ اب وہی اس کائنات کو چلاتی ہیں۔ لہٰذا ہم ان ہستیوں کی عبادت کرتے ہیں اور ان سے اپنی ساری امیدیں وابستہ رکھتے ہیں۔ اس مشرکانہ عقیدے کی رد میں قرآن میں سینکڑوں آیات ہیں، جن میں ارشاد فرمایا ہے کہ اس کائنات کی تدبیر سے متعلق تمام امور میرے ہاتھ ہیں۔ میں رزق دیتا ہوں۔ میں بارش برساتا ہوں۔ میں سبزہ اُگاتا ہوں۔ ہواؤں کو چلاتا ہوں۔ گردش لیل و نہار میرے ہاتھ میں ہے۔ ہر چیز کا خزانہ میرے پاس ہے۔ ہر چیز کو خلق کرنے کے بعد اس کی تقدیر میں بناتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

د۔ شرک در عبادت کے بارے بیسیوں آیات موجود ہیں۔

۲۔ والدین پر احسان کے حکم کو اللہ نے ہمیشہ توحید اور نفی شرک کے ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے:

لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ ۟ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ... [2]	اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور (اپنے) والدین پر احسان کرو...
وَ لَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ وَلَا تُشۡرِکۡ۔ [3]	... اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دو اور والدین کے ساتھ احسان کرو...
وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡ... [4]	اور آپ کے پروردگار نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیکی کرو...
وَ وَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ حُسۡنًا ... [5]	اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے...

اس سے یہ مطلب اخذ ہوتا ہے کہ توحید کے بعد سب سے عظیم ذمہ داری والدین پر احسان ہے اور شرک کے بعد سب سے عظیم گناہ والدین پر احسان نہ کرنا ہے۔

بقائے نسل کے لیے اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ساتھ محبت کرنا اور ان پر نیکی کرنا تکوینی طور پر حل فرمایا کہ اولاد کے لیے محبت اور احسان کو والدین کے دل میں ایسے ودیعت فرمایا ہے کہ وہ ان سے محبت و احسان کے

---

[1] ۱۰ یونس: ۳۱ [2] ۲ بقرۃ: ۸۳ [3] ۴ نساء: ۳۶ [4] ۱۷ اسراء: ۲۳ [5] ۲۹ عنکبوت: ۸

بغیر رہ نہیں سکتے اور والدین نے طبیعی طور پر اولاد کے سامنے اس دنیا سے رخصت ہونا ہے، اس لیے اولاد کے دل میں والدین کی محبت اس پیمانے پر نہیں رکھی۔ البتہ تشریعی طور پر یہ سختی سے حکم ہوا کہ ان کے ساتھ نیکی کرنا توحید کے بعد اہم ترین فریضہ ہے۔ جو لوگ تکوین وتشریع، یعنی فطرت وشریعت دونوں کو اپنی زندگی پر نافذ کرتے ہیں ان کا عائلی نظام محبت وسکون کی فضا میں قائم رہتا ہے۔ جیسا کہ اسلامی معاشروں میں نظر آتا ہے اور جو لوگ فطرت کے ساتھ شریعت کو نہیں مانتے، وہ فطری طور پر اولاد سے محبت کریں گے لیکن والدین کے بارے میں انسانی حقوق ادا کرنے کے لیے حاضر نہیں ہوتے۔ جیسا کہ ہم مغربی معاشروں میں مشاہدہ کرتے ہیں، جہاں بہترین اولاد اسے سمجھا جاتا ہے، جو اولڈ ہاؤس میں سال میں ایک بار کرسمس کے موقع پر اپنے والدین سے ملنے جاتی ہے۔

۳۔ قحط وافلاس کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ قدیم جاہلیت ہی نہیں، جدید جاہلیت بھی اس قتل کا جواز خوف افلاس بتاتی ہے۔ اگرچہ جدید مادیت کی جاہلیت نے قتل اولاد کو مانع حمل، اسقاط حمل وغیرہ جیسے عنوان سے رائج کیا ہے لیکن اسقاط حمل، وہی قتل اولاد ہے اور اس قتل کا محرک قدیم و جدید جاہلیت میں ایک ہی ہے، وہ ہے خوف افلاس۔

۴۔ بے حیائی کے قریب نہ جاؤ خواہ آشکار ہو یا پوشیدہ۔ اس کو لفظ فواحش کے ساتھ تعبیر فرمایا۔ فحش، فحشاء اس قول یا فعل کو کہتے ہیں جو قباحت میں حد سے بڑھا ہوا ہو۔ قرآن نے زنا، عمل قوم لوط اور زنا کا بہتان لگانا وغیرہ کو فحش میں شمار کیا ہے اور حدیث کے مطابق فواحش کی ایک لمبی فہرست ہے، وہ سب اس آیت میں شامل ہیں۔

۵۔ ناحق قتل۔ اگرچہ قتل بھی فواحش میں شامل ہے، تاہم اس جرم کی سنگینی کی وجہ سے اس کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔

وَ لَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡیَتِیۡمِ اِلَّا بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ حَتّٰی یَبۡلُغَ اَشُدَّہٗ ۚ وَ اَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَ الۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ ۚ لَا نُکَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا ۚ وَ اِذَا قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوۡا وَ لَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی ۚ وَ بِعَہۡدِ اللّٰہِ اَوۡفُوۡا ؕ ذٰلِکُمۡ وَصّٰکُمۡ بِہٖ لَعَلَّکُمۡ

۱۵۲۔ اور یتیم کے مال کے نزدیک نہ جانا مگر ایسے طریقے سے جو (یتیم کے لیے) بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے رشد کو پہنچ جائے اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا کرو، ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمے داری نہیں ڈالتے اور جب بات کرو تو عدل کے ساتھ اگرچہ اپنے قریب ترین رشتے داروں کے خلاف ہی کیوں نہ جائے اور اللہ سے کیا ہوا عہد پورا کرو، یہ وہ ہدایات

تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۱۵۲﴾ ہیں جو اللہ نے تمہیں دی ہیں شاید تم یاد رکھو۔

تفسیر آیات

ا۔ مال یتیم کے نزدیک نہ جاؤ۔ یعنی یتیم کے مال پر تصرف نہ کرو۔ البتہ وہ تصرف جائز ہے جو یتیم کے حق میں ہو۔ مثلاً یتیم کا مال خراب ہونے کا خطرہ ہے، کوئی پھل گل سڑ جانے کا خطرہ ہے تو اسے فروخت کرنا بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ کے مصداق ہے۔ البتہ رشد کو پہنچ جائے اور اس وقت خود تصرف کرنے کا اہل ہو جائے تو اس کو یتیم نہیں کہتے۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورہ نساء آیت ۶۔

۲۔ ناپ تول میں انصاف کرو اور پورا تولو۔ اس میں ممکن حد تک عدل و انصاف قائم رکھنا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو جیسا سورہ مطففین میں فرمایا:

وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ ۙ﴿﴾ الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ ۫﴿﴾ وَ اِذَا کَالُوۡہُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡہُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ ؕ﴿﴾[1]

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے ہلاکت ہے۔ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا تولتے ہیں اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔

لَا نُکَلِّفُ نَفۡسًا: ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمے داری نہیں ڈالتے۔ اگر بھول چوک اور غیر ارادی یا نادانستہ طور پر کمی بیشی ہو جائے تو اس کا مؤاخذہ نہ ہو گا۔ یہ اسلامی شریعت کا اپنی جگہ ایک مستقل اصول ہے کہ جو کام انسان کی طاقت کار کے دائرے میں نہیں آتا، وہ اس کا مکلّف نہیں ہوتا۔

۳۔ جب شہادت دینا یا فیصلہ سنانا ہو تو اپنی گفتار میں بھی عدل و انصاف کا دامن نہ چھوڑو، خواہ یہ شہادت، یہ فیصلہ اپنے قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ کنبہ پروری اور قریبی رشتوں سے جذباتی رشتہ انسانی جبلت میں ہے۔ اس کے لیے عدل کے حکم کے ساتھ قریبی رشتہ داروں کا ہمیشہ ذکر آتا ہے۔ گفتار کے عدل و انصاف میں گواہی، اقرار، وصیت، فتویٰ اور فیصلے وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

۴۔ اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ عہد فطری بھی ہیں اور شرعی بھی۔ اس طرح شریعت کے تمام احکام عہد خدا میں آتے ہیں نیز انسان کی اپنی عقل اور وجدان کے تقاضے بھی عہد خدا میں آتے ہیں۔

وَ اَنَّ ہٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا فَاتَّبِعُوۡہُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمۡ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ؕ ذٰلِکُمۡ وَصّٰکُمۡ بِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾

۱۵۳۔ اور یہی میرا سیدھا راستہ ہے، اسی پر چلو اور مختلف راستوں پر نہ چلو، ورنہ یہ تمہیں اللہ کے راستے سے ہٹا کر پراگندہ کر دیں گے، اللہ نے تمہیں یہ ہدایات (اس لیے) دی ہیں تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

---

[1] ۸۳ مطففین: ۱ تا ۳

تفسیر آیات

۱۰۔ سیدھے راستے پر چلو۔ اسلامی دستور حیات کے چند ایک اہم نکات بیان فرمانے کے بعد فرمایا: میرا سیدھا راستہ یہی ہے۔ یہاں بحکم خدا، رسولؐ امت سے بات کر رہے ہیں کہ میں تمہیں وہ چیزیں بتاؤں جو تمہارے رب نے حرام کی ہیں ۔ ان کے بیان کے بعد فرمایا: یہی میرا یعنی رسول کریمؐ کا سیدھا راستہ ہے۔ لہٰذا مطلب یہ ہوا کہ راہ رسولؐ پر چلو، دوسرے مختلف راستوں پر نہ چلو۔ اگر دوسرے مختلف راستوں پر چلے تو اختلاف، پراگندگی اور تفرقہ آ جائے گا۔ رسولؐ کے راستے پر چلے تو کوئی تفرقہ نہ ہو گا، کیونکہ یہ منزل تک جانے کا سیدھا راستہ ہے۔ کیونکہ حق تو صرف ایک ہے اور باطل بہت ہوتے ہیں۔

ان آیات میں اصول حیات بیان کرنے کے بعد آیات کے اواخر میں تعقل، تذکر اور تقویٰ کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ شرک باللہ، حقوق والدین، قتل اولاد، بے حیائی کا ارتکاب اور قتل نفس کے ذکر میں فرمایا: لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ تاکہ تم عقل سے کام لو۔ کیونکہ مذکورہ بالا احکام کا ادراک عقل سے مربوط ہے۔ چنانچہ قتل اولاد کے بارے میں اسی سورہ میں فرمایا: قَدۡ خَسِرَ الَّذِیۡنَ قَتَلُوۡۤا اَوۡلَادَہُمۡ سَفَہًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ اور قتل اولاد کو سفاہت اور بیوقوفی قرار دیا۔

یتیم کا مال نہ کھانا، ناپ تول میں انصاف کرنا، گفتار میں عدل و انصاف اختیار کرنا اور عہد و میثاق کو پورا کرنا تعقل کے ساتھ تذکر اور نصیحت آموزی کا محتاج ہے۔ اس لیے فرمایا: لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ اور صراط مستقیم پر فائز رہنا، تقویٰ کے بغیر ممکن نہ تھا، اس لیے اس حکم کے آخر میں فرمایا: لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ۔

اہم نکات

۱۔ دستور قرآن پر عمل کرنا عقل، نصیحت آموزی اور تقویٰ پر موقوف ہے۔

۲۔ آبادی میں خواہ کتنا ہی اضافہ ہو جائے، اللہ کی طرف سے فراہم کردہ رزق اس سے بھی زیادہ ہے۔ مثلاً سورج صرف ایک منٹ میں اہل زمین کے لیے سال بھر کی انرجی فراہم کرتا ہے: نَحۡنُ نَرۡزُقُکُمۡ وَ اِیَّاہُمۡ ....

۳۔ حق کا راستہ صرف ایک اور باطل کے راستے بہت ہوتے ہیں: وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ ....

ثُمَّ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ تَمَامًا عَلَی الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ وَ تَفۡصِیۡلًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ وَّ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً لَّعَلَّہُمۡ

۱۵۴۔ پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی تاکہ نیکی کرنے والے پر احکام پورے کر دیں اور اس میں ہر چیز کی تفصیل بیان ہو اور ہدایت اور

بِلِقَآءِ رَبِّهِمۡ يُؤۡمِنُوۡنَ﴿۱۵۴﴾ رحمت (کا باعث) ہو تا کہ وہ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لے آئیں۔

تفسیر آیات

اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے شرک نہ کرنے، والدین پر احسان کرنے، اولاد کے قتل سے باز رہنے، ناپ تول میں انصاف کرنے، یتیم کا مال نہ کھانے، عہد و پیمان پر قائم رہنے، گفتار میں عدل و انصاف قائم رکھنے کا حکم اور دستور تمام سابقہ شریعتوں میں حالات کے مطابق اجمالاً دیا یا خود موسیٰ (ع) کو اجمالاً دیا۔

ثُمَّ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ: پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی۔ اس کتاب میں ان تمام احکام میں جو کمی رکھی گئی تھی، ان کی تکمیل کی اور ان میں حسب مصلحت جو اجمال رکھا گیا تھا، اس کی تفصیل بیان کی۔

تَمَامًا عَلَى الَّذِيۡۤ اَحۡسَنَ: اس جملے کی تفسیر آسان نہیں ہے۔ اس لیے تَمَامًا میں مختلف اقوال ہیں کہ کس چیز کی تکمیل کا ذکر ہے۔ اکثر نے نعمتوں کی تکمیل مراد لیا ہے لیکن میرے نزدیک احکام کی تکمیل مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ بعد میں تَفۡصِيۡلًا کا ذکر قرینہ بن سکتا ہے کہ احکام کی تکمیل مراد ہے، چونکہ تفصیل بھی احکام کے اجمال کی تفصیل ہے۔

عَلَى الَّذِيۡۤ اَحۡسَنَ سے بعض نے جنس مراد لیا ہے یعنی علی کل من احسن، ای علی المحسنین۔ تمام احسان کرنے والوں پر۔ بعض کے نزدیک الَّذِيۡۤ اَحۡسَنَ سے حضرت موسیٰ (ع) مراد ہیں۔ الذی احسن طاعة ربه فی تحمل الرسالة۔ والیه اذهب۔ وہ ہستی جس نے رسالت کی ذمہ داری کو نبھانے میں بہترین اطاعت کی۔ مطلب یہ بنتا ہے: ہم نے موسیٰ (ع) کو کتاب دی، احکام کی تکمیل اور اجمال کی تفصیل کے لیے اور بنی اسرائیل کو ہدایت و رحمت سے نوازا تا کہ وہ آخرت پر ایمان لے آئیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل یا تو آخرت پر ایمان رکھتے ہی نہ تھے یا ان کا آخرت پر ایمان کمزور تھا۔ چنانچہ موجودہ توریت میں آخرت کا ذکر ہی نہیں ملتا۔

لِّكُلِّ شَيۡءٍ: ہر چیز سے مراد احکام و شریعت میں ضرورت کی تمام چیزیں ہیں۔ واضح رہے ہر دور میں اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق شریعت کامل تھی ۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ شریعت ہر زمانے کے متعلق نہیں تھی، جیسے اسلامی شریعت ہے۔ لہٰذا یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ جب شریعت موسیٰ کامل تھی تو بعد کی شریعتوں کی کیا ضرورت پڑی؟

اہم نکات

۱۔ اللہ اپنی نعمتیں نیکی کرنے والوں پر پوری کرتا ہے: تَمَامًا عَلَى الَّذِيۡۤ اَحۡسَنَ ....۔

۲۔ شریعت و دستور حیات کی تفصیل ہدایت و رحمت ہے: وَتَفۡصِیۡلًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ وَّہُدًی وَّرَحۡمَۃً ....

وَہٰذَا کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰہُ مُبٰرَکٌ فَاتَّبِعُوۡہُ وَ اتَّقُوۡا لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۵۵﴾

۱۵۵۔ اور یہ ایک مبارک کتاب ہے جو ہم نے نازل کی، پس اس کی پیروی کرو اور تقویٰ اختیار کرو شاید تم پر رحم کیا جائے۔

اَنۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اُنۡزِلَ الۡکِتٰبُ عَلٰی طَآئِفَتَیۡنِ مِنۡ قَبۡلِنَا ۪ وَ اِنۡ کُنَّا عَنۡ دِرَاسَتِہِمۡ لَغٰفِلِیۡنَ ﴿۱۵۶﴾

۱۵۶۔ تاکہ کبھی تم یہ نہ کہو کہ کتاب تو ہم سے پہلے پہلے دو گروہوں پر نازل ہوئی تھی اور ہم تو ان کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے۔

تشریح کلمات

مُبٰرَکٌ: (ب ر ك) البركة الزيادہ و النماء۔ برکت اضافے اور بڑھنے کو کہتے ہیں۔

دراسة: (د ر س) مسلسل پڑھنے کے معنوں میں آتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَہٰذَا کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰہُ مُبٰرَکٌ: کتاب موسیٰ (ع) کے ذکر کے بعد قرآن کی طرف اشارہ فرمایا: یہ کتاب مبارک ہے، جس میں خیر الدینا و الآخرة ہے۔ اس میں زندگی کی تمام الجھنوں کا حل ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاتے جائیں، ختم ہونے والا نہیں ہے۔

قرآن کے بابرکت ہونے کے ذیل میں طویل مباحث آ سکتے ہیں جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔

۲۔ فَاتَّبِعُوۡہُ: پس اس برکت کو حاصل کرو جو صرف اتباع سے ممکن ہے۔

۳۔ اَنۡ تَقُوۡلُوۡۤا: اس مبارک کتاب کے نازل کرنے سے تمہارا یہ عذر باقی نہ رہا کہ ہدایت کی کتاب تو دو گروہوں، یہود و نصاریٰ پر نازل ہوئی، اگر ہماری طرف کوئی کتاب نازل ہو جاتی،

۴۔ وَ اِنۡ کُنَّا عَنۡ دِرَاسَتِہِمۡ: کتاب چونکہ یہود و نصاری پر نازل ہوئی تھی، اس لیے ہم اس کی تعلیم و تعلم سے بے خبر رہے۔ یعنی کتاب وہی لوگ پڑھتے پڑھاتے تھے، جن پر نازل ہوئی تھی۔ ہم پر کتاب نازل ہوئی نہیں، لہٰذا ہم بے خبر ہیں۔

اہم نکات

۱۔ قرآن کی برکتیں صرف اتباع سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

۲۔ قرآن نے حجت پوری کر کے عذر ختم کیا ہے۔

اَوۡ تَقُوۡلُوۡا لَوۡ اَنَّاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡنَا الۡکِتٰبُ لَکُنَّاۤ اَہۡدٰی مِنۡہُمۡ ۚ فَقَدۡ جَآءَکُمۡ بَیِّنَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃٌ ۚ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ کَذَّبَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ صَدَفَ عَنۡہَا ؕ سَنَجۡزِی الَّذِیۡنَ یَصۡدِفُوۡنَ عَنۡ اٰیٰتِنَا سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ بِمَا کَانُوۡا یَصۡدِفُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

۱۵۷۔ یا تم یوں کہتے: اگر ہم پر بھی کتاب نازل ہو جاتی تو ہم ان سے بہتر ہدایت لیتے، پس اب تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل ہدایت اور رحمت تمہارے پاس آ گئی ہے، پس اس کے بعد اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ کی نشانیوں کی تکذیب کرے اور ان سے منہ موڑے؟ جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑ لیتے ہیں انہیں ہم اس روگردانی پر بدترین سزا دیں گے۔

تفسیر آیات

عربوں میں عموماً اور قبیلہ قریش میں خصوصاً ایک احساس برتری تھا کہ اقوام عالم میں ذہانت و لیاقت میں ہمارا کوئی ہم پلہ نہیں ہے۔ لہٰذا اگر یہود و نصاریٰ کی طرح ہماری طرف بھی کوئی ہدایت کی کتاب آ جاتی تو ہم دوسروں سے زیادہ اس ہدایت سے فائدہ اٹھاتے۔

۱۔ لَکُنَّاۤ اَہۡدٰی مِنۡہُمۡ: تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔

۲۔ فَقَدۡ جَآءَکُمۡ: اس عذر کو قطع کرتے ہوئے فرمایا: لو اب تمہاری طرف ایسی کتاب آئی ہے جو سابقہ کتابوں سے زیادہ ہدایت و رحمت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس کتاب میں شریعت کے اصول، احکام، آداب دعوت، فضائل و اخلاق وغیرہ کی ایسی انمول تعلیمات ہیں، جن سے روگردانی کی صورت میں عذاب بھی اتنا ہی سخت ہو گا، جتنی حجت عظیم ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآن دوسری کتابوں کی بہ نسبت زیادہ بابرکت ہے۔ اس کی ہدایت و رحمت بھی دوسری کتابوں سے زیادہ ہے، کیونکہ یہ کتاب اعجاز کی شکل میں آئی ہے۔

ہَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِیَہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَوۡ یَاۡتِیَ رَبُّکَ اَوۡ یَاۡتِیَ بَعۡضُ اٰیٰتِ رَبِّکَ ؕ یَوۡمَ یَاۡتِیۡ

۱۵۸۔ کیا یہ لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا آپ کا رب خود آئے یا آپ کے رب کی کچھ نشانیاں آ جائیں؟ جس روز آپ کے رب کی بعض نشانیاں آ جائیں گی

بَعۡضُ اٰیٰتِ رَبِّکَ لَا یَنۡفَعُ نَفۡسًا اِیۡمَانُہَا لَمۡ تَکُنۡ اٰمَنَتۡ مِنۡ قَبۡلُ اَوۡ کَسَبَتۡ فِیۡۤ اِیۡمَانِہَا خَیۡرًا ؕ قُلِ انۡتَظِرُوۡۤا اِنَّا مُنۡتَظِرُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾

تو کسی ایسے شخص کو اس کا ایمان فائدہ نہیں دے گا جو (نشانی کے آنے سے) پہلے ایمان نہ لا چکا ہو یا حالت ایمان میں اس نے کوئی کار خیر انجام نہ دیا ہو، کہد یجیے: انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں۔

تفسیر آیات

جو اس قرآن کو نہیں مانتے اور اس واضح دلیل کو بھی قبول نہیں کرتے، کیا یہ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ فرشتے عذاب لے کر آئیں یا اللہ اور ان کے درمیان سے پردہ ہٹ جائے اور اللہ ان کے سامنے حاضر ہو جائے یا کچھ معجزات رونما ہو جائیں تو ایمان لائیں گے۔

۱۔ یَوۡمَ یَاۡتِیۡ بَعۡضُ اٰیٰتِ رَبِّکَ: جب کہ اگر کچھ ایسے فیصلہ کن معجزے آ جائیں تو اس وقت کا ایمان انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا کیونکہ فرشتے عذاب الٰہی لے آئیں گے تو پھر انہیں مہلت نہیں ملے گی۔ چنانچہ فرمایا:

مَا نُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ مَا کَانُوۡۤا اِذًا مُّنۡظَرِیۡنَ ۝ [۱]

(کہد یجیے) ہم فرشتوں کو صرف (فیصلہ کن) حق کے ساتھ ہی نازل کرتے ہیں اور پھر کافروں کو مہلت نہیں دیتے۔

۲۔ اَوۡ کَسَبَتۡ فِیۡۤ اِیۡمَانِہَا خیراً سے یہ استدلال درست ہے کہ صرف ایمان کافی نہیں ہے اگر ایمان کے ساتھ عمل صالح نہ ہو اور زندگی بھر گناہ میں رہا ہو اور موت یا عذاب آنے پر توبہ کر لے تو قبول نہیں ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

> یَوۡمَ یَاۡتِیۡ بَعۡضُ اٰیٰتِ رَبِّکَ، تمہارے رب کی کچھ نشانیاں آئیں، سے مراد سورج کا مغرب کی طرف سے طلوع کرنا ہے۔ اس دن ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔[۲]

اسی مضمون کی حدیث رسول اکرمؐ سے بھی از طریق اصحاب منقول ہے۔[۳]

اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡہُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمۡرُہُمۡ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ یُنَبِّئُہُمۡ بِمَا

۱۵۹۔ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہوں میں بٹ گئے، بے شک آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان کا معاملہ یقیناً اللہ

---

[۱] ۱۵ حجر: ۸ [۲] تفسیر القمی، ۱: ۲۲۱، سورۃ الانعام

[۳] الدر المنثور ۳: ۵۷۔ اس حدیث کو ابو ہریرہ، ابوسعید ابن مسعود نے روایت کیا ہے۔

كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿١٥٩﴾ | کے حوالے ہے پھر وہ انہیں بتائے گا جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔

تفسیر آیات

روئے سخن اگرچہ مشرکین بلکہ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے، جنہوں نے اپنے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا ہے، تاہم تعبیر عام ہے جس میں تمام تفرقہ کرنے والے شامل ہیں۔ مشرکین کا یہ خیال تھا کہ حضورؐ نے ان کے آبائی دین میں تفرقہ پیدا کیا ہے اور ان کی قومی وحدت میں شگاف ڈالا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ اے محمدؐ آپ کا ان تفرقہ بازوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، آپ دین ابراہیمؑ پر قائم ہیں اور اسی اللہ کے دین واحد کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہے ہیں۔ تفرقہ باز وہ ہے جو اس دین واحد اور ملت ابراہیم سے ہٹ کر اپنا ایک جدا راستہ بنا لیتا ہے۔

ہر فرقے کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ حق پر ہے اور ہر فرقہ حق کا متلاشی بھی ہوتا ہے اور مطمئن ہوتا ہے کہ جس مسلک کو اس نے اختیار کیا ہے، وہی حق ہے۔ لہٰذا ہر فرقہ حق کو چاہتا ہے اور ناحق کو مسترد کرتا ہے۔ اپنے مذہب کو بر بنائے حق اختیار کرتا ہے۔ آگے وہ یا تو حق کو پا لیتا ہے یا حصول حق میں غلطی کرتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ناصبی (دشمنان علیؑ و اولاد علیؑ) کا شمار حق کے متلاشی فرقوں میں نہیں ہوتا کہ انہوں نے حق کو تلاش کیا ہو اور حصول حق میں غلطی کا شکار ہو گئے ہوں۔ کیونکہ علی و اولاد علیؑ سے دشمنی ان کی ذات یا ان کے کردار میں کسی قسم کے ابہام، اعتراض یا غلط فہمی کی وجہ سے نہیں ہو سکتی۔ چونکہ ابتدائے بعثت سے لے کر دور بنی امیہ و بنی عباس تک اسلام کے تحفظ اور سربلندی کے لیے علی اور اولاد علیؑ کا خون کام آیا۔ علیؑ و آل علیؑ نے اس دنیا سے سوائے مصائب و آلام کے کیا حاصل کیا ہے؟

ناصبی علیؑ و آل علیؑ کے ساتھ صرف حسد اور عناد کی وجہ سے دشمنی کرتے ہیں۔ علیؑ کے مقام و منزلت پر حسد اور کچھ لوگوں کے بزرگ اسلامی جنگوں میں علیؑ کے ہاتھ قتل ہوئے تو اس پر عناد کرتے ہیں۔ بعد کے نواصب (مثلاً ہمارے معاصر نواصب) محبان علیؑ کے ساتھ عناد کی وجہ سے علیؑ سے دشمنی کرتے ہیں، جس کا وہ اپنی خصوصی محافل میں تو نہایت واشگاف لفظوں میں اور علانیہ طور پر زیر لب اظہار کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ نواصف (دشمنان علی و آل علی) بحکم نص سنت رسولؐ یقیناً جہنمی ہیں۔ حدیث رسولؐ ہے:

تفترق أمّتي على ثلاث وسبعين فرقة،فرقةناجية والباقي في النّار۔ | میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں سے ایک فرقہ نجات پانے والا ہے۔ باقی جہنمی ہیں۔

اس مضمون کی روایت شیعہ و سنی مصادر میں اس قدر کثرت طرف سے موجود ہیں کہ مضمون روایت یقینی ہو جاتا ہے۔

امام محمد عبدہ اس جگہ لکھتے ہیں:

ان فرقوں میں کون سا فرقہ نجات پانے والا ہے اور کون سا فرقہ اس مذہب پر باقی ہے جس پر رسول اللہؐ اور ان کے اصحاب تھے، ابھی تک مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔ کیونکہ ہرفرقہ رسولؐ کی رسالت پر ایمان رکھتا ہے۔ حتیٰ میر داماد[1] نے تو دلیل دی ہے کہ ان تمام فرقوں سے مراد شیعہ فرقے ہیں اور ان میں نجات پانے والا فرقہ امامیہ ہے اور اہل سنت و معتزلہ کو تو انہوں نے امت دعوت[2] میں شمار کیا ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

یہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ فرقہ ناجیہ پہلے آ چکا ہو، اب جو فرقے باقی ہیں، سب ناری ہیں یا ہوسکتا ہے کہ رسول اللہؐ نے جن فرقوں کا ذکر فرمایا ہے، وہ تعداد ابھی پوری نہیں ہوئی یا ہوسکتا ہے کہ وہ فرقہ ناجیہ ابھی تک آیا ہی نہیں ہے اور مستقبل میں آنے والا ہے یا یہ کہ اس وقت موجود تمام مسلمان ایک ہی فرقہ ہیں اور ناجی ہیں اور گمراہ فرقے ابھی پیدا ہونے والے ہیں یا کچھ پیدا ہو گئے ہیں، جیسے نصیری۔[3]

رشید رضا اس عبارت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

اگرچہ درج بالا عبارت محمد عبدہ کے فکری استقلال اور تقلید و تعصب سے بالاتر ہونے پر دلالت کرتی ہے، تاہم وہ اس وقت (طالب علمی کے زمانے میں) کتب حدیث پر وسیع آگاہی کی کمی کا شکار تھے۔ اس وجہ سے وہ فرقہ ناجیہ کی تشخیص نہ کر سکے۔[4]

ہم احادیث رسولؐ پر اطلاع کے لیے چند ایک احادیث کی طرف اشارہ کرتے ہیں، شاید تلاش حق و حصول نجات کے لیے حدیث پر وسیع آگاہی کی کمی کو پورا کیا جاسکے۔

۱۔ امام حاکم نے عوف بن مالك اشجعی کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

تفترق امتی علی بضع و سبعین فرقہ اعظمها فتنة قوم یقیسون الدین برأیهم یحرمون به ما احل اللّٰه ویحلون ما

میری امت ستر فرقوں سے زائد فرقوں میں بٹ جائے گی اور ان میں سے زیادہ فتنہ انگیز فرقہ وہ ہے جو دین کے معاملات میں اپنی ذاتی رائے سے قیاس کرے

---

[1] السید محمد باقر الحسینی معروف میر داماد معروف محقق فلسفی
[2] امت دعوت اس امت کو کہتے ہیں جسے ایمان کی دعوت دی گئی ہے اور امت اجابت اس امت کو کہتے ہیں جس نے ایمان کی دعوت کو قبول کیا ہو۔
[3] تلخیص از المنار ۸: ۲۲۱۔ [4] المنار ۸: ۲۲۲

حرّم اللّٰہ ۔[1]

گا۔ اس طرح وہ اللہ کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیں گے۔

واضح رہے کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام بالاجماع قیاس کے مخالف ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ السُّنَّۃَ لَا تُقَاسُ اَلَا تَرَی اَن امْرَاَۃً تَقْضِی صَوْمَھَا وَ لَا تَقْضِی صَلَاتَھَا۔ یَا اَبَانُ اِنَّ السُّنَّۃَ اِذَا قِیسَتْ مُحِقَ الدِّیْنُ. [2]

سنت میں قیاس نہیں کیا جاتا۔ دیکھتے نہیں ہو حائض عورت روزے کی قضا کرتی ہے، نماز کی نہیں۔ اے ابان! سنت میں قیاس کیا جائے تو دین مٹ جاتا ہے۔

دوسری روایت میں فرمایا:

ان دین اللّٰہ لا یصاب بالقیاس [3]　　دین خدا قیاس سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ صحیح البخاری کتاب الاعتصام بالکتاب و السنۃ ، باب ما کان النبی ص یسأل مما لم ینزل ''حضورؐ، جب تک وحی نازل نہ ہوتی، جواب نہ دیتے'' میں آیا ہے:

و لم یقل برأی و لا قیاس لقولہ تعالیٰ: بما اراک اللّٰہ ۔ آپؐ نے کبھی اپنی رائے اور قیاس سے جواب نہیں دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىکَ اللّٰہُ ....[4]

ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ جیسے اللہ نے آپ کو بتایا ہے، اسی کے مطابق لوگوں میں فیصلے کریں....

قیاس سنت ابلیس ہے: سنن دارمی باب تغیر الزمان میں آیہ خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَہٗ مِنۡ طِیۡنٍ ....[5] ابلیس نے کہا تو نے مجھے آتش سے خلق کیا ہے اور آدم کو گِل سے خلق کیا ہے، لہٰذا میں آدم سے بہتر ہوں، کے ذیل میں حسن کا یہ قول نقل کیا ہے:

اول من قاس ابلیس۔　　سب سے پہلے قیاس ابلیس نے کیا ہے۔

سنن دارمی اسی باب میں ابن سیرین کا یہ قول بھی نقل ہے:

اول من قاس ابلیس و ما عبدت الشمس و القمر الا بالمقاییس۔　　سب سے پہلے قیاس ابلیس نے کیا ہے اور سورج اور چاند کی پرستش قیاس کی بنیاد پر کی گئی ہے۔

یہاں حضرت عمر کا قول بھی قابل توجہ ہے کہ اپنے ایک خطبے میں فرمایا:

---

[1] المنار ۸: ۲۱۹۔ سورۃ الانعام، مسألۃ ج۸: ۱۹۳۔ ناشر: الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب۔ ۱۹۹۰ میلادی۔ المستدرک علی الصحیحین باب ذکر مناقب عوف بن مالک الأشجعی ۲:۶۳۱۔ الإبانۃ الکبری، لابن بطۃ متوفی ۳۷۸ھ، باب ذکر افتراق الامم فی دینھم ....۔ ح ۲۸۲

[2] و [3] الکافی ۱: ۵۷ باب البدع والرأی والمقاییس　[4] نساء : ۱۰۵　[5] ۷ اعراف: ۱۲

أيّها النّاس أنّ الرأْي إنما كان من رسول اللّٰه - صلى اللّٰه عليه وآله وسلم - مُصِيبًا لِّأنّ اللّٰه عزّ وجلّ يُرِيهُوإنّما هو مَنَّاالظَّنُّوَالتَّكَلُّفُ۔[1]

لوگو! رسول اللہؐ کی رائے صائب ہوتی تھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ان کو بتا دیا کرتا تھا لیکن ہماری رائے صرف گمان اور تکلّف (خودساختگی) ہوگی۔

تفسیر مظہری میں اس آیت کے ذیل میں ان کی اپنی کتابوں کی منقولہ احادیث پر تبصرے قابل مطالعہ ہیں۔ ایک حدیث کا متن ملاحظہ فرمائیں جو تفسیر مظہری میں درج ہے:

عن عائشة قالت: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وآله وسلم: سِتّةٌ لعنْتُهُمْ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَكُلُّ نَبِيّ كَانَ الزَّائدُ فى كتابِ اللّٰهِ والمُكَذِّبُ بقَدَرِ اللّٰه وَالْمُتَسَلِّط بالجَبَرُوت لِيُعِزَّ بِذَلِكَ مَن أَذَلَّ اللّٰهُ وَيُذِلُّ مَنُ أَعَزَّه اللّٰهُ والْمُسْتَحِلُّ مِنُ عِترتي مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَالتَّارِكُ لِسُنَّتِي۔[2]

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھ ہیں جن پر میں نے بھی لعنت کی ہے، اللہ نے بھی اور ہر مقبول الدعا نبی نے بھی۔ اللہ کی کتاب میں بیشی کرنے والا۔ تقدیر خداوندی کا انکار کرنے والا۔ زبردستی لوگوں پر تسلط جمانے والا تاکہ جن لوگوں کو اللہ نے عزت دی ہے، ان کو ذلیل کرے اور جن کو اللہ نے ذلت دی ہے، ان کو معزز بنا دے۔ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کرنے والا۔ میری عترت کے ساتھ اس عمل کو حلال سمجھنے والا، جس کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اور میرے طریقے کو چھوڑنے والا۔

پھر ان چھ گروہوں میں سے ”اللہ کی کتاب میں بیشی کرنے والا“ کو لیتے ہیں اور وہی روایتی بہتان طرازی شروع کر دیتے ہیں کہ شیعہ، کتاب خدا میں بیشی کے قائل ہیں۔ باقی گروہوں میں سے کسی گروہ پر تبصرہ نہیں کرتے۔ نہ زبردستی تسلط جمانے والوں پر، نہ اللہ کی طرف سے عزت ملنے والوں کو ذلیل کرنے والوں پر، نہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کرنے والوں پر، نہ عترت رسولؐ پر ظلم و ستم کرنے والوں پر کوئی تبصرہ ہے۔ جب کہ ان پر واہیات پر مبنی نہیں بلکہ طویل اور مستند تبصرے ہو سکتے ہیں۔

رہا شیعوں کا قرآن کے بارے میں مؤقف، اس پر ہم نے مقدمہ میں مفصل بحث کی ہے۔ تحریف قرآن کے بارے میں روایات شیعہ اور غیر شیعہ دونوں کی کتابوں میں کثرت سے موجود ہیں مگر شیعہ ان

---

[1] سنن بیہقی ۲: ۴۴۳ باب ۲۱۔ سنن ابی داؤد ، ۳: ۳۲۹، باب ۷۔ فتح الباری ۱۵: ۲۲۵ ط دار الفکر بیروت

[2] مستدرك حاكم، ۱: ۱۰۵ كتاب الايمان۔ تفسير المظهرى ۳: ۳۱۶ سورة الأنعام آية ۱۵۹، ۔ الكافى، ۲: ۲۹۳۔ سنن الترمذي كتاب ۲۸۔ القدر، باب ۱۷: ستة لعنهم اللّٰه، ۸ : ۳۰۷۔ حاکم نے ترمذی کی مانند اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ صحيح ابن حبان ۱۳: ۶۰ كتاب الحظر والإباحة، باب اللعن۔

روایات کو قبول نہیں کرتے یا تو توجیہ کرتے ہیں کہ تحریف سے مراد تحریف معنوی لیتے ہیں، اگر قابل توجیہ نہیں ہیں تو ان روایات کو مخالف قرآن قرار دے کر رد کرتے ہیں۔

غیر شیعہ ان روایات کو رد نہیں قبول کرتے ہیں اور قبول کرنے کے بعد توجیہ کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں: نسخ تلاوت کی وجہ سے یہ آیات قرآن میں نہیں ہیں۔

ان دونوں مؤقفوں کے درمیان نمایاں فرق ہے:

شیعہ مؤقف کے مطابق ان روایات میں موجود کوئی عبارت قرآن کا حصہ ثابت نہیں ہوتی۔ جب کہ غیر شیعہ کے موقف کے مطابق ان روایات میں موجود عبارات قرآن کا حصہ ثابت ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد نسخ تلاوت کے ذریعے انہیں قرآن سے منفی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر نسخ تلاوت ثابت ہو تو فبہا، ورنہ یہ عبارات قرآن کا حصہ رہتی ہیں۔ ہم نے مقدمہ میں ثابت کیا ہے کہ نسخ تلاوت ثابت نہیں ہے۔

اس کے بعد تفسیر مظہری میں ان روایات کا بھی ذکر کرتے ہیں:

رسول اللہؐ نے فرمایا: میری امت کے کچھ لوگ ہوں گے جن کو رافضی کہا جائے گا۔ وہ اسلام کو چھوڑ دیں گے۔ (رواہ البیہقی)

جب کہ اس قسم کی واہیات کو علماء نے پہلے مسترد کر دیا ہے۔ چنانچہ علامہ شہاب الدین خفاجی اپنی کتاب نسیم الریاض شرح الشفا قاضی عیاض میں لکھتے ہیں:

رواہ البیہقی من طرق الا انہا کلہا ضعیفۃ۔[1]

بیہقی نے کئی طرق سے روایت کی ہے، مگر یہ سب ضعیف ہیں۔

علامہ ابن الجوزی نے اپنی کتاب العلل المتناہیۃ فی الاحادیث الواہیۃ میں اس حدیث کو مختلف الفاظ وطرق کے ساتھ نقل کرنے کے بعد اس پر شدید جرح کی ہے اور نا قابل اعتبار قرار دیا ہے۔[2]

نیز روافض، رافضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد کی اصطلاح ہے۔ عصر رسولؐ میں اس قسم کی اصطلاح کا ذکر کسی جگہ نہیں ملتا، جس طرح قیاس کرنے والوں کا ذکر ملتا ہے۔

چنانچہ قیاس پر عمل نہ کرنا فقہ جعفری کے شعار میں داخل ہے۔

ا۔ کتاب المجروحین ۳: ۶۵ میں ابن حبان نے اور خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں یوسف بن اسباط سے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ فرماتے تھے:

لو ادرکنی رسول اللّٰہ و ادرکتہ لاخذ بکثیر من قولی۔	رسول خداؐ میرے زمانے میں ہوتے اور میں ان کے زمانے میں ہوتا تو رسول اللہؐ میرے بیشتر اقوال کو اخذ فرماتے۔

۱۔ نسیم الریاض شرح الشفا قاضی عیاض ۳: ۱۹۷ ط عثمانیہ اسلامبول ۱۳۱۵ھ ۲۔ العلل المتناہیۃ فی الاحادیث الواہیۃ جلد اول صفحہ ۱۵۹۔۱۶۲

بعض کتابوں میں اس قول کے ساتھ یہ جملہ بھی ہے: وھل الدین الا الرأی الحسن کیا دین اچھی رائے کے علاوہ کچھ ہے؟

ممکن ہے امام ابوحنیفہ کا خیال حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی دوسالہ شاگردی سے پہلے کا ہو۔ اگرچہ وہ رسولؐ کو نہیں پا سکے، فرزند رسولؐ کو تو پا لیا اور کہدیا: لولا السنتان لھلك النعمان۔ اگر دوسالہ شاگردی نہ ہوتی تو نعمان ہلاک ہو چکا ہوتا۔

۲۔ سنت رسولؐ متواترہ (خواہ تواتر معنوی ہو) سے معلوم ہوتا ہے کہ امت ضلالت و گمراہی سے دوچار ہو گی۔ اس کے لیے خود اسی روایت میں حل بھی پیش کیا گیا ہے۔ چند ایک مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

الف. انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ و عترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی۔

میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اللہ کی کتاب اور میری عترت اہل بیت جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہو گے میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔

اس حدیث کو چونتیس اصحاب رسول نے روایت کیا ہے، جس کی تفصیل سورۂ نساء: ۵۹ میں گزر چکی ہے۔ اس حدیث متواتر سے یہ ثابت اور قطعی ہے کہ قرآن و عترت سے تمسک کرنے والا فرقہ ناجی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر فرقہ یہ دعویٰ کرے کہ قرآن و عترت سے تمسک کرنے والا فرقہ ہم ہیں۔

ب. مثل اھل بیتی کمثل سفینۃ نوح من رکبھا نجا و من تخلف عنھا غرق و ھوی۔

میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے جو اس پر سوار ہوا، اس کو نجات مل گئی، جو اس سے پیچھے رہ گیا، وہ غرق ہو گیا۔

اس حدیث کو حضرت علی علیہ السلام، ابوذرؓ، ابوسعید خدری، ابن عباس اور انس بن مالک نے روایت کیا ہے۔

ج۔ بعض روایات میں آیا ہے:

و مثل باب حطۃ فی بنی اسرائیل۔[1] اہل بیت کی مثال بنی اسرائیل میں باب حطۃ کی سی ہے۔

ملاحظہ ہو: مستدرك حاکم ۳: ۱۵۰۔ حلیۃ الاولیاء ۴: ۳۰۶۔ تاریخ بغداد ۱۲: ۱۹۔ مجمع الزوائد ۹: ۱۶۸۔ کنز العمال ۶: ۱۔ صواعق محرقہ ص ۷۵۔ دار قطبی، طبرانی، ابن جریر اور احمد بن حنبل سے روایت لی ہے۔[2]

---

[1] السیرۃ الحلبیۃ، ۲: ۶۹۳۔ غزوۃ الحدیبیۃ، المعجم الأوسط ۴: ۹۔ من اسمہ الحسین، المعجم الصغیر ۱: ۲۴۷، مثل أھل بیتی .... المعجم الکبیر، ۳: ۴۵۔ حسن بن علیؑ، مصنف ابن أبی شیبۃ، ۱۲: ۷۷، ۱۸۔ فضائل علیؑ، جامع الاحادیث للسیوطی ۱۰: ۸۔ جمع الجوامع ۱: ۹۲۷۹۔ الدر المنثور ۱: ۱۲۴ باب ۵۸۔ کنز العمال ۲: ۴۳۵ سورۃ ھود۔

[2] معالم المدرستین ۱: ۳۱۲

ہم نے یہاں مشہور احادیث کا ایک نمونہ پیش کیا ہے اگر کوئی ان تمام احادیث کو جمع کر لے جن میں اہل بیت اطہار علیہم السلام کی پیروی کو ہی ذریعہ نجات قرار دیا ہے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی اور حدیث کا معنوی تواتر بھی ثابت ہو جائے گا۔

مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِہَا ۚ وَ مَنۡ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجۡزٰۤی اِلَّا مِثۡلَہَا وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۰﴾

۱۶۰۔ جو (اللہ کے پاس) ایک نیکی لے کر آئے گا اسے دس گنا (اجر) ملے گا اور جو برائی لے کر آئے گا اسے صرف اسی برائی جتنا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تفسیر آیات

۱۔ یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے ایک نوید ہے، ایک عظیم احسان ہے، جس نے رحمت کو اپنی ذات پر لازم قرار دیا ہے:

کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ ...[1] تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے.

وہ ایک نیکی کا کم سے کم دس گنا اجر دے گا اور گناہ کی صورت میں صرف ایک بدلہ دیا جائے گا۔ ایک نیکی کو دس نیکیوں کے برابر اجر دینے سے مراد کمترین درجہ کی بات ہے کہ ایک نیکی کا اجر دس گنا سے کم نہ ہوگا، زیادہ اجر کی حد بندی نہیں کی گئی۔ مثلاً راہ خدا میں خرچ کرنے کی نیکی کے بارے میں فرمایا:

مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِیۡ کُلِّ سُنۡۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ ؕ وَ اللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿﴾[2]

جو لوگ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں ان (کے مال) کی مثال اس دانے کی سی ہے جس کی سات بالیاں اگ آئیں جن میں سے ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں اور اللہ جس (کے عمل) کو چاہتا ہے دگنا کر دیتا ہے، اللہ بڑا کشائش والا، دانا ہے۔

۲۔ اس آیت میں ایک دانہ جو راہ خدا میں خرچ ہوتا ہے، سات سو دانوں کے برابر اور اسے دگنا کرنے سے ایک نیکی چودہ سو کے برابر بتائی گئی ہے اور صبر کی نیکی کے بارے میں تو فرمایا:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَہُمۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿﴾[3]

یقیناً بے شمار ثواب تو صرف صبر کرنے والوں ہی کو ملے گا۔

۳۔ مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَۃِ: جو اللہ کے پاس نیکی لے کر آئے۔ جب وہ اللہ کی بارگاہ میں

---

[1] ۶ انعام: ۵۴ [2] ۲ بقرۃ: ۲۶۱ [3] ۳۹ زمر: ۱۰

حاضر ہوگا تو نیکی اس کے پاس ہوگی۔ اس سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ نیکی بجا لانا کافی نہیں ہے، قیامت کے دن اللہ کے حضور نیکی لے کر حاضر ہو۔ چونکہ بعض اوقات ایک لغزش سے ساری نیکیاں اکارت جاتی ہیں۔ چنانچہ سورہ حجرات میں فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ [1]

اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نبی کے ساتھ اونچی آواز سے بات نہ کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات کرتے ہو کہیں تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

حضرت ابوذر روایت کرتے ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا:

إنّ اللّٰه تعالى قال: الحسنة عشر أو أزيد، والسيّئة واحدة، أو اغفر، فالويل لمن غلبت آحاده أعشاره۔ [2]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک نیکی کا دس گنا یا زیادہ اجر رکھا ہے اور گناہ کو ایک ہی رکھا ہے یا اسے بھی بخش دوں گا۔ افسوس تو ان لوگوں پر ہے جن کی اکائیاں دہائیوں پر غالب آ جاتی ہیں۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے:

ويل لمن غلبت احاده اعشاره۔ [3]

افسوس ان لوگوں پر جن کی اکائیاں دہائیوں پر غالب آ جاتی ہیں۔

اہم نکات

۱۔ نیکی کا اجر لاتعداد اور گناہ کا بدلہ عفو کے ذریعے صفر ہو سکتا ہے۔ یہ ہے مقام ارحم الراحمین۔

۲۔ نیکی لے کر آئے، صرف انجام دینا کافی نہیں ہے۔ چونکہ بعض اوقات اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

۱۶۱۔ کہد یجیے: میرے پروردگار نے مجھے صراط مستقیم دکھائی ہے جو ایک استوار دین ہے، (یہی) ملت ابراہیم (اور توحید کی طرف) یکسوئی کا دین ہے اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہیں تھے۔

---

[1] حجرات:۲

[2] مجمع البیان۔ ذیل آیہ۔ تفسیر کبیر ۱۱، ۴۳۔ سورۃ النساء، تفسیر نیسابوری ۳: ۳۸۰۔ عون المعبود ۷: ۷۸ عیادۃ النساء۔

[3] معانی الاخبار ص ۲۴۸۔ الوسائل ۱۶: ۱۰۳

تشریح کلمات

مِلَّۃَ: (م ل ل) املاء سے ہے۔ مراد شریعت ہے۔ ہر نبی اپنی امت کو شریعت اور دستور حیات املاء کرتا ہے، یعنی تعلیم دینا ہے۔

تفسیر آیات

اس سورہ مبارکہ میں کفر و شرک کے مقابلے میں دلائل، تذکر اور نصائح پیش کرنے اور حلال و حرام کے سلسلے میں نظام اسلامی کا ایک معتدبہ حصہ بیان فرمانے کے بعد یہ ہدایت ملتی ہے: اے رسولؐ کہد یجیے: یہ ہے میرے رب کی رہنمائی، یہ ہے دین قیم، یہ ہے ایک استوار نظام جو دین توحید، دین ابراہیمی سے عبارت ہے۔

۱۔ دِیۡنًا قِیَمًا: ایسا دین جو استقامت اور استواری پر مبنی ہے، جو نا قابل تنسیخ ہے۔ ایک قرائت میں قَیِّماً آیا ہے چنانچہ قَیِّم اور قِیَم دونوں کے ایک معنی ہیں۔

۲۔ مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ: اس نا قابل تنسیخ دین سے شریعت ابراہیمی کی تشکیل ہوگئی ہے۔

۳۔ حَنِیۡفًا: جو صرف اللہ کی طرف یکسوئی رکھنے والا ہے۔

قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾

۱۶۲۔ کہد یجیے: میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب یقیناً اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

لَا شَرِیۡکَ لَہٗ ۚ وَ بِذٰلِکَ اُمِرۡتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۶۳﴾

۱۶۳۔ جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

تفسیر آیات

توحید خالص یہ ہے کہ تمام امور خواہ تشریعی ہوں، جیسے نماز و دیگر عبادات، خواہ تکوینی ہوں، جیسے زندگی اور موت، سب کا تعلق رب العالمین سے ہے۔ عبادت ہو تو صرف اسی ذات کے لیے ہو۔ زندگی یا موت کا مسئلہ درپیش ہو تو راضی برضا اور تسلیم بامر خدا ہو۔ عبادت، موت و حیات کے کسی مسئلے میں غیر اللہ کی طرف رجوع کا شائبہ تک نہ ہو۔ دین ابراہیمی کا اصل الاصول یہی ہے کہ آتش نمرود کے شعلوں کی لپیٹ میں جاتے ہوئے جبرئیل امین جیسے عظیم القدر فرشتے کو بھی اعتنا میں نہ لائے اور صرف اور صرف اپنے رب سے لو لگائے۔

اَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ: اول سے مراد از لحاظ زمانہ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ خود رسول خداؐ سے مروی ہے:

اول ما خلق اللّٰہ نوری ۔[1] اللہ نے جو سب سے پہلے خلق کیا ہے، وہ میرا نور ہے۔

اور از لحاظ درجہ تو یقیناً رسول اسلامؐ اول درجہ پر فائز ہیں۔ اسی لیے قرآن نے باقی انبیاء (ع) کے بارے میں من المسلمین کی تعبیر اختیار فرمائی ہے اور صرف رسول اسلامؐ کے لیے اول المسلمین کہا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کا جینا اللہ کے لیے ہوتا ہے تو اس کا ہر عمل کھانا، سونا اور کسب و کمائی کرنا، سب عبادت ہو جاتا ہے۔ مرنا اللہ کے لیے ہوتا ہے تو انسان دیدار رب کا مشتاق ہوتا ہے۔ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ ....

قُلۡ اَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡغِیۡ رَبًّا وَّ ہُوَ رَبُّ کُلِّ شَیۡءٍ ؕ وَ لَا تَکۡسِبُ کُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَیۡہَا ۚ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ۚ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ مَّرۡجِعُکُمۡ فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ﴿۱۶۴﴾

۱۶۴۔ کہد یجیے: کیا میں کسی غیر اللہ کو اپنا معبود بناؤں؟ حالانکہ اللہ ہر چیز کا رب ہے اور ہر شخص اپنے کیے کا خود ذمے دار ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے پھر (وہاں) وہ تمہیں بتائے گا جس چیز کے بارے میں تم لوگ اختلاف کیا کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ توحید پر ایک واضح دلیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہر چیز کا رب ہے تو غیر اللہ کو رب بنانے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی، کیونکہ ہر چیز کا وجود، بقا اور ارتقا اللہ کی طرف سے ہے۔ غیر اللہ کی طرف سے نہ وجود ہے، نہ بقا و ارتقا نیز کُلِّ شَیۡءٍ میں مشرکوں کے سارے معبود آ جاتے ہیں۔ لہٰذا جب سورج، ستارے، اصنام اور حضرت مسیح (ع) سب میری طرح اللہ کی مخلوق اور مربوب ہیں تو ان کو رب کیسے بنا سکتا ہوں۔

۲۔ توحید اور عدل الٰہی کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے۔ نہ اس پر کسی اور کے عمل کا بوجھ آئے گا، نہ اس کے عمل کا بوجھ کوئی اور اٹھائے گا:

اَمۡ لَمۡ یُنَبَّاۡ بِمَا فِیۡ صُحُفِ مُوۡسٰی ۙ وَ اِبۡرٰہِیۡمَ الَّذِیۡ وَفّٰۤی ۙ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ

کیا اسے ان باتوں کی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں میں تھیں؟ اور ابراہیم کے (صحیفوں میں)

---

[1] عوالی الآلی ۴: ۹۹۔ بحار الانور ۲۵: ۲۲، باب ۱۔ المواقف ۲: ۶۸۶، المقصد الاول، السیرۃ الحلبیۃ ۱: ۲۴۰۔ تفسیر النیسابوری ۳: ۳۸۴۔ مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ۱: ۳۸۷، باب الایمان بالقدر

وِّزۡرَ اُخۡرٰی ﴿ۙ﴾ وَ اَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿ۙ﴾[1]

جس نے (حق اطاعت) پورا کیا؟ یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کو صرف وہی ملتا ہے جس کی وہ سعی کرتا ہے۔

اس عادلانہ کلیے سے صنم پرستوں اور مشرکوں کے عقائد و نظریات کی بیخ کنی ہو گئی۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ بتوں کی وجہ سے وہ اپنے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے اور بغیر عمل و کوشش کے قرب الٰہی کے مستحق بنیں گے۔

اس کلیہ میں درج ذیل امور داخل نہیں ہیں:

i۔ جو شخص ایک اچھی سنت رائج کرتا ہے، اس کو اس کا ثواب اور اس پر عمل کرنے والوں کا بھی ثواب ملے گا اور جو شخص ایک بری سنت رائج کرتا ہے تو اسے اس کا گناہ اور اس پر عمل کرنے والوں کا بھی گناہ اٹھانا ہوگا۔ (حدیث نبوی)

ii۔ انسان جب مر جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے: صدقہ جاریہ، وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے اور اولاد صالح جو اس کے لیے دعا کرے۔ (حدیث نبوی)

iii۔ مرنے والے کی نماز و روزہ کی قضا بیٹے کی طرف سے بجا لائی جائے۔

iv۔ دعائے مؤمن برائے استغفار مومن۔

چنانچہ پہلی اور دوسری صورت عمل کنندہ کے آثار ہیں، جن کا سبب وہ خود ہے۔ اس لیے وہ بھی ثواب کا مستحق بن جاتا ہے۔ تیسری اور چوتھی صورت میں انسان اپنے اختیار سے دوسرے کو اپنے اعمال کے نتائج و ثمر کو ہدیہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ عمل منظور ہے، بشرطیکہ ہدیہ وصول کرنے والا خود کو اپنے اعمال سے اس لائق بنائے کہ کسی کا ہدیہ اس کے لیے مفید ہو۔ مثلاً جسم کا نظام اس قابل ہو کہ دوائی اس کے لیے مفید ہو اور وہ روایت اس آیت سے متصادم ہے جو کہتی ہے کہ رونے سے میت کو عذاب ملتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہر شخص کو خود اپنے عمل پر تکیہ کرنا چاہیے: وَلَا تَکۡسِبُ کُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَیۡهَا ...۔

۲۔ دوسروں کے گناہ کا بوجھ آپ پر نہیں گرے گا تو دوسروں کے عمل خیر سے بھی آپ کو کچھ نہیں ملے گا، سوائے مقررہ موارد کے۔

وَ هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَکُمۡ خَلٰٓئِفَ الۡاَرۡضِ وَ رَفَعَ بَعۡضَکُمۡ فَوۡقَ

۱۶۵۔ اور وہ وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض پر بعض کے درجات بلند کیے تاکہ جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا

---

[1] ۵۳ نجم: ۳۶ تا ۳۹

بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبۡلُوَکُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰىکُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّکَ سَرِیۡعُ الۡعِقَابِ ۫ۖ وَ اِنَّہٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۶۵﴾	ہے اس میں وہ تمہیں آزمائے، بے شک آپ کا رب (جہاں) جلد عذاب دینے والا ہے (وہاں) وہ یقیناً بڑا غفور رحیم بھی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ آدم و اولاد آدم کو زمین میں جانشین بنانے کے مسئلہ پر ہم سورہ بقرہ آیت ۳۰ میں بحث کر چکے ہیں۔ البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جَعَلَکُمۡ کا خطاب مسلمانوں سے من حیث الانسان ہے تو اولاد آدم مراد ہو گی اور اگر من حیث الامۃ ہے تو امت محمد یہ مراد ہو گی۔ پھر خلافت سے مراد نسلاً بعد نسلٍ ایک دوسرے کے جانشین ہیں یا اللہ کا نمائندہ ہونے کے اعتبار سے ہے؟ ہم نے سورہ بقرہ میں یہ نظریہ اختیار کیا ہے کہ خلافت سے مراد خلافت الٰہیہ ہے۔ یعنی اللہ کا نمائندہ ہونے کے اعتبار سے ہے۔ لہٰذا جَعَلَکُمۡ کا خطاب زمین پر اللہ کے نمائندوں سے ہے۔ جو لوگ خلیفہ سے مراد گزشتہ نسلوں کے جانشین لیتے ہیں، ان کے نزدیک جَعَلَکُمۡ کا خطاب سب انسانوں سے ہے۔

۲۔ انسانوں کی درجہ بندیاں کی گئی ہیں کہ کچھ کو دوسروں سے طاقت، علم، دولت، فکر و عمل کے اعتبار سے زیادہ مقام حاصل ہوتا ہے۔ یہ انسان کے خود مختار ہونے اور تکوینی امور کے ثانوی حیثیت کے تقاضوں کی وجہ سے ہے۔ اس درجہ بندی کا ذمے دار بھی خود انسان کا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے انسانوں کا امتحان لیتا ہے:

وَ جَعَلۡنَا بَعۡضَکُمۡ لِبَعۡضٍ فِتۡنَۃً ؕ اَتَصۡبِرُوۡنَ ...[1]	اور ہم نے تمہیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنا دیا، کیا تم صبر کرتے ہو؟

چنانچہ بعض اقوام کو دوسری قوموں پر مسلط کیا جاتا ہے۔ بعض کو دوسرے گروہ پر مسلط کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مسلم اقوام آج کل غیر مسلم طاقتوں کے زیر تسلط مسلوب الاختیار ہیں۔ اس کی ذمہ داری بھی کمزور اقوام پر عائد ہوتی ہے کہ ان کی اپنے شامت اعمال کی وجہ سے وہ کمزور واقع ہو جاتی ہیں ورنہ اصولاً ان میں کوئی کمزوری نہیں تھی۔

اللہ تعالیٰ مکافات عمل کے عقاب میں دیر نہیں کرتا، اگرچہ قانونی سزا میں وہ غفور و رحیم ہے۔

اہم نکات

۱۔ قوموں کے عروج و زوال کے ذریعے قوموں کی آزمائش ہوتی ہے۔

۲۔ مکافات عمل اور طبعی عقاب فوری ہوتا ہے۔ کوئی قوم اپنی کوتاہی سے کمزور بن جاتی ہے تو ذلت و خواری کا عذاب فوری ہے۔ البتہ اللہ اپنی قانونی سزا دینے میں بڑا غفور و رحیم ہے۔

---

[1] ۲۵ فرقان: ۲۰

سُورَۃُ الاَعۡرَاف

بسم اللہ الرحمن الرحیم
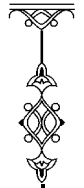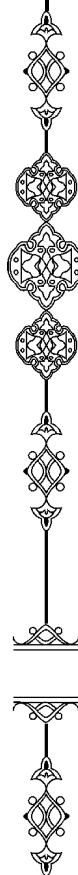
الاعراف: اس سورہ کا نام الاعراف اس لیے ہے کہ آیت ۴۶۔ ۴۷ میں اعراف کا ذکر آیا ہے۔ اعراف جنت اور جہنم کے درمیان ایک اونچی جگہ کا نام ہے، جہاں کچھ ہستیاں اہل جنت اور اہل جہنم دونوں کا مشاہدہ کریں گی۔

زمانہ نزول

ممکن ہے سورۂ اعراف، سورۂ انعام سے پہلے نازل ہوا ہو۔ چنانچہ سورۂ انعام میں فرمایا:

قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطۡعَمُہٗۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّکُوۡنَ مَیۡتَۃً اَوۡ دَمًا مَّسۡفُوۡحًا اَوۡ لَحۡمَ خِنۡزِیۡرٍ فَاِنَّہٗ رِجۡسٌ اَوۡ فِسۡقًا اُہِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰہِ بِہٖ ....[1]

کہد یجیے: جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو کھانے والے پر حرام ہو مگر یہ کہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت کیونکہ یہ ناپاک ہیں یا ناجائز ذبیحہ جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو..

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے ان چیزوں کے علاوہ باقی اشیاء کی حلیت کا حکم آ چکا تھا اور وہ سورۂ اعراف کی یہ آیت ہوسکتی ہے:

قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِہٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ ...[2]

کہد یجیے: اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی اور پاک رزق کو کس نے حرام کیا؟

چنانچہ اس سورہ کے احکام زیادہ مختصر اور اجمال کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ جیسا کہ بیانِ احکام میں شارع مقدس کا یہی طریقہ رہا ہے کہ احکام کو تدریجاً اجمال کے بعد تفصیل سے بیان فرمایا کرتا ہے اور بعض روایات میں بھی آیا ہے کہ سورۂ اعراف پہلے نازل ہوا ہے۔

زمانہ نزول

قرآنی سورتوں میں سے ہر سورہ اپنی جگہ جدا تشخص رکھتا ہے اور ہر سورہ ایک خصوصیت کا حامل ہے، جب کہ مقصد اور منزل ایک ہی ہے۔ چنانچہ سورہ انعام اور سورہ اعراف دونوں مکی ہیں۔ دونوں ایک جیسے

---

[1] ٦ انعام: ١٤٥　[2] ٧ اعراف: ٣٢

ماحول اور ایک جیسے حالات میں نازل ہوئے اور دونوں سورتوں کا موضوع اور روئے سخن بھی ایک ہے یعنی توحید۔ اس کے باوجود سورۂ انعام توحید پر منطقی دلائل پیش کرتا ہے، جب کہ سورۂ اعراف دعوت توحید کے تاریخی حقائق بیان کرتا ہے۔ شاید طبعی ترتیب بھی یہی ہے کہ پہلے دعوت کی تاریخی شہادتیں پیش کریں، پھر بعد میں اس کی معقولیت اور حقانیت پر دلیل پیش کی جائے۔

یہ سورہ، توحید کی تاریخ کا بیان تخلیق آدم کے وقت سے شروع کرتا ہے۔ چنانچہ تخلیق آدم کے وقت پوری نسل آدم سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی۔ فرمایا:

وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّکَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّیَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی ۚۛ شَهِدۡنَا ۚۛ ...۔[1]	اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور ان پر خود انہیں گواہ بنا کر (پوچھا تھا:) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا تھا: ہاں! (تو ہمارا رب ہے) ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔

آدمؑ و ابلیس کا واقعہ بیان ہوتا ہے جو اس توحیدی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اس کاروان کے اہم ارکان نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب اور موسیٰ علیہم السلام کا ذکر ہے اور ان سب کی آواز یہ تھی:

یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ...۔[2]	اے میری قوم! تم اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے...۔

تاریخ توحید کے بیان کے ساتھ اس کے میر کاروان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی یہ بتایا جا رہا ہے کہ جو سلوک یہ مشرک قوم آپؐ کے ساتھ کر رہی ہے، ایسا ہی سلوک آپؐ سے پہلے قومیں اپنے رسولوں کے ساتھ کرتی رہی ہیں اور وہ اپنے برے انجام کو پہنچ چکی ہیں۔

---

[1] ۷ اعراف: ۱۷۲ [2] ۷ اعراف: ۵۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بنام خدائے رحمن رحیم

الٓمّٓصٓ ①

۱۔ الف لام میم صاد۔

کِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ فَلَا یَکُنۡ فِیۡ صَدۡرِکَ حَرَجٌ مِّنۡہُ لِتُنۡذِرَ بِہٖ وَ ذِکۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ②

۲۔ یہ کتاب آپ پر (اس لیے) نازل کی گئی ہے کہ آپ اس سے لوگوں کو تنبیہ کریں اور اہل ایمان کے لیے نصیحت ہو پس آپ کو اس سے کسی قسم کی دل تنگی محسوس نہیں ہونی چاہیے۔

تفسیر آیات

یہ کتاب ایک ایسا پیغام لے کر نازل ہوئی ہے جو اس وقت کے لوگوں کی خواہشات، عقائد و نظریات، روایات اور دیگر مفادات کا مخالف ہے اور ایک ایسی قوم تک یہ پیغام پہنچاتی ہے جو تمام انسانی، اخلاقی اور اجتماعی قدروں سے نابلد ایک نہایت معاند اور جھگڑالو ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰہُ بِلِسَانِکَ لِتُبَشِّرَ بِہِ الۡمُتَّقِیۡنَ وَ تُنۡذِرَ بِہٖ قَوۡمًا لُّدًّا ○ [1]

(اے رسول!) پس ہم نے یہ قرآن آپ کی زبان میں یقیناً آسان کیا ہے تاکہ آپ اس سے صاحبان تقویٰ کو بشارت دیں اور جھگڑالو قوم کی تنبیہ کریں۔

اس بدتہذیب اور جھگڑالو قوم کا سدھارنا اور ان کی تربیت کرنا ایک نہایت مشکل کام تھا۔ اس وجہ سے دوسری جگہ فرمایا:

وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّکَ یَضِیۡقُ صَدۡرُکَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ○ [2]

اور بتحقیق ہمیں علم ہے کہ یہ جو کچھ کہ رہے ہیں اس سے آپ یقیناً دل تنگ ہو رہے ہیں۔

اس آیت میں ارشاد ہوا:

فَلَا یَکُنۡ فِیۡ صَدۡرِکَ حَرَجٌ [3]

پس آپ کو اس سے کسی قسم کی دل تنگی محسوس نہیں ہونی چاہیے۔

ایک اور جگہ قرآن میں فرمایا:

---

[1] ۱۹ مریم: ۹۷ [2] ۱۵ حجر: ۹۷ [3] ۷ اعراف: ۲

اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَکَ صَدۡرَکَ ۝ [1] کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کا سینہ کشادہ نہیں کیا.

اس شرح صدر سے حضورؐ نے اس قول ثقیل کا تحمل فرمایا:

اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ۝ [2] عنقریب آپ پر ہم ایک بھاری حکم (کا بوجھ) ڈالنے والے ہیں۔

اس بدو، ناخواندہ اور ہٹ دھرم قوم میں ایسا دستور اور نظام حیات نافذ فرمایا جس سے دنیا نے تمدن سیکھا۔ انسانی اور اخلاقی قدریں سیکھیں۔

اہم نکات

۱۔ پیغام اس قدر سنگین تھا کہ وحی الٰہی تحمل کرنے والا عظیم اور طاقتور قلب بھی تنگ پڑ جاتا تھا۔

۲۔ مؤمن کے لیے یاددہانی، ذِکۡرٰی اور غیر مؤمن کے لیے انذار، انجام بد سے آگاہ کرنا رسولؐ کی رسالت کا خلاصہ ہے۔

اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ لَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ۝۳

۳۔ اس (کتاب) کی پیروی کرو جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور اس کے سوا دوسرے آقاؤں کی اتباع نہ کرو، مگر تم نصیحت کم ہی قبول کرتے ہو۔

تفسیر آیات

یہ آیت سابقہ آیت پر عمل کی صورت بیان کر رہی ہے کہ اِتَّبِعُوۡا سے مومنین کے لیے کتاب اللہ کی پیروی کرنے کی نصیحت شروع ہوتی ہے اور وَلَا تَتَّبِعُوۡا دوسروں کے لیے اللہ کے سوا دوسرے آقاؤں کی اتباع سے باز رہنے کا حکم اور اس کے انجام بد سے آگاہی ہے جو اس سورہ کا مرکزی عنوان ہے اور اس دعوت کی اساس ہے کہ قرآن کے دیے ہوئے نظام حیات کو اپنانا چاہیے۔ اسے چھوڑ کر دوسرے آقاؤں کی اتباع کرنا ہلاکت ہے۔

اہم نکات

۱۔ راستے صرف دو ہیں: ایک ما انزل اللّٰہ کی اتباع اور دوسرے اس کے ماسوا کی اتباع، یعنی دوسرے آقاؤں کی اتباع۔

---

[1] ۹۴ الم نشرح: ۱ [2] ۷۳ مزمل: ۵

۲۔ جس ماسوا اللہ کی اتباع ہو گی، وہی اس کا ولی اور آقا ہو گا، خواہ اس کو آقا تسلیم کرے یا اس پر لعنت کرے: مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ...۔

وَکَمۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اَہۡلَکۡنٰہَا فَجَآءَہَا بَاۡسُنَا بَیَاتًا اَوۡ ہُمۡ قَآئِلُوۡنَ ﴿۴﴾ فَمَا کَانَ دَعۡوٰىہُمۡ اِذۡ جَآءَہُمۡ بَاۡسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۵﴾

۴۔ اور کتنی ایسی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے تباہ کیا، پس ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت آیا یا ایسے وقت جب وہ دوپہر کو سو رہے تھے۔
۵۔ پس جب ہمارا عذاب ان پر آیا تو وہ صرف یہی کہہ سکے: واقعی ہم ظالم تھے۔

تشریح کلمات

البیات : (ب ی ت) رات کو دشمن پر حملہ کرنا۔ شبخون مارنا۔

قَآئِلُوۡنَ : (ق ی ل) قیلولہ۔ دوپہر کے وقت استراحت کے لیے سونا۔

تفسیر آیات

سنت الٰہی اور خدائی طریقہ کار کی طرف اشارہ ہے کہ قرون ماضیہ کی قومیں عبرت کے لیے بہترین مثال ہیں۔ ان میں اللہ کا طریقۂ عمل یہ تھا کہ ان پر حجت پوری کرنے کے بعد بھی اگر شیطانی اتباع جاری رہی، معجزہ دکھانے کے باوجود طغیانی جاری رہی، دلیل و برہان قائم کرنے کے لیے ان کے سارے مطالبات قبول ہونے کے بعد بھی کفر و الحاد پر عمل ہوتا رہا تو ان پر عذاب نازل ہو جاتا ہے اور ان کو نابود کر دیا جاتا ہے۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ ہر طرح حجت پوری ہونے کے بعد سرکشی جاری رہنے پر جب عذاب آجاتا ہے اور مہلت ختم ہو جاتی ہے تو اس وقت غلطی کا اعتراف بے سود ہو گا۔

اہم نکات

۱۔ ناقابل تردید معجزات کے بعد جب مہلت ختم ہو جاتی ہے تو اللہ سریع العذاب ہے۔

۲۔ سرکش سے اللہ ہر صورت میں اعتراف لیتا ہے: اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ۔

فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِیۡنَ اُرۡسِلَ اِلَیۡہِمۡ وَلَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۶﴾

۶۔ پس جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے ہم ہر صورت میں ان سے سوال کریں گے اور خود پیغمبروں سے بھی ہم ضرور پوچھیں گے۔

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیۡہِمۡ بِعِلۡمٍ وَّ مَا کُنَّا غَآئِبِیۡنَ﴿۷﴾

۷۔ پھر ہم پورے علم و آگہی سے ان سے سرگزشت بیان کریں گے اور ہم غائب تو نہیں تھے۔

تفسیر آیات

فَلَنَسۡـَٔلَنَّ: یہ روز قیامت کی بازپرس کا ذکر ہے کہ پیغمبروں سے پوچھا جائے گا کہ اللہ کا پیغام پہنچانے میں کوئی کوتاہی تو نہیں کی گئی اور جن قوموں کی طرف رسول بھیجے گئے تھے، ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے ہمارے رسولوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

فَلَنَقُصَّنَّ: اس کے بعد فرمایا کہ سوال کرنے والا ان دونوں کے حالات سے خوب واقف ہے۔ لہٰذا وہ خود ان کے اعمال کا حال بیان کرے گا اور ان پر یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ سوال کرنے والا خود وہاں حاضر تھا۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کے دن انبیاء تک سے بھی سوال ہو گا: وَلَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ... ۔

۲۔ قیامت کے دن حساب لینے اور فیصلہ سنانے والی وہی ذات ہو گی جس کے سامنے گناہ کیا گیا ہے: وَّ مَا کُنَّا غَآئِبِیۡنَ۔

وَالۡوَزۡنُ یَوۡمَئِذِ ۣالۡحَقُّ ۚ فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴿۸﴾

۸۔ اور اس دن (اعمال کا) تولنا برحق ہے، پھر جن (کے اعمال) کا پلڑا بھاری ہو گا پس وہی فلاح پائیں گے۔

وَ مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ بِمَا کَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَظۡلِمُوۡنَ﴿۹﴾

۹۔ اور جن کا پلہ ہلکا ہو گا وہ لوگ ہماری آیات سے زیادتی کے سبب خود گھاٹے میں رہے۔

تفسیر آیات

آیت سے یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ نیکیوں کا وزن ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں گناہوں کا وزن نہیں ہوتا۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ وَلِقَآئِہٖ — یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں

فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَلَا نُقِيۡمُ لَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَزۡنًا ○ [1]

اور اللہ کے حضور جانے کا انکار کیا جس سے ان کے اعمال برباد ہو گئے، لہٰذا ہم قیامت کے دن ان کے (اعمال کے) لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔

لہٰذا اعمال کے وزن کے بارے میں کسی تاویل و توجیہ کی طرف جانے کی بجائے خود قرآن کی تعبیر کے مطابق یہ مؤقف اختیار کرنا درست ہو گا: انسان کے اعمال اللہ کے معیار کے مطابق یا مثبت ہوں گے یا منفی۔ مثبت اعمال کا قیامت کے دن وزن اور قیمت ہو گی اور منفی اعمال بے وزن اور بے قدر ہوں گے۔ چنانچہ زیر بحث آیت اور دیگر متعدد آیات میں نیکیوں کے لیے وزن ثابت ہوا ہے اور گناہوں کو بے وزن کہا ہے۔ قرآنی تعبیر ثَقُلَتۡ اور خَفَّتۡ میں وہی موازنہ ہے جو مثبت اور منفی، قیمتی اور بے قدری میں ہے۔ لہٰذا ثقل سے وزن، قدر اور قیمت کی طرف اشارہ ہے اور خَفَّتۡ سے بے قیمت اور بے قدری کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح اعمال کے وزن کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جس کی نیکیاں زیادہ ہوں گی، اس کا مثبت پہلو غالب رہے گا اور وہ فلاح پائے گا اور جس کا منفی پہلو غالب آئے گا، وہ ہلاکت میں ہو گا۔

ہشام بن حکم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں:

آپؑ سے ایک زندیق نے سوال کیا کہ کیا اعمال کا وزن کیا جاتا ہے؟
فرمایا: نہیں۔ اعمال کوئی جسم نہیں بلکہ یہ تو ان کے کردار کے وصف کا نام ہے۔
وزن تو وہ کرتا ہے جس کو اشیاء کی تعداد کا علم نہ ہو اور اس وزن اور خفت کا علم بھی نہ ہو۔ اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔
زندیق نے پوچھا: تو میزان سے کیا مراد ہے؟
فرمایا: اس سے مراد انصاف ہے۔
زندیق نے کہا: پھر فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ کا کیا مطلب ہے؟
فرمایا: جس کا عمل غالب آئے۔ [2]

بعض دیگر احادیث میں انبیاء اور اوصیاء علیہم السلام کو مقیاس اور معیار قرار دیا ہے۔ اس طرح قیامت کے ترازو کا مفہوم بھی قابل فہم ہو جاتا ہے کہ اعمال کو تولنے سے کیا مراد ہے؟ چنانچہ میزان اس چیز کو کہتے ہیں جس پر چیزوں کو پرکھا جاتا ہے۔ لہٰذا انبیاء و اوصیاء ہی میزان اور ترازو اور الٰہی معیار کی اساس ہیں، جن پر دوسرے بندوں کے اعمال کی قیمت لگائی جائے گی۔

وَلَقَدۡ مَكَّنّٰكُمۡ فِي الۡاَرۡضِ وَ

۱۰۔ اور ہم ہی نے تمہیں زمین میں بسایا اور اس

---

[1] ۱۸ کہف: ۱۰۵ [2] المیزان ۸: ۱۲

جَعَلۡنَا لَکُمۡ فِیۡہَا مَعَایِشَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۱۰﴾ میں تمہارے لیے سامان زیست فراہم کیا (مگر) تم کم ہی شکر کرتے ہو۔

تفسیر آیات

یہاں مکنا سے مراد، بسانا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد فِیۡ سے بات آگے بڑھائی ہے اور اگر لام کے ساتھ بات آگے بڑھتی تو اقتدار وسلطنت کے معنوں میں ہوتا۔ جیسا کہ مَکَّنَّا لِیُوۡسُفَ[1] میں لام آیا ہے۔ البتہ سورج آیت ۴۱ میں مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ سے اقتدار مراد لیا جا سکتا ہے۔

کائنات کی فضا کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہاں حیات اور زندگی کے لیے کوئی فضا سازگار نہیں ہے۔ اگر کوئی شعور و ارادہ جو کائناتی رکاوٹوں سے کہیں زیادہ طاقتور ہو، موجود نہ ہو، یہاں زندگی کی نشو ونما ممکن نہیں۔ اپنے نظام شمسی کو لے لیجیے کہ اس میں صرف ایک ہی کرہ یعنی زمین اس وقت حیات کے لیے سازگار ہے۔ یہ بھی ایک زمانے میں آگ کے شعلوں سے عبارت تھی۔ اب اس زمین کو زندگی کے لیے سازگار بنایا۔ نہ اتنی سخت بنائی کہ دانہ نہ نکلے، نہ اتنی نرم بنائی کہ کوئی چیز ٹھہر نہ سکے۔ چونکہ نرم چیز پر کوئی عمارت ٹھہر نہیں سکتی۔ سورج سے نہ چنداں دور کہ سردی سے زندگی ممکن نہ ہو، نہ چنداں نزدیک کہ گرمی سے حیات ممکن نہ ہو۔ زمین کی سورج کے گرد گردش اور محوری حرکت کی رفتار بھی مناسب۔ پھر زمین کے اندر وہ خصوصیات ودیعت فرمائیں جن سے انسان اور دیگر جاندار اپنی روزی حاصل کر سکتے ہیں اور انسان ان کی صلاحیتوں کو مسخر کر سکتا ہے۔ اس پر پڑنے والی شعاعیں، اس کی فضا میں موجود ہوائیں، اس کی خاک میں موجود صلاحیتیں اور پانی کی طراوت وغیرہ سب انسانی زندگی کے لیے سازگار اور معاون ہیں۔ جیسا کہ سورہ حٰمٓ سجدہ آیت ۱۰ میں فرمایا:

وَ جَعَلَ فِیۡہَا رَوَاسِیَ مِنۡ فَوۡقِہَا وَ بٰرَکَ فِیۡہَا وَ قَدَّرَ فِیۡہَاۤ اَقۡوَاتَہَا فِیۡۤ اَرۡبَعَۃِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیۡنَ﴿﴾ اور اسی نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں برکات رکھ دیں اور اس میں چاردنوں میں حاجت مندوں کی ضروریات کے برابر سامان خوراک مقرر کیا۔

زمینی حقائق کا تفصیلی اور دقیق مطالعہ کرنے کے بعد اس آیت کی تلاوت کی جائے:

وَ لَقَدۡ مَکَّنّٰکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ جَعَلۡنَا لَکُمۡ فِیۡہَا مَعَایِشَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ﴿﴾

تو مؤمن بے ساختہ کہہ اٹھے گا: صدق اللّٰہ العلی العظیم۔

وَ لَقَدۡ خَلَقۡنٰکُمۡ ثُمَّ صَوَّرۡنٰکُمۡ ۱۱۔ بتحقیق ہم نے تمہیں خلق کیا پھر تمہیں شکل وصورت

---

[1] ۱۲ یوسف: ۲۱

ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ⑪

دی پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو پس سب نے سجدہ کیا صرف ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ تھا۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ⑫

۱۲۔ فرمایا: تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے باز رکھا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا؟ بولا: میں اس سے بہتر ہوں، مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ⑬

۱۳۔ فرمایا: یہاں سے اتر جا! تجھے حق نہیں کہ یہاں تکبر کرے، پس نکل جا! تیرا شمار ذلیلوں میں ہے۔

قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ⑭

۱۴۔ بولا: مجھے روز قیامت تک مہلت دے۔

قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ⑮

۱۵۔ فرمایا: بے شک تجھے مہلت دی گئی۔

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑯

۱۶۔ بولا: جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں بھی تیرے سیدھے راستے پر ان کی گھات میں ضرور بیٹھا رہوں گا۔

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَاۗىِٕلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ⑰

۱۷۔ پھر ان کے آگے پیچھے دائیں اور بائیں (ہر طرف) سے انہیں ضرور گھیر لوں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا۔

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ⑱

۱۸۔ فرمایا: تو یہاں سے ذلیل و مردود ہو کر نکل جا، ان میں سے جو بھی تیری اتباع کرے گا تو میں تم سب سے جہنم کو ضرور بھر دوں گا۔

تفسیر آیات

آدمؑ کو زمین میں بسانے کا واقعہ کس طرح پیش آیا؟ اس کے پیچھے کون سے محرکات کارفرما تھے؟ آدم بحیثیت انسان کون سا مقام اور منصب لے کر اس سرزمین پر جاگزین ہوئے؟ ان کو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا؟ اس کرۂ ارض پر نسل آدم کو کن ارتقائی مراحل سے گزارا گیا؟ ان آیات میں انسانی تاریخ کے ان اہم واقعات کا ذکر ملے گا۔

۱۔ وَلَقَدۡ خَلَقۡنٰکُمۡ: اس آیت کی ترتیب کلام پر نظر ڈالیں۔ پورے بنی نوع انسان سے خطاب ہے کہ ہم نے تم کو خلق کیا۔ پھر تم کو شکل و صورت دی۔ ترتیب کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ تخلیق اور تصویر، دو مختلف ادوار میں عمل میں آئیں۔ پہلے تخلیق کا عمل، پھر دوسرے دور میں تصویر کا عمل۔ اس طرح تخلیق و تصویر میں تدریجی عمل کا بھی عندیہ ملتا ہے۔ پھر آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا۔

> اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آدم کو جو سجدہ کرایا گیا تھا وہ ذات آدم کے لیے نہ تھا، بلکہ نوع انسانی کا نمایندہ ہونے کی حیثیت سے تھا۔ آدم تو اس سجدہ کے لیے کعبہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ لہٰذا نوع انسان مسجود ملائکہ ہے۔ آدم اس نوع کے نمائندے کی حیثیت سے اس سجدہ کے لیے کعبہ قرار پائے۔[1]

۲۔ ابلیس نے آدم کو سجدہ نہیں کیا جب کہ ملائکہ کو حکم ہوا تھا کہ سجدہ کریں۔ ابلیس کا تعلق ملائکہ سے نہ تھا بلکہ وہ تو جن تھا۔ چنانچہ فرمایا:

فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ کَانَ مِنَ الۡجِنِّ	سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے وہ جنات میں سے
فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّہٖ ...[2]	تھا پس وہ اپنے رب کی اطاعت سے خارج ہو گیا۔

جواب یہ دیتے ہیں کہ ابلیس اگرچہ جنات میں سے تھا لیکن وہ کثرت عبادت کے ذریعے مقام قدس پر فائز ہوا تھا۔ چنانچہ وَنُقَدِّسُ لَکَ[1] سے ظاہر ہے اور آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم مقام قدس پر فائز ہونے والوں کے لیے تھا۔ اس بات کو خود ابلیس بھی درک کر چکا تھا۔ اسی لیے اس نے سجدہ نہ کرنے پر نسلی امتیاز سے استدلال کیا۔

۳۔ مَا مَنَعَکَ: اللہ کی طرف سے ابلیس سے سوال یہ ہوا کہ تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے باز رکھا جب کہ میں نے حکم دیا تھا تو ابلیس نے جواب دیا: میں آدم سے بہتر ہوں، مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔

اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ: ابلیس نے نص صریح کے مقابلے میں ذاتی رائے، امر الٰہی کے خلاف اپنا اجتہاد، حکمت الٰہی کے مقابلے میں اپنا فلسفہ، الٰہی معیار کے مقابلے میں اپنا معیار، خالق کے دستور کے مقابلے میں اپنی منطق پیش کی اور عناصر تخلیق میں تقابل کیا۔ عنصر خاکی پر آگ کے عنصر کو فضیلت دی۔ ان عناصر کے خالق

---

[1] المیزان ذیل آیہ [2] ۱۸ کہف: ۵۰

کے سامنے یہ گستاخی کی اور کہا: میرے نزدیک خاکی عنصر سے آتشی عنصر بہتر ہے۔ لٰہذا اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ [1] کا نعرہ بلند کیا۔ یوں اس نے ایک باطل قیاس کے رواج اور ایک غیر منطقی استدلال کی روش کی بنیاد رکھی۔ اس طرح وہ اس سے غافل رہا کہ اگر عناصر ہی کو معیار بنایا جائے تو نوری مخلوق، فرشتوں کو قبلہ گاہ سجدہ بنایا جانا چاہیے، نہ خاکی مخلوق آدمؑ کو۔ پھر یہ بھی قابل توجہ ہے کہ عناصر میں فضیلت کا معیار کیا ہے اور نار سے خاک افضل کیوں نہیں ہوسکتی؟

سب سے پہلا قیاس: ابونعیم نے حلیة الاولیاء میں، دیلمی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے، انہوں نے اپنے پدر بزرگوار سے، انہوں نے اپنے جد بزرگوار سے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

اول من قاس امر الدین برأیه ابلیس قال اللّٰه تعالیٰ له اسجد لاٰدم فقال انا خیر منه۔

دینی امور میں سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کو اپنایا۔ اللہ نے اس کو حکم دیا آدم کو سجدہ کرو، اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں۔

قال جعفر: فمن قاس امر الدین برأیه قرنه اللّٰه تعالیٰ یوم القیمة بابلیس ۔ [2]

جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: لٰہذا جو دینی امور میں قیاس کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بروز قیامت ابلیس کے ساتھ کر دیتا ہے۔

ابن سیرین سے صحیح السند روایت ہے کہ انہوں نے کہا:

اول من قاس ابلیس وما عبدت الشمس و القمر الا بالمقاییس.

سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا اور سورج چاند کی پوجا قیاس ہی کی بنیاد پر کی گئی۔

اور واحدی نے البسیط میں ابن عباس سے روایت کی ہے:

کانت الطاعة اولی بابلیس من القیاس فعصی ربه و قاس و اول من قاس ابلیس فکفر بقیاسه فمن قاس الدین بشیٔ من رأیه قرنه اللّٰه مع ابلیس۔ [3]

ابلیس کے لیے اللہ کی اطاعت کرنا قیاس کرنے سے بہتر تھا لیکن اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور قیاس کیا۔ اس طرح سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کو اپنایا۔ لٰہذا جو بھی دین کے بارے میں قیاس کرے، اللہ تعالیٰ اسے ابلیس کے ساتھ کر دے گا۔

مشہور فقیہ شعبی کہتے ہیں: خبردار! قیاس پر عمل نہ کرو۔ اگر تم نے قیاس پر عمل کیا تو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دے گا۔

مسروق وراق قیاس کے بارے میں کہتے ہیں:

---

[1] بقرہ: ۳۰　[2] المنار ۸: ۳۳۱۔ تفسیر مراغی ۷: ۱۱۲

[3] تفسیر ابن جریر۔ تفسیر قرطبی ۷: ۱۷۱۔ تفسیر ابوحیان ۵: ۱۸۔ تفسیر کشف الاسرار ۳: ؟۳

قاموا من السوق اذ قلّت مکاسبھم. فاستعملوا الرأی عند الفقر و البؤس۔[1]

جب ان کی کمائی میں کمی آئی تو اپنی غربت کو دور کرنے کے لیے بازار سے اٹھ کر قیاس کو ذریعہ بنانے کے لیے آ گئے۔

اشرف تھانوی لکھتے ہیں:

> ایسا شخص شیطان کا وارث ہے جو اپنی رائے اور رویئت کو، چاہے وہ کشف پر مبنی ہو یا وجدان و ذوق پر، شریعت کے مقابلے میں ترجیح دیتا ہے۔[2]

قیاس یا ذاتی رائے: اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک مسئلہ ایسا ہے کہ جس کا حکم قرآن وسنت اور کسی شرعی دلیل میں نہیں ملتا تو اس حکم کو ذاتی رائے اور مفروضہ کی بنیاد پر کسی اور حکم پر قیاس کر کے ثابت کیا جائے۔ اس حکم کے اندر موجود حکمت اور راز کو اپنی رائے سے فرض کر لیا جاتا ہے اور اس خود ساختہ مفروضے کی بنیاد پر حکم خدا ثابت کیا جاتا ہے۔ مثلاً کفن تیار کرنے کے بعد کسی وجہ سے میت ناپید ہو جاتی ہے تو کفن وارث کو واپس مل جاتا ہے۔ فقہ حنفی نے اس حکم پر مسجد کو قیاس کر لیا کہ اگر آبادی نہ ہونے کی وجہ سے مسجد بے مصرف ہوگئی تو یہ مسجد واقف کو واپس مل جائے گی اور مفروضہ یہ ہے کہ کفن بے مصرف ہونے کی وجہ سے وارث کو واپس ملا ہے تو مسجد بے مصرف ہونے کی وجہ سے واقف کو واپس جاتی ہے۔ یہاں مکتب قیاس نے بے مصرف ہونے کو حکم کا دار و مدار قرار دیا ہے جو ایک خیال، ظن اور مفروضہ ہے۔ جب کہ کفن کے کپڑے اور مسجد کے درمیان آسمان و زمین کا فرق ہے۔ مسجد وقف ہے اور کفن وارثوں پر میت موجود ہونے کی صورت میں واجب ہے۔ میت نہ ہونے کی صورت میں واجب ہی نہیں۔ مسجد اللہ کی عبادت سے متعلق ہے فی الوقت مصرف نہ ہونا ایک وقتی بات ہے، جب کہ کفن ایک میت سے متعلق ہے۔

لوگ اس قسم کا قیاس سود کے بارے میں کرتے ہیں اور کہتے ہیں: اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا...[3] بیع یعنی خرید و فروخت بھی تو سود ہی کی طرح ہے اور ذبیحہ کے بارے میں مکہ کے مشرکین اسی طرح قیاس کرتے تھے: کیا وجہ ہے کہ جس کو تم لوگوں نے ذبح کیا ہے وہ تو حلال ہے اور جس کو اللہ نے مارا ہے وہ حلال نہیں ہے۔

اس وجہ سے ائمہ اہل البیت علیہم السلام بالاجماع قیاس کو مسترد کرتے ہیں۔ امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ السُّنَّۃَ اِذَا قِیسَتْ مُحِقَ الدِّینُ۔[4] سنت میں اگر قیاس کیا جائے تو دین مٹ جاتا ہے۔

ہم نے اس سے پہلے بھی علامہ عبد البر سے عوف بن مالک اشجعی کی یہ حدیث نقل کی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] تفسیر محاسن التاویل ۷: ۲۰ [2] بیان القرآن ۱: ۴۸۴ [3] ۲ بقرہ: ۲۷۵ [4] اصول الکافی ۱: ۵۷

تفترق امتی علی بضع و سبعین فرقة اعظمها فتنة قوم یقیسون الدین برأیهم یحرمون به ما احل اللّٰه و یحلّون ما حرم اللّٰه ۔[1]	میری امت ستر سے زائد فرقوں میں بٹ جائے گی ان میں سب سے زیادہ فتنہ انگیز فرقہ وہ ہے جو دین کے بارے میں اپنی رائے سے قیاس کرے گا۔ اس طرح وہ اللہ کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دے گا۔

قَالَ فَاهۡبِطۡ مِنۡهَا : یہ جگہ تواضع اور بندگی کی جگہ ہے۔ تکبر کی جگہ نہیں ہے۔ لہٰذا ھبوط و نزول اس کے عمل کا ایک قدرتی نتیجہ تھا۔

۴۔ قَالَ اَنۡظِرۡنِیۡۤ : ابلیس نے اگرچہ قیامت تک کے لیے مہلت مانگی تھی مگر اس کو قیامت تک مہلت نہیں ملی، البتہ ایک مدت معلوم تک اسے مہلت دی گئی ہے۔ چنانچہ سورۂ حجر میں فرمایا:

قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ○ قَالَ فَاِنَّکَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ○ اِلٰی یَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ○ [2]	کہا: پروردگارا! پھر مجھے لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن (قیامت) تک مہلت دے دے. فرمایا: تو مہلت ملنے والوں میں سے ہے. معین وقت کے دن تک.

۵۔ قَالَ فَبِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ : ابلیس نے مہلت پانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے چیلنج کیا اور کہا: جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں بھی تیرے صراط مستقیم کی گھات میں بیٹھا رہوں گا۔ اس میں ابلیس نے اپنی گمراہی کو اللہ کے ذمے ڈالا کہ تو نے آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر مجھے فاسق کر دیا۔ یہ بھی ابلیسی سوچ ہے کہ اپنے عمل کا خود کو ذمے دار نہ سمجھے اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبری عمل تصور کرے۔

ابلیس نے انسان سے انتقام لینے کے لیے یہ قسم کھا لی کہ وہ اللہ کے صراط مستقیم کی گھات میں بیٹھا رہے گا اور لوگوں کو گمراہی کی طرف لے جایا کرے گا۔ اس مقصد کے لیے وہ انسان کے نفسیاتی ذرائع استعمال میں لاتا ہے۔ چنانچہ وہ خوف، امید، آرزو، خواہشات اور غصہ وغیرہ کے ذریعے انسان پر اپنا تصرف قائم کرتا ہے:

یَعِدُهُمۡ وَ یُمَنِّیۡهِمۡ ؕ وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا○ [3]	وہ انہیں وعدوں اور امیدوں میں الجھاتا ہے اور ان کے ساتھ شیطان کے وعدے بس فریب پر مبنی ہوتے ہیں.

وہ باطل کو حق کی شکل دیتا ہے اور یہ باور کراتا ہے کہ یہی حق ہے اور انسان یہ سوچتا ہے کہ یہ میری اپنی سوچ ہے۔ اس سوچ میں استدلال رکھتا ہوں، جب کہ در اصل ابلیس اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس کو غلط فہمی میں ڈال دیتا ہے۔ غفلت اور تساہل ہر جرم و گناہ کے لیے آماجگاہ ہوا کرتی ہیں۔ یہاں سے شیطان اپنے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیۡمٍ○ [4]	ہر جھوٹے بدکار پر شیاطین اترتے ہیں۔

---

[1] المنار ۸: ۲۱۹　[2] ۱۵ حجر: ۳۶ تا ۳۸　[3] ۴ نساء: ۱۲۰　[4] ۲۶ شعراء: ۲۲۲

چنانچہ ابلیس انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے وہی کردار ادا کرتا ہے جو فرشتے صحیح رہنمائی کے لیے ادا کرتے ہیں لیکن قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ انسان پر ابلیس کے تصرفات ایسے نہیں ہیں جو خود انسان کے اپنے تصرفات سے متصادم ہوں۔ مثلاً انسان خود حرام نہیں کھانا چاہتا مگر ابلیس اس کو حرام کھانے پر مجبور کرتا ہو بلکہ وہ انسان کے تصرفات کے پیچھے ایک محرک کے طور پر کام کرتا ہے اور عمل انسان کا اپنا ہوتا ہے، ابلیس اس عمل کا محرک ہوتا ہے۔ لہٰذا شیطان کے بہکانے سے نہ انسان مجبور ہوتا ہے، نہ اس کی خود مختاری مجروح ہوتی ہے۔ چنانچہ صرف جنات میں شیطان نہیں ہوتے بلکہ انسانی شیطان بھی ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ ....[1] اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے جن و انس کے شیطانوں کو دشمن قرار دیا ہے ....

انسانی شیطان، جب اپنے پھندے میں آنے والوں کو گمراہ کرتا ہے تو وہ محرک بنتا ہے، دوسروں کو مجبور نہیں کرتا۔ اگر مجبور کرے تو یہ صرف جبر کرنے والے کا عمل شمار ہوگا، مجبور شخص معذور ہوگا۔

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ : مجمع البیان میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ آگے سے ان پر آخرت کو بے اہمیت کر دیتا ہوں، مِنْ خَلْفِهِمْ پیچھے سے مال و دولت جمع کرنے پر لگاتا ہوں اور حقوق کے منع کرنے پر اکساتا ہوں تاکہ وارث کے لیے رہ جائے۔ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ دائیں طرف سے گمراہی کے شبہات کو خوشنما بنا کر ان کے دین کو بگاڑ دیتا ہوں۔ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ بائیں طرف سے لذتوں سے دلچسپی پیدا کرتا ہوں اور ان کے دلوں میں شہوتوں کو غالب کرتا ہوں۔

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ اور اے آدم! آپ اور آپ کی زوجہ اس جنت میں سکونت اختیار کریں اور دونوں جہاں سے چاہیں کھائیں مگر اس درخت کے نزدیک نہ جانا ورنہ آپ دونوں ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ

۲۰۔ پھر شیطان نے انہیں بہکایا تاکہ اس طرح ان دونوں کے شرم کے مقامات جو ان سے چھپائے رکھے گئے تھے، ان کے لیے نمایاں ہو جائیں

---

[1] ۶ انعام: ۱۱۲

الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَا مَلَكَيۡنِ اَوۡ تَكُوۡنَا مِنَ الۡخٰلِدِيۡنَ ﴿۲۰﴾

اور کہا: تمہارے رب نے اس درخت سے تمہیں صرف اس لیے منع کیا ہے کہ مبادا تم فرشتے بن جاؤ یا زندہ جاوید بن جاؤ۔

وَقَاسَمَهُمَاۤ اِنِّىۡ لَـكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيۡنَ ۙ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اور اس نے قسم کھا کر دونوں سے کہا: میں یقیناً تمہارا خیر خواہ ہوں۔

فَدَلّٰٮهُمَا بِغُرُوۡرٍ‌ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتۡ لَهُمَا سَوۡاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخۡصِفٰنِ عَلَيۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَـنَّةِ‌ ؕ وَنَادٰٮهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمۡ اَنۡهَكُمَا عَنۡ تِلۡكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّـكُمَاۤ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَـكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ پھر فریب سے انہیں (اس طرف) مائل کر دیا، جب انہوں نے درخت کو چکھ لیا تو ان کے شرم کے مقامات ان کے لیے نمایاں ہو گئے اور وہ جنت کے پتے اپنے اوپر جوڑنے لگے اور ان کے رب نے انہیں پکارا: کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا؟ اور تمہیں بتایا نہ تھا کہ شیطان یقیناً تمہارا کھلا دشمن ہے؟

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ٚ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ دونوں نے کہا: پروردگارا! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

تشریح کلمات

سوآت: (س و ء) وہ بات جو بری لگے۔ سوءۃ الانسان سے مراد اس کی شرم گاہ ہے۔

دلّی: (د ل و) پستی کی طرف تدریجاً لے جانا۔ الدلو

غرور: (غ ر ر) فریب، دھوکہ دینا۔

یخصف: (خ ص ف) گوتھنا جوڑنا۔

تفسیر آیات

ا۔ انسان کو بہکانے کے لیے ابلیس کا سب سے پہلا ہدف انسان کے شرم کے مقامات تھے اور اسی مقصد کے لیے اس نے آدم کو وسوسہ میں ڈالا۔ چنانچہ فرمایا: پھر شیطان نے ان دونوں کو بہکایا تا کہ ان دونوں

کے شرم کے مقامات جوان سے چھپائے گئے تھے، نمایاں ہو جائیں: لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَاوُرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا...

۲۔ آدم کو عریاں کر کے ابلیس انتقام لینا چاہتا تھا یا اس سے جنسی خواہشات کی طرف اشارہ ہے کہ پھل کھانے سے تناسلی خواہشات شروع ہو گئیں اور انسان کو گمراہ کرنے کے اس ذریعے کو ابلیس استعمال کرنا چاہتا تھا؟ یا پھل کھانے سے بقول بائبل آدم وحوا کی آنکھیں کھل گئیں؟ یا ان سے جنت کے لباس اتر گئے یا یہ کوئی تکوینی امر تھا اور پھل کھانے اور لباس اترنے میں کوئی طبعی ربط تھا؟ یہ سب تحقیق طلب باتیں ہیں، جن کو ثابت کرنے کے لیے ہمارے پاس قرآن و روایات کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہیں ہے اور ان سے یہ وضاحتیں نہیں ملتیں۔ البتہ شرم کے مقامات اور پردہ ایک مادی چیز ضرور تھی، جسے ڈھانپنے کے لیے مادی چیز (پتوں) کی ضرورت پیش آئی: يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ....

البتہ درخت کے پھل کھانے اور شرم کے مقامات کھلنے میں کوئی ربط ضرور تھا: فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا ....

بائبل میں آیا ہے:

> تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور انہیں معلوم ہوا کہ ہم ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لیے لنگیاں بنائیں۔[1]

۳۔ بہرحال اس آیت سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ شرم و حجاب ایک فطری اور طبعی امر ہے۔ یہ تہذیب و تمدن، تربیت کی وجہ سے نہیں ہے۔ آج بھی ابلیس کی اولاد، آدم کی اولاد کو بے لباس کرنے پر مصر ہے:

يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا ...[2]　　اور انہیں بے لباس کیا...۔

اور آج کا ابلیس جنسی خواہشات کی راہ سے بے حیائی اور فواحش کو عام کرنے پر تلا ہوا ہے۔

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ: ابلیس نے آدمؑ سے کہا اس درخت کے کھانے سے منع اس لیے کیا گیا ہے کہ مبادا تم فرشتے بن جاؤ۔ یعنی آدم کو فرشتہ بننے کا لالچ دیا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آدمؑ مسجود ملائکہ ہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انہیں اپنے سے کمتر بننے کا لالچ دیا جائے؟

جواب: ابلیس نے آدمؑ کی سرشت میں موجود حب بقا کو ذریعہ بنایا۔ آدمؑ کو علم تھا کہ فرشتے تا قیامت زندہ رہیں گے۔ اس لیے ابلیس نے یہ لالچ دیا ہو کہ آپؑ جہاں مسجود ملائکہ ہیں، وہاں درخت کھانے کے بعد فرشتوں کا یہ وصف بھی حاصل کر سکیں گے۔ چنانچہ سورہ طہ: ۱۲۰ میں فرمایا:

هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ○　　ابلیس نے کہا: اے آدم! کیا میں تمہیں ہیشگی کے درخت اور لازوال سلطنت کے بارے میں بتاؤں؟

---

[1] پیدائش ۳: ۷　　[2] ۷ اعراف: ۲۷

یعنی حیات جاویداں اور لازوال سلطنت کی خواہش انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ شیطان نے اسی خواہش کو متحرک کر کے آدمؑ کو شجرہ ممنوعہ سے کھانے پر اکسایا۔ کیونکہ انسان کو جب اپنی خواہشات کی تکمیل کا آسان راستہ دیکھایا جاتا ہے تو وہ بہت جلد اس پر چل پڑتا ہے۔ قصہ آدمؑ کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۲۹۔۳۰۔

اہم نکات

۱۔ روٹی، مکان اور بیوی، انسان کے ابتدائی لوازم حیات ہیں: وَ یٰۤاٰدَمُ اسۡکُنۡ اَنۡتَ وَ زَوۡجُکَ الۡجَنَّۃَ فَکُلَا مِنۡ حَیۡثُ شِئۡتُمَا ....

۲۔ بقاء کی خواہش انسان کی سرشت میں ودیعت ہے۔ ابلیس نے اس خواہش کو ذریعہ بنایا: اَوۡ تَکُوۡنَا مِنَ الۡخٰلِدِیۡنَ۔

قَالَ اهۡبِطُوۡا بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِیۡهَا تَحۡیَوۡنَ وَ فِیۡهَا تَمُوۡتُوۡنَ وَ مِنۡهَا تُخۡرَجُوۡنَ ﴿۲۵﴾

۲۴۔ فرمایا: ایک دوسرے کے دشمن بن کر نیچے اتر جاؤ اور زمین میں تمہارے لیے ایک مدت تک قیام اور سامان زیست ہوگا۔

۲۵۔ فرمایا: زمین ہی میں تمہیں جینا اور وہیں تمہیں مرنا ہوگا اور (آخرکار) اسی میں سے تمہیں نکالا جائے گا۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ نے دو فیصلے انسان کے لیے لازمی قرار دیے ہیں: ایک یہ کہ انسان و ابلیس میں ہمیشہ عداوت رہے گی۔ دوسرا یہ کہ ارضی زندگی گزارنا انسان کے لیے لازمی ہوگا۔

قصہ آدمؑ کے بارے میں اہم نکات کے لیے ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۲۹ تا ۳۶۔

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیۡرٌ ؕ ذٰلِکَ مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اے فرزندان آدم! ہم نے تمہارے لیے لباس نازل کیا جو تمہارے شرم کے مقامات کو چھپائے اور تمہارے لیے آرائش (بھی) ہو اور سب سے بہترین لباس تو تقویٰ ہے، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے شاید یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔

تشریح کلمات

رِيْشًا: (ر ی ش) پرندے کے پروں کو کہتے ہیں اور یہ پر ان کے لیے لباس کی جگہ ہوتے ہیں، اس لیے لباس کو ریش کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیت میں ایک ایسے مسئلے کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جو انسان کی شرم و حیا سے بھی مربوط ہے اور ساتھ جمالیاتی قدروں سے بھی مربوط ہے۔ یہ دونوں فطری اور طبعی ہیں۔ پہلے بھی ذکر ہوا کہ انسان کے میں شرم و حیا تہذیب و تربیت کی طرف سے آنے والی اکتسابی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک فطری چیز ہے۔ انسان کو اپنے فطری تقاضوں پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اس شرم و حیا کو از خود محسوس کرتا ہے اور بغیر کسی تعلیم و تلقین کے اپنی شرم کے مقامات کو چھپانے لگتا ہے۔ حضرت آدم و حوا نے جنت کے پتوں سے اس طبعی اور فطری محرک کی بنا پر اپنے لیے ستر بنایا تھا۔

اس آیہ شریفہ میں فرمایا: ہم نے لباس نازل کیا ہے۔ نزول خلق کے معنوں میں بھی قرآن میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ لوہے کے بارے میں فرمایا: وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ [1] ہم نے لوہا نازل کیا۔ اگرچہ لباس انسان کے اپنے ہاتھوں سے بنایا جاتا ہے، تاہم کائنات میں رونما ہونے والا ہر عمل بالآخر اللہ تعالیٰ پر منتہی ہے۔ اس لیے یہاں رونما ہونے والا ہر عمل اللہ کی طرف منسوب ہوتا ہے: وَاللّٰہُ خَلَقَکُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ [2] تمہیں اور تمہارے اعمال کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔

اور ممکن ہے کہ اَنۡزَلۡنَا سے مراد شرعنا ہو۔ یعنی ہم نے لباس سے ستر پوشی کو واجب قرار دیا ہے۔

وَرِیۡشًا: یعنی لباس جہاں ذریعہ حفظ حیاء و عفت ہے، وہاں انسان کے لیے زیب تن بھی ہے۔ قدرت نے جمالیاتی ذوق جہاں انسانی فطرت میں ودیعت فرمایا ہے، وہاں اس ذوق کی تکمیل کے لیے ضروری تعلیم بھی دی ہے۔ قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِہٖ ...۔ [3] یہاں سے استنباط کیا جاتا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے لباس کے زینت بنانے کو بطور احسن ذکر کیا ہے، لہٰذا اس زینت کو اختیار کرنا نہ صرف مباح ہے بلکہ اعتدال کی حدود میں رہ کر اس کو اختیار کرنا مستحسن بھی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

اَزْيَنُ اللِّبَاسِ لِلْمُؤْمِنِ لِبَاسُ التَّقْوَى...۔ [4]	مؤمن کے لیے زیبا ترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلِبَاسُ التَّقۡوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیۡرٌ ...۔ مگر ظاہری لباس بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، جس

---

[1] ۵۷ حدید: ۲۵ [2] ۳۷ صافات: ۹۶ [3] ۷ اعراف: ۳۲ [4] مستدرک الوسائل ۳: ۳۲۵

سے اولاد آدم کی ستر پوشی ہوتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔ جس سے اللہ نے اولاد آدم کو نوازا ہے دوسروں کو نہیں نوازا۔ اور یہ مؤمنین کے لیے فرض کی ادائیگی کا ذریعہ ہے۔ تمہارا بہترین لباس وہ ہے جو تجھے اللہ سے دور نہ کرے بلکہ اس کے ذکر، شکر اور اطاعت کے ذریعے اللہ سے قریب کرے اور تجھے خود پسندی دکھاوے، زینت و تفاخر اور تکبر پر نہ اکسائے۔ ایسا کرنا دین کے لیے آفت اور قساوت قلبی کا باعث ہے۔ جب تم اپنا لباس پہن لو تو یہ بات ذہن میں لاؤ۔ اللہ نے اپنی رحمت سے تمہارے گناہوں کو چھپایا ہے اور جیسے تو نے اپنے ظاہر کو کپڑے سے چھپایا ہے، اپنے باطن کو بھی چھپا۔ تیرا باطن، سچائی کی ہیبت کے پردے میں اور ظاہر اطاعت کے پردے میں ہونا چاہیے۔ اللہ کے فضل و کرم سے یہ بات سمجھو کہ اس نے اپنے فضل سے لباس کے مواد فراہم کیے تاکہ ظاہری شرم گاہوں کی پردہ پوشی ہو جائے اور توبہ و انابت و فریاد رسی کا دروازہ کھول کر گناہ اور بداخلاقی کی باطنی شرم گاہوں کی ستر پوشی فرمائی۔ ملاحظہ ہو مستدرک الوسائل ۳:۳۲۴۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

خیر لباس کل زمان لباس اھلہ۔[1]	ہر زمانے کا بہترین لباس، اس زمانے کے لوگوں کا لباس ہے۔

اسلام کی اس انسانی و فطری تعلیم کی وجہ سے افریقہ اور ہندوستان کی بہت سی متوحش قوموں کو ستر پوشی کرنے اور لباس پہننے کا سلیقہ آ گیا، جس کی تفصیل تفسیر المنار نے بیان کی ہے۔

وَلِبَاسُ التَّقۡوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیۡرٌ : جس کے پاس تقویٰ ہے وہ شرم و حیا کا احساس کرتا ہے اور اس احساس اور انسانی قدروں کا موجود ہونا بہترین زینت اور ساتھ عفت کا بھی بہترین محرک ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآن کی نظر میں پرکشش شخصیت کا مالک وہ ہے جو مادی زینت (لباس) اور روحانی زینت (تقویٰ) دونوں سے مزین ہو۔

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ لَا یَفۡتِنَنَّکُمُ الشَّیۡطٰنُ کَمَاۤ اَخۡرَجَ اَبَوَیۡکُمۡ مِّنَ الۡجَنَّۃِ یَنۡزِعُ عَنۡہُمَا لِبَاسَہُمَا لِیُرِیَہُمَا سَوۡاٰتِہِمَا ؕ اِنَّہٗ یَرٰىکُمۡ ہُوَ وَ قَبِیۡلُہٗ مِنۡ حَیۡثُ لَا تَرَوۡنَہُمۡ ؕ اِنَّا	۲۷۔ اے اولاد آدم! شیطان تمہیں کہیں اس طرح نہ بہکا دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوایا اور انہیں بے لباس کیا تاکہ ان کے شرم کے مقامات انہیں دکھائے، بے شک شیطان اور اس کے رفقائے کار تمہیں ایسی جگہ سے دیکھ رہے ہوتے ہیں جہاں سے انہیں تم

---

[1] الکافی ۶: ۴۱۱

جَعَلۡنَا الشَّیٰطِیۡنَ اَوۡلِیَآءَ لِلَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۷﴾

نہیں دیکھ سکتے، ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا آقا بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

تفسیر آیات

شیطانی فتنوں کا مرکزی کردار، اولاد آدم کو بے لباس کر کے اس سے شرم و حیا کے مادے کو سلب کرنے میں معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً ہماری معاصر دنیا میں حوا کی بیٹیاں اس دام میں بیشتر مبتلا نظر آتی ہیں اور شیطان ان سے ان کی حیا وعفت کو سلب کرنے میں زیادہ کامیاب نظر آتا ہے۔

اِنَّہٗ یَرٰىکُمۡ : اس فتنے کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ وہ انسانوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایسی کمین گاہ میں بیٹھے ہوتے ہیں جہاں سے انسان انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ مثلاً جراثیموں کا حملہ ان لوگوں کے لیے زیادہ خطرناک ہوتا ہے جو ان کے وجود کا علم نہیں رکھتے اور ان کے وجود کو محسوس نہیں کرتے۔

ہُوَ وَقَبِیۡلُہٗ : ابلیس خود بھی کمین گاہ میں چھپا ہوا ہوتا ہے اور اس کا قبیل بھی۔ قبیل سے مراد ابلیس کی نسل اور اولاد ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

اَفَتَتَّخِذُوۡنَہٗ وَذُرِّیَّتَہٗۤ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِیۡ ...[1]

تو کیا تم لوگ میرے سوا اسے (ابلیس) اور اس کی نسل کو اپنا سرپرست بناؤ گے؟

اگرچہ دوسری آیت میں وَجُنُوۡدُ اِبۡلِیۡسَ [2] اور ابلیس کا لشکر کہا ہے مگر اس کی اولاد لشکر کا کام کرتی ہے۔ ان دونوں میں منافات نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ شیطان کا پہلا وار عریانی اور بے حیائی کی ترغیب ہے: یَنۡزِعُ عَنۡہُمَا لِبَاسَہُمَا ....

۲۔ یہ آیت ان روشن خیال لوگوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے جو اپنی ناموس کی بے حجابی کو عمل شیطان نہیں بلکہ عصری تقاضے تصور کرتے ہیں اور اغیار سے مشابہت قائم کرنے میں عار و ننگ کی بجائے فخر محسوس کرتے ہیں۔

۳۔ خطرناک دشمن وہ ہے جو چھپ کر حملہ کرے: مِنۡ حَیۡثُ لَا تَرَوۡنَہُمۡ ....

وَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً قَالُوۡا وَجَدۡنَا عَلَیۡہَاۤ اٰبَآءَنَا وَاللّٰہُ اَمَرَنَا بِہَا ؕ قُلۡ اِنَّ

۲۸۔ اور جب یہ لوگ کسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا کرتے پایا ہے اور اللہ نے ہمیں ایسا کرنے

---

[1] ۱۸ کہف: ۵۰ [2] ۲۶ شعراء: ۹۵

اللّٰہَ لَا یَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ ؕ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸﴾	کا حکم دیا ہے، کہدیجیے: اللہ یقیناً بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہو جن کا تمہیں علم ہی نہیں؟

تفسیر آیات

مذہب کے نام پر انجام پانے والی ہر بدعت کے لیے بدعتی لوگ عموماً دو توجیہ پیش کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ نسلوں پر محیط ہمارے رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور کلچر ہے۔ دوسری یہ کہ خود خدا نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ جیسا کہ اس آیت کی شان نزول میں وارد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب، جاہلیت میں کعبہ کے گرد برہنہ طواف کرتے اور کہتے تھے کہ ہم اس طرح طواف کرتے ہیں جیسے ہم پیدا ہوئے ہیں۔ ان کپڑوں میں طواف نہیں کرتے جن میں گناہ کیا ہے۔ یہ رسم فتح مکہ تک جاری رہی۔ فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو آیات برائت کے ساتھ مکہ روانہ فرمایا اور اس رسم بد کا خاتمہ کر دیا۔

اَمَرَنَا بِھَا: وہ اس رسم بد کی نسبت اللہ کی طرف دیتے تھے، جو ایک بہتان ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ: اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ اللہ فعل قبیح کا حکم نہیں دیتا۔ پاکیزہ ہے وہ ذات ایسی باتوں سے۔

اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ: اللہ پر افترا باندھنا شرک کی طرح سنگین جرم ہے۔

اس آیت کا شان نزول مذکورہ موضوع ہو سکتا ہے۔ تاہم آیت کی تعبیر میں عمومیت موجود ہے، جس میں ہر قسم کی بے حیائی شامل ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہر بدکار اور بے حیائی کا ارتکاب کرنے والا اپنے لیے کوئی نہ کوئی جواز تلاش کر لیتا ہے۔

قُلۡ اَمَرَ رَبِّیۡ بِالۡقِسۡطِ ۟ وَ اَقِیۡمُوۡا وُجُوۡہَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ وَّ ادۡعُوۡہُ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ۬ؕ کَمَا بَدَاَکُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ ﴿ؕ۲۹﴾	۲۹۔ کہدیجیے: میرے رب نے مجھے انصاف کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ہر عبادت کے وقت تم اپنی توجہ مرکوز رکھو اور اس کے مخلص فرمانبردار بن کر اسے پکارو، جس طرح اس نے تمہیں ابتدا میں پیدا کیا ہے اسی طرح پھر پیدا ہو جاؤ گے۔
فَرِیۡقًا ہَدٰی وَ فَرِیۡقًا حَقَّ عَلَیۡہِمُ الضَّلٰلَۃُ ؕ اِنَّہُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیۡنَ	۳۰۔ (اللہ نے) ایک گروہ کو ہدایت دے دی ہے اور دوسرے گروہ پر گمراہی پیوست ہو چکی

اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَيَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ﴿۳۰﴾ ہے، ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیاطین کو اپنا آقا بنا لیا ہے اور (بزعم خود) یہ سمجھتے ہیں کہ ہدایت یافتہ ہیں۔

تشریح کلمات

قسط: (ق س ط) قسط عدل اور جور، دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔قسط اس حصے کو کہتے ہیں جو انصاف کے ساتھ مل جاتا ہے۔ عدل کے ساتھ دوسروں کا حصہ دینا انصاف ہے اور دوسروں کا حصہ لینا جور ہے۔

تفسیر آیات

سلسلۂ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بیہودگی اور بے حیائی کا نہیں بلکہ درج ذیل دستور کا حکم دیتا ہے:

۱۔ قُلۡ اَمَرَ رَبِّیۡ بِالۡقِسۡطِ: عدل و انصاف قائم کرو۔

۲۔ وَاَقِيۡمُوۡا: عبادت میں اپنی پوری توجہ مبذول رکھو۔ بے اعتنائی اور سہل انگاری کے ساتھ بجا لائی جانے والی عبادت بے جان ہوتی ہے۔ وَاَقِيۡمُوۡا: قائم کرو، یعنی حق ادا کرو، وُجُوۡهَكُمۡ: اپنی پوری توجہ کا، عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ ہر مسجد میں عبادت کے وقت۔ یعنی ہر عبادت کے وقت اپنی پوری توجہ قائم رکھو۔ لیکن روایت میں عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ کے بارے میں آیا ہے:

مساجد محدثة فامروا ان يقيموا وجوھھم شطر المسجد الحرام۔[1] اس سے مراد جدید التاسیس مساجد ہیں انہیں حکم ہوا ہے کہ وہ اپنے چہرے مسجد الحرام کی طرف کریں۔

اگرچہ آیت مکی ہے لیکن اجمال ہے۔ اس کا تفصیلی حکم مدینہ میں تحویل قبلہ کے موقع پر آیا۔

۳۔ وَّادۡعُوۡهُ مُخۡلِصِيۡنَ: اللہ کو پکارو تو اس حالت میں پکارو کہ قولاً وعملاً صرف اسی کے دین کے پابند رہو اور فرمانبرادری میں خلوص رکھو کہ خالصتاً اللہ کی ذات کو لائق عبادت و اطاعت سمجھ کر اس کی فرمانبرداری کرو۔ کسی غیر اللہ کی رضامندی کا شائبہ تک اس کی فرمانبرداری میں نہ ہو۔

۴۔ كَمَا بَدَاَكُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ: آخرت کی حیات ابدی پر بھی ایمان رکھو کہ وہ اللہ جس نے تم کو ابتدا ہی میں نیستی سے پیدا کیا، دوبارہ پیدا کرے گا۔ جس طرح تم دنیا میں بے بس پیدا ہوئے تھے، آخرت میں بھی جب اٹھائے جاؤ گے، بے بس ہو گے یا جس طرح تم پہلی بار مٹی سے پیدا ہوئے، دوبارہ اسی مٹی سے اٹھائے جاؤ گے۔

۵۔ فَرِيۡقًا هَدٰى: تو تم دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک ہدایت پر، دوسرا گمراہی پر۔ قیامت کے دن

---

[1] التہذیب ۔۲: ۴۳

بھی ایسا ہی ہو گا۔ ایک گروہ ہدایت یافتہ لوگ ہوں گے اور دوسرا گروہ گمراہ لوگ ہوں گے۔

۶۔ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ: گمراہی کی وجہ شیطان کا ان پر تسلط ہے۔

۷۔ وَيَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ: وہ اپنے آپ کو ہدایت یافتہ سمجھتے ہیں۔ ان کی گمراہی کا اصل محرک یہی جہل مرکب ہے۔ کیونکہ اگر انسان کو یہ احساس ہو کہ میں حق پر نہیں ہوں یا اپنے حق پر ہونے کے بارے میں شک ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حق کا تصور اس کے صفحہ ذہن سے نہیں مٹا ہے۔ کسی دن وہ حق کی طرف آ سکتا ہے لیکن اگر وہ اسی باطل کو حق سمجھتا ہے تو وہ کبھی حق کی طرف نہیں آ سکتا۔

اہم نکات

۱۔ قبول اعمال اور رضائے رب کے لیے خلوص نیت شرط ہے: مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ....

۲۔ اجتماعی اعتبار سے عدل و انصاف پر قائم ہو۔ انفرادی اعتبار سے عبادت میں یکسوئی رکھتا ہو۔ یہی ایک جامع الصفات مسلم کی علامت ہے: اَمَرَ رَبِّیۡ بِالۡقِسۡطِ ۟ وَاَقِيۡمُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ ....

يٰبَنِيۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِيۡنَتَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ وَّكُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا وَلَا تُسۡرِفُوۡا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الۡمُسۡرِفِيۡنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اے بنی آدم! ہر عبادت کے وقت اپنی زینت (لباس) کے ساتھ رہو اور کھاؤ اور پیو مگر اسراف نہ کرو، اللہ اسراف کرنے والوں کو یقیناً دوست نہیں رکھتا۔

قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِيۡنَةَ اللّٰهِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ ؕ قُلۡ هِیَ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا خَالِصَةً يَّوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ کہد یجیے: اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی اور پاک رزق کو کس نے حرام کیا؟ کہد یجیے: یہ چیزیں دنیاوی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو خالصتاً انہی کے لیے ہوں گی، ہم اسی طرح اہل علم کے لیے آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں.

تفسیر آیات

۱۔ خُذُوۡا زِيۡنَتَكُمۡ: یہ بات ممکن نہیں ہے کہ اللہ دنیا کو زیب و زینت کی چیزوں اور پاکیزہ اشیاء سے پر کر دے، پھر ان کو اپنے بندوں کے لیے حرام کر دے۔ اگر کوئی شریعت ان چیزوں کو حرام قرار دے تو یہ

فطرت سے متصادم ہونے کی وجہ سے خود باطل ثابت ہوتی ہے۔ اسلامی شریعت کی حقانیت پر قائم دلائل و آیات میں سے ایک یہی بات ہے کہ یہ شریعت کسی حکم میں بھی فطرت کے ساتھ متصادم نہیں ہے۔ چنانچہ یہ بات ممکن نہیں ہے کہ اسلام صاف ستھرا اور پرکشش رہنے کی نصیحت نہ کرے، ہر قسم کی قابل نفرت اور کراہت کی چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم نہ دے۔ اسی لیے قرآن کا ارشاد ہو رہا ہے: عبادت گاہوں میں جاؤ تو پرکشش اور پر وقار طریقے سے جاؤ۔ اللہ نے کسی قسم کی زینت کو حرام قرار نہیں دیا۔ اسلام ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ انسان بدزیب اور بدنما نظر آئے۔ اس نے انسان کو تکویناً و فطرتاً عزت و تکریم سے نوازا ہے:

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ [1] تحقیق ہم نے انسان کو بہترین اعتدال میں پیدا کیا۔

اور وہ تشریعاً بھی باعزت اور باوقار دیکھنا چاہتا ہے۔

اسی سے ہر ایسا لباس پہننا حرام ہے جو باعث اہانت ہو، جسے فقہی اصطلاح میں ''لباس شہرت'' کہتے ہیں۔

۲۔ وَّکُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا وَلَا تُسۡرِفُوۡا: ان آیات میں کھانے پینے سے متعلق دو اہم ترین اصول بیان کیے ہیں: ایک یہ کہ اسراف حرام ہے۔ دوسرا یہ کہ طیبات حلال ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ کیا کھانا ہے اور کتنا کھانا ہے۔

۳۔ وَلَا تُسۡرِفُوۡا: یہ مختصر جملہ بتاتا ہے کہ کتنا کھانا ہے۔ کسی چیز کے حلال ہونے کے لیے سب سے زیادہ اس کی ضرورت ہے۔ لہٰذا انسانی جسم کو زندہ اور متحرک رکھنے کے لیے جتنی غذا کی ضرورت ہے، اس کا کھانا مباح ہے اور کبھی واجب ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ قدرت ہمارے جسم میں کسی چیز کی ضرورت ودیعت کرے، پھر اس پر پابندی لگائے اور ہمارے وجود کے اندر کسی چیز کی خواہش رکھے، پھر اس خواہش کو پوری کرنے کی صورت نہ چھوڑے۔ مثلاً ممکن نہیں کہ انسان کو پیاس لگے اور پانی موجود نہ ہو۔ بھوک لگے، غذا موجود نہ ہو۔ لہٰذا پیاس سے جہاں پانی کے وجود کا علم ہوتا ہے، وہاں اس کے مباح ہونے کا علم بھی ہوتا ہے اور ضرورت ان تمام باتوں کی بنیاد ہے۔ ضرورت ہی کی وجہ سے کھانے پینے کی چیزیں گوارا ہوتی ہیں، جسم کے لیے مفید ہوتی ہیں، نظام بدن کے ساتھ سازگار ہوتی ہیں اور نتیجے کے طور پر بدن سالم رہتا ہے۔

اگر کوئی چیز ضرورت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ کھا پی لے تو یہ اس نظام کی خلاف ورزی ہے، جس نظام کے تحت اس کا وجود قائم ہے۔ یہ اس ماحول سے خارج ہے، جس میں یہ پیدا ہوا ہے اور اس راستے سے انحراف ہے، جس راستے کو قدرت نے اس کے لیے منتخب کیا ہے۔ اسراف خلاف ورزی ہے۔ اسراف ظلم ہے اپنی جان پر، اپنے جسم پر، اپنی اقتصاد پر اور اپنے ملک پر۔ بالآخر پوری انسانیت پر ظلم ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے اسراف کی یہ تعریف روایت ہوئی ہے:

اِنَّمَا الۡاِسۡرَافُ فِیمَا اَفۡسَدَ الۡمَالَ وَ اَضَرَّ بِالۡبَدَنِ۔۔۔۔ [2] اسراف یہ ہے کہ مال کا ضیاع ہو اور بدن کا ضرر۔

---

[1] ۹۵ التین: ۴ [2] اصول الکافی ۴: ۵۳۔ المیزان

۴۔ قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ: کس نے حرام کیا اس زیب و زینت کو جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے۔ نہ اللہ کے علاوہ کوئی حرام کرنے کا مجاز ہے، نہ ہی یہ چیزیں اللہ کے بندوں کے علاوہ کسی اور کے لیے پیدا کی ہیں تو پھر اللہ کی سرزمین میں موجود چیزوں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی تامل ہونا چاہیے؟

۵۔ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ: الطیب۔ جو انسانی طبع و مزاج کے ساتھ موافق ہو۔ راغب کہتے ہیں کہ طیب اسے کہا جاتا ہے جس سے انسان کے حواس بھی لذت یاب ہوں اور نفس بھی۔ شریعت نے ان چیزوں کو حلال کیا ہے جو انسانی مزاج کے ساتھ موافق ہیں، جن سے جسم فعال اور نفس پاک رہتا ہے اور ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جو انسانی مزاج کے لیے مناسب اور موافق نہیں ہیں۔

۶۔ قُلۡ ہِیَ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: کہد یجیے یہ زینت اور طیبات دنیا میں ایمان والوں کے لیے بھی ہیں اور آخرت میں صرف اہل ایمان کے لیے مختص ہیں:

یٰۤاَیُّہَا الرُّسُلُ کُلُوۡا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعۡمَلُوۡا صَالِحًا ...۔[1]	اے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور عمل صالح بجا لاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت ہے:

المَعِدَۃُ بَیْتُ الدَّاءِ وَ الْحِمْیَۃُ رَأْسُ الدَّوَاءِ وَ اَعْطِ کُلَّ بَدَنٍ مَا عُوِّدَتہ ۔[2]	معدہ تمام امراض کا گڑھ ہے۔ فاقہ ہر مرض کی دوا ہے۔ ہر جسم کو وہ چیز فراہم کرو جس کی تو نے عادت ڈالی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

خُذُوا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ۔ قال فی العیدین و الجمعۃ۔[3]	نماز جمعہ اور نماز عید کے لیے اچھے کپڑے زیب تن کرو۔

روایت ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام پر لباس فاخرہ پہننے پر اعتراض ہوا تو فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ جَمِیلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ فَاَتَجَمَّلُ لِرَبِّی وَ ھُوَ یَقُولُ: خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ فَاُحِبُّ اَنْ اَلْبَسَ اَجْمَلَ ثِیَابِی۔[4]	اللہ جمال کا مالک ہے، جمال کو دوست رکھتا ہے۔ لہٰذا میں اپنے رب کے لیے جمالیات کو اپناتا ہوں وہ فرماتا ہے: خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ، اس لیے میں عمدہ کپڑے پہننا پسند کرتا ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام سے ایک طویل حدیث میں مروی ہے:

واعلموا یا عباد اللّٰہ ان المتقین حازوا عاجل الخیر و آجلہ۔ شارکوا اھل	اللہ کے بندو! تمہیں علم ہونا چاہیے اہل تقویٰ دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی جمع کر لیتے ہیں۔ وہ اہل

---

[1] ۲۳ مومنون: ۵۱ [2] عوالی اللآلی ۲: ۳۰ [3] اصول الکافی ۳: ۴۲۴ [4] وسائل الشیعۃ ۴: ۴۵۵

الدنیا فی دنیا هم ولم یشارکهم اهل الدنیا فی آخرتهم۔[1]	دنیا کی دنیا میں شرکت کرتے ہیں لیکن اہل دنیا، اہل تقویٰ کی آخرت میں شریک نہیں ہوتے۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن کے لیے خیر دنیا و آخرت جمع ہو سکتی ہیں، جیسا کہ بعض دیگر لوگ خسر الدنیا و الآخرہ ہوتے ہیں۔

۲۔ نعمتوں کی فراوانی دنیا میں مؤمن و کافر دونوں کے لیے ہو سکتی ہے لیکن آخرت میں مؤمن کے لیے خاص ہے: خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ....

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾	۳۳۔ کہدیجیے: میرے رب نے علانیہ اور پوشیدہ بے حیائی (کے ارتکاب)، گناہ، ناحق زیادتی اور اس بات کو حرام کیا ہے کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤ جس کے لیے اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرو جنہیں تم نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیات میں جب یہ بتا دیا گیا کہ اللہ نے زینت اور پاکیزہ رزق کو حلال قرار دیا ہے تو محرمات کا ذکر بھی اس لیے ضروری ہو گیا کہ کسی قسم کی غلط فہمی یا سوء استفادہ کی گنجائش نہ رہے۔

فواحش، غلیظ گناہوں کو کہتے ہیں۔ جیسے زنا، لواط اور قتل وغیرہ ہیں۔ الاثم مطلق گناہ کو کہتے ہیں جو ذلت و اہانت کا سبب بنے۔ جیسے مے نوشی۔ البغی کسی چیز کا ناحق طلب کرنا۔ مثلاً کسی کا مال ظلماً چھین لینا، یتیم کا مال کھانا وغیرہ اور اس کے بعد سب سے بڑا ظلم اور بغاوت، شرک ہے۔

مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ: آیت کے اس جملے کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: الانعام آیت ۱۵۱۔

وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ: حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ ان سے پوچھا گیا بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے؟ فرمایا:

ان یقولوا ما یعلمون و یقفوا عند ما لا یعلمون۔[2]	وہی بات کریں جو جانتے ہیں اور وہاں رک جائیں جہاں نہیں جانتے ہیں۔

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۱: ۲۶۶ [2] الوسائل ۲۷: ۱۶۳

کسی شرعی حکم کو اللہ کی طرف نسبت دینے کے لیے واحد ذریعہ علم ہے۔ یہی اس آیت کا مطلب ہے۔ لہٰذا کسی حکم کو اللہ کی طرف نسبت دینے کے لیے ضروری ہے کہ ایسی دلیل ہو جس سے علم و یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسے صریح قرآن، حدیث متواتر، مسلمات دین وغیرہ یا ایسی دلیل موجود ہو جس کے دلیل ہونے پر علم و یقین ہو۔ جیسے عادل راویوں کی حدیث آحاد، ظاہر قرآن وغیرہ۔ لہٰذا جس بات سے علم و یقین حاصل نہ ہوتا ہو، نہ ہی اس کے دلیل ہونے پر علمی و یقینی دلیل قائم ہو، اس کے ذریعے کسی حکم کو اللہ کی طرف نسبت دینا افتراء ہے اور حرام ہے۔ جیسے ذاتی رائے یعنی قیاس، استحسان وغیرہ بلکہ ذاتی رائے دلیل نہ ہونے پر دلیل قائم ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی شریعت میں حلال و حرام بھی بندوں پر رحمت ہے کہ اس نے طیبات کو حلال اور فواحش کو حرام قرار دیا ہے۔

۲۔ جو لوگ اس رحمت سے محروم ہیں، وہ فواحش کو رحمت اور رحمت کو فواحش سمجھتے ہیں۔

وَ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُہُمۡ لَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَۃً وَّ لَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور ہر قوم کے لیے ایک وقت مقرر ہے پس جب ان کا مقررہ وقت آ جاتا ہے تو نہ ایک گھڑی تاخیر کر سکتے ہیں اور نہ جلدی۔

تشریح کلمات

اَجَلٌ: (ا ج ل) کسی چیز کی مقررہ مدت کے معنوں میں ہے۔ مدت حیات پوری کر لینے کو بھی اجل کہتے ہیں۔

سَاعَۃً: اجزائے زمانہ میں سے ایک جزو کو کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

ہر قوم و ملت کے لیے عروج و زوال ہوتا ہے اور ہر عروج و زوال کے پیچھے اس کے علل و اسباب کارفرما ہوتے ہیں۔ یہی سنت الٰہی ہے، جس کا قرآن اکثر حوالہ دیا کرتا ہے:

سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَ کَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرَا ﴿۟ۙ۳۸﴾ ...[1]

جو (انبیاء) پہلے گزر چکے ہیں ان کے لیے بھی اللہ کی سنت یہی رہی ہے اور اللہ کا حکم حقیقی انداز سے طے شدہ ہوتا ہے۔

---

[1] ۳۳ احزاب: ۳۸

جب کوئی قوم برائیوں کے ارتکاب میں حد سے گزر جاتی ہے تو اس بدکار قوم کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے ہم کئی بار اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ کسی قوم نے اپنے نبی سے معجزے کا مطالبہ کیا اور نبی نے وہ معجزہ پیش کیا، وہ نہ مانے تو اس وقت ان پر عذاب نازل ہو جاتا۔ جیسے قوم صالح کے ساتھ ہوا۔

اگر قوم راہ حق پر ثابت قدم رہتی ہے تو اللہ اسے اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے:

وَّ اَنۡ لَّوِ اسۡتَقَامُوۡا عَلَی الطَّرِیۡقَۃِ لَاَسۡقَیۡنٰہُمۡ مَّآءً غَدَقًا ۝[1]

اور (انہیں یہ بھی سمجھا دیں کہ) اگر یہ لوگ اسی راہ پر ثابت قدم رہتے تو ہم انہیں وافر پانی سے سیراب کرتے.

امت مسلمہ اللہ کے اس کلی قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے، عروج و زوال کے اس قانون کی زد میں رہے گی۔ البتہ امت مسلمہ پر عذاب نازل نہ ہو گا۔ کیونکہ اس امت کے رسولؐ، عالمین کے لیے رحمت ہیں اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی ہے:

وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَہُمۡ وَ اَنۡتَ فِیۡہِمۡ ؕ وَ مَا کَانَ اللّٰہُ مُعَذِّبَہُمۡ وَ ہُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ ۝[2]

اور اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کرے گا جب تک آپ ان کے درمیان موجود ہیں اور نہ ہی اللہ انہیں عذاب دینے والا ہے جب وہ استغفار کر رہے ہوں.

رہا امت مسلمہ کی عظمت کا زوال۔ یہ ممکن ہے بلکہ اس وقت وقوع پذیر بھی ہے۔ کیونکہ یہ زوال اس کے علل و اسباب کی وجہ سے ہی آتا ہے اور جب اس کے علل و اسباب موجود ہوں گے تو زوال کا آنا لازمی ہو گا۔ لہٰذا زوال ان علل و اسباب سے پہلے آ سکتا ہے نہ علل و اسباب آنے کے بعد تاخیر ہو سکتی ہے کیونکہ یہ زوال طبیعی امکانات کے طور پر ہو گا۔ طبیعی مکافات تاخیر پذیر نہیں ہوتے:

مَا تَسۡبِقُ مِنۡ اُمَّۃٍ اَجَلَہَا وَ مَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ ۝[3]

کوئی قوم اپنی معینہ مدت سے نہ آگے نکل سکتی ہے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔

زوال کے علل و اسباب میں سے خیانت، بدنظمی، کاہلی اور اپنے عوام پر ظلم ہے۔ قانون فطرت اور مکافات عمل میں نظم و ضبط کا معجزانہ دخل ہے کہ دنیا کا بدترین ظلم بھی اگر ایک نظم و ضبط کے ساتھ کیا جائے تو وہ ظلم محسوس ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ جدید مہذب اور تعلیم یافتہ جاہلیت نے یہی کیا ہے کہ اقوام عالم پر ظلم اور زیادتی ایک منظم انداز میں جاری رکھی ہوئی ہے۔ مصر کے ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

لقد کان هذا الظلم فوضی فهذبت حواشیه حتی صار ظلما منظما

یہ ظلم پہلے بدنظمی کا شکار تھا، اب اس کی نوک پلک درست کی گئی تو یہ ظلم منظم ہو گیا ہے۔

قرآن قوموں کے زوال کے درج ذیل اسباب ذکر کرتا ہے:

i۔ صالح افراد امت اگر ملک کے تدبیر امور میں شریک اور مشیر رہیں تو یہ قوم ترقی کی راہوں پر گامزن

---

[1] ۷۲جن: ۱۶ [2] ۸انفال: ۳۳ [3] ۱۵حجر: ۵

رہتی ہے لیکن جب صالح افراد بے بس، فرمانبردار اور بے اختیار رہیں تو غیر صالح اقتدار والوں کی ہوس رانی کو آزادی مل جاتی ہے۔ وہ اس قوم کو قعر مذلت تک پہنچا دیتے ہیں:

وَقَالُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِیۡلَا ۝[1]

اور وہ کہیں گے: ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی تھی، پس انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔

ii۔ کسی امت اور قوم کے مقدرات پر چند خاندانوں کا تسلط قائم ہو جائے تو اس صورت میں تمام قدروں کو پامال کیا جاتا ہے اور جرائم کے سامنے کوئی روک تھام نہ ہو گی:

وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنَا فِیۡ کُلِّ قَرۡیَۃٍ اَکٰبِرَ مُجۡرِمِیۡهَا لِیَمۡکُرُوۡا فِیۡهَا ؕ وَمَا یَمۡکُرُوۡنَ اِلَّا بِاَنۡفُسِهِمۡ وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ ۝[2]

اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں وہاں کے بڑے بڑے مجرموں کو پیدا کیا کہ وہاں پر (برے) منصوبے بناتے رہیں (درحقیقت) وہ غیر شعوری طور پر اپنے ہی خلاف منصوبے بناتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ افراد کی طرح قوموں کی بھی عمریں ہوتی ہیں۔ جس طرح بعض صحت اور نفسیاتی اصولوں پر عمل کرنے سے فرد صحت مند ہو جاتا ہے اور عمر لمبی ہوتی ہے، بالکل اسی طرح بعض اصولوں پر عمل کرنے سے قومیں ترقی کرتی ہیں۔ ان پر عمل ترک کرنے سے قومیں ہلاکت میں پڑ جاتی ہیں۔

۲۔ مادی تنزل و ترقی کا دار و مدار، مادی علل و اسباب پر ہے۔ ایمان و عبادات کے اپنے اثرات ہیں۔ یہ چیزیں مادی علل و اسباب کی جگہ نہیں لیتیں۔ مثلاً فصل کے لیے تسبیح و عبادت کھاد کا کام نہیں دے سکتی۔

یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ یَقُصُّوۡنَ عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ ۙ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ اے اولاد آدم! اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں سے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنایا کریں تو (اس کے بعد) جو تقویٰ اختیار کریں اور اصلاح کریں پس انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا اور نہ وہ محزون ہوں گے۔

وَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَاسۡتَکۡبَرُوۡا عَنۡهَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ

۳۶۔ اور جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں اور ان سے تکبر کرتے ہیں وہی اہل جہنم

---

[1] ۳۳ احزاب: ۶۷　[2] ۶ انعام: ۱۲۳

فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۳۶﴾ ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر آیات

قوموں کی اجل اور مقررہ مدت کے ذکر کے بعد انبیاء کی تصدیق و تکذیب کرنے والوں کا ذکر آیا ہے۔

فَمَنِ اتَّقٰى: انبیاء علیہم السلام ان کی طرف دستور حیات لے کر جب آئے تو اس دستور پر عمل کرنے والے امن و آشتی اور نجات و فلاح کی زندگی کریں گے۔

پس جو تکذیب رُسُلٌ سے اپنے آپ کو بچائے اور وَاَصۡلَحَ نیک عمل بھی کرے تو اس صورت میں ان کے لیے کوئی خوف اور غم نہ ہوگا۔

وَالَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا: تکذیب، تکبر و سرتابی کرنے والے ناکام و نامراد ہوں گے۔ چنانچہ قریش، بنی ہاشم کے ایک یتیم کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ یہود عربوں کی اتباع کو عار سمجھتے تھے اور دیگر اقوام نژادی تکبر کے حوالے سے اسلام کو نہیں مانتی تھیں۔

اہم نکات

۱۔ تقویٰ و اصلاح ہی دارین میں ذریعۂ امن ہیں: فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ ....

۲۔ تکبر، کفر و تکذیب اور ظلم کا اصلی سرچشمہ ہے: كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَاسۡتَكۡبَرُوۡا ....

فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوۡ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمۡ نَصِيۡبُهُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوۡنَهُمۡ ۙ قَالُوۡۤا اَيۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوۡا ضَلُّوۡا عَنَّا وَشَهِدُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ اَنَّهُمۡ كَانُوۡا كٰفِرِيۡنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے یا اس کی آیات کی تکذیب کرے؟ ایسے لوگوں کو وہ حصہ ملتا رہے گا جو ان کے حق میں لکھا ہے چنانچہ جب ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ان کی قبض روح کے لیے آئیں گے تو کہیں گے: کہاں ہیں تمہارے وہ (معبود) جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے تھے؟ وہ کہیں گے: وہ ہم سے غائب ہو گئے اور اب وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ واقعی کافر تھے۔

تفسیر آیات

ا۔ فَمَنۡ اَظۡلَمُ: سب سے زیادہ ظلم و زیادتی کا ارتکاب کرنے والے دو گروہوں کا ذکر ہے:

i۔ مِمَّنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا: اللہ پر جھوٹ بہتان باندھنے والے۔ مشرکین اپنے عقائد و اعمال میں بہت سی باتوں کی اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دیتے تھے۔

ii۔ اَوۡ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ: آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والے۔ پہلے گروہ سے یہ ظلم بھی سرزد ہو جاتا ہے اور ممکن ہے، کوئی گروہ افۡتَرٰی کا ارتکاب نہ کرے مگر تکذیب کا ارتکاب کرے۔ یہ دونوں گروہ ارتکاب ظلم میں سب سے بدتر صورت میں ہیں۔

۲۔ اُولٰٓئِکَ یَنَالُہُمۡ نَصِیۡبُہُمۡ مِّنَ الۡکِتٰبِ: اس جگہ الۡکِتٰبِ سے مراد بعض کے نزدیک عذاب ہے اور بعض کے نزدیک لوح محفوظ ہے۔ جو اس میں لکھا ہوا ہے، وہی ان کو حاصل ہو گا۔ دیگر بعض کے نزدیک الۡکِتٰبِ سے مراد نوشتہ تقدیر ہے۔ اس پر اگلا جملہ قرینہ ہے یعنی: حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوۡنَہُمۡ ۔ اس بنا پر آیت کے معنی یہ بنیں گے: ایسے لوگوں کو دنیا میں وہ حصہ ملتا رہے گا جو ان کی قسمت میں لکھا ہے۔ چنانچہ جب ہمارے فرستادہ فرشتے ان کی قبض روح کے لیے آئیں گے تو وہ حصہ ختم ہو جائے گا۔

۳۔ اس صورت میں آیت کی تفسیر اس طرح ہو سکتی ہے: جو لوگ کفر اختیار کرتے ہیں، ان کو دنیا میں وہ کچھ ملتا رہے گا جو ان کے لیے مقدر کر رکھا ہے۔ وہ مقدر اللہ کا قانون علل و اسباب ہے اور اللہ کا قانون علل و اسباب غیر جانبدار ہے۔ ایسا نہ ہو گا کہ ان کے کفر کی وجہ سے علل و اسباب اپنا قدرتی اثر نہ دکھائیں۔ طبیعیاتی قوانین کی دفعات کافر اور مسلمان کے لیے یکساں ہیں۔

۴۔ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوۡنَہُمۡ : یہ یکسانیت اس وقت ختم ہو جائے گی جب ان کی قبض روح کے لیے ہمارے فرستادہ فرشتے ان کے پاس آئیں گے۔ وہاں سب سے پہلے سوال یہ ہو گا:

۵۔ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ: جن غیر اللہ کو تم پکارتے تھے، وہ کہاں ہیں؟ وہ جواب میں کہیں گے: خود ساختہ چیز تھی، اب پتہ چلا کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ مرنے سے پہلے قبض روح کے موقع پر حقائق سے پردہ اٹھ جاتا ہے۔

۶۔ وَشَہِدُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ : پردہ اٹھنے کی وجہ سے وہ اپنے خلاف گواہی دینے لگیں گے۔

اہم نکات

۱۔ ممکن ہے دنیا میں تسخیر طبیعیت پر کافر محنت زیادہ کرے اور مومن سے زیادہ کامیابی حاصل کرے: اُولٰٓئِکَ یَنَالُہُمۡ نَصِیۡبُہُمۡ مِّنَ الۡکِتٰبِ ....

۲۔ طبیعیاتی قوانین، غیر جانبدار ہوتے ہیں۔

۳۔ بدبختی اور خوش بختی کا فیصلہ قبض روح کے موقع پر ہو جاتا ہے۔

قَالَ ادۡخُلُوۡا فِیۡۤ اُمَمٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ مِّنَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ فِی النَّارِ ؕ کُلَّمَا دَخَلَتۡ اُمَّۃٌ لَّعَنَتۡ اُخۡتَہَا ؕ حَتّٰۤی اِذَا ادَّارَکُوۡا فِیۡہَا جَمِیۡعًا ۙ قَالَتۡ اُخۡرٰىہُمۡ لِاُوۡلٰىہُمۡ رَبَّنَا ہٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوۡنَا فَاٰتِہِمۡ عَذَابًا ضِعۡفًا مِّنَ النَّارِ ۬ؕ قَالَ لِکُلٍّ ضِعۡفٌ وَّ لٰکِنۡ لَّا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۸﴾

۳۸۔اللہ فرمائے گا: تم لوگ جن و انس کی ان قوموں کے ہمراہ داخل ہو جاؤ جو تم سے پہلے جہنم میں جا چکی ہیں، جب بھی کوئی جماعت جہنم میں داخل ہو گی اپنی ہم خیال جماعت پر لعنت بھیجے گی، یہاں تک کہ جب وہاں سب جمع ہو جائیں گے تو بعد والی جماعت پہلی کے بارے میں کہے گی: ہمارے رب! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا لہٰذا انہیں آتش جہنم کا دوگنا عذاب دے، اللہ فرمائے گا: سب کو دوگنا (عذاب) ملے گا لیکن تم نہیں جانتے۔

تشریح کلمات

اُخۡتَہَا : (ا خ ت) الاخت: مثل۔ ہم مسلک۔

ادَّارَکُوۡا: (د ر ك) اصل میں تدارکوا ہے تاء دال میں ادغام ہو گیا ہے۔ یعنی ایک دوسرے کو پا لینا۔ ایک دوسرے سے ملحق ہونا۔

تفسیر آیات

۱۔ لَّعَنَتۡ اُخۡتَہَا : کافر لوگ جب اخروی زندگی میں داخل ہوں گے تو ان کی آپس کی مخاصمت، ایک دوسرے سے برائت اور ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالنے کا ذکر ہے۔ یہ ایک کلیہ ہے کہ کسی جماعت کو شکست اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ اس شکست و فضیحت کی ذمہ داری آپس میں ایک دوسرے پر ڈالتے ہیں۔

۲۔ قَالَتۡ اُخۡرٰىہُمۡ : اہل جہنم کی مخاصمت تو اس قدر شرمناک ہو گی کہ اپنے ہم مذہب اور ہم مشرب لوگوں پر نفرین کریں گے۔ ان پر دگنے عذاب کی خواہش کریں گے کیونکہ یہ لوگ خود گمراہ تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا ہے۔ جواب ملے گا:

لِکُلٍّ ضِعۡفٌ ۔ سب کو دگنا عذاب ملے گا۔ گمراہ کرنے والوں کے اپنے گناہ اور جن کو گمراہ کیا، ان کے گناہ بھی ان کی گردن پر ہوں گے۔ گمراہ ہونے والوں پر ایک اپنا گناہ اور دوسرا، گمراہ کرنے والوں کے

حمایتی بننے کا گناہ ہوگا:

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ۚ[1]

جو شخص اچھی بات کی حمایت و سفارش کرتا ہے وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو بری بات کی حمایت و سفارش کرتا ہے وہ بھی اس میں کچھ حصہ پائے گا اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

اہم نکات

۱۔ آخرت کے انواع عذاب میں سے ایک عذاب ایک دوسرے سے نفرت اور عداوت ہے۔

وَ قَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾

۳۹۔ان کی پہلی جماعت دوسری جماعت سے کہے گی: تمہیں ہم پر کوئی بڑائی حاصل نہ تھی؟ پس تم اپنے کیے کے بدلے عذاب چکھو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ: پیروں نے اپنے مریدوں سے کہا۔ یعنی جس جماعت کو دگنا عذاب دینے کا مطالبہ ہوا تھا، اس جماعت کا بھی یہی مؤقف ہے کہ گمراہ ہونے اور دوسروں کے لیے گمراہی ورثہ میں چھوڑنے میں تم بھی ہماری طرح ہو۔

۲۔ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ: تم کو ہم پر جرم کی کمی میں کوئی برتری حاصل نہیں ہے کہ ہمارا عذاب دگنا ہو اور تمہارا نہ ہو بلکہ ہم دونوں اس جرم میں برابر شریک ہیں۔ لہٰذا تم کو کوئی بڑائی ایسی حاصل نہیں ہے کہ تمہارا عذاب کم ہو اور ہمارا عذاب دگنا ہو۔ لہٰذا تم بھی دگنا عذاب چکھ لو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۭ وَكَذٰلِكَ

۴۰۔جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان سے تکبر کیا ہے ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور ان کا جنت میں جانا اس طرح محال ہے جس طرح سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزرنا اور ہم مجرموں کو اسی

---

[1] ۴ نساء: ۸۵

نَجۡزِی الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۴۰﴾ طرح سزا دیتے ہیں۔

لَہُمۡ مِّنۡ جَہَنَّمَ مِہَادٌ وَّ مِنۡ فَوۡقِہِمۡ غَوَاشٍ ؕ وَ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ ان کے لیے جہنم ہی بچھونا اور اوڑھنا ہو گی اور ہم ظالموں کو ایسا بدلہ دیا کرتے ہیں۔

تشریح کلمات

یَلِجَ: (و ل ج) ولوج۔داخل ہونے کو کہتے ہیں۔

سَمِّ: (س م م) اَلسَّمُّ تنگ سوراخ، جیسے سوئی کی ناک اور کان کا سوراخ۔

غَوَاشٍ: (غ ش و) اوڑھنا۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تُفَتَّحُ لَہُمۡ: کفار کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھلنے کا مطلب ممکن ہے یہ ہو کہ ان کے اعمال قبول نہیں ہوں گے کیونکہ عمل صالح کے بارے میں فرمایا:

اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ ...[۱]

پاکیزہ کلمات اسی کی طرف اوپر چلے جاتے ہیں اور نیک عمل اسے بلند کر دیتا ہے۔

اس تفسیر کے مطابق ممکن ہے آیت کا مطلب یہ بنے کہ دنیا میں ان کافروں کے اعمال اور دعا وغیرہ کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور آخرت میں ان لوگوں کا جنت میں جانا بعید از امکان ہے۔

ممکن ہے کہ آسمان کے دروازے نہ کھلنے کا مطلب جنت میں داخل نہ ہونا ہو۔ اس تفسیر کے مطابق وَلَا یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ کا جملہ پہلے جملے کے لیے وضاحتی جملہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ حَتّٰی یَلِجَ الۡجَمَلُ: اَلۡجَمَلُ اونٹ کو کہتے ہیں۔ اور الجُمَّل حرف جیم پر پیش اور میم پر شد کے ساتھ موٹے رسے کو کہتے ہیں۔ ابن عباس کی ایک قرائت میں یہی تلفظ آیا ہے اور الجُمل صرف جیم کے پیش اور میم کے شد کے بغیر بھی ایک تلفظ ہے جو موٹے رسے کو کہتے ہیں۔

بعض اہل تحقیق کا موقف یہ ہے کہ اونٹ اور سوئی کے ناکے میں کوئی مناسبت نہیں ہے، لہٰذا الجُمَّل سے رسا مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔

ہمارا موقف ہے کہ اول تو اس موقف کے لیے مشہور قرائت کو چھوڑ کر ابن عباس کی قرائت کو اختیار

---

[۱] ۳۵ فاطر: ۱۰

کرنا پڑے گا اور قرائت الجَمَل کے ساتھ رسا مراد لینا درست نہیں ہے۔

ثانیاً: اونٹ مراد لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ یہاں سوئی کا ذکر کسی چیز کے سینے اور جوڑنے کے لیے نہیں ہو رہا کہ رسا زیادہ مناسب ہو بلکہ یہاں کافروں کے جنت میں جانے کو بعید از امکان بتانا مقصود ہے۔ چونکہ سوئی کے چھوٹے سے سوراخ سے اونٹ جیسے بڑے حیوان کا گزرنا محال ہے، لہٰذا یہاں پر جمل سے اونٹ مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ عرب محاورہ ہے: لا افعل حتی یشیب الغراب ییبض القار۔ میں اس کام کو کوئے کے سفید ہونے اور تارکول کے سفید چمکدار ہونے تک نہیں کروں گا۔ شاعر نے کہا ہے:

اذا شاب الغراب اتیت اهلی　　وصار القاد کاللبن الحلیب

جب کوا سفید ہو جائے اور تارکول دودھ جیسا ہو جائے اس وقت میں گھر والوں کے پاس جاؤں گا۔

یعنی کسی بات کو بعید از امکان بتانا مقصود ہو تو یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں کافروں کا جنت میں جانا اسی طرح عدل الٰہی کے منافی اور ناممکن ہے، جس طرح اونٹ جیسی عظیم الجثۃ چیز کا سوئی کے ناکے سے گزرنا عملاً ناممکن ہے۔

اہم نکات

۱۔ جس طرح مؤمن کا جہنم میں داخل ہونا محال اور عدل الٰہی کے خلاف ہے، اسی طرح کافر کا جنت میں داخل ہونا بھی اللہ کے حتمی فیصلہ کے خلاف اور ناممکن ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُکَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَاۤ ۫ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ اور ایمان لانے والے اور نیک اعمال بجا لانے والے اہل جنت ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، ہم کسی کو (نیک اعمال کی بجا آوری میں) اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ دار نہیں ٹھہراتے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: ایمان کے ساتھ عمل صالح بجا لانے والے اہل جنت ہیں۔

۲۔ لَا نُکَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَاۤ: سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ تمام اعمال صالحہ بجا لائے جائیں تو جنت ملے گی کیونکہ اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں دیتا۔ جس قدر عمل صالح بجا لانا آسانی سے ممکن ہوا اور جس میں عسر و حرج لازم نہیں آتا، اسی مقدار میں عمل صالح بجا لانے والے ہمیشہ کے لیے جنت میں رہیں گے۔

اہم نکات

۱۔ وہ تھوڑے اعمال کو قبول اور بڑے گناہوں کو درگزر فرماتا ہے۔

وَ نَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ مِّنۡ غِلٍّ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہِمُ الۡاَنۡہٰرُ ۚ وَ قَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ ہَدٰىنَا لِہٰذَا ۟ وَ مَا کُنَّا لِنَہۡتَدِیَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ ہَدٰىنَا اللّٰہُ ۚ لَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ ؕ وَ نُوۡدُوۡۤا اَنۡ تِلۡکُمُ الۡجَنَّۃُ اُوۡرِثۡتُمُوۡہَا بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ اور ہم ان کے دلوں میں موجود کینے نکال دیں گے، ان کے (محلات کے) نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی اور وہ کہیں گے: ثنائے کامل ہے اس اللہ کے لیے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا اور اگر اللہ ہماری رہنمائی نہ فرماتا تو ہم ہدایت نہ پاتے، ہمارے رب کے پیغمبر یقیناً حق لے کر آئے اور اس وقت ان (مومنین) کو یہ ندا آئے گی کہ یہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو ان اعمال کے صلے میں ہے جنہیں تم بجا لاتے رہے ہو۔

تشریح کلمات

غِلٍّ: (غ ل ل) الغِل کینہ و عداوت۔

تفسیر آیات

۱۔ اہل ایمان کے جنت میں داخل ہونے سے پہلے اگر دنیا میں ان کی آپس میں کدورت ہو تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں سے ان کدورتوں اور عداوتوں کو صاف کر دے گا تاکہ ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشی اور کیف و سرور محسوس کریں کیونکہ جن سے عداوت ہو ان کو دیکھنے سے اذیت ہوتی ہے۔ جنت میں کسی قسم کی اذیت نہ ہو گی اور احباب کے ساتھ بیٹھنے سے لطف اندوز ہوں گے۔

۲۔ وَ مَا کُنَّا لِنَہۡتَدِیَ: عرصہ آخرت میں قدم رکھنے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آئے گی کہ اللہ کی ذات ہی سرچشمہ ہدایت ہے۔ اگر اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہوتی اور ضمیر، وجدان، عقل، فرشتے اور انبیاء کے ذریعے ہدایت کا سامان فراہم نہ کیا ہوتا تو آج جنت کے اس درجہ پر فائز ہونا ممکن نہ تھا۔

۳۔ لَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ: یہ بات بھی کھل کر سامنے آ جائے گی کہ انبیاء و مرسلین اللہ کی طرف سے جو کچھ پیغام لائے، وہ سب مبنی برحق تھے۔

۴۔ وَ نُوۡدُوۡۤا اَنۡ: جنت میں ہر مکلّف کے لیے مخصوص درجہ و مقام موجود ہے، جس کا مستحق ایمان و

عمل کے ذریعے بنتا ہے۔ جو لوگ ایمان نہیں لاتے اور عمل صالح نہیں کرتے، وہ جنت کے اس مقام کو کھو دیتے ہیں اور یہ مقام اہل ایمان وتقویٰ کو مل جاتا ہے۔ اس لیے اہل ایمان کو جنت کے وارث کہتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ دنیا و آخرت دونوں میں عمل ہی سے انسان کی تقدیر کا تعین ہوتا ہے۔

۲۔ جنت میں مختلف افراد اور مختلف فرقوں کے درمیان موجود کدورتیں دور ہو جائیں گی۔

۳۔ ممکن ہے دو افراد یا دو فرقے جو آپس میں کدورت رکھتے تھے، دونوں جنتی ہوں۔

وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَہَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّکُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیۡنَہُمۡ اَنۡ لَّعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ یَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ۚ وَ ہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ کٰفِرُوۡنَ ﴿۴۵﴾

۴۴۔ اور اہل جنت اہل جہنم سے پکار کر کہیں گے: ہم نے وہ تمام وعدے سچے پائے جو ہمارے پروردگار نے ہم سے کیے تھے، کیا تم نے بھی اپنے رب کے وعدوں کو سچا پایا؟ وہ جواب دیں گے: ہاں، تو ان (دونوں) کے درمیان میں سے ایک پکارنے والا پکارے گا: ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو۔

۴۵۔ جو لوگوں کو راہ خدا سے روکتے اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے تھے اور وہ آخرت کے منکر تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَنَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ اَصۡحٰبَ النَّارِ: اہل جنت اہل جہنم کو پکاریں گے۔ یعنی ان دونوں میں مکالمہ ہو گا یہ مکالمہ جنت میں داخل ہونے سے پہلے اعراف کی جگہ ہو گا۔ جہاں اہل جنت اور اہل جہنم نے اپنا اپنا راستہ لینا ہے۔

اس مکالمہ کا مضمون یہ ہے کہ اہل جنت اپنی کامیابی پر فخر کرتے ہوں گے کہ وہ تمام وعدے سچے پائے جو ہمارے پروردگار نے ہم سے کیے تھے اور ساتھ یہ تمسخر بھی ہو گا: کافرو! کیا تم نے بھی اپنے رب کے وعدوں کو سچ پایا؟ وہ کہیں گے: ہاں۔

اہل جنت اللہ کی نعمتوں پر فخر کریں گے اور کافروں کے ساتھ تمسخرانہ لہجے میں بات کریں گے کیونکہ

یہ لوگ دنیا میں اہل ایمان کا مزاح اڑاتے تھے۔ اگرچہ تمسخر کرنا خود اپنی جگہ ایک مستحسن عمل نہیں ہے، تاہم ان لوگوں کے ساتھ تمسخر کرنے میں کوئی حرج نہیں جو خود دوسروں سے تمسخر کرتے رہے ہیں۔

ثانیاً اہل جنت اور اہل جہنم کے اس مکالمے سے اہل جنت کو نعمتوں کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی ہے اور اہل جہنم کی حسرت و ندامت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس مکالمے میں دونوں مستحقین کے لیے ثواب و عذاب دونوں موجود ہیں۔

۲۔ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌ: اس موقع پر ایک اذان دینے والے نے اذان دی۔ یعنی اعلان کیا۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے کوفہ میں ایک خطبہ میں فرمایا:

انا المؤذن فی الدنیا والآخرۃ قال اللّٰہ تعالیٰ: فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ لَّعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ انا ذلک المؤذن و قال: وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖۤ انا ذلک المؤذن۔[1]

میں دنیا و آخرت دونوں کا مؤذن ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ لَّعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ میں ہی وہ مؤذن ہوں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖۤ۔ یہاں بھی میں مؤذن ہوں۔

محمد بن الحنفیۃ راوی ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

انا ذلک المؤذن۔

وہ مؤذن میں ہوں۔

ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ذیل آیت۔

ابن عباس کہتے ہیں:

قرآن میں علی علیہ السلام کے کچھ نام ایسے بھی ہیں جو لوگ نہیں جانتے۔ ان میں سے ایک فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيۡنَهُمۡ ہے۔

ملاحظہ ہو شواھد التنزیل ذیل آیت۔

ابن مردویہ نے مناقب علی علیہ السلام میں روایت کی ہے کہ یہ مؤذن امیر المؤمنین علیہ السلام ہیں۔

ملاحظہ ہو کشف الغمۃ اربلی ۱: ۳۲۱۔

یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مشرکین سے برائت کا اعلان، بحکم خدا و رسولؐ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا جو دنیا میں کفر و ایمان کے درمیان ایک فیصلہ کن اعلان اور نتیجہ خیز اذان تھی۔ کفر و ایمان میں ہمیشہ کے لیے امتیاز کی اذان، حق و باطل میں ایک فیصلہ کن اذان، شرک کی نفی کرنے والی توحیدی اذان،

---

[1] بحار الانوار ۲۳: ۲۸۲ باب نوادر الاحتجاج علی معاویۃ۔ میر کشفی نے مناقب مرتضوی صفحہ ۶۰ میں روح المعانی ۸: ۱۰۷ ط مصر ابن عباس سے روایت کی ہے کہ یہ مؤذن علی علیہ السلام ہیں۔

رسولؐ کی رسالت کی کامیابی کی اذان اور حقیقی معنوں میں یہ فتح کی اذان تھی۔

آخرت میں ہونے والی یہ اذان اسی اذان مکہ کا تسلسل ہے۔ وہی حق والوں کی اذان، اہل جنت و جہنم میں امتیاز کی اذان، اب برائت کی نہیں، ظالموں پر لعنت کی اذان، ایک نہایت فیصلہ کن اذان، تاریخ اذان کی سب سے بڑی اذان اور سب سے آخری اذان۔ وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ...[1] اذان ابراہیمی کے وارث کی اذان۔ البتہ دنیا کی اذان مشرکین سے برائت کی اذان تھی مگر آخرت کی اذا ظالموں پر لعنت کی اذان ہے۔ ظالموں کا دائرہ وسیع ہے۔

۳۔ بَیۡنَہُمۡ: ان کے درمیان یعنی یہ موذن ان دونوں فریقوں کے درمیان ہو گا۔ چنانچہ اگلی آیت میں اصحاب اعراف کے بارے میں ذکر آئے گا کہ وہ ان کے درمیان میں ہوں گے۔

اہم نکات

۱۔ روز قیامت کی فضیحت سے بچنے اور اہل جنت میں شامل ہونے کے لیے ظلم برنفس، ظلم بر غیر سے بچنا ہو گا۔

۲۔ اذان ابراہیم، اذان برائت اور اذان لعنت، تحریک توحید کی اہم اذانیں ہیں۔

وَبَیۡنَہُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَی الۡاَعۡرَافِ رِجَالٌ یَّعۡرِفُوۡنَ کُلًّۢا بِسِیۡمٰہُمۡ ۚ وَنَادَوۡا اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ اَنۡ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ ۟ لَمۡ یَدۡخُلُوۡہَا وَہُمۡ یَطۡمَعُوۡنَ ﴿۴۶﴾

۴۶۔ اور (اہل جنت اور اہل جہنم) دونوں کے درمیان ایک حجاب ہو گا اور بلندیوں پر کچھ ایسے افراد ہوں گے جو ہر ایک کو ان کی شکلوں سے پہچان لیں گے اور اہل جنت سے پکار کر کہیں گے: تم پر سلامتی ہو، یہ لوگ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے مگر امیدوار ہوں گے۔

تشریح کلمات

الۡاَعۡرَافِ: (ع ر ف) بلند جگہ، ٹیلہ۔ اسی سے گھوڑے کے ایال اور مرغ کی کلغی کو عُرف کہتے ہیں۔

سیما: (س و م) علامت۔

تفسیر آیات

وَبَیۡنَہُمَا حِجَابٌ: آیت سے جو مطلب سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ قیامت کے دن ایک ایسی جگہ ہو گی، جہاں ایک طرف اہل جنت ہوں گے اور دوسری طرف اہل جہنم ہوں گے، درمیان میں ایک دیوار

---

[1] ۲۲ حج: ۲۷

ہو گی۔ چنانچہ اس دیوار کا ذکر دوسری جگہ بھی آیا ہے کہ منافقین جب اہل ایمان سے کہیں گے:

انۡظُرُوۡنَا نَقۡتَبِسۡ مِنۡ نُّوۡرِکُمۡ ۚ قِیۡلَ ارۡجِعُوۡا وَرَآءَکُمۡ فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًا ؕ فَضُرِبَ بَیۡنَہُمۡ بِسُوۡرٍ لَّہٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُہٗ فِیۡہِ الرَّحۡمَۃُ وَ ظَاہِرُہٗ مِنۡ قِبَلِہِ الۡعَذَابُ ؕ [1]

ہمارا انتظار کریں تا کہ ہم تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں، (مگر) ان سے کہا جائے گا: اپنے پیچھے لوٹ جاؤ اور نور تلاش کرو، پھر ان کے درمیان ایک دیوار بنا دی جائے گی جس کا ایک دروازہ ہو گا جس کے اندرونی حصے میں رحمت ہو گی اور اس کی بیرونی جانب عذاب ہو گا۔

وَعَلَی الۡاَعۡرَافِ رِجَالٌ: قیامت کے دن میدان محشر میں ایک اونچی جگہ ہو گی۔ اس اونچی جگہ کی ایک طرف اہل جنت دوسری طرف اہل جہنم ہوں گے۔ اس اونچی جگہ پر کچھ رجال (شخصیتیں) ہوں گے اور اہل جنت اور اہل جہنم دونوں پر ان کی نظر ہو گی۔

اہل اعراف کون ہیں: اس بارے میں بارہ اقوال ہیں لیکن قرآنی قرائن کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ اہل اعراف قابل توجہ درجات پر فائز لوگ ہیں:

i۔ اصحاب الاعراف کی قدر و منزلت کا اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو پس پردہ نہیں رکھا گیا بلکہ ان کو ایسی بلند اور نمایاں جگہ دی گئی ہے جو اہل جنت سے بھی ممتاز حیثیت کی حامل ہے کیونکہ دوسرے اہل جنت پس حجاب ہوں گے۔ وَبَیۡنَہُمَا حِجَابٌ

ii۔ یَعۡرِفُوۡنَ کُلًّۢا بِسِیۡمٰہُمۡ: وہ اہل جنت اور اہل جہنم پر نظر رکھے ہوں گے اور ان سب کو شکلوں سے پہچانتے ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اعراف والے، لوگوں کے اعمال سے بھی واقف ہیں کہ کون اہل جنت ہے اور کون اہل جہنم۔ ذہبی نے الاعتدال میں روایت کی ہے کہ اصحاب اعراف اپنے محبین کو چہرے کی روشنی سے اور بغض رکھنے والوں کو چہرے کی سیاہی سے پہچان لیں گے۔

ابن مردویہ نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

نحن اصحاب الاعراف من عرفنا بسیماہ ادخلناہ الجنۃ۔

ہم ہی اصحاب الاعراف ہیں جس کو چہرے سے ہم پہچان لیتے ہیں اس کو جنت میں داخل کرتے ہیں

ملاحظہ ہو مفتاح النجا بدخشی و ارجی المطالب۔ امرتسری۔

iii۔ یہ لوگ اہل جنت و اہل جہنم سے بات کرنے کے مجاز ہوں گے۔ یہ بھی ایک اہم درجہ ہے۔ کیونکہ ارشاد ہوتا ہے:

----

[1] ۵۷ حدید: ۱۳

لَّا یَتَکَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا۝ [1]	اور کوئی بات نہیں کر سکے گا سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے اور جو درست بات کرے۔

iv۔ وہ اہل جنت کو داخل جنت ہونے کی نوید سنائیں گے:

اُدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡکُمۡ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ۝ [2]	جنت میں داخل ہو جاؤ جہاں نہ تمہیں کوئی خوف ہو گا اور نہ تم محزون ہو گے۔

v۔ وہ تکبر والوں کو سرزنش کریں گے اور دنیا میں ان کے اعمال سے باخبر ہوں گے کہ وہ اہل ایمان کے بارے میں کیا مؤقف رکھتے تھے۔ وہ دنیا میں قسم کھا کر کہتے تھے کہ ایمان والوں کو اللہ کی رحمت میسر نہیں آئے گی۔

لہٰذا اعراف کی شخصیتیں انبیاء اور اولیاء ہو سکتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ اگر اصحاب الاعراف انبیاء و آئمہ ہیں تو اس جملے کا کیا مطلب ہے: لَمۡ یَدۡخُلُوۡهَا وَهُمۡ یَطۡمَعُوۡنَ جو کہتا ہے کہ یہ لوگ ابھی جنت میں داخل نہیں ہو چکے ہوں گے بلکہ امیدوار ہوں گے۔

جواب یہ ہے کہ جیسا کہ صاحب المیزان نے مؤقف اختیار کیا ہے کہ یہ جملہ اصحاب الاعراف سے نہیں بلکہ اہل جنت سے مربوط ہے کہ جو داخل جنت ہونے کی امید میں ہوں گے اور طَمَعَ بمعنی عَلِم بھی آتا ہے۔

لہٰذا وہ روایات جو بتاتی ہیں، اصحاب الاعراف وہ ہیں جن کی نیکیاں اور گناہ برابر ہیں وغیرہ، خلاف ظاہر قرآن ہونے کی وجہ سے ناقابل توجیہ قرار دی جاتی ہیں۔ بعض حضرات نے جمع کرنے کی کوشش کی ہے کہ اصحاب الاعراف انبیاء و ائمہ کے ساتھ کمزور و مستضعف لوگ دونوں ہیں۔ یہ قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ یہ ظاہر قرآن کے خلاف ہے۔

البتہ یہاں ایک روایت اس جمع کے حق میں ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

> الاعراف جنت و دوزخ کے درمیان ایک ٹیلے کا نام ہے، جہاں ہر نبی اور ہر خلیفہ اپنے زمانے کے گنہگاروں کے ساتھ ہو گا... الیٰ آخر۔

یہ روایت چونکہ ان کثیر روایات کے خلاف ہے جن کے مطابق اصحاب الاعراف، صرف انبیاء و ائمہ علیہم السلام کو بتایا ہے، لہٰذا اس روایت کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ مقام اعراف سے انبیاء و خلفاء اپنے زمانے کے گنہگاروں کی شفاعت کریں گے اور عین ممکن ہے کہ راوی کو لفظ اعراف سے اشتباہ ہو گیا ہو کہ یہ گنہگار اصحاب الاعراف میں شامل ہیں یا اعراف پر ان کی شفاعت ہو گی نیز یہ بات بھی معقول نہیں کہ جن لوگوں نے جنت میں جانا ہے وہ پس حجاب ہوں اور جن گنہگاروں کو روکا گیا ہے وہ انبیاء و ائمہ کی معیت

---

[1] ۷۸ نباء: ۳۸　　[2] ۷ اعراف: ۴۹

میں حجاب و پردے سے بالاتر ہوں۔

متعدد روایات میں آیا ہے کہ اصحاب الاعراف ائمہ و اہل بیت علیہم السلام ہیں۔

مجمع البیان میں آیا ہے کہ عالم اہل سنت ابو القاسم حسکانی نے اصبغ بن نباتہ سے، انہوں نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے ابن الکواء کو بتایا:

نحن نوقف یوم القیامة بین الجنة و النار فمن ینصرنا عرفناه بیسماه فادخلناه الجنة و من ابغضنا عرفناه بسیماه فادخلناه النار۔[1]

قیامت کے دن ہم کو جنت اور جہنم کے درمیان ٹھہرایا جائے گا پھر جس نے ہماری مدد کی اس کو شکل سے ہم پہچان لیں گے اور اسے جنت میں داخل کریں گے اور جس نے ہمارے ساتھ عداوت کی ہے اس کو بھی شکل سے ہم پہچان لیں گے اور اسے آتش میں داخل کریں گے۔

تفسیر البرہان میں آیا ہے کہ مفسر اہل سنت ثعلبی نے ابن عباس سے روایت کی:

قال الاعراف موضع عالی من الصراط علیه العباس و حمزة و علی بن ابی طالب و جعفر ذوالجناحین یعرفون محبیهم ببیاض الوجوه و مبغضیهم بسواد الوجوه.[2]

انہوں نے کہا: اعراف، صراط پر موجود ایک بلند جگہ کا نام ہے۔ وہاں عباس، حمزہ، علی بن ابی طالبؑ اور جعفر ذوالجناحین ہوں گے اور اپنے دوستداروں کو چہروں کی روشنی سے اور دشمنوں کو سیاہ چہروں سے پہچان لیں گے۔

شیعہ مصادر میں تو یہ روایت کثرت سے ملتی ہے۔ ائمہ اہل بیتؑ نے فرمایا:

ہم ہی اصحاب الاعراف ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

ہم اکرم الخلق علی اللّٰہ۔[3]

وہ مخلوقات میں اللہ کے نزدیک محترم ترین لوگ ہیں.

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یا علی انت والائمة من ولدك علی الاعراف یوم القیمة تعرف المجرمین بسیماهم و المؤمنین بعلاماتهم.[4]

اے علی! آپ اور آپ کی اولاد میں سے ائمہ قیامت کے دن اعراف پر ہوں گے۔ آپ مجرموں کو ان کے چہرے اور مؤمنین کو ان کی مخصوص نشانیوں سے پہچان لیں گے۔

---

[1] شواهد التنزیل ذیل آیت۔ مناقب ابن مردویه کشف الغمة اربلی ۱: ۳۲۴

[2] تفسیر روح المعانی، شوکانی: فتح القدیر ۲: ۱۹۸، ابن حجر

[3] بصائر الدرجات ص ۵۰۰۔ ۱۶ باب فی الائمة انهم الذین ذکرهم۔

[4] الامالی للشیخ المفید صفحه ۲۱۳

اہم نکات

۱۔ آج جیسی نشانی لگائی جائے گی، کل ویسے پہچانے جائیں گے۔

۲۔ قیامت کے دن مختلف مقامات پر شفاعت کی ضرورت پیش آئے گی۔ ان میں سے ایک مقام اعراف یا صراط ہے۔ جیسا کہ حدیث فریقین میں آیا ہے۔ پیغمبر اکرم (ص) سے روایت ہے:

لا یجوز علی الصراط الا من کان معه کتاب بولایة علی ابن ابی طالب۔[1]　　صراط سے کوئی نہیں گزر سکے گا جب تک اس کے پاس علی علیہ السلام کی ولایت کا پروانہ نہ ہو۔

وَ اِذَا صُرِفَتۡ اَبۡصَارُہُمۡ تِلۡقَآءَ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوۡا رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۷﴾

۴۷۔ اور جب ان کی نگاہیں اہل جہنم کی طرف پلٹائی جائیں گی تو وہ کہیں گے: ہمارے پروردگار ہمیں ظالموں کے ساتھ شامل نہ کرنا۔

تفسیر آیات

قَالُوۡا رَبَّنَا: یہ جملہ اصحاب الاعراف ہی کی طرف سے ہے، کیونکہ دوسرے لوگ تو پس حجاب ہوں گے، وہ اصحاب النار کی طرف نہیں دیکھ رہے ہوں گے۔ اس دعا سے اول تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ظالمین کی حالت کس قدر وحشت ناک ہوگی کہ ہر دیکھنے والا اس سے پناہ مانگتا ہے۔ ثانیاً اولو العزم انبیاء نے بھی اس قسم کے مضمون کی دعائیں کی ہیں۔ چنانچہ خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوا ہے، اس طرح دعا کریں:

رَبِّ فَلَا تَجۡعَلۡنِیۡ فِی الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿﴾[2]　　میرے پروردگار! مجھے اس ظالم قوم کے ساتھ شامل نہ کرنا۔

وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡاَعۡرَافِ رِجَالًا یَّعۡرِفُوۡنَہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ قَالُوۡا مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡکُمۡ جَمۡعُکُمۡ وَ مَا کُنۡتُمۡ تَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ اور اصحاب اعراف کچھ ایسے لوگوں کو بھی پکاریں گے جنہیں وہ ان کی شکلوں سے پہچانتے ہوں گے اور کہیں گے: آج نہ تو تمہاری جماعت تمہارے کام آئی اور نہ تمہارا تکبر۔

تفسیر آیات

وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡاَعۡرَافِ رِجَالًا: یہ اصحاب الاعراف کی دوسری ندا ہے۔ جو اہل جہنم کی طرف ہو

---

[1] نہج الحق ص ۲۲۳۔　[2] ۲۳ المومنون: ۹۴

گی۔ پہلی ندا کا ذکر آیت ۴۶ میں ہو گیا۔ وَنَادَوۡا اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ اور ان دونوں آیتوں میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ اصحاب الاعراف اہل جنت اور اہل جہنم، دونوں کو ان کے چہروں سے پہچان لیں گے۔ چنانچہ اہل جنت کے بارے میں آیت ۴۶ میں فرمایا: یَعۡرِفُوۡنَ کُلًّۢا بِسِیۡمٰہُمۡ ہر ایک کو ان کی شکلوں سے پہچان لیں گے اور اہل جہنم کے بارے میں اس آیت میں فرمایا: یَعۡرِفُوۡنَہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ وہ ان کو شکلوں سے پہچان لیں گے۔

یہ ندا ایسی ہستیوں کی طرف سے ہو سکتی ہے جو ان کے اعمال کی شاہد ہوں۔ان جہنمیوں کو دنیا میں دو چیزوں پر ناز تھا، اس کی یاد دہانی کرائیں گے:

i۔ مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡکُمۡ جَمۡعُکُمۡ: جس جماعت پر تمہیں ناز تھا۔ یہ جمعیت اور جماعت آج تمہارے کام نہ آئی۔

ii۔ وَ مَا کُنۡتُمۡ تَسۡتَکۡبِرُوۡنَ: دنیا میں تمہارا سیاسی، معاشی اور معاشرتی مقام اونچا رہا جس کی بنا پر تم خود کو بہت اونچے لوگ سمجھتے تھے۔ آج تمہیں پتہ چل گیا تم کس قدر اونچے لوگ ہو۔

اس جگہ یہ حدیث قابل توجہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے۔

الغنی و الفقر بعد العرض علی اللّٰہ۔[1] امیری اور فقیری کا فیصلہ اللہ کے سامنے پیش ہونے کے بعد ہو گا۔

اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ اَقۡسَمۡتُمۡ لَا یَنَالُہُمُ اللّٰہُ بِرَحۡمَۃٍ ؕ اُدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡکُمۡ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ﴿۴۹﴾

۴۹۔ اور کیا یہ (اہل جنت) وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ ان تک اللہ کی رحمت نہیں پہنچے گی؟ (آج انہی لوگوں سے کہا جا رہا ہے کہ) جنت میں داخل ہو جاؤ جہاں نہ تمہیں کوئی خوف ہو گا اور نہ تم محزون ہو گے۔

تفسیر آیات

خطاب اہل جہنم سے ہے اور موضوع سخن ہیں اہل جنت۔ یعنی: اے جہنمیو! یہ اہل جنت وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم دنیا میں قسم کھا کر کہا کرتے تھے: لَا یَنَالُہُمُ اللّٰہُ بِرَحۡمَۃٍ ان تک اللہ کی رحمت نہیں پہنچے گی۔

اس آیت کے چند نکات قابل توجہ ہیں:

---

[1] بحار الانوار ۶۹: ۵۳

i۔ اصحاب الاعراف یہ بھی جانتے ہیں کہ دنیا میں ان جہنمیوں نے اہل ایمان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

ii۔ اصحاب الاعراف اہل جنت کو جنت میں داخل ہونے کا حکم دے رہے ہیں۔ یہ بات نہایت اہم ہے کہ ان ہستیوں کو اللہ کی طرف سے اختیار ہے کہ جنت کے مستحقین کو جنت لے جائیں۔

iii۔ جنت میں رنج وخوف نہ ہونے کی نوید سنا رہے ہیں۔

ان تمام باتوں سے ہمارے اس مؤقف کی تائید ہوتی ہے کہ اصحاب الاعراف بلند مقام ہستیاں ہیں۔

وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ اَنۡ اَفِیۡضُوۡا عَلَیۡنَا مِنَ الۡمَآءِ اَوۡ مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَہُمَا عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿ۙ۵۰﴾

۵۰۔ اور اہل جہنم اہل جنت کو پکاریں گے: تھوڑا پانی ہم پر انڈیل دو یا جو رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے اس میں سے کچھ ہمیں دے دو، وہ جواب دیں گے: اللہ نے جنت کا پانی اور رزق کافروں پر حرام کیا ہے۔

تفسیر آیات

اہل جہنم ہر طرف سے عذاب میں گھیرے ہوئے ہوں گے۔ منجملہ بھوک اور پیاس کے عذاب میں ہوں گے۔ اس پر مزید عذاب یہ کہ وہ اہل جنت کو نعمتوں کی فراوانی میں دیکھتے بھی ہوں گے۔ تب ہی تو وہ اہل جنت سے پانی اور رزق مانگ رہے ہوں گے۔

اس آیت سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت اور اہل جہنم آپس میں ایک دوسرے سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ ہماری اس دنیا کی زندگی میں ایک دوسرے سے گفتگو ہوا کے ارتعاش کے ذریعے ہو جاتی ہے۔ اگر فاصلہ ہو تو دوسرے ذرائع ایجاد ہوئے ہیں لیکن آخرت میں فاصلے رکاوٹ بنیں گے یا گفتگو کے لیے آواز درکار ہوگی؟ وغیرہ۔ ان چیزوں کو ہم دنیاوی نظام پر قیاس نہیں کر سکتے۔

اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَہُمَا: یہ تحریم تکوینی یعنی قانوناً نہیں بلکہ عملاً ان کو محروم کر دیا گیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ جہنم والوں کی طرف نگاہ کرنا بھی قابل تحمل نہ ہوگا: وَ اِذَا صُرِفَتۡ اَبۡصَارُہُمۡ ....

۲۔ دنیا میں کسی کی اکثریت یا گروہ و جماعت قیامت کے دن کوئی فائدہ نہ دے گی: مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡکُمۡ جَمۡعُکُمۡ....

۳۔ دنیا میں جو لوگ اہل ایمان کی تحقیر و تذلیل کریں گے وہی لوگ کل اہل ایمان کے سامنے حقیر و ذلیل ہوں گے: اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيۡنَ اَقۡسَمۡتُمۡ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحۡمَةٍ ....

۴۔ پانی کو دنیا و آخرت دونوں میں بنیادی حیثیت حاصل ہے: اَفِيۡضُوۡا عَلَيۡنَا مِنَ الۡمَآءِ ....

الَّذِيۡنَ اتَّخَذُوۡا دِيۡنَهُمۡ لَهۡوًا وَّ لَعِبًا وَّغَرَّتۡهُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا ۚ فَالۡيَوۡمَ نَنۡسٰهُمۡ كَمَا نَسُوۡا لِقَآءَ يَوۡمِهِمۡ هٰذَا ۙ وَ مَا كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَجۡحَدُوۡنَ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا دیا تھا اور دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈالا تھا، پس آج ہم انہیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح وہ اس دن کے آنے کو بھولے ہوئے تھے اور ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ جنت کی نعمتوں کے حرام ہونے کے اسباب کا ذکر ہے:

i۔ لَهۡوًا وَّ لَعِبًا: انہوں نے اپنے دین کو کھیل اور بے مقصد بنایا تھا۔ مثلاً طواف کے وقت سیٹی بجانا اور تالی بجانا۔ اپنے بتوں کے سامنے مقابلے میں مختلف موسموں میں لغویات کا انجام دینا وغیرہ۔

ii۔ وَّغَرَّتۡهُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا: وہ ساری توجہ دنیا کی چند روزہ زندگی پر مرکوز رکھتے تھے۔

iii۔ درگاہ الٰہی میں آنے کا خیال تک ذہن میں نہیں لاتے تھے۔

iv۔ آیات الٰہی کا انکار کرتے تھے۔

۲۔ فَالۡيَوۡمَ نَنۡسٰهُمۡ: مکافات عمل، عمل کے مطابق ہو گا۔ فراموشی کے مقابلے میں فراموشی۔ کل تم نے آج کے دن کو فراموش کیا، آج ہم تم کو فراموش کر رہے ہیں۔

وَلَقَدۡ جِئۡنٰهُمۡ بِكِتٰبٍ فَصَّلۡنٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ هُدًى وَّ رَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۲﴾

۵۲۔ اور ہم ان کے پاس یقیناً ایک کتاب لا چکے ہیں جسے ہم نے از روئے علم واضح بنایا ہے جو ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے.

تفسیر آیات

۱۔ فَصَّلۡنٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ: یہ قرآن ایک ایسا دستور پیش کرتا ہے جس کو اس ذات نے ترتیب دیا جو دانائے راز ہے۔ انسان کی ضرورتوں اور اس کے تمام تقاضوں پر علم و آگہی رکھتی ہے۔ یہ دستور مفصل ہے۔

تفصیل سے مراد یہ ہے کہ حق کو باطل سے جدا، امر واقع وحقیقت کو خرافات سے جدا کرنے والی کتاب ہے۔ تفصیل سے مراد یہ نہیں کہ تمام جزئیات کو بیان کیا ہے۔

۲۔ هُدًى وَّ رَحْمَةً: یہ کتاب مؤمنین کے لیے ہدایت ہے۔ چونکہ اس سے ہدایت لینے والے صرف مؤمنین ہوتے ہیں، جیسے هدی للمتقین میں بیان ہوا۔ وَّ رَحْمَةً اور مؤمنین ہی کے لیے یہ کتاب رحمت کی باعث ہے۔ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۔[1] غیر مؤمن کے لیے یہ نہ صرف رحمت نہیں بلکہ اس سے منہ موڑنے کی وجہ سے ان کے لیے باعث خسارت ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآن کے بعد اہل حق کے لیے اشتباہ و غلط فہمی کی گنجائش نہیں: بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ ....

۲۔ اہل ایمان کے لیے اس قرآن میں راہنمائی اور رحمت ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ کیا یہ لوگ صرف اس (کتاب کی تنبیہوں) کے انجام کار کے منتظر ہیں؟ جس روز وہ انجام کار سامنے آئے گا جو لوگ اس سے پہلے اسے بھولے ہوئے تھے وہ کہیں گے: ہمارے پروردگار کے پیغمبر حق لے کر آئے تھے کیا ہمارے لیے کچھ سفارشی ہیں جو ہماری شفاعت کریں یا ہمیں (دنیا میں) واپس کر دیا جائے تا کہ جو عمل (بد) ہم کرتے تھے اس کا غیر (عمل صالح) بجا لائیں؟ یقیناً انہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال دیا اور جو جھوٹ وہ گھڑتے رہتے تھے وہ ان سے ناپید ہو گئے۔

تفسیر آیات

۱۔ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ: تاویل وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد احکام و اعمال کا مدار ہے۔ یعنی وہ راز وحکمت جس کی بنا پر احکام صادر ہوتے ہیں اور تمام احکام کا مآل و مرجع وہی نقطہ ہوتا ہے۔

۲۔ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ: قرآن جس دستور و نظام کو متعارف کرا رہا ہے، اس کے راز وحکمت کو دنیا

---

[1] ۱۷ اسراء: ۸۲

میں لوگ نہیں مانتے تھے اور اس کی تکذیب کرتے تھے۔ جب بروز قیامت وہ حقیقت منکشف ہو کر سامنے آ جاتی ہے تو تسلیم کر لیتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے کیے کی سزا پاتے ہیں تو مانتے ہیں۔

۳۔ فَهَلۡ لَّنَا مِنۡ شُفَعَآءَ: یہاں وہ دو چیزوں میں سے ایک کی خواہش کریں گے: ایک یہ کہ دنیا میں پھر بھیج دیے جائیں اور ایک موقع اور دیا جائے تا کہ وہ اپنے اعمال کو درست کریں یا یہ کہ ان کے لیے کوئی شفاعت کرنے والا مل جائے۔ جب کہ یہ دونوں باتیں قابل عمل نہیں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مشاہدۂ عذاب سے پہلے اس سے بچنے کا چارہ سوچنا ہوگا: یَوۡمَ یَاۡتِیۡ تَاۡوِیۡلُهٗ ....

۲۔ ارتقائی سفر میں واپسی ممکن نہیں ہے: اَوۡ نُرَدُّ فَنَعۡمَلَ غَیۡرَ الَّذِیۡ ....

۳۔ قیامت کے دن واحد سہارا شفاعت ہے۔ فَیَشۡفَعُوۡا لَنَاۤ ....

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰهُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ۟ یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّهَارَ یَطۡلُبُهٗ حَثِیۡثًا ۙ وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ وَ النُّجُوۡمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمۡرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَ الۡاَمۡرُ ؕ تَبٰرَکَ اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۵۴﴾

۵۴۔ تمہارا رب یقیناً وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر متمکن ہوا، وہ رات سے دن کو ڈھانپ دیتا ہے جو اس کے پیچھے دوڑتی چلی آتی ہے اور سورج اور چاند اور ستارے سب اسی کے تابع فرمان ہیں، آگاہ رہو! آفرینش اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے، بڑا بابرکت ہے اللہ جو عالمین کا رب ہے۔

تشریح کلمات

اسۡتَوٰی: (س و ی) یہ لفظ جب علیٰ کے ساتھ تعدی ہو تو قرار پکڑنے اور مستولی ہونے کے معنوں میں ہوتا ہے اور جب الی کے ذریعے متعدی ہو تو کسی چیز تک بالذات یا بالتدبر پہنچ جانے کے معنوں میں ہوتا ہے، جیسے ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ[۱]۔

الۡعَرۡشِ: (ع ر ش) چھت والی چیز کو کہتے ہیں اور اس میں بلندی بھی ملحوظ رہتی ہے۔ بادشاہ کے تخت

---

[۱] ۲ بقرۃ: ۲۹

کو اسی بلندی کی وجہ سے عرش کہا جاتا ہے اور بطور کنایہ عرش کا لفظ عزت، غلبہ اور سلطنت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے: فلانٌ قَلّ عرشہ۔ فلاں کی عزت جاتی رہی۔

حَثِیۡثًا: (ح ث ث) کے معنی لکھتے ہیں: الاعجال و السرعۃ۔ یعنی شتاب اور تیزی کرنا۔

تفسیر آیات

قرآن مجید میں سات مقامات پر اس بات کی صراحت کی ہے کہ آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا گیا ہے۔[1]

یوم سے مراد ہمارے ارضی یوم نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ ہمارے نظام شمسی کے وجود سے پہلے کا ذکر ہے۔ اس یوم کا تعلق کائنات کے کسی خاص شعبہ سے نہیں ہے۔ مثلاً کائنات میں سے ہمارے ارضی نظام کی تدبیر امور کے بارے میں فرمایا:

یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ ثُمَّ یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗۤ اَلۡفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ۝[2]

وہ آسمان سے زمین تک امور کی تدبیر کرتا ہے پھر یہ امر ایک ایسے دن میں اللہ کی بارگاہ میں اوپر کی طرف جاتا ہے جس کی مقدار تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال ہے۔

تو اس یوم کا تعلق تدبیری شعبہ سے بھی نہیں ہے بلکہ اس یوم کا تعلق کل کائنات سے ہے۔ یہ خود زمانہ وجود میں آنے سے پہلے کا ذکر ہے۔ لہٰذا ان ایام ستۃ کا تصور ہم اپنے زمانے کے حوالے سے نہیں کر سکتے۔ ان ایام کا تصور کرنے کے لیے ہمیں کل کائنات کی خلقت و ارتقا اور اس کی وسعت کو سامنے رکھنا ہو گا۔ اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے:

وَ السَّمَآءَ بَنَیۡنٰہَا بِاَیۡىدٍ وَّ اِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ ۝[3]

اور آسمان کو ہم نے قوت سے بنایا اور ہم ہی وسعت دینے والے ہیں۔

درج بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق و توسیع اور ارتقا کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہر چیز کا یوم اس کے حساب سے ہوتا ہے۔ حکومتوں کے زوال و عروج کے ادوار کو یوم سے تعبیر کرتے ہیں۔ پوری انسانی زندگی کو دو یوم سے تعبیر کرتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ یَوْمٌ لَکَ وَ یَوْمٌ عَلَیْکَ...۔[4] یعنی زندگی میں ایک دن تیرے حق میں ہو گا تو ایک دن تیرے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہر چیز کے ایام کا اندازہ اس کی مناسبت سے کرنا ہو گا۔

---

[1] سورہ ہائے اعراف: ۵۴، یونس: ۳، ہود: ۷، فرقان: ۵۹، سجدہ: ۴، ق: ۳۸ حدید: ۴
[2] ۳۲ سجدہ: ۵
[3] ۵۱ ذاریات: ۴۷
[4] الکافی ۸: ۲۰ خطبہ امیر المؤمنین علیہ السلام

الٰہی ایام کا اندازہ ہم اپنے محدود پیمانوں سے نہیں کر سکتے اور رسالتی ایام کا بھی اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ معراج کے موقع پر حضورؐ ہمارے زمانے کے چند لمحوں میں پوری ملکوت سماوات کی سیر فرما کر واپس تشریف لاتے ہیں۔ ہمارے نظام شمسی کا زمانہ اور دیگر عوالم کے زمانے میں فرق بھی معلوم ہوا ہے۔ لہٰذا یوم سے مراد مراحل ہو سکتے ہیں۔

نیز قابل توجہ بات یہ ہے کہ نظریہ اضافت کے تحت خود زمانہ بھی مطلق چیز کا نام نہیں ہے بلکہ زمانہ ایک اضافی چیز ہے۔ یعنی زمانہ ہر جگہ یک گونہ نہیں ہے۔

ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ: پھر عرش پر متمکن ہوا۔ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو خلق فرماتا ہے تو اس کی تخلیق میں دو عنصر نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں: اول یہ کہ اس کی تخلیق، ایجاد ہوتی ہے۔ یعنی عدم سے وجود میں لایا جاتا ہے۔ دوم یہ کہ تخلیق کے بعد مخلوق اپنی بقا میں بھی اللہ کی محتاج ہوتی ہے۔ جب کہ انسانی تخلیق میں یہ دونوں باتیں نہیں ہوتیں۔ نہ عدم سے وجود میں لایا جاتا ہے بلکہ ایک شکل سے دوسری شکل میں لایا جاتا ہے، نہ تخلیق کے بعد اس کی محتاج ہوتی ہے۔ ایک مکان یا ایک مشینری کے بنانے کے بعد وہ اپنی بقاء میں اس بنانے والے کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ کسی دوسرے کے سپرد ہو سکتی ہے۔

کائنات کی تخلیق اور اس کو عدم سے وجود دینے کے بعد اس نظام کی بقا اور اس کے ہر ذرے کا باقی رہنا، اس کے خالق کا محتاج ہے۔ یہ کائنات ایک لحہ کے لیے بھی اپنے خالق سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔

اس آیت میں دو باتوں کا ذکر ہے: عالم خلق اور عالم امر۔ عالم خلق کے بارے میں فرمایا کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور عالم امر کے بارے میں فرمایا: پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ یعنی اس کائنات کے وجود میں آنے کے بعد بھی یہ سب اسی کے محتاج ہیں اور وہ اس پر حاکم اور مسلط ہے کہ سب کائنات اسی کے زیر نگین ہے اور کائنات کی تخلیق میں جس طرح صرف اس کی کن فکانی چلتی تھی، اس کی بقا و تدبیر امور میں بھی اسی کی حکمرانی چلتی ہے۔

چنانچہ قرآن میں جہاں بھی عرش پر متمکن ہونے کا ذکر آیا، وہاں اس کائنات کی تدبیر و حکومت کا ذکر ایک لازمہ کے طور پر آیا ہے۔ سورۂ یونس میں فرمایا:

ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ ...[1]	پھر اس نے عرش پر اقتدار قائم کیا، وہ تمام امور کی تدبیر فرماتا ہے...

اس آیت میں عرش پر متمکن ہونے کے بعد تدبیر امور کو اس کا لازمہ قرار دیا ہے:

ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ وَ سَخَّرَ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ ؕ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ ...[2]	پھر اس نے عرش پر سلطنت استوار کی اور سورج اور چاند کو مسخر کیا، ان میں سے ہر ایک مقررہ مدت کے لیے چل رہا ہے، وہی امور کی تدبیر کرتا ہے...

---

[1] ۱۰ یونس: ۳ [2] ۱۳ رعد: ۲

اس آیت میں عرش پر متمکن ہونے کا نتیجہ شمس وقمر کی تسخیر و تدبیر بتایا۔

اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی ○ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا وَ مَا تَحۡتَ الثَّرٰی ○ [1]

وہ رحمٰن جس نے عرش پر اقتدار قائم کیا۔ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان اور جو کچھ زمین کی تہ میں ہے سب کا وہی مالک ہے.

اس آیت میں بھی عرش پر متمکن ہونے کا لازمہ آسمانوں اور زمین کی ملکیت قرار دیا ہے۔

چنانچہ اسی زیر بحث آیت میں بھی عرش پر متمکن ہونے کے چند ایک نتائج بیان فرمائے ہیں:

۱۔ یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّہَارَ : وہ رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے۔ یعنی رات کی تاریکی دن کی روشنی پر غالب آتی ہے اور بلا فاصلہ بڑی سرعت اور تیزی کے ساتھ رات کی تاریکی دن کی روشنی کا تعاقب کرتی ہے۔

ہم نے اس سے پہلے بھی اس اہم ترین نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مجموعی طور پر کائنات زندگی اور حیات کے لیے سازگار نہیں ہے۔ کائنات کی وسیع وعریض فضاؤں میں زندگی کے پروان چڑھنے کے لیے بہت سے نامساعد حالات کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اس مقابلے کے لیے ایک قوت قہار اور لا متناہی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اس ارضی فضا سے خارج ہونے کے بعد لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں ایک نہایت محدود فضا میں محدود مدت تک زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔

آیت کے اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات پر مجموعی طور پر تاریکی حاکم ہے اور دن کی روشنی اس لامحدود تاریکی کا ایک محدود فضا میں مقابلہ کرتی ہے۔ اس روشنی سے رب کائنات نے نظام حیات کو برقرار رکھا ہے، جو اس کی سلطنت کے تخت پر تمکنت، تدبیر عالم کا ایک نمونہ ہے:

ذُو الۡعَرۡشِ الۡمَجِیۡدُ ۙ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ○ [2]

بڑی شان والا، عرش کا مالک ہے۔ وہ جو چاہتا ہے اسے خوب انجام دینے والا ہے۔

۲۔ وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ وَ النُّجُوۡمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمۡرِہٖ : سورج، چاند اور تارے اس کے امر کے تابع اور مسخر ہیں۔ یہ امر بھی اس کی حکومت وسلطنت کی ایک لازوال نشانی ہے۔

۳۔ اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَ الۡاَمۡرُ : دیکھو! خلق بھی اس کی اور امر بھی اس کا۔ تخلیق خدا کے مراحل ہوتے ہیں اور یہ تدریجی عمل ہے۔ چنانچہ خلق کا عمل چھ دنوں میں انجام پایا۔ جب کہ امر فوری عمل ہے:

وَ مَاۤ اَمۡرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَۃٌ کَلَمۡحٍۭ بِالۡبَصَرِ ○ [3] اور ہمارا حکم بس ایک ہی ہوتا ہے پلک جھپکنے کی طرح۔

و لذا کان الخلق یقبل التدریج ... بخلاف الامر۔ (المیزان)۔

اس طرح اس جملے میں خلق اور امر کا ایک جگہ ذکر فرما کر خلق اور امر دو مختلف عوالم ہونے کی طرف اشارہ فرمایا۔ خلق ایجاد ہے اور امر بقائے نظام۔ خلقت کے بعد کائنات میں تصرف ہے۔ ان دونوں

---

[1] ۲۰ طٰہٰ: ۵۔۶ [2] ۸۵ بروج ۱۵۔۱۶ [3] ۵۴ قمر: ۵۰

کا تعلق صرف اللہ ہی سے ہے۔ یہاں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے۔ سفیان بن عیینہ جو قرآن کے غیر مخلوق ہونے پر زور دینے والوں میں سے ہیں، کہتے ہیں:

اللہ نے خلق اور امر میں فرق رکھا ہے، لہٰذا جو امر (قرآن) کو مخلوق سمجھے وہ کافر ہے۔[1]

سفیان اور ڈاکٹر زحیلی یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ وہ امر ہے جس کا تعلق پوری کائنات پر تصرف و تدبیر سے ہے۔ چنانچہ اسی آیت میں فرمایا: وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ وَ النُّجُوۡمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمۡرِہٖ ....۔

اہم نکات

۱۔ کائنات کی تخلیق پر چھ دنوں کے ذکر سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ ارتقا کا عمل تدریجی ہوتا ہے، یکبارگی نہیں ہوتا۔

۲۔ نظام کائنات کے تمام اختیارات کا ارتکاز اس جبروتی و ملکوتی قوت و سلطنت پر ہے جس کو اللہ نے عرش سے تعبیر کیا ہے۔

۳۔ تخلیق و تسخیر اور تدبیر سب کا تعلق ایک مرکز سے ہے جو تصور توحید پر قائم ہے۔

اُدۡعُوۡا رَبَّکُمۡ تَضَرُّعًا وَّ خُفۡیَۃً ؕ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ ﴿ۚ۵۵﴾ وَ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِہَا وَ ادۡعُوۡہُ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا ؕ اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۵۶﴾

۵۵۔ اپنے رب کی بارگاہ میں دعا کرو عاجزی اور خاموشی کے ساتھ، بے شک وہ تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

۵۶۔ اور تم زمین میں اصلاح کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ اور اللہ کو خوف اور امید کے ساتھ پکارو، اللہ کی رحمت یقیناً نیکی کرنے والوں کے قریب ہے۔

تفسیر آیات

یہاں انسان کے دو روابط کا ذکر ہے: ایک اس کا رابطہ اپنے رب سے اور دوسرا بندوں سے۔ رب کے ساتھ روابط عبودیت و بندگی کے ہونے چاہئیں۔ بندگی کے آداب یہ ہیں:

i۔ اُدۡعُوۡا رَبَّکُمۡ: جو کچھ مانگنا ہے اس کی بارگاہ سے مانگا جائے۔ اللہ کو یہ بات بہت پسند ہے کہ بندے اس سے مانگیں۔ اللہ سے مانگنا ہی عبادت کی روح ہے:

---

[1] محاسن التاویل ۷: ۱۴۷۔ التفسیر المنیر ڈاکٹر زحیلی ۷: ۲۳۶۔

کہدیجیے: اگر تمہاری دعائیں نہ ہوتیں تو میرا رب تمہاری پرواہ ہی نہ کرتا۔	قُلۡ مَا یَعۡبَؤُا بِکُمۡ رَبِّیۡ لَوۡلَا دُعَآؤُکُمۡ ...[1]

ii۔ تَضَرُّعًا وَّ خُفۡیَۃً: مانگنے کے مزید آداب یہ بتلائے ہیں کہ عاجزی کے ساتھ ہو اور نہایت دھیمی آواز میں ہو کیونکہ چیخ کر مانگنا ادب کے منافی ہے۔ اس ادا میں اس بات کا ادراک بھی مضمر ہے کہ وہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

iii۔ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ: بندگی کے جو آداب بیان ہوئے ہیں، ان کا لحاظ نہ رکھنا، آداب و حدود بندگی سے تجاوز شمار ہوتا ہے۔ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ: تجاوز کار کو اللہ دوست نہیں رکھتا۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ بندگی کے لیے ضروری ہے، وہ اپنے آپ کو اس مقام پر رکھے جس کو اللہ دوست رکھتا ہے۔

iv۔ وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ: اس جملے میں بندوں سے ربط و تعلقات کا ذکر ہے۔ بندگی صرف دعا و گریہ زاری اور محراب عبادت میں وقت گزارنے سے عبارت نہیں ہے۔ بندگی کے کچھ دیگر تقاضے ہوتے ہیں، جن کا تعلق بندوں سے ہے۔ ان دونوں کو یکساں اہمیت دینے کا نام بندگی ہے۔ جہاں دعائیں کرو، وہاں اصلاحی عمل میں پیش پیش رہو۔ بندوں سے ربط و تعلق کی نوعیت بھی اسی بندگی کے دائرے میں ہونی چاہیے کہ اللہ نے انسانوں کو جن فطری تقاضوں کے مطابق بنایا اور انہی فطری تقاضوں کے مطابق قانون بنایا ان کو سبوتاژ کر کے زمین پر فساد نہ پھیلاؤ۔

v۔ وَادۡعُوۡہُ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا: کسی کی طرف رجوع کرنے کے عام طور پر دو عوامل ہوتے ہیں: خوف اور امید۔ اللہ سے مانگنے اور اس کو پکارنے میں یہ دو عوامل کارفرما ہونے چاہئیں۔ یعنی خوف صرف اللہ کا ہو اور امیدیں بھی صرف اسی سے وابستہ ہوں۔

vi۔ اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ: اپنے روابط اللہ اور بندوں کے ساتھ درست رکھنے والے ہی محسنین (نیکی کرنے والے) ہوتے ہیں۔ رحمۃ اللّٰہ قریبۃ نہیں فرمایا۔ چونکہ رحمۃ مصدر ہے۔ اس میں دونوں صورتیں جائز ہیں۔ جیسے لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیۡبٌ ...[1] بندوں سے تعلق و ربط کی نوعیت بھی اسی بندگی کے دائرہ میں ہونی چاہیے کہ اللہ نے جن فطری تقاضوں کے مطابق انسانوں کو بنایا اور انہی فطری تقاضوں کے مطابق قانون بنایا۔ ان کو سبوتاژ کر کے زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔

اہم نکات

۱۔ رب کی بندگی سے آزاد ہو تو انسان مفسد و تجاوز کار بن جاتا ہے۔

---

[1] ۴۲ شوریٰ: ۱۷

۲۔ بندگی خود بینی و مایوسی سے نہیں، خوف و رجاء کے دائرے میں ہوتی ہے: خَوۡفًا وَّ طَمَعًا ...۔

وَ هُوَ الَّذِیۡ یُرۡسِلُ الرِّیٰحَ بُشۡرًۢا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتۡ سَحَابًا ثِقَالًا سُقۡنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنۡزَلۡنَا بِهِ الۡمَآءَ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ کَذٰلِکَ نُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰی لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ اور وہی تو ہے جو ہواؤں کو خوش خبری کے طور اپنی رحمت کے آگے آگے بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب وہ ابر گراں کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم انہیں کسی مردہ زمین کی طرف ہانک دیتے ہیں پھر بادل سے مینہ برسا کر اس سے ہر طرح کے پھل پیدا کرتے ہیں، اسی طرح ہم مُردوں کو بھی (زمین سے) نکالیں گے، شاید تم نصیحت حاصل کرو۔

تشریح کلمات

اَقَلَّتۡ: (ا ق ل) الاقال اٹھانا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ هُوَ الَّذِیۡ یُرۡسِلُ الرِّیٰحَ: ہوا کے بارے میں تفصیل ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ: ۱۶۴۔

۲۔ بُشۡرًۢا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِهٖ: ہوائیں خود رحمت الٰہی ہیں اور بہت سی دیگر رحمتوں کے لیے ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ اس آیت میں ہوا کو بارش کی خوشخبری قرار دیا ہے۔ یعنی بارش کے آگے چلنے والی ہوا میں انسان کے لیے ایک فرحت ہے۔

یہ بات تشنۂ تحقیق ہے کہ بارش سے پہلے چلنے والی ہوا ارضی حیات کے لیے کیا کیا نوید زندگی لے کر آتی ہے، جسے اللہ نے بُشۡرًا خوشخبری کہا ہے۔ البتہ یہ بات مسلم ہے کہ ہوا نہ ہوتی تو نہ سمندر کے بخارات بلندی کی طرف اٹھتے، نہ یہ بخارات سمندر سے خشکی کی طرف چلتے۔

۳۔ اَقَلَّتۡ سَحَابًا ثِقَالًا: جب ہوا اپنا پہلا کام کر لیتی ہے تو دوسرا کام یہ ہوتا ہے کہ بخارات بادل میں تبدیل ہونے کے بعد پانی سے لدے ہوئے وزنی بادلوں کو خشکی کی طرف چلائے۔

۴۔ سُقۡنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ: مردہ زمین کو ہم سیراب کرتے ہیں۔ جس زمین میں نباتاتی حیات نہیں ہے، اس کو مردہ زمین کہتے ہیں۔

۵۔ کَذٰلِکَ نُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰی: جیسا کہ ہم مردہ زمین سے نباتاتی حیات پیدا کرتے ہیں، اسی طرح ہم مُردوں کو زندگی دیتے ہیں۔

ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ الحادی نظریہ رکھنے والوں کے پاس حیات کی کوئی توجیہ نہیں ہے کہ مردہ زمین سے حیات کس طرح نکل آئی۔ جب کہ یہ بات طے ہے کہ حیات کا سرچشمہ، حیات ہی ہوتی ہے۔

الٰہیاتی مؤقف کے مطابق مردہ زمین اور بے جان مادے میں حیات کا پیدا ہونا اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ اللہ بے جان زمین کو زندگی عطا کرتا ہے اور جو پہلی بار ایسا کرسکتا ہے وہ دوبارہ بھی ایسا کرسکتا ہے:

اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۝ [1]

کیا ہم پہلی بار کی تخلیق سے عاجز آ گئے تھے؟ بلکہ یہ لوگ نئی تخلیق کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ حیات بعد الممات پر دلیل بھی ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ الَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّشْكُرُوْنَ ۝۵۸

۵۸۔ اور پاکیزہ زمین میں سبزہ اپنے رب کے حکم سے نکلتا ہے اور خراب زمین کی پیداوار بھی ناقص ہوتی ہے، یوں ہم شکر گزاروں کے لیے اپنی آیات کو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔

تشریح کلمات

نَكِدًا: (ن ك د) کسی چیز کی فراہمی میں آمادگی پیدا نہ کرنا۔

تفسیر آیات

زمین کی زرخیزی ہونے نہ ہونے کی وجہ سے بعض زمین پُرفیض یعنی سرسبز و شاداب ہوتی ہے اور بعض زمین روئیدگی کے قابل ہی نہیں ہوتی۔ جب کہ باراں و ہوا اور روشنی کا فیض ان پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔

۱۔ وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ: زرخیز زمین کی طرح نیک باطن انسان خدائی رحمت و ہدایت کو فوراً قبول کر لیتا ہے

۲۔ وَالَّذِیْ خَبُثَ: اور خبیث انسان شوریدہ زمین کی طرح نہ صرف یہ کہ رحمتوں کو قبول نہیں

[1] ۵۰ ق: ۱۵

کرتا بلکہ اندر کی خباثتوں کو ابھار کر پورے ماحول کو کانٹوں سے بھر دیتا ہے۔

۳۔ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ: ہم اپنی تعلیمات کو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں اور تمہارے سامنے روز مشاہدے میں آنے والی چیزوں کے ذریعے سمجھاتے ہیں کہ زمین کے مختلف علاقوں میں بارش ایک طرح سے برستی ہے لیکن بعض زرخیز زمین فیاض ہوتی ہے، شاداب ہو جاتی ہے اور بعض شورہ زار زمین میں پانی پڑنے سے اس کی شورہ زاری میں اضافہ ہو جاتا ہے اور مشکل سے کوئی پودا اُگتا ہے۔ انسان بھی اسی طرح ہیں۔ سب کے لیے اللہ نے ضمیر، وجدان، عقل، فرشتے اور انبیاء کے ذریعے ہدایت کا سامان فراہم کیا ہے۔ کچھ لوگ ان سے خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں اور ایمان کی طراوت سے ان کے ضمیر میں شادابی آ جاتی ہے اور کچھ کی شورہ زاری بڑھ جاتی ہے۔ یعنی کفر و سرکشی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا...[1]

اہم نکات

۱۔ اللہ کی رحمت سب کے لیے عام ہے۔ فرق انسان کی طینت میں ہے کہ وہ پاک ہے یا خبیث۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾

۵۹۔ ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا پس انہوں نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، مجھے تمہارے بارے میں ایک عظیم دن کے عذاب کا ڈر ہے۔

تفسیر آیات

انبیاء علیہم السلام میں قدیم ترین اور توحید کے سلسلے میں طویل ترین جہاد کرنے والے نبی حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے۔ آپؑ پہلے صاحب شریعت رسولؑ ہیں اور حضرت آدمؑ کے بعد دوسرے ابو البشر ہیں۔ آپ حضرت آدمؑ سے دسویں پشت میں آتے ہیں۔ آپؑ کا مسکن موجودہ عراق کے بالائی علاقے تھے۔ آپؑ نے ۹۵۰ سال تبلیغ فرمائی۔

آپؑ کی دعوت اللہ کی وحدانیت اور تصور آخرت میں خلاصہ ہو جاتی ہے اور توحید کی دعوت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت نوح (ع) کی قوم اللہ کی منکر نہ تھی بلکہ وہ مشرک قوم تھی۔ یہ لوگ دوسری ہستیوں کو بھی اللہ کے ساتھ شریک کرتے تھے۔

---

[1] ۱۷ بنی اسرائیل: ۸۲

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان فطرتاً خدا پرست تھا۔ انبیاء نے شرک جیسے انحراف کا مقابلہ کیا ہے۔

اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ: انبیاء اپنی اپنی امتوں پر نہایت مہربان ہوتے ہیں حتیٰ کہ امت کے سرکش لوگ خود اپنے بارے میں خوف نہیں کرتے۔ ان کے نبی ان پر رحم کھاتے ہیں۔ ان کے انجام بد کا خوف کرتے ہیں۔

قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِہٖۤ اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۶۰﴾

۶۰۔ ان کی قوم کے سرداروں نے کہا: ہم تو تمہیں صریح گمراہی میں مبتلا دیکھتے ہیں۔

قَالَ یٰقَوۡمِ لَیۡسَ بِیۡ ضَلٰلَۃٌ وَّ لٰکِنِّیۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ کہا: اے میری قوم! مجھ میں تو کوئی گمراہی نہیں بلکہ عالمین کے پروردگار کی طرف سے ایک رسول ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِہٖۤ: انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے ساتھ ہمیشہ اس قوم کا مراعات یافتہ طبقہ رکاوٹ بنتا رہا، کیونکہ الٰہی دعوت عدل و انصاف، برادری و برابری کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے، جس سے یہ مراعات یافتہ طبقہ متاثر ہوتا ہے اور محروم طبقہ مستفیض ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے انبیاء کی دعوت کو غریب طبقہ میں پذیرائی ملی اور طاغوتی طاقتوں نے اس کا مقابلہ کیا۔

۲۔ اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ: اپنے رسم و رواج اور عادات کو حق اور اس کے خلاف ہر بات کو گمراہ سمجھنا جہالت کی نمایاں علامت ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کا فرمان قابل توجہ ہے:

الناس اعداء ما جھلوا۔[1]　　لوگ اس چیز کے دشمن ہوتے ہیں جس کو وہ نہیں جانتے۔

۳۔ قَالَ یٰقَوۡمِ لَیۡسَ بِیۡ ضَلٰلَۃٌ: حضرت نوح علیہ السلام کا جواب یہ تھا کہ میں گمراہ نہیں ہوں۔ میں تو رب العالمین کا رسول ہوں۔ رب العالمین ہی حق اور حقیقت ہے۔ اس کے مقابلے میں آنے والے ضلالت پر ہیں۔

اُبَلِّغُکُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّیۡ وَ اَنۡصَحُ لَکُمۡ وَ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ میں اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچاتا ہوں اور تمہیں نصیحت کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

اَوَ عَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَکُمۡ ذِکۡرٌ

۶۳۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ خود تم میں سے ایک شخص کے پاس تمہارے رب کی طرف

---

[1] نہج البلاغۃ حکمت: ۱۷۲

مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَلٰی رَجُلٍ مِّنۡکُمۡ لِیُنۡذِرَکُمۡ وَ لِتَتَّقُوۡا وَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ﴿۶۳﴾	سے تمہارے لیے نصیحت آئی تاکہ وہ تمہیں تنبیہ کرے؟ اور تم تقویٰ اختیار کرو شاید تم اس طرح رحم کے مستحق بن جاؤ۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی رسالت کے اوصاف بیان فرما رہے ہیں۔ وہ تین باتوں سے عبارت ہے:

i۔ اُبَلِّغُکُمۡ : میں اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں۔

ii۔ وَاَنۡصَحُ لَکُمۡ : خود لوگوں کے مفاد کی باتیں بتانا نصیحت ہے۔ چنانچہ نصیحت کے خلوص سے معنی کیے گئے ہیں۔

iii۔ وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ : قوم نوح ابھی ابتدائی بشری زندگی میں تھی۔ ان کے ہاں تمدن و تعلم کا فقدان تھا۔ وہ نہایت سطحی ذہن کے لوگ تھے۔ ان کو عذاب، ثواب، قیامت، آخرت، آخروی زندگی وغیرہ کے بارے میں معلومات نہ تھیں۔ اس لیے فرمایا: میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

۲۔ اَوَعَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَکُمۡ : شروع ہی سے تمام انبیاء پر ایک اعتراض یہ وارد کرتے رہے کہ اللہ کی طرف سے کوئی پیغام لاتا ہے تو وہ ایسی ذات ہو جو مافوق الفطرت ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمارے درمیان میں پلا بڑھا ہو، وہی اللہ کی نمائندگی کے مقام پر فائز ہو۔

اس کا جواب قرآن نے مختلف مقامات پر مدلل انداز میں دیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ انعام: ۹

وَلَوۡ جَعَلۡنٰہُ مَلَکًا لَّجَعَلۡنٰہُ رَجُلًا وَّلَلَبَسۡنَا عَلَیۡہِمۡ مَّا یَلۡبِسُوۡنَ﴿۹﴾	اور اگر ہم اسے فرشتہ قرار دیتے بھی تو مردانہ (شکل میں) قرار دیتے اور ہم انہیں اسی شبہ میں مبتلا کرتے جس میں وہ اب مبتلا ہیں۔

انبیاء کے مبعوث کرنے کے یہاں چند ایک مقاصد بیان ہوئے ہیں:

i۔ لِیُنۡذِرَکُمۡ : تنبیہ کرنا۔ آنے والے خطرات سے تنبیہ کرنا۔

ii۔ وَلِتَتَّقُوۡا : لوگ ان خطرات سے محفوظ رہیں۔

iii۔ رحمت الٰہی ان کے شامل حال رہے۔

فَکَذَّبُوۡہُ فَاَنۡجَیۡنٰہُ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗ	۶۴۔ مگر ان لوگوں نے ان کی تکذیب کی تو ہم نے

فِی الۡفُلۡکِ وَ اَغۡرَقۡنَا الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَوۡمًا عَمِیۡنَ ﴿۶۴﴾

انہیں اور کشتی میں سوار ان کے ساتھیوں کو بچا لیا اور جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی انہیں غرق کر دیا کیونکہ وہ اندھے لوگ تھے۔

تفسیر آیات

حضرت نوح (ع) کی قوم دجلہ و فرات کے کنارے آباد تھی اور طوفان صرف عراق کی سرزمین میں آیا تھا؟ چند ایک قرائن کے علاوہ اس کا کوئی شافی جواب موجود نہیں ہے۔ تمام اقوام عالم میں حضرت نوح (ع) کے قصے سے مشابہ روایات قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہیں۔ ہم طوفان نوح کے بارے میں تفصیلی تحقیق سورۂ ہود میں بیان کریں گے۔

اہم نکات

۱۔ اصلاحی و الٰہی تحریکوں کے سامنے رعایت یافتہ طبقہ ہی رکاوٹ بنتا ہے: قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِہٖۤ . ۔

۲۔ خواہش پرستی اور گروہ بندی کے طوفان سے وہی لوگ نجات حاصل کر سکتے ہیں جو الٰہی نمائندوں کی کشتی پر سوار ہوں: وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗ فِی الۡفُلۡکِ ....۔

وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاہُمۡ ہُوۡدًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ اور قوم عاد کی طرف ہم نے انہی کی برادری کے (ایک فرد) ہود کو بھیجا، انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، کیا تم (ہلاکت سے) بچنا نہیں چاہتے؟

تشریح کلمات

اخ: (ا خ و) بھائی۔ ہر وہ شخص جو کسی دوسرے شخص کی ولادت میں ماں یا باپ دونوں یا ان میں سے ایک کی طرف سے یا رضاعت میں شریک ہو، اس کا اخ کہلاتا ہے لیکن بطور استعارہ اس کا استعمال عام ہے اور ہر اس شخص کو، جو قبیلہ، دین و مذہب، صنعت و حرفت، دوستی یا کسی دیگر معاملے میں دوسرے کا شریک ہو، اخ کہا جاتا ہے۔ (راغب)

اس آیت میں حضرت ہودؑ کو قوم عاد کا بھائی، ہم قبیلہ ہونے کی وجہ سے کہا ہے۔ چنانچہ دوسرے انبیاء کے لیے مِنۡہُمۡ (انہی کا ایک فرد) کا لفظ استعمال فرماتا ہے۔

تفسیر آیات

حضرت ھود بن عابر بن شالح بن ارفخشد بن سام بن نوح۔ سامی نسل کے سب سے قدیم ترین نبی ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ آپؑ عربی تھے۔ جب کہ عربی، یعرب بن قحطان بن ھود سے شروع ہوتے ہیں، البتہ عربوں کے سلسلۂ نسب میں ضرور آتے ہیں۔

قوم عاد: اگرچہ عرب کا سلسلہ تو یعرب بن قحطان سے شروع ہوتا ہے اور عاد، یعرب سے پانچ پشت پہلے کا ہے۔ یعرب بن قحطان بن ھود بن عبد اللّٰہ بن ریاح بن جلود بن عاد۔ تاہم سلسلۂ نسب کے اعتبار سے قوم عاد کو قدیم ترین عرب قوم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن کے مطابق اس قوم کا مسکن الاحقاف کی سرزمین تھی ۔ احقاف کا علاقہ شرقاً غرباً عمان سے یمن تک اور شمالاً جنوباً نجد سے حضرموت تک پھیلا ہوا تھا۔

یہ قوم اپنے زمانے کی تمدن یافتہ تھی:

اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۙ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُھَا فِی الْبِلَادِ ....[1] — ستونوں والے ارم کے ساتھ، جس کی نظیر کسی ملک میں نہیں بنائی گئی۔

دوسری جگہ قرآن میں آیا ہے:

فَاَصْبَحُوْا لَا یُرٰۤی اِلَّا مَسٰکِنُھُمْ ....[2] — پھر وہ ایسے ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا....۔

ان علاقوں میں حضرت ہودؑ کے ذکر پر مشتمل کتبے بھی ملے ہیں۔ اخیراً عمان کے جنوب میں ایک مقام پر کھدائی سے آبار نامی شہر کے آثار دریافت ہوئے ہیں، جو غالباً حضرت ہودؑ کی قوم عاد سے مربوط ہیں۔ قوم عاد کے بارے میں سورہ ہائے ہود، احقاف اور فجر میں مزید ذکر آئے گا۔

قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ: تمام انبیاء کی دعوت کی اساس، ایک معبود کی پرستش، ایک مالک کی بندگی، ایک رب کو پکارنے پر استوار ہے۔

مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ: اس ایک حقیقی معبود کے سوا کسی اور معبود کا وجود نہیں ہے۔ جس معبود کو تم پوجتے ہو، وہ خود تمہارا خود ساختہ ہے۔ خیال و سراب ہے۔

اَفَلَا تَتَّقُوْنَ: کیا تم اپنا بچاؤ کرنا نہیں چاہتے۔ خداوند کریم اور انبیاء کو انسانوں کو بچانے کے علاوہ کسی سے کوئی اور غرض نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ صرف اللہ کی عبادت کرو ۔ یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا نعرہ ہے: یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ ....

---

[1] ۸۹ فجر: ۷۔۸ [2] ۴۶ احقاف: ۲۵

قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِہٖۤ اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیۡ سَفَاہَۃٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ ان کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا: ہمیں تو تم احمق لگتے ہو اور ہمارا گمان ہے کہ تم جھوٹے بھی ہو۔

قَالَ یٰقَوۡمِ لَیۡسَ بِیۡ سَفَاہَۃٌ وَّ لٰکِنِّیۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ انہوں نے کہا: اے میری قوم! میں احمق نہیں ہوں بلکہ میں تو رب العالمین کا رسول ہوں۔

اُبَلِّغُکُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّیۡ وَ اَنَا لَکُمۡ نَاصِحٌ اَمِیۡنٌ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں (اور) میں تمہارا ناصح اور امین ہوں۔

تفسیر آیات

اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیۡ سَفَاہَۃٍ: قدیم و جدید جاہلیت، ناخواندہ اور تہذیب یافتہ، دوسرے لفظوں میں غیر منظم اور تنظیم یافتہ جاہلیت ایک ہی مؤقف، ایک ہی نعرہ اور ایک ہی سوچ رکھتی ہے۔ قدیم جاہلیت اپنے پیغمبروں کو گمراہ، احمق، دیوانہ اور جادوگر کے الفاظ سے یاد کرتی تھی۔ آج کی منظم جاہلیت انبیاء (ع) کے نقش قدم پر چلنے والوں کو رجعت پسند، جمود پرست اور بنیاد پرست کے لفظوں سے یاد کرتی ہے: تَشَابَہَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ...[1] دل را بدل رہیست۔

اِنَّا لَنَظُنُّکَ مِنَ الۡکٰذِبِیۡنَ: یہاں ظن علم و یقین کے معنوں میں ہے۔ قوم عاد کا اپنے رسول سے سلوک بتاتا ہے کہ وہ یقین رکھتے تھے کہ آپؑ کاذب ہیں۔ اس پر اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیۡ سَفَاہَۃٍ بھی قرینہ ہے۔ البتہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے: فِیۡ سَفَاہَۃٍ۔ ظن بمعنی گمان کے لیے قرینہ بن سکتا ہے۔

جواب میں حضرت ہودؑ نے اپنا تعارف اس طرح کرایا کہ میں عالمین کے پروردگار کی طرف سے پیغام لے کر آیا ہوں۔ میرا کام تبلیغ احکام اور تمہیں نصیحت اور حق کی راہ کی طرف تمہاری ہدایت کرنا ہے۔ ان سب ذمے داریوں کو نبھانے کے لیے میں امین ہوں۔

اہم نکات

۱۔ سطحی اور مادی سوچ رکھنے والے، دینداروں کو بے وقوف سمجھتے ہیں: اِنَّا لَنَرٰىکَ فِیۡ سَفَاہَۃٍ... یہ ایسا ہے کہ ہمیشہ کی صحت کے لیے معالجے کی وقتی تکلیف اٹھانے کو کوئی حماقت سمجھے۔

۲۔ رہبر و قائد وہ ہوتا ہے جو دوسروں کو نصیحت کرنے کی پوزیشن میں ہو اور امین ہو۔ نَاصِحٌ اَمِیۡنٌ۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۱۱۸

اَوَ عَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَکُمۡ ذِکۡرٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ عَلٰی رَجُلٍ مِّنۡکُمۡ لِیُنۡذِرَکُمۡ ؕ وَ اذۡکُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَکُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ زَادَکُمۡ فِی الۡخَلۡقِ بَصۜۡطَۃً ۚ فَاذۡکُرُوۡۤا اٰلَآءَ اللّٰہِ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۶۹﴾

۶۹۔ کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا کہ خود تم میں سے ایک شخص کے پاس تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے نصیحت آئی تا کہ وہ تمہیں تنبیہ کرے؟ اور یاد کرو جب قوم نوح کے بعد اس نے تمہیں جانشین بنایا اور تمہاری جسمانی ساخت میں وسعت دی (تنومند کیا) پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو، شاید تم فلاح پاؤ۔

تفسیر آیات

۱۔ اَوَ عَجِبۡتُمۡ: اس جملے کے ذیل میں تشریح آیت ۶۳ ہو چکی ہے۔

۲۔ اِذۡ جَعَلَکُمۡ خُلَفَآءَ: حضرت نوح (ع) کے بعد کرۂ ارض پر آباد ہونے کے اعتبار سے جانشین کہا گیا ہے، ورنہ حضرت نوح (ع) عراق میں آباد اور حضرت ہودؑ کی قوم جنوب عرب میں آباد تھی۔

۳۔ وَّ زَادَکُمۡ فِی الۡخَلۡقِ بَصۜۡطَۃً: تم کو جسمانی ساخت میں تنومند کیا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قوم عاد ایک تمدن یافتہ قوم تھی۔ اقتصادی اعتبار سے خوشحال تھے اور نژادی اعتبار سے اچھی جسامت کے لوگ تھے۔

اس جگہ اسرائیلیات پر مشتمل خرافاتی روایات بہت زیادہ ہیں۔ بدقسمتی سے ہماری بعض تفاسیر میں بھی ان چیزوں کو جگہ مل گئی ہے۔

۴۔ فَاذۡکُرُوۡۤا اٰلَآءَ اللّٰہِ: اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھنے کا مطلب یہ ہے: ناشکری نہ کرو، ان نعمتوں کی قدر دانی کرو۔ شکر و قدر یہ ہے کہ اس کی اطاعت کرو جس نے یہ نعمتیں عنایت کی ہیں۔ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ کامیابی کا واحد راستہ یہی ہے۔

اہم نکات

۱۔ جسمانی ہیکل اور قد و قامت میں تنومند ہونا اللہ کی نعمت ہے۔

قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِنَعۡبُدَ اللّٰہَ وَحۡدَہٗ وَ نَذَرَ مَا کَانَ یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاۡتِنَا

۷۰۔ انہوں نے کہا: کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم خدائے واحد کی عبادت کریں اور جن کی ہمارے باپ دادا پرستش کرتے تھے انہیں

بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ﴿۷۰﴾

چھوڑ دیں؟ پس اگر تم سچے ہو تو ہمارے لیے وہ (عذاب) لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو.

تفسیر آیات

اس آیت اور دیگر متعدد آیات و تاریخی اور دیگر شواہد سے یہ بات ثابت ہے کہ تمام قدیم قومیں خدا پرست تھیں۔ انبیاء (ع) لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ یعنی اصل دین لوگوں میں فطرتاً موجود تھا۔ انبیاء انحرافات کے خلاف جہاد کرتے رہے۔

اس سے یہ فرض باطل ثابت ہوتا ہے کہ دین خوف، جہالت اور اقتصادی عوامل وغیرہ کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔

اَجِئۡتَنَا لِنَعۡبُدَ اللّٰہَ وَحۡدَہٗ: ایک معبود کی پرستش، ان کی ثقافت میں نا معروف اصطلاح اور ان کی لغت میں اجنبی لفظ تھا۔ پھر اپنے مسلمہ مذہب کو ترک کرنے کی دعوت، انہیں خاصی عجیب دعوت لگتی تھی۔

فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ: وہ عذاب لے آ جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے۔ ایک استہزاء اور انتہائی حقارت کا اظہار ہے کہ جو کچھ کر سکتے ہو کر لو۔

اہم نکات

۱۔ آباء و اجداد کی اندھی تقلید شرک و عصیان کا باعث ہے۔

قَالَ قَدۡ وَقَعَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ رِجۡسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوۡنَنِیۡ فِیۡۤ اَسۡمَآءٍ سَمَّیۡتُمُوۡہَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ مَّا نَزَّلَ اللّٰہُ بِہَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ فَانۡتَظِرُوۡۤا اِنِّیۡ مَعَکُمۡ مِّنَ الۡمُنۡتَظِرِیۡنَ﴿۷۱﴾

۷۱۔ ہود نے کہا: تمہارے رب کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب مقرر ہو چکا ہے، کیا تم مجھ سے ایسے ناموں کے بارے میں جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں؟ اللہ نے تو اس بارے میں کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے، پس تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

تفسیر آیات

۱۔ قَدۡ وَقَعَ عَلَیۡکُمۡ: جس عذاب کو آنا تھا وہ آنے ہی والا ہے۔ اس عذاب کے ساتھ غضب الٰہی بھی ہوگا۔

۲۔ اَتُجَادِلُوۡنَنِیۡ فِیۡۤ اَسۡمَآءٍ: وہ اپنے خود ساختہ ناموں کو حقیقت کا روپ دیکر جھگڑتے تھے۔ یعنی جن بتوں کو ان لوگوں نے معبود کا نام دے رکھا تھا، وہ اسم بے مسمّیٰ ہیں۔ دریا کا معبود، خشکی کا معبود، رزق کا معبود وغیرہ وغیرہ۔ الفاظ بے معنی ہیں۔ مثلاً بارش کا معبود، جنگ کا معبود۔

۳۔ مَّا نَزَّلَ اللّٰہُ بِہَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ: دنیا میں مختلف قوموں نے جن جن کو خدائی مقام دیا ہے اور اپنے وہم و گمان کی بنا پر ان کو خدائی کا کچھ حصہ دیا اور ان کے لیے ایک نام تجویز کیا، جو اللہ کے ساتھ شریک اور خدائی اختیارات میں حصہ دار ہونے کا عندیہ دیتا ہے، اس کی ان کے پاس کوئی دلیل و سند موجود بھی نہیں ہوتی۔ صرف باپ دادا کی اندھی تقلید ہی کو سند کا درجہ دیتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ غیر خدا کی طرف رجوع کرنے والوں کے پاس چند خود ساختہ اصطلاحات کے سوا کچھ نہیں ہوتا: سَمَّیۡتُمُوۡہَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ ...۔

فَاَنۡجَیۡنٰہُ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗ بِرَحۡمَۃٍ مِّنَّا وَ قَطَعۡنَا دَابِرَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ مَا کَانُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ہم نے اپنی رحمت کے ذریعے ہود اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا اور جو ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے ان کی جڑ کاٹ دی (کیونکہ) وہ تو ایمان لانے والے ہی نہ تھے۔

تفسیر آیات

فَاَنۡجَیۡنٰہُ: قوم عاد کا وہ حصہ جو عذاب الٰہی سے نابود ہو گیا، اس کو عاد اولیٰ کہتے ہیں اور حضرت ہودؑ کے ساتھ جو حصہ باقی رہا اس کو عاد ثانیہ کہتے ہیں۔

قوم عاد کو طوفانی آندھی سے تباہ کر دیا گیا اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ تاریخی شواہد اور آثار قدیمہ کے انکشافات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ عاد اولیٰ بالکل تباہ ہو گئی تھی اور ان کے بعد عاد ثانیہ آباد رہی اور شریعت ہودؑ کے مطابق حکمران، حکومت اور فیصلے کرتے تھے اور اقتصادی اعتبار سے بھی خوشحال لوگ تھے۔

اہم نکات

۱۔ خاتم الرسلؐ کے بعد جہاں بلا واسطہ حجت خدا پوری کرنے کے لیے نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے، اس قسم کے عذاب الٰہی کا سلسلہ بھی بند ہے۔

وَ اِلٰی ثَمُوۡدَ اَخَاہُمۡ صٰلِحًا ۘ

۷۳۔اور قوم ثمود کی طرف ہم نے انہی کی برادری

قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ بَیِّنَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ ھٰذِہٖ نَاقَۃُ اللّٰہِ لَکُمۡ اٰیَۃً فَذَرُوۡھَا تَاۡکُلۡ فِیۡۤ اَرۡضِ اللّٰہِ وَ لَا تَمَسُّوۡھَا بِسُوۡٓءٍ فَیَاۡخُذَکُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۷۳﴾

کے (ایک فرد) صالح کو بھیجا، انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس واضح دلیل آ چکی ہے، یہ اللہ کی اونٹنی ہے جو تمہارے لیے ایک نشانی ہے، اسے اللہ کی زمین میں چرنے دینا اور اسے برے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ دردناک عذاب تمہیں آ لے گا۔

تفسیر آیات

ثمود۔ ان کا بزرگ ثمود کی طرف منسوب ہے۔

ثمود بن جیشر بن ارم بن سام بن نوح۔ قوم ثمود عرب کے مغربی و شمالی علاقوں میں آباد تھی اور ان کے دار الحکومت کا نام الحجر تھا۔ چنانچہ سورۂ حجر میں فرمایا:

وَ لَقَدۡ کَذَّبَ اَصۡحٰبُ الۡحِجۡرِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ۙ[1] اور بتحقیق حجر کے باشندوں نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔

الحجر کا موجودہ نام مدائن صالح ہے جو حجاز سے شام کو جانے والے قدیم راستے پر واقع ہے۔

حضرت صالح (ع) کے شجرہ نسب کے بارے میں کہتے ہیں: صالح بن آسف بن کاشح بن اردم بن ثمود بن جیشر بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام۔

قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ: حضرت صالح (ع) کی دعوت ایک معبود کی بندگی کرنے اور غیر اللہ کی بندگی نہ کرنے سے عبارت ہے جو تمام انبیاء کی دعوت ہے۔

قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ بَیِّنَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ: تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل اور معجزہ آ چکا ہے۔ اگلے جملے میں اس کی وضاحت ہے کہ یہ واضح معجزہ، ناقہ ہے۔

ھٰذِہٖ نَاقَۃُ اللّٰہِ۔ **ناقۂ صالح**: بعض حضرات کا خیال ہے کہ ناقۂ صالح ایک معمول کی اونٹنی تھی، کوئی معجزانہ طریقہ سے وجود میں نہیں آئی تھی۔ صرف یہ کہ اس اونٹنی کو امان کی علامت قرار دیا تھا کہ جب بھی کوئی اس اونٹنی کو گزند پہنچائے گا، عذاب الٰہی نازل ہوگا۔ تعجب کی بات ہے کہ اس اونٹنی میں اگر کوئی حجت کوئی معجزہ نہ ہو تو اسے گزند پہنچانے سے عذاب کیوں آئے؟

---

[1] ۱۵ حجر: ۸۰

متعدد قرآنی آیات سے یہ بات واضح ہے کہ ناقۂ صالح ایک معجزہ اور ایک حجت کے طور پر وجود میں آئی تھی۔ چنانچہ فرمایا:

مَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ۚۖ فَاۡتِ بِاٰیَۃٍ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ۝ قَالَ ہٰذِہٖ نَاقَۃٌ لَّہَا شِرۡبٌ وَّ لَکُمۡ شِرۡبُ یَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ ۝ [1]

اور تم ہم جیسے بشر کے سوا اور کچھ نہیں ہو، پس اگر تم سچے ہو تو کوئی نشانی (معجزہ) پیش کرو۔ صالح نے کہا: یہ ایک اونٹنی ہے، ایک مقررہ دن اس کے پانی پینے کی باری ہو گی اور ایک مقررہ دن تمہارے پانی پینے کی باری ہو گی۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ ناقہ، معجزہ کے مطالبے کے جواب میں پیش کی گئی۔

وَ اٰتَیۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَۃَ مُبۡصِرَۃً فَظَلَمُوۡا بِہَا ؕ وَ مَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰیٰتِ اِلَّا تَخۡوِیۡفًا ۝ [2]

اور ثمود کو ہم نے اونٹنی کی کھلی نشانی دی تو انہوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا اور ہم ڈرانے کے لیے ہی نشانیاں بھیجتے ہیں۔

سورہ قمر میں فرمایا:

اِنَّا مُرۡسِلُوا النَّاقَۃِ فِتۡنَۃً لَّہُمۡ ... [3]

بے شک ہم اونٹنی کو ان کے لیے آزمائش بنا کر بھیجنے والے ہیں۔

اس آیت میں لفظ مرسل (بھیجنے والے ہیں) سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ناقہ معجزانہ طور پر وجود میں آئی تھی۔

فَذَرُوۡہَا تَاۡکُلۡ: اس کو چرنے دو اور ہاتھ نہ لگاؤ۔ اگر تم نے اس کو بری نیت سے ہاتھ لگایا تو تم پر عذاب آ جائے گا۔ چنانچہ اس قوم نے ناقہ صالح کی کونچیں کاٹ ڈالیں، اسے قتل کیا، فوراً ان پر عذاب نازل ہو گیا۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو اپنے دعوائے نبوت کے اثبات کے لیے ضروری معجزہ پہلے ہی فراہم فرماتا ہے۔ اس معجزے کے انکار پر عذاب نہیں آتا۔ اس کے بعد مزید معجزے کا مطالبہ منظور نہیں ہوتا اگر منظور ہو گیا اور اس کا انکار ہو گیا فوری عذاب آ جاتا ہے۔

قوم صالح نے ناقہ کے معجزے کا مطالبہ کیا یہ معجزہ دکھایا گیا انکار پر عذاب نازل ہوا۔

وَ اذۡکُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَکُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ

۷۴۔ اور یاد کرو جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں جانشین بنایا اور تمہیں زمین میں آباد کیا،

---

[1] ۲۶ شعراء: ۱۵۴۔۱۵۵　[2] ۱۷ اسراء: ۵۹　[3] ۵۴ قمر: ۲۷

تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡ سُہُوۡلِہَا قُصُوۡرًا وَّ تَنۡحِتُوۡنَ الۡجِبَالَ بُیُوۡتًا ۚ فَاذۡکُرُوۡۤا اٰلَآءَ اللّٰہِ وَ لَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ﴿۷۴﴾

تم میدانوں میں محلات تعمیر کرتے ہو اور پہاڑ کو تراش کر مکانات بناتے ہو، پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو۔

تفسیر آیات

۱۔ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ عَادٍ: قوم ثمود کو تمدن و آبادکاری میں قوم عاد کا جانشین بنایا۔

۲۔ وَّ بَوَّاَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ: قوم ثمود اپنے زمانے کی متمدن ترین قوم تھی۔ صنعت میں بھی حیرت انگیز حد تک ترقی حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ قرآن کی اس آیت کے مطابق وہ میدانوں میں قصور و محلات تعمیر کرتے تھے اور پہاڑوں کو تراش کر ان کے اندر عالی شان محلات بناتے تھے۔ چنانچہ مدائن صالح میں اب تک ان عمارتوں کے آثار نمایاں طور پر موجود ہیں۔ ان کو دیکھ کر اس قوم کی صنعتی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں وہ سردیوں میں پہاڑوں کے اندر تراشے ہوئے گھروں میں رہتے تھے اور گرمیوں میں میدانوں میں موجود قصور میں۔ بعض روایات کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوہ تبوک جاتے ہوئے ادھر سے گزرے تو آپؐ نے اس کنویں کی نشاندہی کی جس سے ناقہ صالح پانی پیتی تھی اور فج الناقہ نامی وہ درہ بھی دکھایا کہ بعض روایت کے مطابق یہاں سے اونٹنی نکلی تھی۔

ابو الحسن اشعری کا کہنا ہے: میں ثمود کی سرزمین سے گزرا تو اونٹنی کا سینہ ناپا تو ساٹھ ہاتھ تھا۔ تفسیر ابو حیان ۵: ۹۳ صحیح و غیر صحیح بگردن راوی۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی فرمانبرداری کے ساتھ حسب ضرورت قصور و محلات بنانا جائز ہے: تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡ سُہُوۡلِہَا قُصُوۡرًا ...۔

قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِہٖ لِلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِمَنۡ اٰمَنَ مِنۡہُمۡ اَتَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرۡسَلٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلَ بِہٖ مُؤۡمِنُوۡنَ﴿۷۵﴾

۷۵۔ ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے کمزور طبقہ اہل ایمان سے کہا: کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ صالح اپنے رب کی طرف سے بھیجے گئے (رسول) ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: جس پیغام کے ساتھ انہیں بھیجا گیا ہے اس پر ہم ایمان لاتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا: پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ انبیاء کی دعوت کے سامنے مراعات یافتہ خوشحال طبقہ ہی رکاوٹ بنتا ہے کیونکہ عدل و انصاف سے یہی طبقہ متاثر ہوتا ہے۔ محروم طبقہ ہمیشہ عدل و انصاف چاہتا ہے نیز مراعات یافتہ طبقے میں غرور و سرکشی آ جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

کَلَّاۤ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَیَطۡغٰۤی ۙ﴿۶﴾ اَنۡ رَّاٰہُ اسۡتَغۡنٰی ؕ﴿۷﴾ [1] — ہرگز نہیں! انسان تو یقیناً سرکشی کرتا ہے، اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز خیال کرتا ہے۔

قوم ثمود کے مراعات یافتہ طبقہ (مستکبرین) نے اپنی رعونت کے ساتھ ایمان والے محروم طبقہ مستضعفین سے کہا: اَتَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرۡسَلٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ ... کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ صالح اپنے رب کی طرف سے بھیجے گئے ہیں؟ یہ سوال انکاری ہو سکتا ہے کہ یعنی تمہیں کہاں سے معلوم ہوا کہ یہ پیغمبر ہیں؟ اور استہزا بھی ہو سکتا ہے: تم کو علم ہو جاتا ہے، ہمیں نہیں ہوتا۔ اہل ایمان پوری استقامت کے ساتھ ان کے سامنے یہ کہہ کر ڈٹ گئے: قَالُوۡۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلَ بِہٖ مُؤۡمِنُوۡنَ۔ ہم ان کے ہر پیغام پر ایمان لاتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ صالح (ع) رسول برحق ہیں۔ یقین بلاوجہ حاصل نہیں ہوتا، قطعی دلیل کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ ہم نے وہ قطعی دلائل دیکھے ہیں جن کے بعد ہم کو یقین حاصل ہوا اور ہم مومن ہو گئے۔

اہم نکات

۱۔ محروم طبقہ ہی ہمیشہ حق کے ساتھ رہا ہے: لِلَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا ....۔

قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا اِنَّا بِالَّذِیۡۤ اٰمَنۡتُمۡ بِہٖ کٰفِرُوۡنَ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ متکبرین نے کہا: جس پر تمہارا ایمان ہے ہم تو اس سے منکر ہیں۔

فَعَقَرُوا النَّاقَۃَ وَ عَتَوۡا عَنۡ اَمۡرِ رَبِّہِمۡ وَ قَالُوۡا یٰصٰلِحُ ائۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۷۷﴾

۷۷۔ آخر انہوں نے اونٹنی کے پاؤں کاٹ دیے اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے: اے صالح! اگر تم واقعی پیغمبر ہو تو ہمارے لیے وہ (عذاب) لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو.

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا: مؤمنین کے ایمان کو زیر سوال لانے اور ان کا استہزا کرنے کے بعد

---

[1] ۹۶ علق: ۶۔ ۷

اپنے متکبرانہ انداز میں کہتے ہیں: جس بات پر تمہارا ایمان ہے اس کو ہم نہیں مانتے۔

۲۔ فَعَقَرُوا النَّاقَۃَ: آخر انہوں نے اونٹنی کے پاؤں کاٹ دیے۔ جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزہ اور دلیل و حجت کے طور پر پیش ہوئی تھی اس کے ساتھ یہ سلوک ایک انتہائی جسارت تھی اور یہ جسارت اگرچہ ایک شخص کے ہاتھ سے عمل میں آئی تاہم اس اقدام کے لیے سب کی منظوری لے لی گئی۔ لہٰذا سب اس جرم میں شریک ہیں۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

فَنَادَوۡا صَاحِبَہُمۡ فَتَعَاطٰی فَعَقَرَ ﴿﴾[1]　　پھر انہوں نے اپنے ساتھی کو بلایا اور اسے (ہتھیار) تھمایا پس اس نے (اونٹنی کی) کونچیں کاٹ دیں۔

اس سے واضح ہو گیا کہ یزید کی طرح کوئی جرم کوئی ایک شخص انجام دیتا ہے مگر اس پر راضی ہونے والے سب اس میں شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ حدیث نبوی ہے:

مَنْ أَحَبَّ قَوْماً حُشِرَ مَعَهُمْ وَ مَنْ أَحَبَّ عَمَلَ قَوْماً أُشْرِكَ فِي عَمَلِهِمْ.[2]　　جو کسی قوم سے محبت کرے وہ اس کے ساتھ محشور ہو گا اور اگر کوئی کسی قوم کے عمل کو پسند کرے تو وہ بھی اس میں شریک ہے۔

نیز حدیث نبوی ہے:

شِرَارُ النَّاسِ مَنْ بَاعَ آخِرَتَهُ بِدُنْيَاهُ وَ شَرٌّ مِنْ ذَلِكَ مَنْ بَاعَ آخِرَتَهُ بِدُنْيَا غَيْرِهِ.[3]　　لوگوں میں سب سے بدتر شخص وہ ہے جو اپنی آخرت کو دنیا کے بدلے میں بیچ ڈالے۔ اس سے بدتر وہ شخص ہے جو کسی دوسرے کی دنیا کے لیے اپنی آخرت کو بیچ ڈالتا ہے۔

۱۔ وَقَالُوۡا یٰصٰلِحُ ائۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ: تکبر و نخوت کا اندازہ اس طرز کلام سے بھی ہوتا ہے کہ نہایت تحقیر اور استہزاء کے لہجے میں کہ رہے ہیں کہ ہم نے ناقہ کو ہلاک کر دیا۔ اب دیکھتے ہیں تم کیا کر سکتے ہو۔

فَاَخَذَتۡہُمُ الرَّجۡفَۃُ فَاَصۡبَحُوۡا فِیۡ دَارِہِمۡ جٰثِمِیۡنَ ﴿۷۸﴾　　۷۸۔ چنانچہ انہیں زلزلے نے گرفت میں لے لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

فَتَوَلّٰی عَنۡہُمۡ وَ قَالَ یٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُکُمۡ رِسَالَۃَ رَبِّیۡ وَ نَصَحۡتُ لَکُمۡ وَ لٰکِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِیۡنَ ﴿۷۹﴾　　۷۹۔ پس صالح اس بستی سے نکل پڑے اور کہا: اے میری قوم! میں نے تو اپنے رب کا پیغام تمہیں پہنچا دیا اور تمہاری خیرخواہی کی لیکن تم خیرخواہوں کو پسند نہیں کرتے۔

---

[1] ۵۴ قمر:۲۹

[2] مستدرك الوسائل ۱۲: ۱۰۸ باب تحريم الرضا بالظلم

[3] مستدرك الوسائل ۱۲: ۵ باب تحريم اختتال الدنيا بالدين

تفسیر آیات

پہلے بھی ہم نے ذکر کیا ہے:

i۔ اگر لوگ اپنے نبی سے مطالبہ کردہ معجزے کو نہ مانیں تو فوری عذاب آتا ہے۔ قوم صالح نے نبی سے جس معجزے کا مطالبہ کیا تھا، اس کو نہ صرف یہ کہ مانا نہیں بلکہ اسے قتل کر دیا تو عذاب کا فوری طور پر آنا سنت الٰہی ہے۔

ii۔ براہ راست تبلیغ کے لیے نبوت کا سلسلہ بند ہونے کی وجہ سے جرائم پر عذاب الٰہی کی فوری آمد کا سلسلہ بھی بند ہے۔

iii۔ فَتَوَلّٰی عَنۡہُمۡ : تباہی کے بعد حضرت صالح (ع) نے اپنی تبلیغ و نصیحت کے ذکر کے ساتھ ناصحوں کے ساتھ جاہلوں کے سلوک کا ذکر فرمایا۔

اہم نکات

۱۔ ناقہ صالح جانور ہونے کے باوجود حجت خدا اور اللہ کا معجزہ ہونے کی وجہ سے اہل زمین کے لیے امان کی علامت تھی۔

۲۔ پوری انسانی تاریخ کا یہ المیہ رہا ہے کہ لوگ ہادیان برحق اور انسانیت کے خیرخواہوں کی معرفت نہیں رکھتے تھے: وَلٰکِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِیۡنَ ۔

۳۔ حضرت صالح (ع) کا اپنی ہلاک شدہ امت سے خطاب، اس بات پر دلیل ہے کہ مُردے سن لیتے ہیں: یٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُکُمۡ ....

وَ لُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مَا سَبَقَکُمۡ بِہَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۸۰﴾

۸۰۔ اور لوط (کا ذکر کرو) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ایسی بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو کہ تم سے پہلے دنیا میں کسی نے اس کا ارتکاب نہیں کیا۔

اِنَّکُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَہۡوَۃً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ ﴿۸۱﴾

۸۱۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو بلکہ تم تو تجاوزکار ہو۔

تفسیر آیات

حضرت لوط بن حاران بن تارخ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حقیقی بھتیجے۔ آپؑ عراق کی سرزمین

کلدانیوں کی بستی'' اور'' میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے چچا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مابین النہرین تشریف لے گئے۔ وہاں سے جزیرہ قورا چلے گئے، جسے آج کل جزیرۂ ابن عمر کہتے ہیں، جو نہر دجلہ کے کنارے پر واقع ہے۔ وہاں آشوریوں کی حکومت قائم تھی۔ وہاں سے کنعان کی سرزمین کی طرف چلے گئے۔ حضرت ابراہیمؑ کے حکم پر آپؑ نے شرق اردن کے سرسبز و شاداب علاقے کو اپنی تبلیغ کا مرکز بنایا۔ حضرت لوطؑ کی اس قوم کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں تھی، اس لیے لوطؑ کو ان کی برادری کا نہیں فرمایا۔

توریت میں ان کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے، البتہ یہودی مزاج بہتان تراشیوں کے ساتھ۔

قوم لوط: یہ قوم عراق و فلسطین کے درمیان مشرق اردن میں بستی تھی۔ ان کے دارالحکومت کا نام سدوم تھا جو بحیرۂ مردار، جسے بحر لوط بھی کہتے ہیں، کے کنارے آباد تھا۔ اس بحیرہ کے گرد کئی ایک بستیاں آباد تھیں۔ تاریخ میں ان بستیوں کا نام بھی آتا ہے لیکن آج ان بستیوں کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ بعض مورخین یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ممکن ہے یہ بستیاں بحیرہ مردار میں غرق ہو گئی ہوں۔

مَا سَبَقَكُمْ: اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ قوم لوط نے ہی ہم جنس بازی کے عمل بد کی ابتدا کی، اس کو رواج دیا اور دنیا میں اس غیر فطری فحش کاری کو متعارف کرایا۔ لہٰذا یہ قوم اس عمل بد کے ارتکاب کے علاوہ اس کو رواج دینے اور اسے دنیا میں متعارف کرانے کی بھی مجرم ہے۔ قوم لوط کے بعد یونانی قوم نے اس فحش کاری کو اخلاقی جواز دینے کی کوشش کی اور مغرب کی جدید جاہلیت نے تو اس کو قانونی تحفظ بھی فراہم کیا اور اس خیانت کو قانون کا سہارا دیا۔ یہ لوگ صنفی حقوق کی ضامن تعدد زوجات کو ناجائز سمجھتے ہیں لیکن مردوں کو زنانہ پن میں مبتلا اور کم از کم دو عورتوں کی جنسی حق تلفی کر کے ان کے لیے صنفی خیانت اور اخلاقی بے راہ روی کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح وہ تعدد زوجات کو غیر انسانی اور تعدد تجاوزات کو اخلاقی و قانونی سمجھتے ہیں۔ مغرب کے مادی انسان کی فکری و اخلاقی پستی اور قدروں کی پامالی پر حیرت ہوتی ہے، لیکن طفیلی سوچ رکھنے والے مشرقی مغرب زدہ حضرات کی حالت زار پر تو حیرت کی انتہا ہوتی ہے کہ وہ بھی تعدد زوجات کے بارے میں مغربی سوچ سے بات کرتے ہیں۔

جنسی انحراف میں عمل قوم لوط سب سے بڑا گناہ ہے کہ کسی گناہ کے لیے اس قدر شدید سزا نہیں جیسی اس جرم کی ہے۔ چنانچہ فاعل اور مفعول دونوں کی سزا قتل ہے اور قتل کا طریقہ بھی نہایت خوفناک اختیار کرنے کا حکم ہے۔ اس عمل بد پر مترتب ہونے والی منفی نفسیات کی بنا پر فاعل پر مفعول کی بہن، بیٹی اور ماں حرام ہو جاتی ہیں، اگر شادی سے پہلے یہ عمل بد واقع ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس عمل بد کے مرتکب پر کس قدر منفی نفسیاتی اثرات مترتب ہوتے ہیں اور انسان سے رجولیت اور مردانگی کی شہامت اور شخصیت سلب ہو جاتی ہے۔ تجربے نے بتایا ہے کہ ایسے لوگ مردانہ قوت کے مالک نہیں رہتے اور مردوں کے عورتوں سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے عورتوں میں بے عفتی آ جاتی ہے۔

روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے شیعوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَ لَمْ یَکُنْ فِیہِمْ مَنْ یُؤْتَی فِی دُبُرِہِ۔[1]

ان میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ شیعہ ہم جنس بازی کے عمل سے پاک رہتے ہیں۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِۦٓ إِلَّآ أَن قَالُوٓاْ أَخْرِجُوهُم مِّن قَرْيَتِكُمْ ۖ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ﴿٨٢﴾

۸۲۔ اور ان کی قوم کے پاس کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ کہیں: انہیں اپنی بستی سے نکال دو، یہ لوگ بڑے پاکیزہ بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

اپنی بستی سے نکال دو، اس لیے کہا گیا ہوگا چونکہ حضرت لوط (ع) یہاں کے باشندہ نہ تھے۔ آپؑ یہاں تبلیغ کے لیے تشریف لائے تھے اور بستی سے نکالنے کی وجہ بھی یہ تھی کہ یہ پاکیزہ لوگ ہیں۔ اس بستی میں نہ کوئی پاکیزہ رہے، نہ کوئی پاکباز اور یہاں ہر طرف فحش کار اور بدکار لوگ ہی آباد رہیں۔

جدید جاہلیت بھی اس طرز فکر سے مختلف نہیں ہے۔ ان میں اگر کوئی فرد پاکباز رہنا چاہتا ہے، کوئی عورت پاکدامن رہنا چاہتی ہے، کوئی شخص انسانی اور اخلاقی قدروں کی پاسداری کرنا چاہتا ہے تو اس کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ حال ہی میں فرانس میں مسلم طالبات نے صرف یہ قدم اٹھایا کہ سکولوں میں اسلامی حجاب کے ساتھ جانا شروع کیا تو مہذب جاہلیت سے یہ بات برداشت نہ ہوئی اور ان طالبات کو سکول سے نکال دیا۔

فَأَنجَيْنَٰهُ وَأَهْلَهُۥٓ إِلَّا ٱمْرَأَتَهُۥ كَانَتْ مِنَ ٱلْغَٰبِرِينَ ﴿٨٣﴾

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِم مَّطَرًا ۖ فَٱنظُرْ كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ ٱلْمُجْرِمِينَ ﴿٨٤﴾

۸۳۔ چنانچہ ہم نے لوط اور ان کے گھر والوں کو نجات دی، سوائے ان کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔

۸۴۔ اور ہم نے اس قوم پر ایک بارش برسائی، پھر دیکھو ان مجرموں کا کیا انجام ہوا۔

تفسیر آیات

ان آیات سے معلوم ہوا کہ قوم لوط میں صرف حضرت لوط (ع) کا گھرانہ ایمان پر تھا۔ چنانچہ سورہ ذاریات کی آیت ۳۶ میں اس کی تصریح ہے:

---

[1] اصول الکافی ۵ : ۵۵۱۔ وسائل الشیعۃ ۲۰ : ۳۳۷۔ کتاب الخصال، تفسیر نور الثقلین ۲ : ۵۰

فَمَا وَجَدۡنَا فِیۡهَا غَیۡرَ بَیۡتٍ مِّنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ○　　وہاں ہم نے ایک گھر کے علاوہ مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

اور حضرت لوط (ع) کی بیوی، جو اسی قوم کی بیٹی تھی، حضرت لوط (ع) پر ایمان نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے ہجرت کے وقت حضرت لوط (ع) کو حکم ملا کہ اس کو ساتھ نہ لیا جائے۔

وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَیۡهِمۡ : بارش سے مراد یہاں پتھر کی بارش ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا کہ ان بستیوں کو الٹ دیا گیا۔

اہم نکات

۱۔ ہم جنس بازی بہت ہی بڑا گناہ ہے، جس کی شرعی سزا دنیا میں موت اور آخرت میں ہلاکت ہے۔

۲۔ ناپاک معاشرے میں پاکیزہ لوگ ناقابل تحمل ہوتے ہیں: اَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ قَرۡیَتِکُمۡ ....۔

۳۔ ایمان کی توفیق نہ ہو تو نبی کے قریب تر ہونا بھی فائدہ نہیں دیتا: اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ۫ۖ کَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِیۡنَ ۔

وَ اِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ؕ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ بَیِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ فَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَ الۡمِیۡزَانَ وَ لَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَهُمۡ وَ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸۵﴾

۸۵۔ اور اہل مدین کی طرف ہم نے انہی کی برادری کے (ایک فرد) شعیب کو بھیجا، انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آ چکی ہے، لہٰذا تم ناپ اور تول پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دو اور زمین میں اصلاح ہو چکی ہو تو اس میں فساد نہ پھیلاؤ، اگر تم واقعی مؤمن ہو تو اس میں خود تمہاری بھلائی ہے۔

تفسیر آیات

مدین کا محل وقوع بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے فلسطین کے جنوب اور حجاز کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ یہ علاقہ تجارتی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ یمن سے مکہ اور ینبوع سے ہوتا ہوا شام کا راستہ، دوسری طرف عراق سے مصر کا راستہ بھی اس علاقے سے گزرتا تھا۔ چنانچہ تاریخی حقائق کے علاوہ سیاق آیت بھی بتاتا ہے کہ مخاطب قوم کو تجارت، ناپ تول سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا۔ یہ شہر حضرت ابراہیمؑ کے ایک

صاحبزادے جناب مدین کے نام سے موسوم ہوا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کا نسب نامہ اس طرح منقول ہے: شعیب بن میکیل بن یشجر بن مدین بن ابراھیم [۴]۔

۱۔ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ: مدین کی قوم دراصل دین ابراہیمی پر تھی۔ مرور زمانہ سے ان میں انحراف آ گیا تو ان کی ہدایت کے لیے حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ آپؑ نے یہاں چند بڑے انحرافات کو درست کرنے کی سعی فرمائی۔ ان میں شرک بھی آ گیا تھا۔ اس لیے فرمایا: صرف اللہ ہی کی عبادت کرو۔

۲۔ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ بَیِّنَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ: واضح دلیل وہ معجزات ہی ہو سکتے ہیں جو حضرت شعیب علیہ السلام کی رسالت کے ثبوت کے لیے پیش کیے گئے۔ ان معجزات کی تفصیل اگرچہ ہمیں معلوم نہیں تاہم اس آیت سے معجزات ثابت ہیں۔

۳۔ فَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَ الۡمِیۡزَانَ: دوسرا یہ لوگ تجارتی معاملات میں بد دیانت ہو گئے تھے۔ لہٰذا حضرت شعیبؑ فرماتے تھے: لوگو! ماپ تول پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم کر کے نہ دو۔

۴۔ وَ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ: تیسرا یہاں لوگ بد اخلاقیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ دین ابراہیمی پر عمل سے ان کے آبا و اجداد میں جو اصلاح آئی تھی، وہ باقی نہ رہی تھی۔ اس لیے فرمایا: اصلاح کے بعد فساد نہ پھیلاؤ۔

اہم نکات

۱۔ اخلاقی اقدار کو فروغ دینا اور لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرنا انبیاء کے پیغام کا حصہ رہا ہے۔

وَ لَا تَقۡعُدُوۡا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوۡعِدُوۡنَ وَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ مَنۡ اٰمَنَ بِہٖ وَ تَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ۚ وَ اذۡکُرُوۡۤا اِذۡ کُنۡتُمۡ قَلِیۡلًا فَکَثَّرَکُمۡ ۪ وَ انۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۸۶﴾

۸۶۔ اور اللہ پر ایمان رکھنے والوں کو خوفزدہ کرنے، انہیں اللہ کے راستے سے روکنے اور اس میں کجی پیدا کرنے کے لیے ہر راستے پر (راہزن بن کر) مت بیٹھا کرو اور یہ بھی یاد کرو جب تم کم تھے اللہ نے تمہیں زیادہ کر دیا اور دیکھو کہ فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔

تفسیر آیت

۱۔ وَ لَا تَقۡعُدُوۡا: اس آیت سے حضرت شعیب (ع) کو اپنی قوم کی طرف سے پیش آنے والی مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رہزن بن کر اہل ایمان کو امن و سکون سے ایمان کی راہ پر چلنے نہ دیتے تھے۔ اس

بارے میں وہ تین طریقوں سے اہل ایمان پر حملہ کرتے تھے:

i۔ تُوۡعِدُوۡنَ: پہلا یہ کہ ان کو خوفزدہ کرتے تھے۔

ii۔ تَصُدُّوۡنَ: دوسرا یہ کہ ایمان لانے کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔

iii۔ وَتَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا: تیسرا یہ کہ دلوں میں شبہ پیدا کر کے کجی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

۲۔ وَاذۡکُرُوۡۤا اِذۡ کُنۡتُمۡ قَلِیۡلًا فَکَثَّرَکُمۡ: نسلی افزائش خوشحالی کی علامت ہے۔ بعض روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے صاحبزادے حضرت مدین کی اولاد کو اللہ نے نسلی افزائش کے ذریعے ایک کثیر تعداد پر مشتمل ایک قوم بنایا۔

اہم نکات

۱۔ ہادیان برحق کے دشمن ہمیشہ ایمان کی راہ میں رہزن ہوا کرتے ہیں: وَلَا تَقۡعُدُوۡا بِکُلِّ صِرَاطٍ.

۲۔ کفر کے مقابلے میں آبادی میں اضافہ نعمت ہے: فَکَثَّرَکُمۡ ....۔

وَاِنۡ کَانَ طَآئِفَۃٌ مِّنۡکُمۡ اٰمَنُوۡا بِالَّذِیۡۤ اُرۡسِلۡتُ بِہٖ وَطَآئِفَۃٌ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا فَاصۡبِرُوۡا حَتّٰی یَحۡکُمَ اللّٰہُ بَیۡنَنَا ۚ وَہُوَ خَیۡرُ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۸۷﴾

۸۷۔ اور اگر تم میں سے ایک گروہ میری رسالت پر ایمان لاتا ہے اور دوسرا گروہ ایمان نہیں لاتا تو ٹھہر جاؤ یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

ہر نبی کی قوم کا یہی حال رہا ہے کہ ایک گروہ ایمان لے آتا ہے اور دوسرا گروہ ایمان نہیں لاتا۔ اہل ایمان ہمیشہ کافروں کی طرف سے اذیت و مصائب کا شکار رہتے ہیں۔ یہاں فَاصۡبِرُوۡا صبر کرو، بیک لہجہ اہل ایمان کے لیے نوید فتح و نصرت ہے اور کافروں کے لیے دھمکی اور انجام بد کی خبر ہے۔

اہم نکات

۱۔ فیصلہ جب اللہ پر چھوڑا جاتا ہے تو یہ سب سے بڑی سزا ہوتی ہے: وَہُوَ خَیۡرُ الۡحٰکِمِیۡنَ۔

قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِہٖ لَنُخۡرِجَنَّکَ یٰشُعَیۡبُ وَ

۸۸۔ ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے کہا: اے شعیب! ہم تجھے اور تیرے مومن ساتھیوں کو اپنی

الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَكَ مِنۡ قَرۡیَتِنَاۤ اَوۡ لَتَعُوۡدُنَّ فِیۡ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوۡ کُنَّا کٰرِهِیۡنَ ﴿۸۸﴾	بستی سے ضرور نکال دیں گے یا تمہیں ہمارے مذہب میں واپس آنا ہو گا، شعیب نے کہا: اگر ہم بیزار ہوں تو بھی؟

تشریح کلمات

مِلَّتِنَا: ملة۔ دین اور ملت تقریباً ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ملت کی اضافت صرف اسی نبی کی طرف ہوتی ہے جس کا وہ دین ہوتا ہے۔ جیسے ملت ابراہیم۔ دوسرا فرق یہ بیان کیا گیا ہے من جانب اللہ شروع ہونے کے لحاظ سے ملت اور اس پر عمل کرنے کے لحاظ سے دین کہا جاتا ہے کیونکہ دین کے معنی اطاعت و فرمانبرداری ہیں۔ (راغب)

تفسیر آیات

حضرت شعیب علیہ السلام کو جابر اور متکبر سرداروں نے منطق اور استدلال کی جگہ طاقت کے استعمال کی دھمکی دی اور کہا: اے شعیبؑ آپ کو یا تو ملک چھوڑنا ہو گا یا اپنا دین چھوڑ کر ہمارے دین کی طرف آنا ہو گا۔ طاقت کی اس غیر منطقی زبان کے جواب میں حضرت شعیبؑ نے عقل و منطق کی بات کی اور فرمایا: کیا کراہت اور بیزاری کے ساتھ بھی کسی دین و مذہب کا اختیار کرنا معقول ہوتا ہے کیونکہ دل طاقت کے سامنے ہتھیار کبھی نہیں ڈالتا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں بقرہ: ۲۵۶۔

اہم نکات

۱۔ دین الٰہی قبول کرنے میں جبر چل سکتا ہے نہ مسترد کرنے میں: اَوَلَوۡ کُنَّا کٰرِهِیۡنَ۔

قَدِ افۡتَرَیۡنَا عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اِنۡ عُدۡنَا فِیۡ مِلَّتِکُمۡ بَعۡدَ اِذۡ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنۡهَا ؕ وَ مَا یَکُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّعُوۡدَ فِیۡهَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا کُلَّ شَیۡءٍ عِلۡمًا ؕ عَلَی اللّٰهِ تَوَکَّلۡنَا ؕ رَبَّنَا افۡتَحۡ بَیۡنَنَا	۸۹۔ اگر ہم تمہارے مذہب میں واپس آ گئے تو ہم اللہ پر بہتان باندھنے والے ہوں گے جب کہ اللہ نے ہمیں اس (باطل) سے نجات دے دی ہے اور ہمارے لیے اس مذہب کی طرف پلٹنا کسی طرح ممکن نہیں مگر یہ کہ ہمارا رب اللہ چاہے، ہمارے رب کا علم ہر چیز پر محیط ہے، ہم نے اللہ (ہی) پر توکل کیا ہے، اے ہمارے پروردگار!

وَ بَیۡنَ قَوۡمِنَا بِالۡحَقِّ وَ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡفٰتِحِیۡنَ ﴿۸۹﴾ ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان برحق فیصلہ کر اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

تفسیر آیت

۱۔ قَدِ افۡتَرَیۡنَا عَلَی اللّٰہِ: شعیب علیہ السلام کی قوم بت پرست تھی۔ لہٰذا بت پرستی کی طرف پلٹنے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اللہ کے ساتھ شرک کرے اور اللہ پر بہتان باندھے۔ وہ بھی اس علم و یقین کے ساتھ کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔

۲۔ وَ مَا یَکُوۡنُ لَنَاۤ اَنۡ نَّعُوۡدَ: کیسے ممکن ہے اللہ کا کوئی شریک بنائے۔ اس لیے فیصلہ فرمایا کہ اس مذہب کی طرف پلٹنا ممکن نہیں۔

۳۔ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ: مگر جو اللہ چاہے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ہٹ کر قطعی بات کرنا انبیاء کے یہاں خلاف ادب سمجھا جاتا ہے، اس لیے کفر اختیار نہ کرنے کے فیصلہ کو بھی اللہ کی مشیت کے ساتھ مربوط کیا ہے یا اس کا یہ مطلب ہوسکتا ہے: مذہب شرک کی طرف پلٹنا ممکن نہیں مگر اللہ ہم سے ایمان سلب کر لے یا اللہ ہم کو اپنی رحمت سے دور کرے اور ہم کو اپنے حال پر چھوڑ دے تو ممکن ہے کہ ایمان کی دولت سے محروم ہو کر دوبارہ شرک کی طرف پلٹ جائیں اور اللہ ہمارے ساتھ ایسا نہیں کرے گا یا ممکن ہے اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ کا مطلب یہ ہو: ہم شرک کی طرف اس صورت میں پلٹ سکتے ہیں جب اللہ شرک کو چاہے اور یہ محال ہے۔ لہٰذا ہمارا شرک کی طرف پلٹنا محال ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ سورہ اعلیٰ آیت ۶۔۷ میں فرمایا:

سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی ۙ﴿﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ۔۔۔ (عنقریب) ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے۔ مگر جو اللہ چاہے۔۔۔۔

یعنی اگر اللہ آپؐ سے وحی سلب کرنا چاہے تو آپؐ کے ذہن سے یہ وحی نکل جائے گی مگر اللہ ایسا نہیں کرے گا۔

۴۔ وَسِعَ رَبُّنَا کُلَّ شَیۡءٍ عِلۡمًا: ہمارے رب کی مشیت اس کے علم و حکمت کے مطابق ہوتی ہے وہ ہمارے حال سے باخبر ہے لہٰذا وہ ہم کو اپنے حال پر نہیں چھوڑے گا۔

۵۔ عَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلۡنَا: اس بینش کے تحت ہم اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں اور اپنے تمام معاملات کو اسی کے سپرد کرتے ہیں۔

۶۔ رَبَّنَا افۡتَحۡ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَ قَوۡمِنَا: اپنے علم و حکمت اور ہمارے توکل کی بنیاد پر ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ فرما۔

وَ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ﴿۹۰﴾

۹۰۔اور قوم شعیب کے کافر سرداروں نے کہا: اگر تم لوگوں نے شعیب کی پیروی کی تو یقیناً بڑا نقصان اٹھاؤ گے۔

تفسیر آیات

یہ قوم تجارت پیشہ قوم تھی۔ کافر یہ خیال کرتے ہوں گے کہ حضرت شعیبؑ کی شریعت کے مطابق تجارت میں خسارہ ہو گا کیونکہ اس صورت میں ناپ تول درست کرنا ہوتا ہے یا ممکن ہے کافروں کے بائیکاٹ کی وجہ سے مالی اعتبار سے خسارہ ہو گا اور عزت و وقار مجروح ہو گا۔ بہرحال جن کے پاس آخرت کی ابدی زندگی کا تصور نہیں، ان کی سوچ پر مادیت حاکم ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان کی منزل پر فائز ہونے والا نہ شک کرتا ہے نہ مرتد ہو سکتا ہے: وَمَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ ...۔

۲۔ مادی سوچ رکھنے والوں کا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ شریعت کی پابندی میں خسارہ ہے: اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ﴿۹۱﴾

۹۱۔ چنانچہ انہیں زلزلے نے آلیا وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔

الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ۚۛ اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ﴿۹۲﴾

۹۲۔ جنہوں نے شعیب کی تکذیب کی (ایسے تباہ ہوئے) گویا وہ کبھی آباد ہی نہیں ہوئے تھے، شعیب کی تکذیب کرنے والے خود خسارے میں رہے۔

تشریح کلمات

یَغْنَوْا: (غ ن ی) غنی فی مکان کذا۔ کسی جگہ مدت دراز تک اقامت کرنا، گویا وہ دوسری جگہوں سے بے نیاز ہے۔

تفسیر آیات

مدین کی تباہی کی داستانیں بعد کی قوموں میں ایک بڑی مدت تک ضرب المثل رہی ہیں۔ چنانچہ

توریت گنتی باب ۳۱۔ ۳۵ و دیگر قدیم آسمانی کتابوں میں مدین کی تباہی کا ذکر ملتا ہے۔

اس آیت میں مدین کی تباہی کی ایک تصویر پیش کی گئی ہے کہ ان کی آبادی ایسی ختم ہوئی گویا وہ کبھی آباد ہی نہیں تھی۔

اس قوم کی تباہی سے یہ بات سامنے آ گئی کہ خسارے میں کون تھے۔

اہم نکات

۱۔　دیندار کبھی خسارے میں نہیں ہوتا۔

فَتَوَلّٰى عَنۡهُمۡ وَ قَالَ یٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّیۡ وَ نَصَحۡتُ لَكُمۡ ۚ فَكَیۡفَ اٰسٰی عَلٰی قَوۡمٍ كٰفِرِیۡنَ ﴿۹۳﴾

۹۳۔ شعیب ان سے نکل آئے اور کہنے لگے: اے میری قوم! میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچائے اور تمہیں نصیحت کی تو (آج) میں کافروں پر رنج و غم کیوں کروں؟

تفسیر آیات

۱۔ فَتَوَلّٰى عَنۡهُمۡ: تبلیغ و نصیحت کے بے اثر ہونے کے بعد وقت کا رسول جب قوم سے منہ موڑ لیتا ہے، وہ قوم ابدی ہلاکت میں چلی جاتی ہے۔

۲۔ فَكَیۡفَ اٰسٰی: اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر شے پر محیط ہے اور وہ ارحم الراحمین ہے۔ اپنے اندر اہلیت پیدا کر کے ہی اس عظیم و وسیع رحمت کو شامل حال کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ قوم رحم کے اہل ہوتی تو ان پر عذاب نازل ہی نہ ہوتا اور ان کا رسول بھی عذاب سے رنج و غم نہ کرتا۔

واضح رہے کہ حضرت شعیب (ع) نے اپنی قوم سے یہ خطاب ان کی ہلاکت کے بعد کیا ہے۔

اہم نکات

۱۔　مردے زندوں کا خطاب سنتے ہیں: یٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ ....

۲۔　اپنے اندر اہلیت پیدا کر کے ہی اس عظیم و وسیع رحمت کو شامل حال کیا جا سکتا ہے، ورنہ سرکش قوم رحم کی مستحق نہیں ہوتی: فَكَیۡفَ اٰسٰی عَلٰی قَوۡمٍ ....

وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذۡنَاۤ اَهۡلَهَا بِالۡبَاۡسَآءِ

۹۴۔ اور ہم نے جس بستی میں بھی نبی بھیجا وہاں کے رہنے والوں کو تنگی اور سختی میں مبتلا کیا کہ

وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمۡ يَضَّرَّعُوۡنَ﴿۹۴﴾	شاید وہ تضرع کریں۔
ثُمَّ بَدَّلۡنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الۡحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوۡا وَّقَالُوۡا قَدۡ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ﴿۹۵﴾	۹۵۔ پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی میں بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوشحال ہو گئے اور کہنے لگے: ہمارے باپ دادا پر بھی برے اور اچھے دن آتے رہے ہیں پھر ہم نے اچانک انہیں گرفت میں لے لیا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔

تفسیر آیات

بعض اقوام و امم کے حالات اور ان کے انجام کے ذکر کے بعد اللہ اپنی اس لایتغیر سنت اور ثابت نظام کو بیان فرماتا ہے جس سے اس نے ہر قوم کو گزارا:

۱۔ اَخَذۡنَاۤ اَهۡلَهَا بِالۡبَاۡسَآءِ: پہلے اس قوم کو مصائب و آفات میں ڈالا اور طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا کیا تاکہ اپنی طاقت وقوت اور مال و دولت، قوم وقبیلہ کے بھروسے پر نخوت کا طلسم اور غرور وتکبر کا نشہ بھی ٹوٹ جائے:

وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوۡ دُعَآءٍ عَرِيۡضٍ۝ [1] اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ لمبی دعائیں کرنے لگتا ہے۔

ایسے حالات میں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے ہیں اور دعوت الی اللہ کے لیے فضا سازگار اور زمین ہموار مل جاتی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ انعام: ۴۲۔

ماہرین نفسیات کا بھی یہی نظریہ ہے کہ مصائب وآفات انسان کی تربیت و اصلاح کے لیے نہایت مد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ عالمی جنگوں کے دوران یہ بات سب کے مشاہدے میں آئی ہے کہ عبادت گاہیں ہر وقت سے زیادہ آباد رہتی تھیں اور یہ بات بھی تجربے میں آئی ہے کہ شدائد و مصائب سے صلاحیتیں نکھرتی ہیں۔ اسی سے ہے کہ اکثر نابغۂ روزگار غریب اور نادار خاندانوں سے ابھرتے ہیں۔

۲۔ ثُمَّ بَدَّلۡنَا: اس سازگار فضا میں بھی ان کا تکبر ونخوت فرو نہیں ہوتا اور ان کی اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی نہیں ہوتی تو ان کو آسودگی اور دولت کی فراوانی میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے برے دن بھول جاتے ہیں اور اس کو اللہ کی طرف سے آزمائش و امتحان کے طور پر قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے بلکہ اس کو نیچر کا کھیل تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں: قَدۡ مَسَّ اٰبَآءَنَا کہ ہمارے آبا و اجداد بھی اسی نشیب وفراز سے دوچار رہے ہیں۔ وہ نیچر کے اس انوکھے کھیل کے کھلونے رہ چکے ہیں۔ اس کے پیچھے کسی قصد و

---
[1] ۴۱ حم سجدہ: ۵۱ [2] ۱۷ اسراء: ۸۳

ارادے اور کسی شعور و مصلحت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ جیسے ہمارے برے دن بے مقصد آئے تھے، ایسے ہی یہ اچھے دن بھی اتفاقیہ ہیں یا شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کے نشیب و فراز اور بدحالی و خوشحالی، صرف انسان کی محنت اور مادی علل و اسباب کے تابع ہیں۔ اسی لغو، طغیانی اور غفلت و نادانی کے عین عالم میں ان کو اچانک گرفت میں لے لیا گیا اور وہ نابود ہو گئے:

وَ اِذَاۤ اَنۡعَمۡنَا عَلَی الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَ نَاٰبِجَانِبِہٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ کَانَ یَئُوۡسًا ۝ ؎

اور جب ہم انسان کو نعمتوں سے نوازتے ہیں تو وہ روگردانی کرتا ہے اور اپنی کروٹ پھیر لیتا ہے اور جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔

سورہ اعراف کے نزول کے وقت قریش کا بھی عیناً یہی طرز عمل تھا۔

اہم نکات

۱۔ تنگی و سختی سے امتحان میں کامیابی مل سکتی ہے، مگر خوشحالی اور نعمتوں کے امتحان میں کامیاب ہونا نہایت مشکل ہے: حَتّٰی عَفَوۡا وَّ قَالُوۡا....

۲۔ اللہ، خوش بختی اور خوشحالی کے علل و اسباب کے متبادل اور مقابل میں نہیں بلکہ اللہ ان تمام علل و اسباب سے پہلے اور ان سب کے اوپر علت و سبب ہے۔ باقی تمام اسباب و علل اللہ کے ذیل میں آتے ہیں۔ وہی تمام اسباب و علل کا خالق ہے۔ (غور کیجیے)

وَ لَوۡ اَنَّ اَہۡلَ الۡقُرٰۤی اٰمَنُوۡا وَ اتَّقَوۡا لَفَتَحۡنَا عَلَیۡہِمۡ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لٰکِنۡ کَذَّبُوۡا فَاَخَذۡنٰہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۹۶﴾

۹۶۔ اور اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمال کے سبب جو وہ کیا کرتے تھے انہیں گرفت میں لے لیا۔

تفسیر آیات

وَ لَوۡ اَنَّ اَہۡلَ الۡقُرٰۤی اٰمَنُوۡا: ایمان باللہ انسانی زندگی سے الگ کسی اور چیز کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان اس زندگی کا مسئلہ ہے۔ ایمان لانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ایمان لانے والا فطری تقاضوں کے خطوط پر اپنی زندگی استوار کرتا ہے۔ اس کے احساسات اور جذبات زندہ ہیں۔ وہ انسانی قدروں کی پاسداری کرتا ہے۔ اگر پورا معاشرہ مومن ہے تو یہ الٰہی و انسانی قدروں کا مالک معاشرہ ظلم و استحصال سے پاک ہوگا۔ کوئی انسان کسی

انسان کا غلام ہو گا نہ کسی کی طرف سے کسی فرد کا اقتصادی، سیاسی، عسکری و اخلاقی استحصال ہو گا۔ ہر ایک کو قدرتی مصادر سے بھرپور استفادہ کرنے کے حق اور موقع ملے گا۔

لہٰذا ایمان باللہ، غیر اللہ کی بندگی سے آزادی کا نام ہے۔ روشن ضمیری اور احساس مسئولیت کا نام ہے۔ معاشرے میں برادری و برابری کا نام ہے۔ انسانی خواہشات پر قدغن نہیں بلکہ ان خواہشات کا محکوم ہوئے بغیر ان کو جائز اور عادلانہ طریقہ سے پورا کرنے کے حق اور ان کے احترام کا نام ہے۔

ایمان باللہ دنیاوی زندگی سے کٹ جانے کا نام نہیں بلکہ اس زندگی کو سنوارنے کا نام ہے:

وَلَا تَنۡسَ نَصِیۡبَکَ مِنَ الدُّنۡیَا ...[1] دنیا سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر....

ایمان باللہ سے منابع طبیعت و مصادر قدرت سے بہتر استفادہ ہو سکتا ہے۔

آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اگر ایمان باللہ لوگوں کی دنیاوی زندگی میں خوشحالی لاتا ہے تو بہت سی مسلم قومیں فقیر اور کافر قومیں ترقی یافتہ کیوں ہیں؟ جواب یہ ہے کہ قوموں نے جب تک اللہ پر ایمان و بھروسہ رکھا، وہ دنیا میں باعزت و بالادست رہیں لیکن آج یہ مسلم قومیں ایمان بالطاغوت رکھتی ہیں۔ وہ اپنے طاغوتی حکمرانوں کی غلام ہیں جو آگے جا کر عالمی طاغوت اور استحصالی قوتوں پر اعتماد کرتی ہیں۔

ثانیاً اس کا تعلق قدرتی عوامل سے ہے، صرف نظریات سے نہیں۔ نظریات قدرتی عوامل کو بروئے کار لانے میں مؤثر نہیں ہیں۔ مثلاً پودے کو پانی اور کھاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ نمازی، تہجد گزار یہ چیزیں فراہم نہ کرے تو تسبیح سے یہ ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ مسلم قوموں نے قدرتی وسائل کے بارے میں غداروں اور اغیار کا تسلط قبول کیا ہے، جو اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے، تو پسماندگی قدرتی بات ہے۔ چونکہ یہاں قانون قدرت ہر ایک کے لیے یکساں نافذ ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن ثواب دارین حاصل کر لیتا ہے جیسا کہ بعض خسر الدنیا والآخرۃ کا شکار ہو جاتا ہیں۔

اَفَاَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰۤی اَنۡ یَّاۡتِیَهُمۡ بَاۡسُنَا بَیَاتًا وَّ هُمۡ نَآئِمُوۡنَ ﴿۹۷﴾

۹۷۔ کیا ان بستیوں کے لوگ بے فکر ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت آ جائے جب وہ سو رہے ہوں؟

اَوَ اَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰۤی اَنۡ یَّاۡتِیَهُمۡ بَاۡسُنَا ضُحًی وَّ هُمۡ یَلۡعَبُوۡنَ ﴿۹۸﴾

۹۸۔ یا کیا ان بستیوں کے لوگ بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن کو آ جائے جب وہ کھیل رہے ہو؟

---

[1] ۲۸ قصص : ۷۷

اَفَاَمِنُوۡا مَکۡرَ اللّٰہِ ۚ فَلَا یَاۡمَنُ مَکۡرَ اللّٰہِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۹۹﴾

۹۹۔ کیا یہ لوگ اللہ کی تدبیر سے خوف نہیں کرتے؟ اللہ کی تدبیر سے تو فقط خسارے میں پڑنے والے لوگ بے خوف ہوتے ہیں۔

تشریح کلمات

بَیَاتًا: (ب ی ت) البیات۔ رات کو دشمن پر حملہ کرنا، شبخون مارنا۔

مَکۡرَ: (م ك ر) المکر۔ کسی شخص کو حیلہ کے ساتھ اس کے مقصد سے پھیر دینا۔ اگر اس سے کوئی اچھا فعل مقصود ہو تو محمود ہوتا ہے، ورنہ مذموم۔

تفسیر آیات

اَفَاَمِنَ اَہۡلُ الۡقُرٰۤی: سرکش اقوام کے انجام اور اللہ کے ضابطہ و دستور کے ذکر کے بعد دیگر اقوام کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لیے استفہام کے لب و لہجے میں فرمایا کہ جب سرکش قوموں کو بہرحال اپنے کیے کے انجام کو پہنچ جانا ہے تو ان سرکش اقوام کو آزمائشی وقفے سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے اور خود ان کے اپنے اعمال کے مکافات سے بے فکر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ مکافات عمل ان کو اس وقت اپنے گرفت میں لے گا جب وہ خواب جیسی غفلت یا کھیل کود جیسی بیہودہ باتوں میں مگن ہوں۔ مَکۡرَ اللّٰہِ سے مراد اللہ کا وہ عذاب ہے، جو مجرموں پر اس وقت آ پڑتا ہے، جب وہ اپنی بدمستیوں میں بے حسی اور لاشعوری کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اللہ اس وقت ایسا کرتا ہے جب وہ عذاب کے مستحق ہوں۔ اللہ ان کو ایسی راہ پر لگا دیتا ہے کہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارے حق میں یہ بہتر ہے حالانکہ یہ عذاب الٰہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ مَکۡرَ اللّٰہِ کی ایک تصویر اس آیت میں پیش فرمائی:

وَ لَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّمَا نُمۡلِیۡ لَہُمۡ خَیۡرٌ لِّاَنۡفُسِہِمۡ ؕ اِنَّمَا نُمۡلِیۡ لَہُمۡ لِیَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ○ [1]

اور کافر لوگ یہ گمان نہ کریں کہ ہم انہیں جو ڈھیل دے رہے ہیں وہ ان کے لیے بہتر ہے، ہم تو انہیں صرف اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں تاکہ یہ لوگ اپنے گناہوں میں اور اضافہ کر لیں، آخرکار ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔

فَلِلّٰہِ الۡمَکۡرُ جَمِیۡعًا ....[2]

...لیکن تمام تر تدبیریں اللہ کے ہاتھ میں ہیں....

اہم نکات

۱۔ کسی سرکش کو ناز و نعمت میں دیکھو تو یہ خیال نہ کرنا کہ اللہ اس پر مہربان ہے بلکہ یہ سمجھ لینا کہ

---

[1] ۳ آل عمران: ۱۷۸　[2] ۱۳ رعد: ۴۲

یہ مَکۡرَ اللّٰہِ کا مستحق بن گیا ہے۔

اَوَ لَمۡ یَہۡدِ لِلَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِ اَہۡلِہَاۤ اَنۡ لَّوۡ نَشَآءُ اَصَبۡنٰہُمۡ بِذُنُوۡبِہِمۡ ۚ وَ نَطۡبَعُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

۱۰۰۔ جو لوگ اہل زمین (کی ہلاکت) کے بعد زمین کے وارث ہوئے ہیں کیا ان پر یہ بات عیاں نہیں ہوئی کہ ہم چاہیں تو ان کے جرائم پر انہیں گرفت میں لے سکتے ہیں؟ اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں، پھر وہ کچھ نہیں سنتے۔

تفسیر آیات

اَوَ لَمۡ یَہۡدِ: ہر آنے والی قوم کے لیے اپنے پیشرؤں کا انجام بد، سبق آموز ہوتا ہے۔ ان کے عروج و زوال میں عبرتیں ہوتی ہیں کہ ان کو کس قسم کی غلطیوں نے تباہ کر دیا۔ اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں آتی، انہی حالات سے ہر سرکش قوم دوچار ہو گی۔ اس فقرے سے اللہ یہ نہیں چاہتا کہ لوگ مضطرب الحال رہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ لوگ بیدار رہیں۔ کیونکہ غفلت میں تباہی اور ہوشیاری میں نجات ہے۔

اہم نکات

۱۔ کامیابی و نجات کا راز گزشتگان کے تجربوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کے انجام سے سبق لینے میں ہے۔

تِلۡکَ الۡقُرٰی نَقُصُّ عَلَیۡکَ مِنۡ اَنۡۢبَآئِہَا ۚ وَ لَقَدۡ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا کَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡا بِمَا کَذَّبُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ کَذٰلِکَ یَطۡبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۰۱﴾

۱۰۱۔ یہ وہ بستیاں ہیں جن کے حالات ہم آپ کو سنا رہے ہیں اور ان کے پیغمبر واضح دلائل لے کر ان کے پاس آئے لیکن جس چیز کو وہ پہلے جھٹلا چکے تھے وہ اس پر ایمان لانے کے لیے آمادہ نہ تھے، اللہ اس طرح کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔

وَ مَا وَجَدۡنَا لِاَکۡثَرِہِمۡ مِّنۡ عَہۡدٍ ۚ وَ اِنۡ وَّجَدۡنَاۤ اَکۡثَرَہُمۡ لَفٰسِقِیۡنَ ﴿۱۰۲﴾

۱۰۲۔ اور ہم نے ان میں سے اکثر کو بدعہد پایا اور اکثر کو ان میں فاسق پایا۔

تفسیر آیات

۱۔ تِلۡکَ الۡقُرٰی: خطاب رسول اللہ صلی اللہ وآلہ وسلم سے ہے اور لہجہ کلام تسلی اور اطمینان کے لیے ہے۔ ان بستیوں کے واقعات ہم آپؐ کے لیے بیان کر رہے ہیں کہ ان کے پاس بھی رسولوں نے واضح دلائل پیش کیے۔ اس کے جواب میں کافروں کا یہ موقف تھا کہ فَمَا کَانُوۡا لِیُؤۡمِنُوۡا جس کی ہم ایک بار تکذیب کر چکے ہیں، اس پر بعد میں ایمان لانا درست نہیں ہے۔ جب کہ دلائل آنے کے بعد ایمان لانا درست تھا۔ خواہ پہلے تکذیب کر چکے ہیں۔

۲۔ کَذٰلِکَ یَطۡبَعُ اللّٰہُ: اس آیت شریفہ میں بھی ایک ضابطے کا بیان ہے۔ وہ یہ کہ جب کفر و انکار، حجت و دلیل کے بعد بھی جاری رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی حالت پر چھوڑ دیتا ہے۔ ہدایت و رہنمائی کے ذرائع ان سے سلب فرماتا ہے۔ قرآن اسی کو دلوں پر مہر لگانے سے تعبیر فرماتا ہے۔ جب ان کی اپنی شامت اعمال سے دل ناقابل ہدایت بن جاتے ہیں تو ایمان و ہدایت کے لیے تو وہ آمادہ ہی نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس جھٹلانے کی وجہ سے ان کے دل ناقابل ہدایت ہو جاتے ہیں اور ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے اس کے بعد واضح دلائل کے سننے کے لیے وہ بالکل آمادہ نہیں ہوتے۔

۳۔ وَمَا وَجَدۡنَا لِاَکۡثَرِہِمۡ مِّنۡ عَہۡدٍ: عہد سے مراد عقل و فطرت کا عہد ہے، جس پر اللہ نے تمام انسانوں کو پیدا کیا۔ ضمیر، وجدان کا عہد، جسے اللہ نے انسانی جبلت میں ودیعت فرمایا ہے۔ انسانی و اخلاقی اقدار کا عہد، جسے اللہ نے ہر انسان کو پڑھایا ہے۔ ان لوگوں نے ان تمام عہدوں کا پاس نہیں کیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کفر و شرک کو چھوڑ کر ایمان کی طرف ہر وقت آیا جا سکتا ہے۔

۲۔ جس کو اللہ اپنے حال پر چھوڑ دے اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔

۳۔ انسان کا اعلیٰ قدروں کا مالک ہونا، عہد الٰہی کا وفادار ہونے کی علامت ہے۔

ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ مُّوۡسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۠ئِہٖ فَظَلَمُوۡا بِہَا ۚ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۱۰۳﴾

۱۰۳۔ پھر ان رسولوں کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرکردہ لوگوں کی طرف بھیجا تو انہوں نے ان نشانیوں (کے انکار) کے سبب (اپنے اوپر) ظلم کیا پھر دیکھ لو مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔

تفسیر آیات

موجودہ ترتیب کے مطابق یہ پہلا مکی سورہ ہے جس میں موسیٰ علیہ السلام کا اہتمام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ۱۳۰ مرتبہ سے زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر قرآن میں سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ ہونے کے چند اسباب ہیں:

i۔ قدیم انسانی تاریخ کے اہم ترین ابواب حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تک کے زمانے میں رقم ہوئے۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تحریک و قیام کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کہ آپؑ نے اپنے وقت کے طاقتور طاغوت کا مقابلہ کیا۔ حق و باطل کا سب سے بڑا طولانی جہاد بنی اسرائیل کے دور میں ہوا اور اس صبر آزما جہاد کے میر کاروان حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

ii۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں انسان نے جہاں تمدن و ترقی کا ایک اہم مرحلہ طے کیا تھا، وہاں کفر و شرک نے بھی ایک مستحکم نظام بنا لیا تھا۔ اس دور میں توحید پرست لوگ محروم و مظلوم ہو گئے تھے اور معاشرے کا ایک کمزور طبقہ شمار کیے جاتے تھے۔ زمانے کا طاقتور طبقہ انا ربکم الاعلیٰ کا ادعا رکھتا تھا اور اہل توحید کا ہر طرح سے استحصال کرتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے زمانے کے انسانوں کے تمام مقدرات پر مسلط ہو گیا تھا۔

iii۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعلق ایک محروم اور محکوم طبقے سے تھا جسے زندہ رہنے کا بھی حق حاصل نہ تھا۔ ان کی نسل کشی ہوتی تھی۔ ایسے مظلوم طبقے کے ایک فرد نے ایک بڑی طاقت کا مقابلہ کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق بھی ایسے ہی خاندان سے تھا۔ چنانچہ آپؐ کو لوگ عبد اللہ کا یتیم کہ کر بڑی حقارت سے یاد کرتے تھے۔

iv۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک جامع نظام حیات اور ایک کامل شریعت عطا ہوئی اور ایک عظیم امت کی تشکیل عمل میں آئی، جس نے روئے زمین کا نقشہ اور اقوام عالم کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ چنانچہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ایک جامع نظام حیات اور ایک کامل و ابدی شریعت عنایت ہوئی اور ایک عظیم امت وجود میں آ گئی۔ جس نے نہ صرف زمین کا نقشہ بدل کر رکھ دیا بلکہ انسانیت کو تہذیب و تمدن سکھایا اور تسخیر طبیعت کا راستہ کھول دیا۔

v۔ انسانی تاریخ کے اس دور میں لکھے گئے اوراق میں ایسے اسباق ملتے ہیں جو آنے والی تمام توحیدی تحریکوں اور مظلوم و محکوم قوموں کے لیے مشعل راہ ہیں کہ بنی اسرائیل کو امامت عظمیٰ کے منصب پر فائز کیا۔ ان کو مختلف آزمائش و ابتلا میں ڈالا گیا۔ کس طرح ان پر ایک ظالم حکمران کو مسلط کیا گیا۔ ان امتحانات میں بنی اسرائیل نے کس ذمے داری کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد ان کے دشمن کو غرق آب کر دیا۔ ان کو ظلم سے نجات دی۔

فَجَعَلۡنٰهُمۡ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلۡاٰخِرِیۡنَ ۝ [1] پھر ہم نے انہیں قصہ پارینہ اور بعد (میں آنے) والوں کے لیے نشان عبرت بنا دیا۔

تاریخ انبیاء میں ان کو سب سے زیادہ معجزات دیے گئے۔ سب سے زیادہ انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے پیغمبر کی آواز پر کہاں تک لبیک کہا، آخر میں ان سے امامت عظمیٰ کا منصب کیسے سلب ہوا وغیرہ وغیرہ۔

فرعون: قدیم اہل مصر اپنے رب اعلیٰ سورج کو رَع کہتے تھے اور اپنے حکمرانوں کو رَع کا مظہر سمجھتے تھے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ جس فرعون کے گھر میں حضرت موسیٰ (ع) نے پرورش پائی، وہ رعمسیس دوم تھا اور جس فرعون کی طرف حضرت موسیٰ (ع) کو بھیجا گیا وہ رعمسیس دوم کا بیٹا منفتاح تھا۔ چنانچہ مصر کے جس میوزیم میں منفتاح نامی فرعون کی حنوط شدہ لاش محفوظ ہے، وہاں یہ آیت تحریر ہے:

فَالۡیَوۡمَ نُنَجِّیۡکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوۡنَ لِمَنۡ خَلۡفَکَ اٰیَۃً ... [2] پس آج ہم تیری لاش کو بچائیں گے تاکہ تو بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت کی نشانی بنے۔

بِاٰیٰتِنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ: آیات سے مراد وہ معجزے ہیں جو حضرت موسیٰ کو دیے گئے۔

فَظَلَمُوۡا بِہَا: ان لوگوں نے ان آیات کا انکار کیا۔ انکار اور کفر کو ظلم سے تعبیر کرنا قرآنی اصطلاح ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ۝ [3] یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

اہم نکات

۱۔ فرعون کے نظام سلطنت اور اقتدار کی وسعت کا اندازہ وَمَلَا۠ئِہٖ سے ہوتا ہے۔

۲۔ مفسدوں کا انجام ہمیشہ عبرتناک ہوتا ہے۔ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُفۡسِدِیۡنَ۔

وَ قَالَ مُوۡسٰی یٰفِرۡعَوۡنُ اِنِّیۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝۱۰۴

۱۰۴۔ اور موسیٰ نے کہا: اے فرعون! میں رب العالمین کا رسول ہوں۔

حَقِیۡقٌ عَلٰۤی اَنۡ لَّاۤ اَقُوۡلَ عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الۡحَقَّ ؕ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِبَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ فَاَرۡسِلۡ مَعِیَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۝۱۰۵

۱۰۵۔ (مجھ پر) لازم ہے کہ میں اللہ کے بارے میں صرف حق بات کروں، میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل لے کر آیا ہوں، لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔

---

[1] ۴۳ زخرف: ۵۶　[2] ۱۰ یونس: ۹۲　[3] ۳۱ لقمان: ۱۳

تفسیر آیات

حق کے داعی اور طاغوت کے درمیان مقابلے کا آغاز رب العالمین کے رسول اور خود ساختہ رب الاعلیٰ (مہادیو) کے درمیان پہلے مکالمے سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دو اہم باتوں کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوئے تھے:

الف۔ اللہ واحد کی بندگی کو قبول کیا جائے۔

i۔ اس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ فرعون کے رب اعلیٰ ہونے کے خلاف براہ راست قیام۔ اس کی حکومت کے غیر قانونی ہونے کا واضح اعلان۔ فرعون کے تخت و تاج کے خلاف ایک انقلاب۔ اس پیامبر انقلاب کا یہ نعرہ کہ میں رب العالمین کا نمائندہ ہوں، فرعون کے رب اعلیٰ ہونے کی بالکل نفی ہے۔ چونکہ رب العالمین کا مطلب صاف یہ نکلتا ہے کہ کائنات میں صرف ایک رب کی حاکمیت ہے اور میں اس ایک رب کا نمائندہ ہوں۔ جب کہ فرعونیوں کی ثقافت میں رب العالمین ایک انوکھا لفظ تھا۔

ii۔ حَقِیۡقٌ عَلٰۤی اَنۡ لَّاۤ اَقُوۡلَ: رب العالمین کا نمائندہ ہونے کی حیثیت میں حق گوئی کا پابند ہوں.

iii۔ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِبَیِّنَۃٍ: اس حق گوئی پر میرے پاس دلیل ہے کہ میں رب العالمین کا نمائندہ ہوں۔

ب۔ بنی اسرائیل کی آزادی۔

بنی اسرائیل اس وقت ایک موحد قوم تھی اور فرعون ان پر طرح طرح کے مظالم توڑتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چاہتے تھے کہ ان موحدوں کو مشرکوں کے ظلم سے نکال کر ان کے لیے اپنی ایک آزاد مملکت کا قیام عمل میں لایا جائے۔

اہم نکات

۱۔ مردان حق خونخواروں اور جابروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق کا اعلان کرتے ہیں: یٰفِرۡعَوۡنُ اِنِّیۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ....

۲۔ باطل کے ایوان میں اس کے غیر قانونی ہونے کا اعلان: اَنۡ لَّاۤ اَقُوۡلَ عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الۡحَقَّ ....

قَالَ اِنۡ کُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰیَۃٍ فَاۡتِ بِہَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾

۱۰۶۔ فرعون نے کہا: اگر تم سچے ہو اور کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اسے پیش کرو۔

فَاَلۡقٰی عَصَاہُ فَاِذَا ہِیَ ثُعۡبَانٌ

۱۰۷۔ موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو وہ دفعتاً سچ مچ کا

مُّبِيْنٌ ﴿١٠٧﴾	اژدھا بن گیا۔
وَّ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿١٠٨﴾	۱۰۸۔ اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ نکالا تو وہ ناظرین کے سامنے یکایک چمکنے لگا۔

تفسیر آیات

فَأْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ: کوئی انسان جب اللہ کا رسول اور اس کا نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا صاف صاف یہ مطلب نکلتا ہے کہ وہ اس ذات کا نمائندہ ہے جو نظام کائنات پر حاکمیت مطلقہ رکھتی ہے کہ وہ جب چاہے، جیسے چاہے، اس نظام پر اپنا ارادہ نافذ کر سکتی ہے۔ لہٰذا لوگوں کو حق حاصل ہوتا ہے کہ اس سے مطالبہ کریں کہ اگر تم اس کائنات کے حاکم اعلیٰ کے نمائندے ہو تو ایسا واقعہ پیش کرو جو عام طبیعیاتی قانون کی دفعات سے ہٹ کر ہو، جس کو اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں۔

ہم نے سورہ بقرہ آیت ۲۳ میں تفصیلاً بیان کیا ہے کہ معجزہ قانون طبیعیت کی عام دفعات سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔ البتہ معجزے کے اپنے ناقابل تسخیر علل و اسباب ضرور ہوتے ہیں۔ جو لوگ معجزات کو خارق عادت نہیں بلکہ قانون طبیعیت کے دائرے میں دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ در اصل فاعل مختار اللہ کو نہیں مانتے بلکہ ان کے نزدیک اللہ سے امور اس طرح سرزد ہوتے ہیں جس طرح آگ سے حرارت اور پانی سے رطوبت صادر ہوتی ہے۔ پس جیسا کہ آگ اور پانی کو اپنی طبیعیت سے ہٹ کر اثر دکھانے کا اختیار نہیں، ایسا ہی اللہ کو بھی عام قانون طبیعیت سے ہٹ کر اثر دکھانے کا اختیار نہیں۔ درحقیقت جو لوگ معجزات کو قانون طبیعیت سے بالاتر نہیں سمجھتے وہ فاعل مختار اللہ کو نہیں بلکہ ایک شعور سے عاری فاعل یعنی طبیعیت کو خدا مانتے ہیں۔

لہٰذا اگر اللہ مردہ مادے کو عادی رفتار کے مطابق ایک اژدھا بنا سکتا ہے تو دفعتاً بھی بنا سکتا ہے کیونکہ خود عادت کا خالق بھی اللہ ہے اور وہ اپنے کسی عمل میں کسی عادت اور زمانے کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ کسی چیز کا امر فرماتا ہے تو اتنا وقت بھی درکار نہیں ہوتا جتنا کاف و نون کن کے تلفظ کے لیے درکار ہوتا ہے۔

بعض اہل تحقیق کے مطابق عناصر کی وحدت کے مطابق عصا اور اژدھے کے عناصر ایک ہیں۔ صرف ترکیب میں تبدیلی درکار ہوتی ہے۔ اللہ کے لیے عناصر کی ترکیب میں تبدیلی کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٩﴾	۱۰۹۔ قوم فرعون کے سرداروں نے کہا: یہ یقیناً بڑا ماہر جادوگر ہے۔
يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ	۱۱۰۔ یہ تمہیں تمہاری سرزمین سے نکالنا چاہتا ہے،

اَرۡضِکُمۡ ۚ فَمَاذَا تَاۡمُرُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾ بتاؤ اب تمہاری کیا صلاح ہے؟

قَالُوۡۤا اَرۡجِہۡ وَ اَخَاہُ وَ اَرۡسِلۡ فِی الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِیۡنَ ﴿۱۱۱﴾ ۱۱۱۔ انہوں نے کہا: موسیٰ اور اس کے بھائی کو کچھ مہلت دو اور لوگوں کو جمع کرنے والے (ہرکاروں) کو شہروں میں روانہ کر دو۔

یَاۡتُوۡکَ بِکُلِّ سٰحِرٍ عَلِیۡمٍ ﴿۱۱۲﴾ ۱۱۲۔ وہ تمام ماہر جادوگروں کو تمہارے پاس لائیں۔

تفسیر آیات

۱۔ یُّرِیۡدُ اَنۡ یُّخۡرِجَکُمۡ: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ (ع) کی طرف سے ایک لاٹھی کے اژدھا بننے سے یہ خطرہ کیوں لاحق ہوا کہ یہ دو آدمی فرعون جیسے وسیع و عریض سلطنت کے مالک کو ان کی سرزمین سے نکال باہر کریں گے۔ جب کہ حضرت موسیٰ (ع) نے نہ اس کے تخت و تاج کے خلاف کوئی بات کی، نہ سرزمین سے بے دخلی کا مطالبہ کیا۔ حضرت موسیٰ (ع) نے تو صرف یہ فرمایا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں، تم بنی اسرائیل کو اپنی غلامی کی قید و بند سے آزاد کر دو بلکہ حضرت موسیٰ (ع) تو خود فرعون کی سرزمین سے نکلنا چاہتے تھے۔

جواب یہ ہے کہ فرعون کی بادشاہت و سلطنت کی بنیاد اس کے رب اعلیٰ ہونے اور سورج دیوتا کا مظہر ہونے پر استوار تھی۔ فرعون کی حاکمیت اعلیٰ اس تصور پر قائم تھی کہ وہ یہ حق سورج دیوتا کا مظہر ہونے کی بنیاد پر رکھتا ہے۔ حضرت موسیٰ (ع) نے جب معجزہ دکھا کر یہ اعلان کیا کہ رب العالمین کا نمائندہ میں ہوں تو سلطنت فرعون کی قانونی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا حضرت موسیٰ (ع) کا اعلان فرعون کا تختہ الٹنے کے اعلان کے مترادف تھا۔ اس کی سلطنت کے غیر قانونی ہونے کا اعلان تھا۔ اس کے اقتدار کا ظالمانہ ہونے کا انکشاف تھا۔ اگر موسیٰ (ع) کا رب، رب العالمین ہے تو حکم اس کا چلے گا، اطاعت اس کی ہو گی اور شریعت اس کی نافذ ہو گی۔ فرعون کی حکومت و سلطنت پر خط بطلان کھنچے گا۔

۲۔ قَالُوۡۤا اَرۡجِہۡ وَ اَخَاہُ: حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعونیوں نے اس لیے مہلت دی کہ جادو کو جادو سے توڑ دیا جائے تو مؤثر ثابت ہو گا، جب کہ فوری قتل وغیرہ سے ممکن ہے لوگ موسیٰ (ع) کو نبی برحق سمجھنے لگ جائیں۔

۳۔ یَاۡتُوۡکَ بِکُلِّ سٰحِرٍ عَلِیۡمٍ: مصر کی عبادت گاہوں میں کاہنوں کا یہی مشغلہ ہوتا تھا۔ تقریباً بت پرستوں میں سحر کو دین کے ساتھ مربوط گردانتے تھے۔ چنانچہ کاہنوں اور بتوں کے مجاوروں میں سحر کا عمل عام تھا۔

وَ جَآءَ السَّحَرَۃُ فِرۡعَوۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ ۱۱۳۔ اور جادوگر فرعون کے پاس آئے (اور) کہنے

لَنَا لَاَجۡرًا اِنۡ کُنَّا نَحۡنُ الۡغٰلِبِیۡنَ ﴿۱۱۳﴾	لگے: اگر ہم غالب رہے تو ہمیں صلہ ملے گا؟
قَالَ نَعَمۡ وَ اِنَّکُمۡ لَمِنَ الۡمُقَرَّبِیۡنَ ﴿۱۱۴﴾	۱۱۴۔ فرعون نے کہا: ہاں یقیناً تم مقرب بارگاہ ہو جاؤ گے۔
قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنۡ نَّکُوۡنَ نَحۡنُ الۡمُلۡقِیۡنَ ﴿۱۱۵﴾	۱۱۵۔ انہوں نے کہا: اے موسیٰ! پہلے تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں؟
قَالَ اَلۡقُوۡا ۚ فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا سَحَرُوۡۤا اَعۡیُنَ النَّاسِ وَ اسۡتَرۡہَبُوۡہُمۡ وَ جَآءُوۡ بِسِحۡرٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۱۶﴾	۱۱۶۔ موسیٰ نے کہا: تم پھینکو، پس جب انہوں نے پھینکا تو لوگوں کی نگاہوں کو مسحور اور انہیں خوفزدہ کر دیا اور انہوں نے بہت بڑا جادو پیش کیا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ جَآءَ السَّحَرَۃُ: ہر طاغوتی طاقت کے لیے ایسے درباریوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کے ساتھ وہ سودا کرتے ہیں کہ وہ طاغوتی طاقت کو دین و مذہب کا لبادہ پہنا دیں اور طاغوت ان کو مقرب درگاہ بنا دے۔

۲۔ قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِیَ: جادوگروں کی طرف حضرت موسیٰ (ع) کو پہل کرنے نہ کرنے کا اختیار دینا بتاتا ہے کہ وہ اپنی جادوگری پر بھرپور بھروسا رکھتے تھے۔ ان کا چیلنج بتاتا ہے کہ ان کو اپنی فتح پر یقین تھا۔

۳۔ قَالَ اَلۡقُوۡا: دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب بتاتا ہے کہ آپؑ ان کے اس چیلنج کو کوئی اہمیت دینے کے لیے حاضر نہیں ہیں اور نہایت بے اعتنائی سے فرمایا: تم پہل کرو تا کہ باطل اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرے، اپنی پوری طاقت صرف کریں اور حضرت موسیٰ (ع) کو ان کے جادو کے باطل ہونے کو ثابت کرنے کا موقع ملے۔ جب باطل اپنے تیر چلا چکے اور ترکش خالی کر دے تو اس فریب کے مقابلے میں حق بہتر طریقے پر اپنی حقانیت کو نمایاں کر سکتا ہے۔

۴۔ وَ جَآءُوۡ بِسِحۡرٍ عَظِیۡمٍ: فرعون کے جادوگروں نے جادو کا عظیم مظاہرہ کیا۔ اس جادوگری کا اہتمام اس قدر وسیع تھا کہ قرآن اس کو عظیم کہتا ہے اور قرآن کے مطابق یہ جادو مؤثر بھی تھا کہ دلوں پر خوف طاری ہوا۔ سورۂ طہ آیات ۶۶۔ ۶۷ میں فرماتا ہے:

فَاِذَا حِبَالُہُمۡ وَ عِصِیُّہُمۡ یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ مِنۡ سِحۡرِہِمۡ اَنَّہَا تَسۡعٰی ۝ فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِہٖ خِیۡفَۃً مُّوۡسٰی ۝	اتنے میں ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کی وجہ سے موسیٰ کو دوڑتی محسوس ہوئیں، پس موسیٰ نے اپنے اندر خوف محسوس کیا۔

البتہ حدیث معصوم میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ (ع) کو لوگوں کے گمراہ ہونے کا خوف لاحق ہو گیا تھا نہ کہ خود جادو سے خوفزدہ ہو گئے تھے۔

اہم نکات

۱۔ ہر باطل طاقت کو درباری وظیفہ خواروں کی ضرورت ہوتی ہے: اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

۱۱۷۔اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنا عصا پھینک دیں، چنانچہ اس نے یکایک ان کے خود ساختہ جادو کو نگلنا شروع کیا۔

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

۱۱۸۔ اس طرح حق ثابت ہوا اور ان لوگوں کا کیا دھرا باطل ہو کر رہ گیا۔

فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

۱۱۹۔ پس وہ وہاں شکست کھا گئے اور ذلیل ہو کر لوٹ گئے۔

تَلْقَفُ: (ل ق ف) لَقِف کے معنی کسی چیز کو ہوشیاری سے لینے کے ہیں اور یہ منہ اور ہاتھ دونوں سے لینے پر بولا جاتا ہے۔

يَاْفِكُوْنَ: (ا ف ك) اَلْاِفْك ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے صحیح رخ سے پھیر دی گئی ہو۔ اسی بنا پر ان ہواؤں کو جو اپنا اصلی رخ چھوڑ دیں مُؤتَفِکۃ کہا جاتا ہے۔ جھوٹ اور بہتان بھی اصلیت اور حقیقت سے پھرا ہوا ہوتا ہے، اس لیے اس پر بھی افك کا لفظ بولا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ: بعض مفسرین یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ یہ بات درست نہیں ہے کہ عصائے موسیٰ ان رسیوں اور ان لاٹھیوں کو نگل گیا ہو بلکہ تَلْقَفُ کا مطلب یہ ہے: عصا نے ان کے جادو کے باطل ہونے کو ظاہر کیا، ان کے جادو نے اگر نگاہوں کو مسحور کیا ہے تو تَلْقِيْف کا مطلب یہ ہوگا: اس کو عصا نے ختم کیا، رسیوں اور لاٹھیوں کو اپنی اصلی حالت میں دکھا دیا یا اس جادو کے پیچھے جو خفیہ عوامل تھے، ان کا انکشاف کیا، جس سے ان کے سحر کا راز کھل گیا اور بے اثر ہو گیا۔[1]

فرعونیوں کو جادو اور معجزے کا فرق معلوم تھا۔ اسی لیے حضرت موسیٰ (ع) کے معجزے کو جادو کہ کر رد کیا۔ لہٰذا عصائے موسیٰ (ع) نے صرف جادو کا اثر ختم کر کے ہر لاٹھی اور ہر رسی کو رسی نہیں دکھایا بلکہ عصائے

---

[1] تفسیر المنار ۹: ۶۸۔ تفہیم القرآن ۲: ۶۹

موسیٰ (ع) نے ان جادوؤں کے ساتھ ایسا عمل کیا کہ اس عمل کو دیکھ کر لوگوں کو علم ہوا کہ عصائے موسیٰ (ع) کا عمل جادو نہیں، حقیقت پر مبنی ایک معجزہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ طاقت کے غرور میں آنے والوں کا انجام، شکست اور ذلت وخواری ہے: وَانۡقَلَبُوۡا صٰغِرِیۡنَ۔

وَاُلۡقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیۡنَ ﴿۱۲۰﴾ — ۱۲۰۔ اور سب جادوگر سجدے میں گر پڑے۔

قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۲۱﴾ — ۱۲۱۔ کہنے لگے: ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے.

رَبِّ مُوۡسٰی وَ ہٰرُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾ — ۱۲۲۔ جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔

تفسیر آیات

وَاُلۡقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیۡنَ: حضرت موسیٰ (ع) کا معجزہ دیکھ کر جادوگر یقین کی اس منزل پر پہنچ گئے کہ اس یقین نے ان کو سجدے میں گرا دیا۔ جو لوگ جادو کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں ان پر اس معجزے کی حقانیت بہتر طریقے سے عیاں ہو جاتی ہے۔ اسی لیے یہ جادوگر چیلنج کے مقام سے تسلیم و رضا کی منزل، غرور سے سجدے کی منزل اور کفر و عناد سے ایمان و ایقان کی منزل پر فائز ہو گئے۔

اہم نکات

۱۔ حق کا مشاہدہ، کمال کا مشاہدہ ہے اور کمال کے سامنے سجدہ ریز ہونا ایک فطری امر ہے: وَاُلۡقِیَ السَّحَرَۃُ سٰجِدِیۡنَ۔

قَالَ فِرۡعَوۡنُ اٰمَنۡتُمۡ بِہٖ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَکُمۡ ۚ اِنَّ ہٰذَا لَمَکۡرٌ مَّکَرۡتُمُوۡہُ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ لِتُخۡرِجُوۡا مِنۡہَاۤ اَہۡلَہَا ۚ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾

۱۲۳۔ فرعون نے کہا: قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا تم اس پر ایمان لے آئے، یقیناً یہ تو ایک سازش ہے جو تم نے اس شہر میں کی ہے تاکہ اہل شہر کو یہاں سے بے دخل کرو، پس عنقریب تمہیں (اس کا انجام) معلوم ہو جائے گا۔

لَاُقَطِّعَنَّ اَیۡدِیَکُمۡ وَ اَرۡجُلَکُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّکُمۡ

۱۲۴۔ میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے ضرور کاٹوں گا پھر تم سب کو ضرور بالضرور

اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۱۲۴﴾ سولی چڑھا دوں گا۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ فِرۡعَوۡنُ: ایمان لانے والے جادوگر عبادت گاہوں کے کاہن لوگ تھے، جو سرکاری ملازمین اور معبود بادشاہ کے وظیفہ خوار تھے۔ جو کل حضرت موسیٰ (ع) کے دعوائے رسالت کو باطل ثابت کرنے کی انتھک کوشش کر رہے تھے، آج نہ صرف اس رسالت پر ایمان لاتے ہیں بلکہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔

طاغوت کو اپنی رعیت کی ہر حرکت اور ہر جنبش پر تسلط حاصل ہے اور اس مملکت میں اس کی اجازت کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ اس کی مرضی کے بغیر حضرت موسیٰ (ع) پر ایمان لانے پر برہم ہوتا ہے اور کہتا ہے: میری اجازت کے بغیر تم موسیٰ (ع) پر ایمان کیوں لائے۔ گویا طاغوت اس خیال میں ہوتا تھا کہ جس طرح لوگوں کی گردنوں پر اس کا تسلط قائم ہے، ان کے دلوں اور ضمیروں پر بھی اس کی حکومت ہے۔ وہ ہر رونما ہونے والے واقعے کو اپنے خلاف سازش سمجھتا ہے اور ہر بات پر اسے اپنے تخت و تاج کی فکر لاحق رہتی ہے کیونکہ اللہ کی طرف دعوت اور فرعونیت ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ تشدد، ظلم اور طاقت استعمال کرنا طاغوت کا پرانا طریقہ کار ہے اور حق کا مقابلہ کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

۲۔ اِنَّ هٰذَا لَمَكۡرٌ: موسیٰ اور یہ جادوگر، دونوں نے مل کر سازش کی ہے کہ وہ سرزمین مصر پر قابض ہو جائیں اور قبطیوں کو بے دخل کر دیں۔

۳۔ لَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ: ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا بقولے سب سے پہلے فرعون نے رائج کی ہے۔

اہم نکات

۱۔ دلیل اور منطق کے مقابلے میں طاقت استعمال کرنا طاغوت کی روش رہی ہے۔

۲۔ دل طاقت کے سامنے نہیں، دلیل و منطق کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔

قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾

۱۲۵۔ انہوں نے کہا: ہمیں تو اپنے رب کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

وَ مَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتۡنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۲۶﴾

۱۲۶۔ اور تو نے ہم میں کون سی بری بات دیکھی سوائے اس کے کہ جب ہمارے رب کی نشانیاں ہمارے پاس آئیں تو ہم ان پر ایمان لے آئے، اے ہمارے رب! ہم پر صبر کا فیضان فرما اور ہمیں اس دنیا سے مسلمان اٹھا لے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ: جو شخص ایمان کی لذت چکھ لیتا ہے، وہ موت سے خائف نہیں ہوتا بلکہ وہ اس وقتی اور زوال پذیر زندگی پر ابدی زندگی کو ترجیح دیتا ہے۔ اللہ کی نشانیوں کا بہت نزدیک سے مشاہدہ کرنے کے بعد جو ایمان لایا جائے، وہ ناقابل تزلزل ایمان ہوتا ہے۔ ایمان کی اس منزل پر فائز ہونے پر اگر سزا دی جائے تو اس پر مؤمن کیف محسوس کرتا ہے اور رضاً بقضائه و تسلیماً لامرِہٖ کا شیرین نعرہ بلند کرتا ہے۔

۲۔ وَ مَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ: طاغوت کے دستور میں سب سے بڑا جرم ایمان لانا ہے۔ چنانچہ آج کی طواغیت ایمان میں راسخ لوگوں کو اپنا حریف اور مجرم سمجھتی ہے۔

۳۔ رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا: طاغوت کے ظلم وستم کے خلاف مؤمن کا اسلحہ صبر ہے اور صبر ہمیشہ ظلم پر فتح حاصل کر لیتا ہے۔

۴۔ وَّ تَوَفَّنَا مُسۡلِمِیۡنَ: ہمارا خاتمہ اسلام پر، ایمان پر ہو۔ کہیں پیش آنے والے صعوبتیں ہم کو دین سے پھر نہ دیں۔ کہیں پیش آنے والے کسی امتحان میں رہ نہ جائیں۔ چنانچہ ہر ایک کو اپنا خاتمہ بخیر کرنے کے لیے اہتمام کرنا چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان بالمعاد یا مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان رکھنے والا اللہ کی بارگاہ میں جانے کا مشتاق ہوتا ہے: اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ۔

۲۔ طاغوت کے نزدیک مؤمن ہونا سب سے بڑا جرم ہے: وَ مَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا ...۔

وَ قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ اَتَذَرُ مُوۡسٰی وَ قَوۡمَہٗ لِیُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَ یَذَرَکَ وَ اٰلِہَتَکَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبۡنَآءَہُمۡ وَ نَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَہُمۡ ۚ وَ اِنَّا فَوۡقَہُمۡ قٰہِرُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾

۱۲۷۔ اور قوم فرعون کے سرداروں نے کہا: فرعون! کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو آزاد چھوڑ دے گا کہ وہ زمین میں فساد پھیلائیں اور وہ تجھ سے اور تیرے معبودوں سے دست کش ہو جائیں؟ فرعون بولا: عنقریب ہم ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیں گے اور ہمیں ان پر بالادستی حاصل ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَتَذَرُ مُوۡسٰی : درباریوں نے کہا: موسیٰ اور اس کی قوم زمین میں فساد پیدا کر رہے ہیں۔ ان کو زندگی کا حق نہیں ملنا چاہیے۔

۲۔ وَیَذَرَکَ وَ اٰلِـہَتَکَ : دوسرا جرم یہ ہے کہ موسیٰ خود آپ سے اے فرعون اور آپ کے معبود سے کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں۔

۳۔ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبۡنَآءَہُمۡ : اس آیت میں جہاں فرعون کی طرف سے اسرائیلیوں کی نسل کشی کا ذکر ملتا ہے، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اپنی رعیت کا معبود تھا اور خود فرعون کا کوئی اور معبود تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں قدیم مصری آثار کا کتبہ نکلا ہے جو اس وقت مصری میوزم میں کتبہ ۳۴۰۲۵ میں محفوظ ہے۔ اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے:

> جب سے دیوتا وجود میں آیا ہے، اس وقت سے مصر معبود رَع کی واحد نسل ہے اور منفتاح اسی معبود کی نسل ہے اور معبود شو کے تخت نشین ہیں اور معبود رَع نے مصر کی طرف نظر ڈالی۔ اس سے منفتاح پیدا ہوا اور اسرائیل کو مٹا دیا گیا۔ اس کا بیج بھی باقی نہ رہا اور فلسطین مصر کے زیر سلطنت آیا۔[1]

یعنی نسل کشی کی وہی مہم جاری رکھیں گے جو حضرت موسیٰ (ع) کی ولادت سے پہلے بھی تھی۔

اہم نکات

۱۔ درباری وظیفہ خوار ہمیشہ انسان سوز مظالم کا مشورہ دیتے ہیں: اَتَذَرُ مُوۡسٰی وَ قَوۡمَہٗ ....۔

۲۔ طاقت کے نشے میں اٹھنے والا قدم خود اس کی پسپائی کا سبب بنتا ہے: وَ اِنَّا فَوۡقَہُمۡ قٰہِرُوۡنَ۔

قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہِ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِاللّٰہِ وَ اصۡبِرُوۡا ۚ اِنَّ الۡاَرۡضَ لِلّٰہِ ۟ۙ یُوۡرِثُہَا مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ ؕ وَ الۡعَاقِبَۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۲۸﴾

۱۲۸۔ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر کرو، بے شک یہ سرزمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور نیک انجام اہل تقویٰ کے لیے ہے۔

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے الٰہی مزاج میں اپنی قوم کی اس نہج پر تربیت فرما رہے ہیں کہ وہ فرعون

---

[1] المنار ۹: ۸۰

کی مادی اور ظاہری طاقت سے مرعوب نہ ہوں بلکہ ان کو اس کائنات میں طاقت کے حقیقی سرچشمے کے ساتھ وابستہ رہنے کی تلقین فرمائی اور فتح و نصرت کے وہ اصول بتلائے جو اس کائنات پر حاکم ہیں۔

اہم نکات

۱۔ طاقت کے حقیقی سرچشمہ اللہ ہی سے مدد طلب کرو۔ اسۡتَعِیۡنُوۡا بِاللّٰہِ...۔

۲۔ سفر لمبا اور مشکلات گھمبیر ہی کیوں نہ ہوں، صبر کا دامن تھام لو۔ وَ اصۡبِرُوۡا

۳۔ اللہ اپنے خاص بندوں کو زمین کا وارث بناتا ہے، اس کے اہل بنو۔ اِنَّ الۡاَرۡضَ لِلّٰہِ ۟ۙ یُوۡرِثُہَا ...۔

۴۔ اہل بننے کا واحد راستہ تقویٰ کا راستہ ہے۔ وَالۡعَاقِبَۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ۔

قَالُوۡۤا اُوۡذِیۡنَا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَاۡتِیَنَا وَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جِئۡتَنَا ؕ قَالَ عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یُّہۡلِکَ عَدُوَّکُمۡ وَ یَسۡتَخۡلِفَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۹﴾

۱۲۹۔ (قوم موسیٰ نے) کہا: آپ کے آنے سے پہلے بھی ہمیں اذیت دی گئی اور آپ کے آنے کے بعد بھی، موسیٰ نے کہا: تمہارا رب عنقریب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور زمین میں تمہیں خلیفہ بنا کر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالُوۡۤا اُوۡذِیۡنَا: بنی اسرائیل کا لب و لہجہ مایوس اور تھکے ہوئے لوگوں کا لہجہ ہے کہ کہتے ہیں: اے موسیٰ! آپ کے آنے سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہم برابر مصیبتوں کا شکار تھے۔ اب بھی شکار ہو رہے ہیں، جب کہ ہمارے ساتھ وعدہ تھا کہ موسیٰ کے آنے پر ہم کو فرعون کے مظالم سے آزادی ملے گی۔

۲۔ قَالَ عَسٰی رَبُّکُمۡ: حضرت موسیٰ (ع) نے ان کے جواب میں اس وعدے کا اعادہ فرمایا کہ تمہارا دشمن ہلاک ہوگا۔ تم اس کی جگہ فرمانروا ہو گے۔

فَیَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ: پھر تمہارا کردار دیکھا جائے گا۔ ایسا نہیں کہ یہ وعدہ، یہ اقتدار اور یہ نعمتیں تمہارا ذاتی حق ہیں بلکہ تم کو اپنے عمل و کردار سے ان چیزوں کا مستحق بننا ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ حق کا سفر لمبا، صبر آزما اور کٹھن ہوتا ہے: اُوۡذِیۡنَا مِنۡ قَبۡلِ ....۔

۲۔ زمین کا وارث بننے کے بعد بدکرداروں کی وجہ سے نعمتیں سلب ہو سکتی ہیں: فَیَنۡظُرَ کَیۡفَ

تَعۡمَلُوۡنَ۔

وَلَقَدۡ اَخَذۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ بِالسِّنِیۡنَ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ﴿۱۳۰﴾

۱۳۰۔ اور بتحقیق ہم نے آل فرعون کو قحط سالی اور پیداوار کی قلت میں مبتلا کیا، شاید وہ نصیحت حاصل کریں۔

فَاِذَا جَآءَتۡهُمُ الۡحَسَنَةُ قَالُوۡا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوۡا بِمُوۡسٰی وَمَنۡ مَّعَهٗ ؕ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَهُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳۱﴾

۱۳۱۔ پس جب انہیں آسائش حاصل ہوتی تو کہتے: ہم اس کے مستحق ہیں اور اگر برا زمانہ آتا تو اسے موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی بدشگونی ٹھہراتے، آگاہ رہو! ان کی بدشگونی اللہ کے پاس ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تشریح کلمات

سنین: (س ن و) سنة کی جمع۔ اس کے معنی سال کے ہیں۔ زیادہ تر سنة کا لفظ قحط والے سال کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

یَّطَّیَّرُوۡا۔ (ط ی ر) تطیر۔ اس کے اصل معنی کسی پرندہ سے شگون لینے کے ہیں۔ پھر یہ ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہونے لگا ہے جس سے برا شگون لیا جائے اور اسے منحوس سمجھا جائے۔ چونکہ بعض پرندوں، جیسے کوے سے بدشگونی لیتے تھے۔ اس سے ہر بدشگونی کے لیے تطیر کہہ دیا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ اَخَذۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ: فرعونیوں نے پہلے قحط سالی نہیں دیکھی تھی۔ حضرت موسیٰ (ع) کی نافرمانی پر قحط سالی آ گئی تو بجائے اس کے کہ اس کو عذاب الٰہی اور معجزہ موسیٰ (ع) تصور کریں، اس کے برعکس اس کو حضرت موسیٰ (ع) کی بدشگونی قرار دیا حالانکہ یہ موسیٰ (ع) کی بدشگونی نہیں، یہ اللہ کی طرف سے عذاب ہے۔

۲۔ فَاِذَا جَآءَتۡهُمُ الۡحَسَنَةُ: جب ملک میں شادابی اور خوشحالی آجاتی تو کہتے تھے یہ خوشحالی ہماری وجہ سے آئی ہے یا ہمارے معبودوں کی طرف سے ہے۔

۳۔ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَیِّئَةٌ: اگر کوئی برا وقت آتا تو وہ اس کو عذاب الٰہی اور معجزہ موسیٰ (ع) کہنے کی جگہ حضرت موسیٰ (ع) کی بدشگونی سمجھتے تھے۔ ہوسکتا ہے شروع میں اسے بدشگونی قرار دے کر اپنے عوام کی

توجہ حضرت موسیٰ (ع) سے ہٹانے کی کوشش کی گئی ہو۔ چونکہ اسی سورہ کی آیت ۱۳۴ میں آیا ہے کہ وہ اسے حضرت موسیٰ (ع) کا معجزہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے اگر آپ نے یہ عذاب ہم سے دور کر دیا تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

۴۔ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ: ان کے لیے یہ بدشگونی اللہ کی طرف سے ہے۔ یعنی یہ عذاب الٰہی ہے، موسیٰ (ع) کی بدشگونی نہیں ہے۔

بدشگونی کی شرعی حیثیت: اگرچہ شرعاً نیک شگونی کے اثرات تسلیم کیے گئے ہیں لیکن بدشگونی کو قبول کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

اجتنب خمساً: الحسد، الطیرة، البغی و سوء الظن و النمیمة۔[1]

پانچ چیزوں سے اجتناب کرو۔ حسد، بدشگونی، زنا، بدگمانی اور چغل خوری سے۔

حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

...وَ الطِیَرَۃُ لَیْسَتْ بِحَقٍّ۔[2]

بدشگونی حق پر مبنی نہیں ہے۔

بدشگونی کے بے حقیقت ہونے پر دلیل، مختلف اقوام میں موجود متضاد بدشگونیاں ہیں۔ مثلاً بعض اقوام میں کوے کا بولنا جدائی اور بعض اقوام میں وصال کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ جب عذاب الٰہی سے عبرت لینے کی بجائے اس کی تاویل و توجیہ کرتے ہیں تو ایسی قوم ناقابل ہدایت ہوتی ہے۔

۲۔ بدشگونی اللہ پر بھروسے کے منافی ہے۔

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

۱۳۲۔ اور کہنے لگے: اے موسیٰ: ہم پر جادو کرنے کے لیے خواہ کیسی نشانی لے آؤ ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۟ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

۱۳۳۔ پھر ہم نے بطور کھلی نشانیوں کے ان پر طوفان، ٹڈی دل، جوؤں، مینڈکوں اور خون (کا عذاب) نازل کیا مگر وہ تکبر کرتے رہے اور وہ جرائم پیشہ لوگ تھے۔

۱۔ مستدرک الوسائل: ۱۲: ۸۲　　۲۔ نہج البلاغۃ حکمت ۴۰۰

تفسیر آیات

۱۔ مَهۡمَا تَاۡتِنَا بِهٖ مِنۡ اٰيَةٍ: کتنے ہی معجزے پیش کرو۔ اس جملے سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ معجزے بہت پیش کئے گئے لیکن وہ ان معجزوں کو جادو سے تعبیر کر کے حضرت موسیٰ (ع) کو مایوس کرنا چاہتے ہیں کہ ہم تم کو ان معجزوں کی وجہ سے نہیں مانیں گے۔

دل میں جب کسی سے عناد آ جاتا ہے تو اس کی کوئی خوبی، دلیل اور منطق دلنشین نہیں ہوتی۔ فرعونیوں کو حضرت موسیٰ (ع) اور بنی اسرائیل کے ساتھ نہایت قلبی عناد تھا۔ اس لیے انہوں نے صریحاً کہا: موسیٰ (ع) آپ لاکھ معجزے پیش کریں، ہم ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ جیسا کہ آج مغرب اور مغرب زدہ ذہنوں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اسلام کے پیش کردہ جامع نظام حیات کو ایک معجزہ سمجھنے کی بجائے الٹا اس کے خلاف نتیجے نکالتے اور زہر افشانی کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

۲۔ طوفان، شدید اور ہمہ گیر حادثے کو کہتے ہیں۔ بعض نے طوفان سے مراد موت یا وبائی مرض بھی لیا ہے۔ توریت میں آیا ہے کہ آسمان سے آتشیں ژالہ باری ہوئی اور اس نے مصر کے تمام شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔[1]

۳۔ ٹڈی دل نے مصر کی زراعت کو تباہ کر دیا۔ توریت میں طوفان کے بعد اس کا ذکر آیا ہے۔

۴۔ قمل، جوئیں یا مطلق گندے کیڑے۔ راغب نے لکھا ہے کہ قمل چھوٹی مکھیوں کو کہتے ہیں۔ توریت نے بھی چھوٹی مکھیوں کا ذکر کیا ہے کہ یہ مکھیاں مصریوں کے گھروں میں گھس جاتی تھیں۔ صرف بنی اسرائیل کے افراد محفوظ رہتے تھے۔

۵۔ مینڈک۔ توریت خروج فصل ۸ میں آیا ہے کہ نہریں مینڈکوں سے پر ہو گئیں۔ وہاں سے وہ فرعونیوں کے گھروں، بستروں اور ہر جگہ پھیل جاتے تھے۔

۶۔ خون۔ دریائے نیل مصریوں کے لیے خونیں ہو گیا۔ توریت فصل ۷ میں آیا ہے کہ مصریوں کے لیے ان کی نہریں اور تالاب، گھاٹ، جہاں جہاں پانی تھا، سب خون ہو گئے۔ مصر کی ساری سرزمین خونیں ہو گئی۔ لکڑی اور پتھر میں بھی خون آ گیا۔

اہم نکات

۱۔ عناد اور عداوت انسان کو بہرا گونگا کر دیتی ہے اور حق کے سامنے بدترین رکاوٹ ہے: مَهۡمَا تَاۡتِنَا بِهٖ مِنۡ اٰيَةٍ ....

۲۔ جب کوئی مجرم بنتا ہے تو اس پر کوئی دلیل اور معجزہ اثر نہیں کرتا: كَانُوۡا قَوۡمًا مُّجۡرِمِيۡنَ۔

---

[1] خروج ۹: ۲۳۔ ۲۷

وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيۡهِمُ الرِّجۡزُ قَالُوۡا يٰمُوۡسَى ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنۡدَكَ ۚ لَئِنۡ كَشَفۡتَ عَنَّا الرِّجۡزَ لَنُؤۡمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرۡسِلَنَّ مَعَكَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۚ﴿۱۳۴﴾

۱۳۴۔اور جب ان پر کوئی بلا نازل ہو جاتی تو کہتے: اے موسیٰ! ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کریں جیسا کہ اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے (کہ وہ آپ کی دعا سنے گا) اگر آپ نے ہم سے عذاب دور کر دیا تو ہم آپ پر ضرور ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی ضرور آپ کے ساتھ جانے دیں گے۔

تشریح کلمات

الرِّجۡزَ : (ر ج ز) اضطراب۔ عذاب کے لیے کنایۃً استعمال کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيۡهِمُ: نزول عذاب کے موقع پر وہ موسیٰ (ع) سے درخواست کرتے تھے کہ اپنے رب سے التجا کریں کہ وہ ہم سے یہ عذاب ٹال دے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اور فرعونیوں نے قلباً مان لیا تھا کہ یہ عذاب موسیٰ (ع) کے رب کی طرف سے ہے اور بِمَا عَهِدَ عِنۡدَكَ جیسا کہ آپ کے رب نے آپ سے عہد کر رکھا ہے، اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعونی اس بات کی طرف بھی متوجہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (ع) سے عہد کر رکھا ہے کہ ان کی دعا کو نہیں ٹالے گا۔

تقریباً یہی مضمون توریت میں بھی ملتا ہے:

> تب فرعون نے موسیٰ اور ہارون علیہا السلام کو بلایا اور کہا کہ خداوند سے شفاعت کرو کہ مینڈکوں کو مجھ سے اور میری رعیت سے دفع کرے اور میں ان لوگوں کو جانے دوں گا۔[1]

فَلَمَّا كَشَفۡنَا عَنۡهُمُ الرِّجۡزَ اِلٰۤى اَجَلٍ هُمۡ بٰلِغُوۡهُ اِذَا هُمۡ يَنۡكُثُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ فِى الۡيَمِّ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ ﴿۱۳۶﴾

۱۳۵۔ پھر جب ہم ایک مقررہ مدت کے لیے جس کو وہ پہنچنے والے تھے، عذاب کو دور کر دیتے تو وہ عہد کو توڑ ڈالتے۔

۱۳۶۔ تب ہم نے ان سے انتقام لیا، پھر انہیں دریا میں غرق کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور وہ ان سے لاپرواہی برتتے تھے۔

---

[1] خروج ۹: ۲۱۔۲۷

تشریح کلمات

يَنْكُثُوْنَ: (ن ك ث) النکث کے معنی کمبل یا سوت ادھیڑنے کے ہیں اور قریب قریب نقضٌ کے ہم معنی ہے۔ بطور استعارہ عہد شکنی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

نقم: (ن ق م) کسی چیز کو برا سمجھنا۔ یہ کبھی زبان کے ساتھ عیب لگانے اور کبھی عقوبت (سزا دینے) پر بولا جاتا ہے۔

انتقمنا: ہم نے بدلہ لیا۔

اليَمِّ: (ی م م) دریا، سمندر۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ: یعنی ایک مدت تک ہم ان سے عذاب ٹالتے رہے۔ جب وہ مدت ختم ہوئی تو ہم نے ان کو غرق آب کر دیا یا اِلٰٓى اَجَلٍ کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ہر مرتبہ عذاب ٹلنے کے بعد ایک مدت ان کو مہلت دی جاتی تھی۔ اس میں وہ عہد شکنی کرتے تو دوبارہ عذاب آ جاتا۔ چونکہ عذاب متعدد آتے رہے ہیں۔

۲۔ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ: جب یہ اَجَلٍ اور مدت ختم ہوگئی تو ہم نے ان کو غرق آب کر دیا اور اس کی وجہ انتقام ایک تو تکذیب معجزات اور دوسری ان معجزوں کی حقانیت سے غفلت برتنا ہے۔ جیسا کہ آج بھی ہمارا معاشرہ اسلامی انسان ساز تعلیمات سے نہایت غفلت کا شکار ہے۔

فرعون کے غرق ہونے کے سلسلے میں تفصیل ملاحظہ ہو سورہ بقرہ آیت ۵۰۔

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

۱۳۷۔ اور ہم نے ان لوگوں کو جو بے بس کر دیے گئے تھے اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنایا جسے ہم نے برکتوں سے نوازا تھا اور بنی اسرائیل کے ساتھ آپ کے رب کا نیک وعدہ پورا ہو گیا کیونکہ انہوں نے صبر کیا تھا اور فرعون اور اس کی قوم جو کچھ بناتے کرتے تھے اور جو اونچی عمارتیں تعمیر کرتے تھے وہ سب کچھ ہم نے تباہ کر دیا۔

تشریح کلمات

دَمَّرۡنَا : (د م ر) التدمیر۔ کسی چیز پر ہلاکت ڈالنا۔

یَعۡرِشُوۡنَ: (ع ر ش) العرش چھت والی چیز کو کہتے ہیں۔ یَعۡرِشُوۡنَ کے معنی یَبۡنُوۡنَ یعنی عمارتیں بناتے ہیں، بھی منقول ہے۔ انگور کی بیل، بانس وغیرہ کی ٹہنی بنانے کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اَوۡرَثۡنَا الۡقَوۡمَ: جس سرزمین کا بنی اسرائیل کو وارث بنایا گیا ہے، اس کے بارے میں دو نظریے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ اس سرزمین سے مراد فلسطین اور شام کی سرزمین ہے۔ اس پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فلسطین کے نواح میں ارض مقدس کو مبارک سرزمین کہا ہے:

وَنَجَّیۡنٰہُ وَلُوۡطًا اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا لِلۡعٰلَمِیۡنَ ۞ [۱]	اور ہم ابراہیم اور لوط کو بچا کر اس سرزمین کی طرف لے گئے جسے ہم نے عالمین کے لیے بابرکت بنایا ہے.
سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ ...۔ [۲]	پاک ہے وہ جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے اس مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے گرد و پیش میں ہم نے برکتیں رکھیں ....

اور جس سرزمین کا بنی اسرائیل کو وارث بنایا گیا ہے اس کو برکت والی زمین کہا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے صرف دو زمینوں کو برکت والی زمین کہا ہے: ایک نواحی فلسطین کی سرزمین اور دوسری مکہ کی سرزمین کو۔

۲۔ وَتَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ الۡحُسۡنٰی عَلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ: کلمہ رب سے مراد وعدہ اور فیصلہ الٰہی ہے جو بنی اسرائیل کے بارے میں کیا تھا اور اس کلمہ رب کو الۡحُسۡنٰی خیر و خوبی کے ساتھ متصف فرمایا کہ یہ وعدہ خیر تھا جو بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ آج پورا ہو گیا۔

۳۔ بِمَا صَبَرُوۡا: جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام و اکرام ہوا وہ اس صبر کا پھل تھا جو بنی اسرائیل نے کیا اور مصر میں غلامی کی صعوبتیں برداشت کیں۔

اس تفسیر کے مطابق مشارق سے مراد حدود شام اور مغارب سے مراد حدود مصر ہے۔ یعنی ارض مقدس کے مشرقی اور مغربی علاقے مراد ہیں اور وارث اس لیے کہا ہے کیونکہ مصر اور شام کی سرزمینوں پر فرعون مصر کی حکومت قائم تھی اور عمالقہ کی بھی حکومت رہی ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ارض مصر کا بھی وارث بنایا۔ چنانچہ تاریخی شواہد پیش کرتے ہیں کہ مصر پر ۱۳ سال تک بنی اسرائیل کی حکومت قائم رہی ہے۔

---

[۱] ۲۱ انبیاء: ۷۱ [۲] ۱۷ اسراء: ۱

اہم نکات

۱۔ صبر و تحمل کی وجہ سے ہی بنی اسرائیل کو مقدس سرزمین کا وارث بنایا: بِمَا صَبَرُوۡا ....

۲۔ مستضعف اور ستم رسیدہ قوموں کو اللہ زمین کا وارث بناتا ہے: وَ اَوۡرَثۡنَا الۡقَوۡمَ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا یُسۡتَضۡعَفُوۡنَ ....

وَ جٰوَزۡنَا بِبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡبَحۡرَ فَاَتَوۡا عَلٰی قَوۡمٍ یَّعۡکُفُوۡنَ عَلٰۤی اَصۡنَامٍ لَّہُمۡ ۚ قَالُوۡا یٰمُوۡسَی اجۡعَلۡ لَّنَاۤ اِلٰـہًا کَمَا لَہُمۡ اٰلِـہَۃٌ ؕ قَالَ اِنَّکُمۡ قَوۡمٌ تَجۡہَلُوۡنَ ﴿۱۳۸﴾

۱۳۸۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا پار کرایا تو وہ ایسے لوگوں کے پاس پہنچ گئے جو اپنے بتوں کی پوجا پاٹ میں لگے ہوئے تھے، کہنے لگے: اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایسا معبود بنا جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں، موسیٰ نے کہا: تم تو بڑی نادان قوم ہو۔

تشریح کلمات

اَصۡنَامٍ: (ص ن م) صنم کے معنی بت کے ہیں جو کہ چاندی، پیتل یا لکڑی وغیرہ کا بنا ہوا ہو۔ بعض کے نزدیک ہر وہ پتھر جسے خدا کے سوا پوجا جائے بلکہ ہر وہ چیز جو انسان کو خدا تعالیٰ سے بیگانہ بنا دے اور اس کی توجہ کو کسی دوسرے کی طرف مبذول کر دے، صنم کہلاتی ہے۔ (راغب)

یَّعۡکُفُوۡنَ: (ع ك ف) العکوف۔ تعظیماً کسی چیز پر متوجہ ہونا اور اس سے وابستہ رہنا۔ اصطلاح شریعت میں الاعتکاف کے معنی ہیں عبادت کی نیت سے مسجد میں رہنا اور اس سے باہر نہ نکلنا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاَتَوۡا عَلٰی قَوۡمٍ: بنی اسرائیل دریا عبور کر کے جزیرہ نمائے سینا کے علاقوں میں داخل ہوئے تو یہاں مختلف آبادیاں موجود تھیں۔ ان میں سے کسی قوم کا ذکر ہے جو بتوں کی پوجا پاٹ میں مصروف تھی۔ ممکن ہے یہ قوم عمالقہ سے متعلق ہو اور ممکن ہے عرب کا ایک قبیلہ بنی لخم ہو جو مصر کی حدود میں آباد تھا۔ جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے۔

بعض اہل قلم کے مطابق یہاں مصری ہی آباد تھے جو اس علاقے میں موجود تانبے اور فیروزے کی کانوں کی محافظت پر مامور تھے۔ صحرائے سینا کا مغربی اور شمالی حصہ مصر کی سلطنت میں شامل تھا۔ اس علاقے میں مَفۡقَۃ نامی جگہ پر ایک بڑا بت خانہ تھا، جس کے آثار اب بھی موجود ہیں اور اسی علاقے میں سامی قوموں

کی چاند دیوی کا بت خانہ بھی تھا۔ ممکن ہے بنی اسرائیل کا گزر انہیں بت خانوں میں سے کسی سے ہوا ہو۔

اسلامی مؤرخ بن جریج کے مطابق ان کے بت تانبے کے بنے ہوئے گوسالہ کی شکل میں تھے۔ یہ روایت قرین قیاس ہے۔ کیونکہ یہ بات اپنی جگہ ثابت ہے کہ قدیم مصری لوگ گوسالہ کی پرستش کرتے تھے جس کو وہ ابیس کے نام سے یاد کرتے تھے۔ بنی اسرائیل دور غلامی میں مصریوں کے ساتھ ایک طویل مدت تک گوسالہ پرستی کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ سامری نے گوسالہ کا بت اسی بنا پر بنایا تھا کہ بنی اسرائیل اس سے خاصے مانوس تھے۔ چنانچہ قرآنی تعبیر ہے:

وَاُشۡرِبُوۡا فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡعِجۡلَ ....[1]	اور ان کے دلوں میں گوسالہ رچ بس گیا...۔

۲۔ قَالُوۡا یٰمُوۡسَی اجۡعَلۡ لَّنَاۤ اِلٰـہًا: بنی اسرائیل اپنے توحید کے پیامبر موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کرتے ہیں: ان بت پرستوں کے معبود کی طرح ہمارے لیے ایک معبود بت بنا دیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ صرف فرعون کے ظلم سے بچنے کے لیے مصر سے نکلے ہیں۔ کسی مذہبی عقیدے کی وجہ سے خاص کر عقیدہ توحید کی وجہ سے نہیں نکلے۔ ان سے تو وہ ساحرین بہتر ثابت ہوہے جو دین توحید کو سمجھ سکے تھے جنہوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور توحید سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔

۳۔ قَالَ اِنَّکُمۡ قَوۡمٌ تَجۡہَلُوۡنَ: حضرت موسیٰ (ع) نے اس بت طلبی کی وجہ ان کی جہالت بتائی۔

اہم نکات

۱۔ اپنے رہبر کو چھوڑ کر اغیار پر نظر جمانے اور ان سے متاثر ہونے والی قوم میں ذلت و رسوائی سے دوچار ہوتی ہیں: اجۡعَلۡ لَّنَاۤ اِلٰـہًا کَمَا لَہُمۡ اٰلِـہَۃٌ ....

۲۔ گمراہی و اغیار پرستی کا بنیادی سبب جہالت ہے: اِنَّکُمۡ قَوۡمٌ تَجۡہَلُوۡنَ۔

اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا ہُمۡ فِیۡہِ وَ بٰطِلٌ مَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ﴿۱۳۹﴾

۱۳۹۔ یہ قوم جس روش پر گامزن ہے یقیناً برباد ہونے والی ہے اور جو اعمال یہ انجام دیتے ہیں وہ باطل ہیں۔

قَالَ اَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡغِیۡکُمۡ اِلٰـہًا وَّ ہُوَ فَضَّلَکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ﴿۱۴۰﴾

۱۴۰۔ موسیٰ نے کہا: کیا میں تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی اور معبود تلاش کروں؟ حالانکہ اس نے تمہیں عالمین پر فضیلت دی ہے۔

تشریح کلمات

مُتَبَّرٌ: (ت ب ر) التبر۔ توڑ دینا۔ ہلاک کر دینا۔

---

[1] ۲ بقرہ: ۹۳

تفسیر آیات

بت پرستی کا مذہب اصولاً و فروعاً درست نہیں ہے۔ جو نظریہ اور عقیدہ یہ لوگ رکھتے ہیں وہ تباہ کن عقیدہ ہے: مُتَبَّرٌ مَّا هُمۡ فِيۡهِ۔ کیونکہ ہلاکت کے لیے عقیدہ ہی بنیاد ہے اور اس غلط عقیدے کی بنیاد پر بجا لانے والا عمل باطل اور بے سود ہے: وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ...۔

اس کے بعد فرمایا: بت پرستی اگرچہ کسی بھی قوم کو زیب نہیں دیتی مگر بنی اسرائیل تو اس وقت توحید کے علمبردار اور اقوام عالم کی قیادت کے ذمے دار ہیں۔ ان کے لیے بت پرستی نہایت ہی مجرمانہ عمل ہے۔

اہم نکات

۱۔ عقیدہ کی نادرستی باعث ہلاکت ہے: : مُتَبَّرٌ مَّا هُمۡ فِيۡهِ ...۔

۲۔ عمل کی نادرستی سے ثواب نہیں ملتا ہے۔ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ...۔

وَ اِذۡ اَنۡجَيۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَ يَسۡتَحۡيُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ ؕ وَ فِيۡ ذٰلِكُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِيۡمٌ ﴿۱۴۱﴾

۱۴۱۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تمہیں آل فرعون سے نجات دی جو تمہیں بدترین عذاب میں مبتلا کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ کی تفسیر سورہ بقرہ آیت ۴۹ میں ملاحظہ فرمائیں۔

وَ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰى ثَلٰثِيۡنَ لَيۡلَةً وَّ اَتۡمَمۡنٰهَا بِعَشۡرٍ فَتَمَّ مِيۡقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرۡبَعِيۡنَ لَيۡلَةً ۚ وَ قَالَ مُوۡسٰى لِاَخِيۡهِ هٰرُوۡنَ اخۡلُفۡنِيۡ فِيۡ قَوۡمِيۡ وَ اَصۡلِحۡ وَ لَا تَتَّبِعۡ سَبِيۡلَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴿۱۴۲﴾

۱۴۲۔ اور ہم نے موسیٰ سے تیس (۳۰) راتوں کا وعدہ کیا اور دس (دیگر) راتوں سے اسے پورا کیا، اس طرح ان کے رب کی مقررہ میعاد چالیس راتیں پوری ہو گئی اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا: میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور اصلاح کرتے رہنا اور مفسدوں کا راستہ اختیار نہ کرنا۔

تفسیر آیات

فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کرنے اور بنی اسرائیل کو ایک آزاد اور مستقل قوم کی حیثیت حاصل ہونے کے بعد حضرت موسیٰ (ع) پر شریعت نازل ہونا شروع ہو گئی اور احکام شریعت کا بوجھ اٹھوانے کے لیے حضرت موسیٰ (ع) کو چالیس راتوں کے لیے اپنی بارگاہ میں کوہ طور پر بلایا۔

حضرت موسیٰ (ع) نے چالیس دن کوہ طور پر گزارے ہیں جن میں دن رات دونوں شامل تھے۔ اس کے باوجود رات کا ذکر کیا، چونکہ رات کو پوری یکسوئی سے مناجات کرتے تھے۔ چنانچہ رسالتمآبؐ کے لیے بھی رات کا وقت انتخاب فرمایا:

اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیۡلِ ہِیَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّ اَقۡوَمُ قِیۡلًا ؕ[1] رات کا اٹھنا ثبات قدم کے اعتبار سے زیادہ محکم اور سنجیدہ کلام کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہے۔

اسی لیے حضورؐ پر مکہ میں جب ابتدائی احکام نازل ہونے شروع ہو گئے تو حکم ہوا:

قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ۙ[2] رات کو اٹھا کیجیے مگر کم۔

اس کی وجہ یہ بھی بتائی:

اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ﴿۵﴾[3] عنقریب آپ پر ہم ایک بھاری حکم (کا بوجھ) ڈالنے والے ہیں۔

حضرت ہارون (ع) کو اپنی غیبت کے دنوں کے لیے خلیفہ بنایا کہ اس مختصر سی مدت میں بھی لوگ گمراہ نہ ہوں۔ حضرت ہارون(ع) شریک نبوت اور معصوم تھے۔ ان سے اصلاح ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود اصلاح کرنے اور مفسد لوگوں کا راستہ اختیار نہ کرنے کا حکم اس لیے دیا ہو گا کہ بنی اسرائیل کے اندر موجود مفسدوں کے کہنے میں نہ آئیں۔ جیسا کہ سامری کے واقعہ میں ظاہر ہوا۔

ہر رہنما اور ہر اجتماعی مسئولیت رکھنے والا اپنی غیبت کے دنوں کے لیے کسی کو نائب اور خلیفہ بناتا ہے۔ بقول تھانوی کے، اس میں اصل ہے شیوخ کے اس عمل کی کہ اپنے مریدوں کو خلفاء کے سپرد کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں مریدوں کو خلفاء کے سپرد کرنے کے لیے سیرت انبیاء میں مأخذ آپ کو مل جاتا ہے لیکن خود انبیاء کی سیرت میں اس اصل کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ عبادت و مناجات کے لیے انبیاء و ائمہ طاہرین علیہم السلام رات کا وقت انتخاب کرتے تھے۔

۲۔ زمین حجت خدا سے کبھی خالی نہیں رہ سکتی۔ ہر نبی اپنے بعد امت کے لیے ایک حجت خدا کا

---

[1] ۷۳ مزمل: ۶ [2] ۷۳ مزمل: ۲ [3] ۷۳ مزمل: ۵

تعین فرماتا ہے: اخۡلُفۡنِیۡ فِیۡ قَوۡمِیۡ ....

وَ لَمَّا جَآءَ مُوۡسٰی لِمِیۡقَاتِنَا وَ کَلَّمَہٗ رَبُّہٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ ؕ قَالَ لَنۡ تَرٰىنِیۡ وَ لٰکِنِ انۡظُرۡ اِلَی الۡجَبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوۡفَ تَرٰىنِیۡ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّ خَرَّ مُوۡسٰی صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبۡحٰنَکَ تُبۡتُ اِلَیۡکَ وَ اَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۴۳﴾

۱۴۳۔ اور جب موسیٰ ہماری مقررہ میعاد پر آئے اور ان کے رب نے ان سے کلام کیا تو کہنے لگے: پروردگارا! مجھے (جلوہ) دکھا کہ میں تیرا دیدار کروں، فرمایا: تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھو، پس اگر وہ اپنی جگہ قائم رہا تو تم مجھے دیکھ سکو گے، پھر جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑے، پھر جب ہوش میں آئے تو عرض کرنے لگے: پاک ہے تیری ذات میں تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں اور میں ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا ہوں۔

تشریح کلمات

تَجَلّٰی: (ج ل و) الجلو کے اصل معنی کسی چیز کے نمایاں طور پر ظاہر ہو جانے کے ہیں۔ راغب کہتے ہیں کہ تجلی کبھی بالذات ہوتی ہے جیسے وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى [1] قسم ہے دن کی جب نمایاں روشن ہو جائے اور کبھی بذریعہ امر اور فعل کے ہوتی ہے جیسے: فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلۡجَبَلِ۔ (راغب)

دَکًّا: (د ك ك) الدك نرم اور ہموار زمین۔ دکہ دکاً کوٹ کر ہموار کرنے کے معنوں میں ہے۔ اسی سے دکان ہے جس کے معنی ہموار چبوترہ کے ہیں۔

خَرَّ: (خ ر ر) کسی چیز کا آواز کے ساتھ نیچے گرنا۔

صَعِقًا: موت اور ہلاکت۔ اصل معنی فضا میں سخت آواز کے ہیں۔ اسی آواز سے کبھی آگ پیدا ہوتی ہے، کبھی عذاب، کبھی موت اور کبھی بے ہوشی کا سبب بھی بن جاتی ہے۔

تفسیر آیات

رویت، حاسۂ بصر کے ذریعے ادراک کو کہتے ہیں اور حاسۂ بصر کے علاوہ اس ادراک کو بھی کہتے ہیں جو قوت ادراک میں بصر کے ہم درجہ یا اس سے بالاتر ہو۔ جیسے فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمۡ ...[2] ظاہر

---

[1] لیل: ۲ [2] ۹ توبۃ: ۱۰۵

ہے کہ اللہ حاسۂ بصر سے نہیں دیکھتا بلکہ اللہ کی رویت میں حقیقت، فکر و دلیل کے بغیر بذات خود سامنے آتی ہے۔ لہٰذا رویت کی دو قسمیں بنتی ہیں: ایک رویت بالواسطہ اور دوسری بلاواسطہ:

ا۔ رویت بالواسطہ: اس سے مراد حاسۂ بصر کے ذریعے کسی شے کا ادراک ہے۔ حس باصرہ اگرچہ احیاناً انسان کو واقع بینی کے خلاف لے جاتی ہے۔ مثلاً کسی چیز کو دور سے چھوٹا دکھاتی ہے۔ سیدھی چیز کو پانی میں کج دکھاتی ہے، تاہم عقل اس غلطی کا ازالہ کر دیتی ہے۔

اس قسم کی رویت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا نظر آنا محال اور ناممکن ہے۔ دنیا میں نہ آخرت میں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کسی حاسۂ بصر میں سمونا ممکن نہیں۔ اس قسم کی رویت کے لیے جہت، زمان، مکان، رنگ، جسم اور ما بہ الامتیاز درکار ہوتے ہیں اور اس کی ذات لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ ...[1] ہے۔ طبعی آنکھوں سے نظر آنے کی صورت میں اس پر مثلہ شیء صادق آئے گا۔ چنانچہ آخرت کے دن اللہ نظر آنے کے قائل حضرات یَوۡمَ یُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ ...[2] اس دن ساق (پنڈلی) کی تجلی فرمائی جائے گی، کو دلیل قرار دیتے ہیں اور اللہ کو کسی نہ کسی مثل میں لاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ دکھائی دینے کا مطالبہ اس کی شان قدسیت میں گستاخی ہے۔ کیونکہ اللہ کے دکھائی دینے کا لازمہ یہ ہوگا کہ اللہ ایک سمت میں محدود ہے۔ وہ جسم، رنگ اور زمان کا محتاج ہے، جو مخلوق کی صفات ہیں۔ جیسا کہ اللہ کا بیٹا ہونے کا تصور اس کی شان قدوسیت کے خلاف ایک جسارت ہے۔ چنانچہ درج ذیل آیت سے ظاہر ہوتا ہے:

یَسۡـَٔلُکَ اَہۡلُ الۡکِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَیۡہِمۡ کِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰۤی اَکۡبَرَ مِنۡ ذٰلِکَ فَقَالُوۡۤا اَرِنَا اللّٰہَ جَہۡرَۃً فَاَخَذَتۡہُمُ الصّٰعِقَۃُ بِظُلۡمِہِمۡ ...[3]

اہل کتاب آپ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے ایک کتاب اتار لائیں جب کہ یہ لوگ اس سے بڑا مطالبہ موسیٰ سے کر چکے ہیں، چنانچہ انہوں نے کہا: ہمیں علانیہ طور پر اللہ دکھا دو ان کی اسی زیادتی کی وجہ سے انہیں بجلی نے آ لیا...

اللہ تعالیٰ کا دکھائی دینا اس کی شان خداوندی میں گستاخی نہ ہوتی تو اس مطالبے پر ان پر فوری عذاب نازل نہ ہوتا۔ چنانچہ خود حضرت موسیٰ (ع) نے بنی اسرائیل کے اس نامعقول مطالبہ کو سفیہانہ حرکت قرار دیا۔ چنانچہ اس مطالبہ کی سزا میں بنی اسرائیل کے ستر (۷۰) چیدہ چیدہ افراد کو بجلی کے ذریعے ہلاک کیا تو فرمایا:

اَتُہۡلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَہَآءُ مِنَّا ...[4]

کیا تو ہمارے کم عقل لوگوں کے اعمال کی سزا میں ہمیں ہلاک کر دے گا؟

رہا یہ سوال کہ اگر یہ مطالبہ قابل سرزنش و عذاب ہے اور شان الٰہی میں گستاخی ہے تو حضرت موسیٰ (ع)

---

[1] ۴۲ شوری: ۱۱　[2] قلم: ۴۲　[3] ۴ نساء: ۱۵۳　[4] ۷ اعراف: ۱۵۵

جیسے اولوالعزم پیغمبر نے یہ سوال کیسے کر دیا؟

جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ مطالبہ صرف اپنی قوم کی تعلیم و تربیت کی خاطر کیا تھا کہ اگر اللہ کا دکھائی دینا ممکن ہوتا تو میرے سوال پر ممکن ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں حضرت موسیٰ (ع) سوال اللہ سے کر رہے ہیں اور ''سر دلبران در حدیث دیگران'' کے طور پر اپنی قوم کو سمجھا رہے ہیں کہ یہ مطالبہ ناممکن اور نامعقول ہے، خواہ خود میری طرف سے ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ حضورؐ کے لیے حکم ہوا:

قُلۡ اِنۡ کَانَ لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدٌ ٭ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الۡعٰبِدِیۡنَ ○ [1]

کہہ دیجیے: اگر رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے (اس کی) عبادت کرنے والا ہوتا۔

بالکل اسی طرح حضرت موسیٰ (ع) کے مطالبے کا سیاق یہ ہے کہ اگر اللہ کا دکھائی دینا ممکن ہوتا تو سب سے پہلے میں اس کا دیدار کرتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ دیدار رب کا مطالبہ قوم موسیٰ (ع) نے کیا تو اس پر فوری عذاب نازل ہوا اور اس کو ظلم قرار دیا۔ اگر عیناً یہی مطالبہ حضرت موسیٰ (ع) کرتے تو حسنات الابرار سیئات المقربین کے مطابق زیادہ قابل سرزنش اور زیادہ ظلم ہوتا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ (ع) کی سرزنش کی گئی نہ عذاب نازل ہوا۔ صرف اس بات کے ناممکن ہونے کو دکھانے کے لیے پہاڑ پر تجلی فرمائی اور عملاً تجربہ کر کے دکھایا کہ رویت باری ممکن نہیں۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ (ع) ہوش میں آئے تو کہا: سُبۡحٰنَکَ ...تو پاک و منزہ ہے ایسی باتوں سے جو تیری شان کے لائق نہیں ہیں۔ تُبۡتُ اِلَیۡکَ کہ یہ مطالبہ اور یہ عمل خود اپنی جگہ قابل توبہ ہے اور سب سے پہلے ایمان لانے والا میں ہوں کہ تیری شان اس سے بالاتر ہے کہ تو دکھائی دے۔

یہ سب بنی اسرائیل جیسی نہایت کینہ پرور قوم کو سمجھانے کے لیے تھا کہ رویت باری کا مطالبہ نہ صرف ناممکن ہے بلکہ اس کی شان میں گستاخی ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ بنی اسرائیل کو اصرار تھا:

لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَہۡرَۃً ... [2]

ہم آپ پر ہرگز یقین نہیں کریں گے جب تک ہم خدا کو علانیہ نہ دیکھ لیں۔

ان طبیعی اور مادی آنکھوں سے رویت باری تعالیٰ آخرت میں بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ آخرت میں انسان کی بشری حقیقت تبدیل نہیں ہو گی بلکہ وہ روح اور جسم سے مرکب بشر ہی رہے گا۔ صرف یہ کہ اہل جنت کا روحانی پہلو غالب ہو گا۔ [3]

کہتے ہیں کہ آخرت میں مومن کا روحانی پہلو غالب ہونے کی وجہ سے رویت باری ممکن ہو گی۔ اس میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ کیا آخرت میں عام مؤمن کا روحانی پہلو دنیا میں خاتم الانبیاءؐ کے روحانی پہلو سے زیادہ طاقتور ہو گا۔ اگر رویت باری تعالیٰ اپنی جگہ ممکن ہو اور روحانیت کی کمزوری کی وجہ سے رویت

---

[1] ۴۳ زخرف: ۸۱ [2] ۲ بقرۃ: ۵۵ [3] المنار

متحمل نہیں تو خاتم الانبیاءؐ کے لیے دیدار رب نہایت آسانی سے ہونا چاہیے تھا۔

نیز فرشتے خصوصاً جبرئیل امین کو بھی دیدار باری نصیب ہونا چاہیے۔ جب کہ جبرئیل فرماتے ہیں:

> میرے اور اللہ کے درمیان ستر حجاب موجود ہیں۔ ان میں سے کسی ایک حجاب کا مشاہدہ کروں تو میں جل کر خاکستر ہو جاؤں۔

۲۔ رویت بلاواسطہ: جسے رویت قلبی کہہ سکتے ہیں، کسی مادی و حسی واسطے کے بغیر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اس رویت میں حقیقت بذات خود ادراک کنندہ کے سامنے آ جاتی ہے۔ یہ رویت حاسۂ بصر کی طرح انسان کو غلط فہمی میں نہیں ڈالتی، جیسے ہم اپنے وجود کے اندر بہت سی باتوں کا احساس کرتے ہیں جو ناقابل تردید ہوتی ہیں۔ مثلاً درد و لذت، نفرت و محبت وغیرہ۔ قرآنی اصطلاح میں بھی قلبی رویت انہی معنوں میں مستعمل ہے۔ جیسے فرمایا:

مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی ﴿﴾[1] — جو کچھ (نظروں نے) دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا۔

علامہ طباطبائی فرماتے ہیں:

> اس قلبی رویت کے لیے جہت مکان و زمان اور جسمانی حالت درکار نہیں ہوتی.

چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ آپؑ نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے؟ تو جواب میں فرمایا:

مَا کُنۡتُ اَعۡبُدُ رَبّاً لَمۡ اَرَہُ.	میں ایسے رب کی بندگی کرنے کے لیے آمادہ نہیں جو نظر نہ آئے،
قَالَ: وَ کَیۡفَ رَاَیۡتَہُ؟	کہا: آپ نے اللہ کو کیسے دیکھا؟
قَالَ: وَیۡلَکَ لَا تُدۡرِکُہُ الۡعُیُونُ فِی مُشَاھَدَۃِ الۡاَبۡصَارِ وَلٰکِنۡ رَاَتۡہُ الۡقُلُوبُ بِحَقَائِقِ الۡاِیۡمَانِ۔[2]	فرمایا: بصر کے مشاہدے کے ذریعے آنکھیں اسے نہیں دیکھتیں بلکہ دل اسے دیکھتے ہیں ایمان کے حقائق کی روشنی میں۔

اس قسم کی رویت دنیا میں انبیاء و ائمہ (ع) کے لیے ثابت ہے اور آخرت میں مؤمنین کے لیے اور اسی رویت کو قرآن لقائے رب کے ساتھ تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت کردہ یہ فرمان مشہور ہے: لو کشف الغطا ما ازددت یقیناً۔[3] اگر پردہ ہٹ بھی جائے (یعنی اللہ ان طبیعی آنکھوں سے نظر آ بھی جائے) تو میرے یقین میں اضافہ نہ ہو۔

کیونکہ بصری رویت سے کہیں زیادہ، یقین دینے والی قلبی رویت کے بعد بصری رویت سے یقین میں کیسے اضافہ ہو۔ رویت قلبی سے یقین کی آخری منزل پر فائز ہو چکے ہیں، جس کے بعد پھر یقین میں اضافے

---

[1] ۵۳ نجم:۱۱ [2] اصول الکافی ۱: ۹۷ باب فی ابطال الرؤیۃ... [3] بحار الانوار ۴۰: ۱۵۳

کے معنی نہیں بنتے۔

آخرت میں مؤمن یقین کی اس منزل پر فائز ہو جائے گا اور اللہ کو اپنے پورے وجود کے ساتھ درک کرے گا۔ اس کی بارگاہ میں اپنے آپ کو حاضر پائے گا اور سایہ رحمٰن میں دیکھ کر امن و سکون، کیف و سرور محسوس کرے گا اور اللہ سے ہمکلام بھی ہو گا، جیسے دنیا میں انبیاء علیہم السلام ہمکلام ہوتے ہیں۔ چنانچہ احادیث اہل بیت علیہم السلام میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت کے لیے تجلی فرمائے گا اور اس آیت کا مطلب بھی یہی لیا ہے:

وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ ۙ﴿﴾ اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ ﴿﴾[1]	بہت سے چہرے اس روز شاداب ہوں گے۔ وہ اپنے رب (کی رحمت) کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

اس نظریے سے اہل سنت، امامیہ اور معتزلہ کا نزاع بھی ختم ہو سکتا ہے۔ اہل سنت کا یہ مؤقف کہ اللہ دنیا میں نہیں، آخرت میں نظر آئے گا، اس صورت میں درست ہے کہ ایسا صرف قلبی نظر کے ذریعے ہو جو بصری نظر سے زیادہ یقینی ہے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

وَ اَبۡیَنُ مِمَّا تَرَی الۡعُیُوۡنُ...[2]	اے اللہ تیرا وجود ان چیزوں سے بھی زیادہ واضح ہے جو احاطۂ نظر میں آتی ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

ما رأیت شیئًا الا رأیت اللّٰہ قبلہ۔[3]	میں نے کسی شے کو نہیں دیکھا مگر یہ کہ اس سے پہلے اللہ کو دیکھا۔

امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

لم ترہ العیون بمشاھدۃ الابصار و لکن رأتہ القلوب بحقائق الایمان...[4]	اگرچہ اس کو آنکھوں کے مشاہدے سے نہیں دیکھا جا سکتا مگر اس کو دلوں نے حقیقت بینی سے دیکھا ہے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام سے سوال ہوا کہ کیا رسول اللہؐ نے اللہ کو دیکھا ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا:

نعم بقلبہ رآہ أ ما سمعت اللّٰہ عز و جل یقول: مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی لم یرہ بالبصر ولکن رآہ بالفؤاد۔[5]	ہاں! انہوں نے اپنے قلبی رویت سے دیکھا ہے۔ کیا تو نے اللہ کا یہ فرمان نہیں سنا: جو کچھ دیکھا اس کو دل نے جھوٹ نہ جانا۔ انہوں نے آنکھوں سے نہیں بلکہ اللہ کو دل کی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

اہم نکات

۱۔ مادی رویت باری ممکن نہیں، خواہ رویت کرنے والا مادی اعتبار سے کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ قَالَ لَنۡ تَرٰىنِیۡ ..... جَعَلَہٗ دَکًّا...

---

[1] ۷۵ قیامۃ: ۲۲۔۲۳ [2] شرح نہج البلاغۃ ۹: ۱۸۱
[3] مفتاح الفلاح ص ۳۶۷ [4] الکافی ۱: ۱۷ باب فی ابطال الرؤیۃ [5] التوحید: ۱۱۶۔ المیزان

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

۱۴۴۔ فرمایا: اے موسیٰ! میں نے لوگوں میں سے آپ کو اپنے پیغامات اور ہمکلامی کے لیے منتخب کیا ہے، لہٰذا جو کچھ میں نے آپ کو عطا کیا ہے اسے اخذ کریں اور شکر گزاروں میں سے ہو جائیں.

تفسیر آیات

اگر حضرت موسیٰ (ع) کا مطالبہ حاسۂ بصرا ور مادی نگاہوں سے اللہ کا دیدار تھا تو اس آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ دیدار ممکن نہیں لیکن میں نے تم کو رسالت و ہم کلامی کے امتیاز سے نوازا ہے۔ یہ کوئی معمولی درجہ نہیں ہے۔ اس پر شکر گزار رہو۔

اگر حضرت موسیٰ (ع) کا مطالبہ صرف اپنی قوم کی تعلیم کے لیے تھا جیسا کہ ہم نے یہی تفسیر اختیار کی ہے تو اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ ایمان کے لیے دیدار پر انحصار کرنا درست نہیں ہے۔ تمہاری نبوت و رسالت پر دلیل کے لیے، جس دستور، پیغام اور مجھ سے براہ راست ہمکلامی کے امتیازات سے نوازا گیا ہے، کافی ہے۔

اہم نکات

۱۔ رسالت کے علاوہ ہم کلامی ایک ارفع مقام ہے۔ اسی لیے رسالت کے ذکر کے بعد ہم کلامی کا ذکر ہوا: بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ....۔

۲۔ اللہ کی عطا پر بھروسا کر کے قدم بڑھانا شیوۂ انبیاء ہے، خواہ اکثر لوگ ملامت کرتے رہیں: فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ ....۔

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

۱۴۵۔ اور ہم نے موسیٰ کے لیے (توریت کی) تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھی (اور حکم دیا) کہ اسے پوری قوت سے سنبھالیں اور اپنی قوم کو حکم دیں کہ اس میں سے شائستہ ترین باتوں کو اپنا لو، عنقریب میں تمہیں نافرمانوں کا ٹھکانا دکھا دوں گا۔

تفسیر آیات

ان تختیوں کا نام توریت پڑا۔ ان کی تعداد کتنی تھیں؟ سوائے لفظ جمع الالواح کے اور کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔ بائیبل نے ان کی تعداد دو بتائی ہے اور یہ تختیاں پتھر کی سلیں تھیں۔

ان تختیوں پر جو کچھ لکھا تھا وہ فعل خدا تھا یا بحکم خدا فعل موسیٰ (ع) یا فعل جبرئیل تھا؟ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، سوائے لفظ کَتَبۡنَا کے۔ یہ تعبیر فعلِ موسیٰ و جبرئیل علیہا السلام ہونے کی صورت میں بھی صحیح ہے۔ البتہ توریت میں آیا ہے:

> اور موسیٰ پھر کر پہاڑ سے اتر گیا اور شہادت کے دونوں تختے اس کے ہاتھ میں تھے اور وہ تختے لکھے ہوئے تھے، دونوں طرف ادھر اور ادھر لکھے ہوئے تھے اور وہ تختے خدا کے کام سے تھے اور جو لکھا ہوا سو خدا کا لکھا ہوا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا۔[1]

ان تختیوں کے بارے میں توریت میں یہ بھی آیا ہے کہ جب موسیٰ (ع) نے دیکھا کہ اس کی قوم نے ان کی مناجات کے دنوں میں گوسالہ پرستی اختیار کی ہے تو ان تختیوں کو اپنے ہاتھوں سے پھینک دیا۔

دوسری جگہ آیا ہے کہ رب نے موسیٰ (ع) سے فرمایا:

> میں سابقہ تختیوں کی طرح دو اور تختیاں کندہ کروں گا اور ان پر بھی وہی کچھ لکھوں گا جو پہلے ان تختیوں پر لکھا تھا، جن کو تو نے توڑ دیا تھا۔

مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ مَّوۡعِظَۃً: ان تختیوں پر ایک اخلاقی و قانونی ضابطہ درج تھا۔ اخلاق و احکام سے متعلق کلیات کا ذکر تھا، جو اس وقت کے معاشرے کے لیے ایک کامل نظام حیات تھا۔ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ میں مِنۡ تبعیضی ہے کہ ہر چیز میں سے ان کی ضرورت کا موعظہ درج تھا۔

وَّ تَفۡصِیۡلًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ: ہر وہ شئی جس کی بنی اسرائیل کے ضرورت تھی یا اس وضع کردہ دستور کے لیے لازم تھی، وہ اس میں درج تھی۔

یَّاۡخُذُوۡا بِاَحۡسَنِہَا: ان مواعظہ میں احسن کو اختیار کیا جائے۔ اگر معاملہ قبیح اور حسن میں دائر ہے تو حسن کو لیا جائے اور اگر معاملہ حسن اور احسن میں دائر ہے تو احسن کو اختیار کرنے کا حکم ہے۔

اہم نکات

۱۔ اخلاق و احکام نظام حیات کی دو بنیادیں ہیں: مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ مَّوۡعِظَۃً وَّ تَفۡصِیۡلًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ...۔

۲۔ دستور حیات ضبط تحریر میں لانا سنت الٰہی ہے: وَ کَتَبۡنَا لَہٗ فِی الۡاَلۡوَاحِ ...۔

---

[1] خروج ۳۲: ۱۵

سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰیٰتِیَ الَّذِیۡنَ یَتَکَبَّرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ وَ اِنۡ یَّرَوۡا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡا بِہَا ۚ وَ اِنۡ یَّرَوۡا سَبِیۡلَ الرُّشۡدِ لَا یَتَّخِذُوۡہُ سَبِیۡلًا ۚ وَ اِنۡ یَّرَوۡا سَبِیۡلَ الۡغَیِّ یَتَّخِذُوۡہُ سَبِیۡلًا ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ کَانُوۡا عَنۡہَا غٰفِلِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾

۱۴۶۔میں انہیں اپنی آیات سے دور رکھوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں اور تمام نشانیاں دیکھ کر بھی ان پر ایمان نہیں لاتے اور اگر یہ راہ راست دیکھ بھی لیں تو اس راستے کو اختیار نہیں کرتے اور اگر انحراف کا راستہ دیکھ لیں تو اس راستے کو اپنا لیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے ہماری نشانیوں کی تکذیب کی اور ان سے غفلت برتتے رہے۔

تفسیر آیات

۱۔ سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰیٰتِیَ: یہ سنت الٰہی ہے کہ جو لوگ زمین پر ناحق تکبر کرتے ہیں۔ یعنی بندگان خدا پر اپنی بالادستی قائم اور ان کو ذلیل کرتے ہیں ایسے طاغوت صفت لوگوں کو ہم اپنی آیات سے دور کر دیتے ہیں۔ جو لوگ از روئے عناد اللہ کی نشانیوں کی تکذیب کرتے ہیں ان سے اللہ ہر قسم کی توفیق سلب فرماتا ہے اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

۲۔ وَ اِنۡ یَّرَوۡا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡا بِہَا: نتیجتاً وہ اللہ کی نشانیوں کو قریب سے دیکھنے کے باوجود ان پر ایمان نہیں لاتے۔ یوں وہ ہر برے راستے کو اختیار کرتے ہیں اور ہر نیک راستے سے انحراف کرتے ہیں۔

۳۔ وَ اِنۡ یَّرَوۡا سَبِیۡلَ الرُّشۡدِ: اگر یہ رشد و ہدایت کا سیدھا راستہ دیکھ بھی لیں ان راستوں کو وہ اختیار نہیں کریں گے۔

۴۔ وَ اِنۡ یَّرَوۡا سَبِیۡلَ الۡغَیِّ: اس کے مقابلے میں وہ گمراہی کا راستہ دیکھتے ہی اسے اپنا لیں گے۔

۵۔ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَذَّبُوۡا: اس طرح توفیق سلب ہونے کے پیچھے اصل محرک اور سبب، آیات الٰہی کی تکذیب ہے۔ جب وہ آیات الٰہی کی تکذیب کریں گے تو سرچشمہ ہدایت سے محروم اور ضلالت کی تاریکی میں ڈوب جائیں گے۔

اہم نکات

۱۔ جن کو اللہ اپنے حال پر چھوڑتا ہے وہ ہر نیکی سے دور اور ہر برائی پر لپک جاتے ہیں۔

۲۔ جو لوگ از روئے عناد کفر اختیار کرتے ہیں، ان کو اللہ اپنی رحمت سے دور کرتا ہے: سَاَصۡرِفُ

عَنۡ اٰیٰتِیَ ... ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَذَّبُوۡا ....

وَ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ لِقَآءِ الۡاٰخِرَۃِ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ ؕ ہَلۡ یُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۷﴾

۱۴۷۔ اور جنہوں نے ہماری آیات اور آخرت کی پیشی کی تکذیب کی ان کے اعمال ضائع ہو گئے، کیا ان لوگوں کو اس کے سوا کوئی بدلہ مل سکتا ہے جو وہ کرتے رہے ہیں؟

تشریح کلمات

حَبِطَتۡ: (ح ب ط) الحبط۔ کسی کام کا اکارت اور ضائع ہو جانا۔ اصل میں لفظ حَبَطَ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں جانور اتنا زیادہ کھا جائے کہ اس کا پیٹ ابھر جائے۔ یعنی وہ نفخ بطن سے مر جائے۔ کھانے کا مقصد تو زندہ رہنے کے لیے ہے، جب یہ کھانا زندگی کے ختم کرنے کا سبب بنتا ہے تو حَبَطَ کہتے ہیں. اسی سے وہ اعمال جو انسان کو مطلوبہ نتیجہ نہ دیں حبط کہلاتے ہیں۔

تفسیر آیات

اعمال کے حبط ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اعمال خود اپنی جگہ حسن رکھتے ہیں جن کا کوئی صلہ ہونا چاہیے تھا مگر عمل کنندہ کی وجہ سے وہ اکارت اور ضائع ہو گئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ عمل حسن فعلی رکھتا ہے لیکن حسن فاعلی نہیں رکھتا۔ اس طرح یہ عمل تو نیک تھا مگر عمل کنندہ نیک نہیں تھا۔ چنانچہ کوئی مجرم نیک عمل بجا لائے، مثلاً ایک چور غریبوں کی مدد کرے تو خود عمل کی خوبی اس کو فائدہ نہیں دے گی۔

آیات الٰہی اور آخرت کا منکر اپنے خالق کا منکر اور نافرمان ہے۔ جن اعضاء و اوزار اور عقل و خرد سے یہ نیک کام کر رہا ہے، وہ ان کو عطا کنندہ کی عطا نہیں سمجھتا۔ وہ شخص درحقیقت چور اور مجرم ہے۔ اس کے اعمال ضائع ہونا ایک لازمی امر ہے۔

ہَلۡ یُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ: جزا عمل پر مرتب ہوتی ہے۔ جیسا عمل ویسی جزا۔

اہم نکات

۱۔ عمل کا نیک ہونا کافی نہیں ہے۔ عمل کنندہ کا بھی نیک ہونا ضروری ہے۔

۲۔ ہر عمل کی قدر و قیمت اس بات سے لگائی جاتی ہے کہ عمل کنندہ کن قدروں کا مالک ہے: ہَلۡ یُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ۔

وَ اتَّخَذَ قَوۡمُ مُوۡسٰی مِنۡۢ بَعۡدِہٖ مِنۡ حُلِیِّہِمۡ عِجۡلًا جَسَدًا لَّہٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّہٗ لَا یُکَلِّمُہُمۡ وَ لَا یَہۡدِیۡہِمۡ سَبِیۡلًا ۘ اِتَّخَذُوۡہُ وَ کَانُوۡا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۱۴۸﴾

۱۴۸۔ اور موسیٰ کے (کوہ طور پر جانے کے) بعد ان کی قوم نے اپنے زیورات سے ایک بچھڑا بنا لیا (یعنی) ایسا جسم جس میں بیل کی آواز تھی، کیا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ نہ تو ان سے بات کر سکتا ہے اور نہ ان کی رہنمائی کر سکتا ہے، ایسے کو انہوں نے معبود بنا لیا اور وہ زیادتی کے مرتکب تھے۔

تشریح کلمات

خُوَارٌ: (خ و ر) یہ لفظ گائے بیل کی آواز کے ساتھ مختص ہے۔ مطلق بہائم کی آواز کو الخوران کہتے ہیں۔

جَسَدًا: (ج س د) جسد بے جان بدن کو کہتے ہیں اور کبھی جاندار جسم پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

جب حضرت موسیٰ (ع) کو اللہ نے کوہ طور پر بلایا اور دس دن کے اضافے کی وجہ سے جب حضرت موسیٰ (ع) کو پہاڑ سے اترنے میں دیر لگی تو اس سے فائدہ اٹھا کر بنی اسرائیل نے بچھڑے کی سنہری مورت بنائی جس میں سے آواز نکلتی تھی۔ اس بے جان قالب سے بیل کی آواز کس طرح نکلتی تھی؟ اس پر مفسرین کی قیاس آرائیوں یا اسرائیلیات پر مبنی غیر معتبر روایات کے علاوہ کوئی شواہد ہمارے پاس نہیں ہیں۔

بنی اسرائیل مصریوں کی گوسالہ پرستی سے خاصے متاثر تھے۔ اب اس سے آواز بھی نکلتی تھی تو قوم موسیٰ (ع) کے جمہور نے اس گوسالہ کے حق میں فیصلہ دیا کہ یہی موسیٰ (ع) کا رب ہے جس نے ہم کو فرعون سے نجات دلائی ہے۔

اَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّہٗ لَا یُکَلِّمُہُمۡ: اور یہ نہیں سوچا کہ یہ گوسالہ نہ بول سکتا ہے، نہ رہنمائی کر سکتا ہے۔ موسیٰ (ع) کا خدا تو موسیٰ (ع) سے ہم کلام ہوتا ہے اور بنی اسرائیل کی نجات کے لیے رہنمائی کرتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایک قوم کی غالب اکثریت کا فیصلہ گمراہ ہو سکتا ہے: وَ اتَّخَذَ قَوۡمُ مُوۡسٰی ... عِجۡلًا ....

۲۔ پیغمبروں کے بعد ان کی امت الٹے پاؤں واپس چلی جایا کرتی ہے۔[۱]: قَوۡمُ مُوۡسٰی مِنۡۢ بَعۡدِہٖ حُلِیِّہِمۡ عِجۡلًا ....

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ آل عمران: ۱۴۴

وَلَمَّا سُقِطَ فِیۡۤ اَیۡدِیۡہِمۡ وَرَاَوۡا اَنَّہُمۡ قَدۡ ضَلُّوۡا ۙ قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ یَرۡحَمۡنَا رَبُّنَا وَیَغۡفِرۡ لَنَا لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۱۴۹﴾	۱۴۹۔ اور جب وہ سخت نادم ہوئے اور دیکھ لیا کہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے: اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے اور ہمیں معاف نہ فرمائے تو ہم حتمی طور پر خسارے میں رہ جائیں گے۔

تشریح کلمات

سُقِطَ فِیۡۤ اَیۡدِیۡہِمۡ: انتہائی ندامت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ محاورہ ندامت کے لیے اس لیے استعمال ہوتا ہے کہ ندامت کرنے والا منہ سے اپنا ہاتھ کاٹنے لگتا ہے تو اصل میں سقط فوہ فی یدہ ہے کہ اس کا منہ ہاتھ پر گرا اور منہ کا لفظ ذکر نہیں کرتے اور کہتے ہیں: ہاتھ پر گرا ہوا یا یہ محاورہ اس لیے ہوسکتا ہے کہ نادم اپنا ہاتھ تھوڑی کے نیچے رکھتا ہے۔ اس طرح اس کا سر ہاتھ پر گرتا ہے۔ یہ جملہ اس وقت کہا جاتا ہے کہ جب انسان نادم ہو جاتا ہے اور پوشیدہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

تفسیر آیات

بنی اسرائیل کی سرکشی اور گمراہی کا یہ عالم حضرت موسیٰ (ع) کی صرف دس دنوں کی تاخیر کی وجہ سے تھا۔ صرف دس دن کی غیبت میں یہ قوم گمراہ ہو گئی۔ جب کہ حجت خدا حضرت ہارونؑ ان کے درمیان موجود تھے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کی وفات کے بعد ان کی گمراہی و سرکشی کا کیا عالم ہوگا۔ چنانچہ چشم جہاں نے بنی اسرائیل کی سرکشی، اپنے دین سے بغاوت اور تحریف دیکھ لی۔

وَرَاَوۡا اَنَّہُمۡ قَدۡ ضَلُّوۡا: بنی اسرائیل وہ واحد قوم ہے جس کو اپنے رسول کی زندگی میں مابعد الرسول کی آزمائش میں ڈالا گیا تاکہ وہ اس تجربے کی روشنی میں اپنے رسول کے بعد پھر مرتد نہ ہو۔

اہم نکات

۱۔ حجت خدا حضرت موسیٰ (ع) کے آنے پر بنی اسرائیل کی اکثریت پر اپنی گمراہی کا انکشاف ہوا: وَرَاَوۡا اَنَّہُمۡ قَدۡ ضَلُّوۡا...۔

۲۔ گمراہی کے بعد بھی اگر قوم حجت خدا کی اطاعت پر مجتمع ہوجائے تو اللہ ان سے درگزر فرماتا ہے: لَئِنۡ لَّمۡ یَرۡحَمۡنَا رَبُّنَا وَیَغۡفِرۡ لَنَا لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ۔

وَ لَمَّا رَجَعَ مُوۡسٰۤی اِلٰی قَوۡمِہٖ غَضۡبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئۡسَمَا خَلَفۡتُمُوۡنِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ ۚ اَعَجِلۡتُمۡ اَمۡرَ رَبِّکُمۡ ۚ وَ اَلۡقَی الۡاَلۡوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاۡسِ اَخِیۡہِ یَجُرُّہٗۤ اِلَیۡہِ ؕ قَالَ ابۡنَ اُمَّ اِنَّ الۡقَوۡمَ اسۡتَضۡعَفُوۡنِیۡ وَ کَادُوۡا یَقۡتُلُوۡنَنِیۡ ۫ۖ فَلَا تُشۡمِتۡ بِیَ الۡاَعۡدَآءَ وَ لَا تَجۡعَلۡنِیۡ مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ﴿۱۵۰﴾

۱۵۰۔اور جب موسیٰ نہایت غصے اور رنج کی حالت میں اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو کہنے لگے: تم نے میرے بعد بہت بری جانشینی کی، تم نے اپنے رب کے حکم سے عجلت کیوں کی؟ اور (یہ کہکر) تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، ہارون نے کہا: اے ماں جائے! یقیناً قوم نے مجھے کمزور بنا دیا تھا اور وہ مجھے قتل کرنے والے تھے، لہٰذا آپ دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دیں اور مجھے ان ظالموں میں شمار نہ کریں۔

تشریح کلمات

اَسِفًا: الاسف رنج اور غضب میں سے ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے۔ اصل میں اس کے معنی جذبہ انتقام سے خونِ قلب کے جوش مارنے کے ہیں۔ اگر یہ کیفیت اپنے سے کمزور آدمی پر پیش آئے تو پھیل کر غضب کی شکل اختیار کر لیتی اور اگر اپنے سے قوی آدمی پر ہو تو منقبض ہو کر حزن بن جاتی ہے۔ (راغب)

تفسیر آیات

حضرت موسیٰ (ع) کو اللہ تعالیٰ نے کوہ طور پر بتا دیا تھا:

قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَکَ مِنۡۢ بَعۡدِکَ وَ اَضَلَّہُمُ السَّامِرِیُّ ﴿۸۵﴾[1] — فرمایا: پس آپ کے بعد آپ کی قوم کو ہم نے آزمائش میں ڈالا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے۔

۱۔ وَ لَمَّا رَجَعَ مُوۡسٰۤی اِلٰی قَوۡمِہٖ غَضۡبَانَ: حضرت موسیٰ (ع) نہایت غضبناک حالت میں اپنی قوم کی طرف واپس جاتے ہیں۔ یہ غیظ و غضب اللہ کے لیے تھا۔

۲۔ بِئۡسَمَا خَلَفۡتُمُوۡنِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ: تم نے میرے بعد بہت بری جانشینی کی۔ ایک سچے رہنما کی جانشینی کا حق تو یہ تھا کہ اسی سچائی کے تسلسل کو باقی رکھا جاتا لیکن تم نے میرے بعد دین حق سے کلی طور پر انحراف

---

[1] ۲۰ طٰہٰ: ۸۵

کیا اور ایک ایسے شخص کی پیروی کی جس کو تمہارے رسول نے اپنے بعد کے لیے ہادی نہیں بنایا۔ جس کو رہنما بنایا تھا اس کے جانی دشمن بن گئے۔

۳۔ اَعَجِلۡتُمۡ اَمۡرَ رَبِّکُمۡ: تم نے گوسالہ پرستی کو قبول کرنے میں عجلت سے کام لیا اور اَمۡرَ رَبِّکُمۡ کا انتظار نہیں کیا جو نزول تورات کے بعد وضاحت سے بیان ہونا تھا۔ جس کو تیس دن بعد حضرت موسیٰ (ع) نے کوہ طور سے واپس آ کر بیان کرنا تھا اور صرف دس دن کی تاخیر ہوئی تھی۔

۴۔ وَ اَلۡقَی الۡاَلۡوَاحَ: غصے کے عالم میں وہ تختیاں زمین پر پھینک دیں جن پر توریت کندہ تھی۔ اس میں کلام اللہ کی توہین کا پہلو نہیں نکلتا، کیونکہ یہ غصہ اللہ کے لیے تھا اور راہ توحید میں سرزد ہونے والا ہر عمل اسی پیمانے پر تولا جاتا ہے۔

۵۔ اَخَذَ بِرَاۡسِ اَخِیۡہِ: فرط غضب سے حضرت موسیٰ (ع) نے حضرت ہارون (ع) کو سر کے بالوں سے پکڑ کر کھینچا، قوم کو اس بات پر تنبیہ کرنے کے لیے کہ جس جرم کا انہوں نے ارتکاب کیا ہے وہ کس قدر بڑا جرم ہے۔ اس جرم کا ارتکاب بھی حضرت ہارون (ع) کی موجودگی میں ہوا تھا۔ بادی الرائے میں وہی اس کے ذمے دار ہوتے ہیں۔

۶۔ قَالَ ابۡنَ اُمَّ اِنَّ الۡقَوۡمَ اسۡتَضۡعَفُوۡنِیۡ: اکثریت نے گوسالہ پرستی اختیار کی تو حضرت ہارونؑ کے ساتھ ایک قلیل جماعت حق پر قائم رہی۔ جن کو اکثریت کی طرف سے کلمہ حق کہنے کے جرم میں جانی خطرہ لاحق ہوا۔

فَلَا تُشۡمِتۡ بِیَ الۡاَعۡدَآءَ: آپ دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دیں۔ حضرت ہارونؑ کا ردعمل بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ، ہارون علیہما السلام کے ساتھ جس سختی سے پیش آتے تھے وہ شماتت اعدا کا موجب بنتا تھا۔

اس میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ (ع) کی واپسی کے بعد یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آ گئی کہ حضرت ہارون (ع) حق پر تھے اور گوسالہ پرست مرتد ہو گئے تھے۔ اس کے بعد بھی کچھ لوگ حضرت ہارون (ع) کے دشمن تھے جن کی شماتت کا حضرت ہارون (ع) ذکر کر رہے ہیں۔

۷۔ یہ عمل حضرت موسیٰ (ع) کی اجتہادی غلطی نہیں تھی کہ ہارون (ع) کو شریک جرم سمجھ کر اس کی سخت سرزنش کی، بعد میں بے خطا نکلے، جیسا کہ تھانوی صاحب کا خیال ہے بلکہ اس عمل میں اگرچہ ہارون (ع) کی بظاہر خفت ہوئی مگر اپنی جگہ وقت کی مصلحت و مزاج کے مطابق تھا۔ تختیوں کے زمین پر پھینکنے اور حضرت ہارون (ع) کے ساتھ اس سختی کے ساتھ پیش آنے سے قوم موسیٰ (ع) کو اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے کس بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ چنانچہ بعد میں اس جرم کے مرتکب لوگوں کو موت کی سزا دی گئی: فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ....[1]

----

[1] ۲ بقرۃ: ۵۴

۸۔ توریت اس جرم میں حضرت ہارونؑ کو برابر شریک گردانتی ہے بلکہ اس عمل شرک کا انہیں بانی قرار دیتی ہے مگر قرآن اس پاکیزہ نبی (ع) کی عصمت و طہارت کی گواہی دے کر اپنی حقانیت اور توریت کے محرف ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہر مسئلہ میں حکم خدا کی تلاش و بحث سے پہلے ذاتی رائے و اجتہاد جائز نہیں: اَعَجِلۡتُمۡ اَمۡرَ رَبِّکُمۡ ...۔

۲۔ ایمان کی سب سے مستحکم رسی، برائے خدا محبت و برائے خدا عداوت کرنا ہے۔(حدیث): غَضۡبَانَ اَسِفًا ...۔

۳۔ امتیں اپنے پیغمبروں کے بعد گمراہی کے خطرات سے دوچار ہوتی ہیں: بِئۡسَمَا خَلَفۡتُمُوۡنِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ ...۔

۴۔ ہمیشہ ایک جماعت حق پر قائم رہتی ہے۔ اکثریت کی طرف سے ظلم و ستم کا نشانہ بنتی ہے: اِنَّ الۡقَوۡمَ اسۡتَضۡعَفُوۡنِیۡ وَ کَادُوۡا یَقۡتُلُوۡنَنِیۡ ...۔

۵۔ حضرت ہارونؑ کے برحق ہونے کے انکشاف کے بعد بھی لوگ ان کے دشمن تھے۔ جن کو ہنسنے کا موقع ملنے کا حضرت ہارون (ع) کو خطرہ تھا: فَلَا تُشۡمِتۡ بِیَ الۡاَعۡدَآءَ ...۔

۶۔ لوگوں نے اس کی پیروی کی جس کو رسول نے رہنما نہیں بنایا۔ جس کو رہنما بنایا تھا اس کے لوگ جانی دشمن بن گئے: وَ کَادُوۡا یَقۡتُلُوۡنَنِیۡ ...۔

قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِاَخِیۡ وَ اَدۡخِلۡنَا فِیۡ رَحۡمَتِکَ ۫ۖ وَ اَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ﴿۱۵۱﴾

۱۵۱۔ موسیٰ نے کہا: اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے بھائی کو معاف فرما اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ سَیَنَالُہُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ ذِلَّۃٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ؕ وَ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُفۡتَرِیۡنَ ﴿۱۵۲﴾

۱۵۲۔ جنہوں نے گوسالہ کو (معبود) بنایا بیشک ان پر عنقریب ان کے رب کا غضب واقع ہو گا اور دنیاوی زندگی میں ذلت اٹھانا پڑے گی اور بہتان پردازوں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِاَخِیۡ: یہ بات قابل توجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی استغفار معصیت کی بنیاد پرنہیں ہوتی۔ یہ آداب بندگی ہیں کہ بندگی کے فرائض انجام دینے کے بعد اپنے اس عمل کو بندگی کا حق ادا کرنے کے لیے ناکافی سمجھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابنیاء اور ائمہ علیہم السلام ہر عبادت کے بعد استغفار کرتے تھے۔ حدیث میں آیا ہے۔

ما عبدناك حق عبادتك۔[1]		ہم نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا۔

۲۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ: جن لوگوں نے گوسالہ پرستی اختیار کی تھی ان کے بارے میں دو قسم کی سزاؤں کا ذکر ہے۔ ایک غضب الٰہی سے دوچار ہوں گے۔ دوسری دنیوی زندگی میں ذلت و خواری سے دوچار ہوں گے۔ چنانچہ اس جرم کے بعد بنی اسرائیل پر گذرنے والے واقعات میں یہ دو باتیں نظر آتی ہیں: گوسالہ پرستوں کے داعی لوگوں کو موت کی سزا دی گئی۔ بعض روایات کے مطابق تین ہزار افراد کو قتل کر دیا گیا۔ سامری کو ذلت و خواری کے ساتھ مردود کیا گیا نیز ذلت و خواری کے سلسلے میں یہ لوگ دوسری طاقتوں کی غلامی میں ذلت کی زندگی گذارنے پر مجبور ہوتے رہے۔

۳۔ وَ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُفۡتَرِیۡنَ: افترا پردازوں کی یہی سزا ہوا کرتی ہے۔ ایک کلیے کا ذکر ہے کہ جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھیں گے، وہ قہر الٰہی اور مذلت سے دوچار ہوں گے۔ چند روز اگر انہیں مہلت مل جاتی ہے تو ان سزاؤں کے منافی نہیں ہیں۔ جیسا کہ قرآن کے متعدد مقامات میں اس کا ذکر ہے۔

اہم نکات

۱۔ انبیاء کا استغفار، آداب بندگی کے تحت ہے۔

۲۔ کبھی گناہ کی سزا دنیا میں بھی دی جاتی ہے: وَ ذِلَّۃٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ....

۳۔ شرک اور اللہ پر بہتان کی سزا دنیا میں بھی دی جاتی ہے: وَ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُفۡتَرِیۡنَ ....

وَ الَّذِیۡنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِہَا وَ اٰمَنُوۡۤا ۫ اِنَّ رَبَّکَ مِنۡۢ بَعۡدِہَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۵۳﴾

۱۵۳۔ اور جنہوں نے گناہ کا ارتکاب کیا پھر اس کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لے آئے تو اس (توبہ) کے بعد آپ کا رب یقیناً بڑا معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

---

[1] بحار الانوار: ۶۸: ۲۲۵

تفسیر آیات

آیت کا اطلاق عام ہے، تاہم اس جگہ گوسالہ پرستوں میں سے وہ گروہ مراد ہے جو صحیح معنوں میں اپنے اس عمل پر نادم اور صحیح معنوں میں ایمان پر قائم ہے۔ اسی طرح ہر ایماندار تائب کے لیے اللہ کی رحمت اس گناہ سے عظیم ہے، جس کا ارتکاب ہوا ہے۔

اس آیت میں پہلے مِنۡۢ بَعۡدِهَا کی ضمیر سیئات کی طرف، دوسرے مِنۡۢ بَعۡدِهَا کی ضمیر توبہ کی طرف راجع ہے۔

اہم نکات

۱۔ ایمان کے ساتھ حقیقی ندامت کی صورت میں مغفرت ہے۔ نہ یہ کہ اللہ غفور رحیم ہونے کا بہانہ بنا کر گناہ کا ارتکاب جاری رکھے۔

وَ لَمَّا سَکَتَ عَنۡ مُّوۡسَی الۡغَضَبُ اَخَذَ الۡاَلۡوَاحَ ۚۖ وَ فِیۡ نُسۡخَتِہَا ہُدًی وَّ رَحۡمَۃٌ لِّلَّذِیۡنَ ہُمۡ لِرَبِّہِمۡ یَرۡہَبُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾

۱۵۴۔ اور جب موسیٰ کا غصہ فرو ہو گیا تو انہوں نے (توریت) کی وہ تختیاں اٹھائیں جن کی تحریر میں ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت تھی جو اپنے پروردگار سے خائف رہتے ہیں۔

تشریح کلمات

نسخه: (ن س خ) نسخ۔ ایک چیز کو زائل کر کے دوسری چیز کو اس کی جگہ پر لانے کو کہتے ہیں اور کبھی اثبات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا نسخ الکتاب، کتاب کے منسوخ ہونے اور کتاب کی کاپی کرنے، دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَخَذَ الۡاَلۡوَاحَ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غیظ و غضب اس وقت فرو ہوا جب حضرت ہارون (ع) نے اپنا عذر پیش کیا۔ اَخَذَ الۡاَلۡوَاحَ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تختیاں سالم موجود تھیں۔ اس میں توریت کی اس بات کی رد ہے کہ یہ تختیاں ٹوٹ گئی تھیں۔

۲۔ وَ فِیۡ نُسۡخَتِہَا ہُدًی وَّ رَحۡمَۃٌ: توریت کی تحریر میں ہدایت و رحمت درج تھی۔ یہ تحریر پتھر کی تختیوں پر کندہ تھی۔ دوسری رحمت، جو اس شریعت پر عمل کرنے کی صورت میں مترتب ہونا تھی۔

۳۔ لِّلَّذِیۡنَ ہُمۡ لِرَبِّہِمۡ یَرۡہَبُوۡنَ: جو دلوں میں خوف خدا رکھتے ہیں، وہی اس ہدایت و رحمت سے سرشار ہو سکتے ہیں جیسا کہ سورہ مائدہ آیت ۶۶ میں فرمایا: اگر یہ لوگ توریت و انجیل اور ان کے رب کی طرف سے نازل شدہ (تعلیمات) کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر (آسمانی برکات) اور اپنے نیچے (زمینی برکات) سے مالا مال ہوتے۔

اہم نکات

۱۔ غم و غصہ اللہ کے لیے ہو تو عذر سن لینے کے بعد دل صاف ہو جاتا ہے: وَ لَمَّا سَکَتَ عَنۡ مُّوۡسَی الۡغَضَبُ....

۲۔ مومن کو اللہ کے عدل و انصاف سے خائف رہنا چاہیے: لِرَبِّہِمۡ یَرۡہَبُوۡنَ....

وَ اخۡتَارَ مُوۡسٰی قَوۡمَہٗ سَبۡعِیۡنَ رَجُلًا لِّمِیۡقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتۡہُمُ الرَّجۡفَۃُ قَالَ رَبِّ لَوۡ شِئۡتَ اَہۡلَکۡتَہُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ وَ اِیَّایَ ؕ اَتُہۡلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَہَآءُ مِنَّا ۚ اِنۡ ہِیَ اِلَّا فِتۡنَتُکَ ؕ تُضِلُّ بِہَا مَنۡ تَشَآءُ وَ تَہۡدِیۡ مَنۡ تَشَآءُ ؕ اَنۡتَ وَلِیُّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا وَ ارۡحَمۡنَا وَ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡغٰفِرِیۡنَ﴿۱۵۵﴾

۱۵۵۔ اور موسیٰ نے ہماری مقررہ میعاد کے لیے اپنی قوم سے ستر افراد منتخب کیے پھر جب انہیں زلزلے نے گرفت میں لیا (تو) موسیٰ نے عرض کیا: پروردگارا! اگر تو چاہتا تو ان کو اور مجھے پہلے ہی ہلاک کر دیتا، کیا تو ہمارے کم عقل لوگوں کے اعمال کی سزا میں ہمیں ہلاک کر دے گا؟ یہ تو تیری ایک آزمائش تھی جس سے جسے تو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، تو ہی ہمارا آقا ہے، پس ہمیں معاف فرما اور ہم پر رحم فرما اور تو معاف کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اخۡتَارَ مُوۡسٰی قَوۡمَہٗ سَبۡعِیۡنَ رَجُلًا: ان ستر افراد کا انتخاب موسیٰ (ع) کی طرف سے تھا۔ البتہ اللہ کے حکم تحت یہ انتخاب عمل میں آیا۔ یعنی حکم اللہ کی طرف سے تھا اور افراد کا تعین موسیٰ (ع) کی طرف سے تھا۔

واضح رہے ان لوگوں کے حضرت موسیٰ (ع) کی طرف سے منتخب اور قوم کے سرکردہ افراد ہونے کے باوجود، ان کا رویہ وہ نہیں تھا جو اللہ کو پسند ہو۔

۲۔ لِّمِیۡقَاتِنَا: وہ میعاد جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی۔ جس میں کوہ طور پر اللہ تعالیٰ سے مناجات کرنا

مقصود تھا۔

۳۔ اَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ: انہیں زلزلے نے گرفت میں لے لیا جس سے یہ سب لوگ ہلاک ہو گئے۔ ان کے ہلاک ہونے پر اگلے جملے میں صراحت ہے کہ حضرت موسیٰ (ع) نے پریشانی کے عالم میں عرض کیا: رَبِّ لَوۡ شِئۡتَ اَهۡلَكۡتَهُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ پروردگار اگر تو چاہتا تو ان کو اور مجھے پہلے ہی ہلاک کر دیتا۔

۴۔ ان ستر افراد کو اللہ تعالیٰ نے کوہ طور پر کس غرض سے بلایا تھا اور وہ کون سا جرم تھا جس کی سزا میں ان کو زلزلہ نے گرفت میں لیا اور سب کو ہلاک بھی کر دیا؟ اور وہ کون سا سفیہانہ عمل تھا جس کی طرف حضرت موسیٰ (ع) نے اشارہ فرمایا؟ اس آیت میں ان باتوں کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ قوم موسیٰ (ع) کے یہ نمائندہ افراد گوسالہ پرستی کی معافی طلب کرنے کے لیے آئے تھے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معافی و توبہ کے لیے آنے پر ہلاکت کی سزا کیوں؟

درحقیقت ان سوالات کا جواب سورۂ بقرہ میں موجود ہے، جہاں اس واقعہ کو اس ترتیب سے بیان کیا ہے:

قوم موسیٰ (ع) کے لیے پہلے دریا شگافتہ ہوا، پھر حضرت موسیٰ (ع) کو چالیس دنوں کے لیے کوہ طور پر بلایا گیا۔ اس دوران گوسالہ پرستی کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد قوم موسیٰ (ع) نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہمیں نہیں معلوم آپ اللہ سے ہم کلام ہوتے ہیں یا نہیں۔ ہم خود اللہ کا کلام سن لیں تو مان لیں گے۔ کلام سننے پر انہوں نے اللہ کو عیاناً دکھانے کا مطالبہ کیا اور مطالبہ کی صورت یہ تھی:

لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً ...[1]　　... ہم آپ پر ہرگز یقین نہیں کریں گے جب تک ہم خدا کو علانیہ نہ دیکھ لیں۔

اس پر قوم کے ستر افراد کو زلزلے نے گرفت میں لے لیا اور ہلاک ہو گئے۔

سورہ بقرہ آیت ۵۶ میں فرمایا:

ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ ....　　پھر تمہارے مرنے کے بعد ہم نے تمہیں اٹھایا....

۵۔ اَتُهۡلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا: اللہ کو عیاناً دکھانے کا مطالبہ ہی وہ سفیہانہ عمل تھا جس کے بعد ان کو ہلاک کر دیا گیا۔

۶۔ اِنۡ هِيَ اِلَّا فِتۡنَتُكَ: حضرت موسیٰ (ع) جیسے اولوالعزم نبی کو یہ معلوم ہے کہ یہ جو کچھ ہوا وہ اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہے۔ جس سے اچھے اور برے جدا ہو جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔　اللہ کے لامتناہی وجود کو حاسۂ بصر میں محدود کر کے دکھانے کا مطالبہ سفیہانہ ہے: بِمَا فَعَلَ

----

[1] ۲ بقرۃ: ۵۵

السُّفَهَآءُ ....

۲۔ آزمائش سے ہی مؤمن اور غیر مؤمن چھن کر الگ ہوتے ہیں: اِنۡ هِیَ اِلَّا فِتۡنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا ....

وَ اكۡتُبۡ لَنَا فِیۡ هٰذِهِ الدُّنۡیَا حَسَنَةً وَّ فِی الۡاٰخِرَةِ اِنَّا هُدۡنَاۤ اِلَیۡكَ ؕ قَالَ عَذَابِیۡۤ اُصِیۡبُ بِهٖ مَنۡ اَشَآءُ ۚ وَ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ كُلَّ شَیۡءٍ ؕ فَسَاَكۡتُبُهَا لِلَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِیۡنَ هُمۡ بِاٰیٰتِنَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾

۱۵۶۔اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بھلائی مقرر فرما، ہم نے تیری طرف رجوع کر لیا ہے، ارشاد فرمایا: عذاب تو میں جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے پس اسے میں ان لوگوں کے لیے مقرر کردوں گا جو تقویٰ رکھتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اكۡتُبۡ لَنَا: دنیا میں نیکی مل جانے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ فطری تقاضوں پر قائم رہتا ہے، جس سے آخرت کی نیکیاں بھی وصول ہو جاتی ہیں۔

۲۔ اِنَّا هُدۡنَاۤ اِلَیۡكَ: ہم نے جب تیری طرف رجوع کیا ہے تو ہم اس قابل ہو سکتے ہیں کہ دنیا و آخرت کی بھلائی ہمارے شامل حال ہو جائے۔

۳۔ عَذَابِیۡۤ اُصِیۡبُ بِهٖ مَنۡ اَشَآءُ: قانون مجازات کے تحت اللہ کا عذاب تو صرف ان لوگوں پر ہے جن پر عذاب کرنا مشیت اور عدل الٰہی میں ضروری ہے۔

۴۔ وَ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ كُلَّ شَیۡءٍ: لیکن اللہ کی رحمت بلا امتیاز ہر چیز کو شامل ہے۔ نیک، مجرم، کافر، منکر حتیٰ سرکشوں کو بھی اللہ دنیا میں اپنی رحمت سے محروم نہیں فرماتا۔

۵۔ فَسَاَكۡتُبُهَا لِلَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ: اس رحمت کو لازم اور ضروری قرار دیتا ہوں اہل تقویٰ، اہل ایمان کے لیے جیسا کہ مجرموں کے لیے عذاب کو ضروری قرار دیتا ہوں۔

۶۔ یہاں دو رحمتوں کا ذکر ہے: ایک عام رحمت جو بلا معاوضہ ہر چیز کو ملتی ہے۔ یہ رحمت ہر چیز کے لیے، ان کے وجود کی ابتدا سے لے کر انتہا تک جاری رہتی ہے۔ دوسری خاص رحمت ہے۔ یہ صرف اہل تقویٰ و عمل اور اہل ایمان کے لیے ہے۔ جو ان کے اعمال حسنہ کے جزا و ثواب کے طور پر ہے۔ اس رحمت میں کافروں کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے۔

علامہ طباطبائی فرماتے ہیں:

اس خاص رحمت کے مقابلے میں کافروں کے لیے عذاب ہے لیکن اس عام رحمت کے مقابلے میں کوئی عذاب نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ عذاب کا سبب مجرم کی طرف سے ہے، جب کہ رحمت اللہ کی طرف سے ہے۔ لہٰذا عذاب جرم کے ساتھ مقید ہے اور رحمت ہر چیز کے لیے عام ہے: عَذَابِیۡۤ اُصِیۡبُ بِہٖ مَنۡ اَشَآءُ ۚ وَ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ ....

۲۔ خاص رحمت کے لیے تقویٰ (عمل کی پاکیزگی) زکوٰۃ (مال کی پاکیزگی) اور ایمان (عقیدہ کی مضبوطی) شرط ہے۔

اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَہٗ مَکۡتُوۡبًا عِنۡدَہُمۡ فِی التَّوۡرٰىۃِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ ۫ یَاۡمُرُہُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡہٰہُمۡ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ یُحِلُّ لَہُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیۡہِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَ یَضَعُ عَنۡہُمۡ اِصۡرَہُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِہٖ وَ عَزَّرُوۡہُ وَ نَصَرُوۡہُ وَ اتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَہٗۤ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

۱۵۷۔ (یہ رحمت ان مومنین کے شامل حال ہو گی) جو لوگ اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جو نبی امی کہلاتے ہیں جن کا ذکر وہ اپنے ہاں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ انہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور پاکیزہ چیزیں ان کے لیے حلال اور ناپاک چیزیں ان پر حرام کرتے ہیں اور ان پر لدے ہوئے بوجھ اور (گلے کے) طوق اتارتے ہیں، پس جو ان پر ایمان لاتے ہیں ان کی حمایت اور ان کی مدد اور اس نور کی پیروی کرتے ہیں جو ان کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔

تشریح کلمات

اِصۡرَ: (ا ص ر) بوجھ کے معنوں میں ہے اور عہد مؤکد کو بھی کہتے ہیں۔ رَبَّنَا وَ لَا تَحۡمِلۡ عَلَیۡنَاۤ اِصۡرًا ....[1]

---

[1] ۲ بقرۃ: ۲۸۶

الۡاَغۡلٰلَ: (غ ل ل) غلّ کی جمع ہے۔ اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے کسی کے اعضاء کو جکڑ کر اس کے وسط میں باندھ دیا جاتا ہے۔

عَزَّرُوۡہُ: (ع ز ر) عزّر۔ التعزیر۔ اس مدد کو کہتے ہیں جو جذبہ تعظیم کے ساتھ ہو۔ اسی سے تادیبی سزا کو تعزیر کہتے ہیں کیونکہ اس شخص کی اصلاح کے لیے ایک قسم کی مدد ہوتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ رسول، نبی اور امّی ان تینوں اوصاف میں سے لفظ رسول موصوف اور نبی امّی صفت کے عنوان سے مذکور ہے۔ اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جو نبی امّی کے نام سے معروف ہیں۔

اہل کتاب عربوں کو امّی کہتے تھے اور اہل حجاز کا تو یہ لفظ لقب بن گیا تھا۔ وہ ان کو امّی کہ کر اپنے برابر انسانی حقوق تسلیم کرنے کے لیے بھی آمادہ نہ تھے۔ وہ ان کے اموال کی جبراً غارت گری کرتے تھے اور کہتے تھے:

لَیۡسَ عَلَیۡنَا فِی الۡاُمِّیّٖنَ سَبِیۡلٌ ... [۱] ناخواندہ (غیر یہودی) لوگوں کے بارے میں ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

قابل توجہ مطلب یہ ہے کہ اس لفظ امّی کو جہاں اہل کتاب خاص کر یہودی تحقیر کے طور پر استعمال کرتے تھے، وہاں قرآن نے اس لفظ کو رسول کریمؐ کی شناخت کے طور پر بیان فرمایا۔ اس میں عظیم نکتہ یہ ہے کہ وہ رسول جن کے بارے میں تم خود تسلیم کرتے ہو کہ وہ امّی ہیں، ایک جامع نظام حیات پیش کرتے ہیں، جس کی نظیر پیش کرنے سے انسانی درسگاہوں کے پڑھے ہوئے دانشور قاصر ہیں۔ یہ اس بات پر واضح دلیل ہے کہ جس نظام حیات نے دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا ہے، اس کا پیش کرنے والا اللہ کی طرف سے پڑھا ہوا ہے۔ وہ ان سب پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ پڑھا لکھا ہے۔ البتہ بشری درسگاہوں میں نہیں بلکہ ملکوتی درسگاہوں کا پڑھا لکھا ہے۔ اس نے ان سیاہ لکیروں والی تحریر کو نہیں پڑھا، وہ لوح کائنات پر قلم قدرت سے لکھی ہوئی تحریروں کو پڑھ کر آیا ہے:

بَلۡ ہُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِیۡدٌ ۙ﴿﴾ فِیۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ ﴿﴾ [۲] بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے۔ لوح محفوظ میں (ثبت) ہے۔

سَنُقۡرِئُکَ فَلَا تَنۡسٰۤی ﴿﴾ [۳] (عنقریب) ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لکیروں کو پڑھ نہیں سکتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ ان لکیروں کو پڑھتے نہیں ہیں۔ وہ انسانیت کو تعلیم دینے آئے ہیں، انسانوں سے تعلیم لینے نہیں آئے کہ

---

[۱] ۳ آل عمران: ۷۵ [۲] ۸۵ بروج: ۲۱۔۲۲ [۳] ۸۷ اعلیٰ: ۶

ان کی تحریروں کو پڑھنے کی ضرورت پیش آئے۔

۲۔ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَہٗ مَکۡتُوۡبًا عِنۡدَہُمۡ فِی التَّوۡرٰىۃِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ: جس کا ذکر وہ اپنے ہاں توریت وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ یہاں نہایت سنجیدہ اور فیصلہ کن لہجے میں یہ اعلان ہے کہ اگر یہ اعلان مبنی برحق نہ ہوتا تو اس طرح کا دعویٰ کرنے کا نتیجہ اس کے حق میں نہ ہوتا بلکہ لوگ اور زیادہ متنفر ہو جاتے کہ یہ شخص غیر ذمہ دار ہے۔

اس قدر تحریف و تغیر کے باوجود موجودہ توریت و انجیل میں رسول کریمؐ کی آمد کے سلسلے میں تصریحات موجود ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں:

الف: توریت استثناء ۱۸: ۱۵ میں آیا ہے:

> خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی طرف کان دھریو۔

ب: توریت استثناء ۱۸: ۱۸ میں آیا ہے:

> اور خدا نے مجھے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کیا سو اچھا کیا۔ میں ان کے لیے ان بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔

بنی اسرائیل کے بھائیوں سے مراد اولاد اسماعیل ہی ہو سکتی ہے۔

ج۔ توریت استثناء ۳۳: ۲ میں آیا ہے:

> خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی۔

فاران مکہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے۔ دس ہزار افراد کے ساتھ حضور (ص) مکہ میں داخل ہوئے تھے۔

د: توریت پیدائش ۱۷: ۲۱ میں آیا ہے:

> اور اسماعیل کے حق میں، میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے آبرومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا۔ اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے۔ میں اسے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔

اولاد اسماعیل کے لیے یہ سب وعدے محمد و آل محمد (ع) کی بارہ ذوات مقدسہ میں پورے ہوئے۔

اس آیت میں جہاں اہل کتاب کے لیے لمحہ فکریہ ہے، وہاں اہل اسلام کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے۔

ھ: انجیل یوحنا ۱۴: ۱ میں آیا ہے:

اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار فارقلیط بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔

جب وہ مددگار رفارقلیط آئے گا، جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کی روح جو باپ کی طرف سے نکلتی ہے تو وہ میری گواہی دے گی۔

و: انجیل یوحنا ۱۶: ۱۳ میں آیا ہے:

جب سچائی کی روح آئے گی تم کو حق کی تمام باتیں سکھائے گی کیونکہ وہ اپنی طرف سے نہیں بولتی۔

فارسی ترجمہ مطبوعہ لندن ۱۸۷۸ء میں فارقلیط کا ترجمہ 'تسلی دہندہ' کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

چون آن تسلی دهنده بیاید که من از جانب پدر به شما خواهم فرستاد یعنی روح راستی که از طرف پدر می آید او دربارۀ من شهادت خواهد داد.

فارقلیط یا فیرقلیط کون ہے؟: فارقلیط یونانی لفظ ہے۔ اس کا انگلش تلفظ Paraclete ہے۔ اس کے معنی عزت یا مدد دینے والا۔ اس کا دوسرا لفظ فیرقلیط Periclite ہے جس کے معنی ہیں جلیل الشان، بلند مرتبہ، بزرگوار، جو محمد، احمد اور محمود کے قریب المعنی ہیں۔

فارقلیط کا تلفظ: حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ (ع) پر انجیل عبرانی زبان میں نازل ہوئی تھی، جس کا یونانی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اس لفظ کا یونانی تلفظ پاراکلیٹوس ہے جس کے معنی عزت دہندہ کے بنتے ہیں اور اس کا عربی تلفظ فارقلیط بنا دیا اور اگر یونانی تلفظ پیرکلوٹوس ہے تو اس کے معنی محمد، احمد اور محمود کے قریب ہیں۔

واضح رہے یہ لوگ توریت و انجیل کا جب کسی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں تو ان کی یہ عام عادت ہے کہ اصل نام کی جگہ اس کا ترجمہ کر دیتے ہیں۔ مؤلف اظہار الحق نے اس کی بہت سے مثالیں پیش کی ہیں۔

انجیل متی باب ۱۱ ترجمہ عربی مطبوعہ ۱۸۱۱ء اور ۱۸۴۴ء میں فان اردتم ان تقبلوہ فھو ایلیا المزمع ان یاتی اور ترجمہ عربی مطبوعہ ۱۸۱۶ء میں ایلیا کی جگہ فھذا ھو ارکھ دیا ہے۔

انجیل یوحنا باب ۴ ترجمہ عربی ۱۸۱۱ء، ۱۸۳۱ء اور ۱۸۴۴ء میں آیا ہے: لما علم یسوع جب کہ ترجمہ عربی مطبوعہ ۱۸۱۶ء اور ۱۸۶۰ء میں یسوع کی جگہ رب رکھا ہے۔ لما علم الرب۔

انجیل یوحنا باب اول آیت ۴۱ میں ترجمہ عربی مطبوعہ ۱۸۱۱ء اور ۱۸۴۴ء میں آیا ہے:

قد وجدنا مسیا الذی تاویله المسیح یعنی ہم نے مسیا کو پایا، جس کی تاویل مسیح ہے۔

فارسی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۱۶ء میں آیا ہے:

ما مسیح را که ترجمۂ آن "کرسطوس" میباشد یافتیم۔

پتہ نہیں چلتا کہ اصل لفظ مسیا ہے، مسیح اس کا ترجمہ ہے یا بقول ترجمۂ فارسی اصل مسیح ہے، اس کا ترجمہ کرسطوس ہے اور بقول ترجمہ اردو مطبوعہ ۱۸۳۹ء اصل لفظ خرستہ ہے۔

انجیل یوحنا باب اول آیت ۴۲ میں حضرت عیسیٰ (ع) نے اپنے حواری بطرس سے کہا (ترجمہ عربی مطبوعہ ۱۸۱۱ء):

انت تدعی ببطرس الذی تاویله الصخرۃ

تجھے پطرس پکارا جائے جس کے معنی پتھر ہیں۔

جب کہ ترجمہ عربی مطبوعہ ۱۸۱۶ء میں اس کے برعکس آیا ہے:

ستسمی انت بالصفا المفسر ببطرس۔

تجھے پتھر پکارا جائے جس کے معنی پطرس ہیں۔

ترجمہ فارسی میں آیا ہے:

ترا کیفاس کہ ترجمۂ آن سنگ است ندا خواہند کرد۔

ان شخصیتوں کے اصلی ناموں میں تبدیلی و تحریف میں ان کا خاص مفاد وابستہ نہیں ہے تو اسم محمد میں تبدیلی لانے میں نہ تو کوئی تأمل ہوسکتا ہے، نہ کسی کو تعجب ہونا چاہیے۔

۳۔ یَاۡمُرُہُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡہٰہُمۡ عَنِ الۡمُنۡکَرِ: اچھی اور نیک باتوں کی دعوت دینا اور بری باتوں سے روکنا، اسلامی تعلیمات کو ہمیشہ زندہ اور فعال رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے اور ساتھ امت اسلامیہ کی تربیت اور اخلاقی و اجتماعی قدروں کا شعور بیدار کرنے کے لیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا نظام ایک انسان ساز نظام ہے۔ یہ نظام اسلامی تعلیمات کا ایک خاصہ ہے۔ اگرچہ دیگر ادیان میں بھی اس دستور کا ذکر ہے لیکن اسلامی نظام میں اس کا جو مقام اور اہمیت ہے وہ کسی اور دین و مذہب میں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے مطابق اس عمل کے سیاسی اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ اگر کوئی قوم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عمل ترک کر دے اور نتیجتاً برے حکمران اس پر مسلط ہو جائیں اور وہ ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے دعا کرے تو اللہ اس کی دعا قبول نہیں کرے گا۔

۴۔ وَیُحِلُّ لَہُمُ الطَّیِّبٰتِ: وہ چیزیں جو انسانی نفس و روح اور جسم کے لیے مناسب اور مفید ہیں، ان کو حلال قرار دیا ہے اور وہ چیزیں جن سے انسانی نفسیات وصحت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، ان کو

حرام قرار دیا ہے۔ ملت اسلامیہ کا ایک امتیازی نشان یہ ہے کہ اس کی شریعت پر عمل پیرا شخص ہر قسم کی گندگی اور پلیدی سے دور رہتا ہے۔

۵۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ : اس رسول کریمؐ کی ایک اہم علامت یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ناروا قید و بند سے آزادی دلاتے ہیں۔ ہر قسم کی غلامی سے آزاد کر دیتے ہیں۔ مذہبی مفاد پرستوں سیاسی آقاؤں کی طرف سے جن بوجھوں تلے یہ لوگ دبے اور جن خود ساختہ جکڑ بندیوں میں پھنسے ہوئے تھے، ان سب سے آزاد کر کے ایک مستقل قوم کی حیثیت دیتے ہیں۔

نیز سابقہ شریعتوں کے برخلاف شریعت محمدی ایک سہل اور آسان شریعت ہے۔ چنانچہ کوئی حکم اگر معمول سے زیادہ ناقابل تحمل مشقت کا باعث ہو تو وہ حکم اٹھ جاتا ہے۔ اسے فقہی اصطلاح میں قاعدۃ نفی الحرج کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۔[1] اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہیں مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

۶۔ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ: آیت کے شروع میں رسول کریم کی تین ذمہ داریوں: i. امر بمعروف نہی از منکر۔ ii. پاکیزہ چیزوں کو حلال اور iii. ناپاک چیزوں کو حرام اور ان پر لدے ہوئے بوجھ اور طوق اتارنا، کے ذکر کے بعد امت کے لیے تین ذمہ داریوں کا ذکر ہے۔ اول ان پر ایمان لانا۔ دوم ان کی تعظیم کے ساتھ ان کی کمک کرنا، ان کا دست و بازو بننا۔ سوم اس نور (قرآن) کی اتباع کرنا جو ان کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ ان شرائط سے گزرنے کے بعد فلاح و کامیابی کی منزل حاصل ہو سکتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ رحمت خاص صرف امت محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہے: اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ.

۲۔ طیب طاہر چیزوں کو حلال اور ہر ناپاک اور گندگی سے اجتناب کرنا اس امت کا خاصہ ہے: وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ....

۳۔ رسول اسلام ہر قسم کے ناروا قید و بند اور جکڑ بندیوں سے آزادی دلانے کے لیے آئے ہیں: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ....

۴۔ فلاح کے لیے ضروری ہے رسول پر ایمان ہو اور رسول کی نصرت کرے فرار نہ کرے۔ قرآن کی اتباع کرے اسے پس پشت نہ ڈالے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ۱۵۸۔ کہد یجیے: اے لوگو! میں تم سب کی طرف

----

[1] ۲ بقرۃ: ۱۸۵

اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعَا الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ ۖ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهِ النَّبِىِّ الۡاُمِّىِّ الَّذِىۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوۡهُ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾

اس اللہ کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زندگی اور وہی موت دیتا ہے، لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، اس اُمّی نبی پر جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو شاید تم ہدایت حاصل کر لو۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعَا: رسول اکرم (ص) کی تعلیمات کے اہم ترین نکات، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، پاکیزہ چیزوں کا حلال اور ناپاک چیزوں کا حرام قرار دینا، ان پر لدے ہوئے بوجھ اور طوق و زنجیر سے آزاد کرنا، کے اعلان کے بعد اپنی رسالت کی آفاقیت کا اعلان فرما رہے ہیں کہ ان تعلیمات کے حامل پیغمبر کی رسالت کسی زماں و مکان میں محدود ہونا ممکن نہیں ہے بلکہ انسانی قدروں پر مشتمل یہ دستور تمام انسانوں کے لیے ہے۔

۲۔ الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ: اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ، توحید اور موت و حیات کا مالک ہونے کا ذکر اس لیے فرمایا ہے کہ جیسا کہ اس کی مالکیت، ربوبیت اور موت و حیات پر قدرت کسی قوم کے ساتھ محدود نہیں ہے، اس کی طرف سے آنے والے رسولؐ کی دعوت و رسالت بھی محدود نہیں ہے۔

۳۔ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهِ النَّبِىِّ الۡاُمِّىِّ: اس مالک ارض و سماوات پر ایمان لے آؤ اور اس نبی اُمّی پر ایمان لے آؤ۔ اس رسول کا اُمّی ہونا ان کے برحق ہونے کا ثبوت ہے۔ اگر تمہارے مکتب کے پڑھے ہوئے ہوتے تو ممکن تھا ان کی نبوت پر شک کرنے کے لیے جواز مل جائے۔ نہیں یہ اللہ تعالیٰ کے ملکوتی مکتب میں دست قدرت سے لکھی ہوئی تحریر پڑھ کر آئے ہیں۔ اس میں اس یہودی طرز تفکر کی رد ہے کہ ایک اُمّی ہمارا رسول کیسے ہو سکتا ہے۔

۴۔ الَّذِىۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ: اسی لیے وہ اللہ پر کامل ایمان رکھتا ہے۔ وَكَلِمٰتِهٖ: اس ملکوتی تحریر میں جن کلمات کو پڑھ کر آئے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مملکت میں نافذ ہونے والے دستورات پر ایمان رکھتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ ہمارے رسول کی رسالت اسی طرح ہمہ گیر ہے جس طرح اللہ کی مالکیت: اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ

اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعَا ....

۲۔　رسول کی عظمت بھی ان کے ایمان کی عظمت سے ہے: یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ کَلِمٰتِہٖ .....

وَ مِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰۤی اُمَّۃٌ یَّہۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَ بِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾

۱۵۹۔ اور قوم موسیٰ میں ایک جماعت ایسی تھی جو حق کے مطابق رہنمائی اور اسی کے مطابق عدل کرتی تھی۔

تفسیر آیات

بنی اسرائیل کی تاریخ اور ان کی سیرت و کردار کے بیان سے ایسا لگتا تھا کہ پوری کی پوری قوم سراپا جرائم سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اس آیت میں اس بات کی وضاحت ہے کہ ایسا بھی نہیں کہ پوری قوم بدکردار ہو بلکہ ان میں ایک جماعت حق پر قائم تھی اور دوسروں کو حق کی طرف بلاتی رہی اور حق کے مطابق انصاف پر بھی قائم رہی۔ سلسلہ کلام اور سیاق آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عصر موسیٰ (ع) کے بنی اسرائیل کے بارے میں ہے، نہ کہ نزول قرآن کے زمانے کے۔

مگر یہ کہ یَّہۡدُوۡنَ اور یَعۡدِلُوۡنَ (فعل مضارع) سے یہ سمجھا جائے کہ اس آیت سے مراد عصر نزول قرآن میں موجود چند ایک بنی اسرائیل ہیں جو اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے ہیں۔

اہم نکات

۱۔　کوئی امت خواہ کتنی گمراہ، ہو ان میں حق کی طرف ہدایت کرنے والی ایک جماعت موجود ہوا کرتی ہے۔

وَ قَطَّعۡنٰہُمُ اثۡنَتَیۡ عَشۡرَۃَ اَسۡبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اِذِ اسۡتَسۡقٰىہُ قَوۡمُہٗۤ اَنِ اضۡرِبۡ بِّعَصَاکَ الۡحَجَرَ ۚ فَانۡۢبَجَسَتۡ مِنۡہُ اثۡنَتَا عَشۡرَۃَ عَیۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَہُمۡ ؕ وَ ظَلَّلۡنَا عَلَیۡہِمُ الۡغَمَامَ وَ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡہِمُ الۡمَنَّ وَ

۱۶۰۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ قبیلوں میں تقسیم کر کے جدا جدا جماعتیں بنائیں اور جب ان کی قوم نے ان سے پانی طلب کیا تو ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنا عصا پتھر پر مارو، چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، ہر جماعت نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر لیا اور ہم نے ان کے سروں پر بادل کا سائبان بنایا اور ان پر من و سلویٰ نازل کیا، جو پاکیزہ چیزیں ہم

السَّلْوٰی ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٠﴾

نے تمہیں عنایت کی ہیں انہیں کھاؤ اور (بعد میں نافرمانی کی وجہ سے) یہ لوگ ہم پر نہیں بلکہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ: بنی اسرائیل کی سرکشیوں کا ذکر کرنے کے بعد ان انعامات و احسانات کا ذکر ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو نوازا ہے۔ توریت میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب صحرائے سینا میں نزول کیا تو ان میں بیس سال سے زائد عمر کے افراد کی تعداد جو جنگ میں شرکت کرنے کے قابل تھی، چھ لاکھ سے زائد تھی۔ اس طرح کل تعداد پندرہ سے بیس لاکھ تک ہو سکتی ہے۔

اگرچہ اس تعداد کا درست ہونا ضروری نہیں ہے تاہم ان کی تعداد اس حد تک ضرور تھی کہ پانی لینے کے لیے بارہ جگہوں کی ضرورت پیش آئی چنانچہ ان میں نظم قائم رکھنے کے لیے ان کو بارہ قبیلوں میں تقسیم کیا۔

من و سلویٰ کی تشریح کے لیے البقرۃ آیت ۵۷، بارہ چشموں کی تشریح کے لیے البقرۃ آیت ۶۰ ملاحظہ فرمائیں۔

وَ اِذْ قِیْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِیْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿١٦١﴾

۱۶۱۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ اس بستی میں سکونت اختیار کرو اور اس میں جہاں سے چاہو کھاؤ اور حطہ کہتے ہوئے اور دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ، ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے، نیکی کرنے والوں کو ہم عنقریب مزید عطا کریں گے۔

فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٢﴾

۱۶۲۔ مگر ان میں سے ظالم لوگوں نے وہ لفظ بدل ڈالا جو خلاف تھا اس کلمہ کے جو انہیں کہا گیا تھا، پھر ان کے اس ظلم کی وجہ سے ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا۔

تفسیر آیات

انسانی تاریخ کا جو باب بنی اسرائیل نے رقم کیا ہے اس کے سیاہ ورق کی طرف اشارہ کیا جا رہا

ہے کہ اس قوم نے اللہ کے بے شمار احسانات کے جواب میں کیا کیا مجرمانہ حرکتیں کیں۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۃ بقرۃ آیت ۵۸۔ ۵۹

وَسۡـَٔلۡهُمۡ عَنِ الۡقَرۡيَةِ الَّتِىۡ كَانَتۡ حَاضِرَةَ الۡبَحۡرِ‌ۘ اِذۡ يَعۡدُوۡنَ فِى السَّبۡتِ اِذۡ تَاۡتِيۡهِمۡ حِيۡتَانُهُمۡ يَوۡمَ سَبۡتِهِمۡ شُرَّعًا وَّيَوۡمَ لَا يَسۡبِتُوۡنَ‌ ۙ لَا تَاۡتِيۡهِمۡ‌ ۛۚ كَذٰلِكَ ‌ۛۚ نَبۡلُوۡهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ﴿۱۶۳﴾

۱۶۳۔ اور ان سے اس بستی (والوں) کے بارے میں پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھی، جب یہ لوگ ہفتہ کے دن خلاف ورزی کرتے تھے اور مچھلیاں ہفتہ کے دن ان کے سامنے سطح آب پر ابھر آتی تھیں اور ہفتہ کے علاوہ باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں، اس طرح ان کی نافرمانی کی وجہ سے ہم انہیں آزماتے تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ یہ بستی ایلہ تھی جو اس وقت اسرائیلی حکومت کی بندرگاہ ہے۔

۲۔ یہ واقعہ توریت میں مذکور نہیں ہے۔ تاہم یہود کی دیگر تاریخی کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر ہے اور ان میں یوم سبت کی بے حرمتی کو یہودیوں کے بڑے جرائم میں شمار کیا ہے۔

۳۔ ہفتہ کے دن مچھلیوں کا ابھر آنا حکمت امتحان کے مطابق ایک اصلاحی عمل تھا، جس سے کامیاب اور ناکارہ لوگ چھن کر الگ ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا:

اِنۡ هِىَ اِلَّا فِتۡنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنۡ تَشَآءُ وَ تَهۡدِىۡ مَنۡ تَشَآءُ ...[1]

یہ تو تیری ایک آزمائش تھی جس سے جسے تو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے.

اللہ تعالیٰ جب کسی کی آزمائش کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے نافرمانی اور معصیت کے مواقع فراہم کرتا ہے تاکہ اس کے اندر چھپا ہوا کفر و عصیان نمایاں ہو جائے۔

لہٰذا بعض مفسرین کا یہ کہنا نہایت تعجب خیز ہے کہ اہل سنت نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صادر ہونے والے احکام میں مصلحت ہونا ضروری نہیں ہے، نہ دین میں نہ دنیا میں۔ کیونکہ اللہ کو علم تھا کہ ہفتہ کے دن مچھلیاں وافر مقدار میں نمودار ہونے سے لوگ گناہ اور کفر میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اگر اللہ پر صلاح اور اصلح کے مطابق عمل کرنا لازم ہوتا تو اس دن مچھلیوں کو ابھر آنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہیے تھا تاکہ وہ کفر و معصیت میں مبتلا نہ ہوں۔[2]

---

[1] ۷ اعراف: ۱۵۵	[2] تفسیر المنیر ۹: ۱۴۵

اس نظریے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اللہ کا دین اور اس کی شریعت کا طبیعی قوانین، تکوینی امور اور فطری تقاضوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ شریعت کے احکام میں دین و دنیا کی مصلحت کارفرما ہوتی ہے، نہ فطری و تکوینی امور میں دینی مصالح کا لحاظ کیا جاتا ہے بلکہ دینی دستورات حکمت و مصلحت سے خالی ایک قید و بند ہیں اوران کا اس دنیا پر حاکم تمام تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں ہے۔ صرف یہ کہ آخرت میں ان کا اجر وثواب ہو گا۔ البتہ اللہ فعال لما یشاء ہے لیکن اللہ کی مشیت اندھی بانٹ نہیں ہے۔ اللہ نے خود اپنی ذات پر حکیمانہ عمل لازم قرار دیا ہے، کسی مخلوق کی طرف سے نہیں۔ جیسے کَتَبَ رَبُّکُمۡ عَلٰی نَفۡسِہِ الرَّحۡمَۃَ ۔[1] تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم قرار دیا ہے۔

عقل وخرد سے خالی اس نظریہ کی رد بھی خود اس نظریے میں موجود ہے تاہم یہ بات سب کے لیے عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نظام امتحان و آزمائش کی بنیاد پر ہے اور امتحان اختیار کی صورت میں قائم ہوسکتا ہے۔ جبر کی صورت میں نہیں کہ ہفتے کے دن مچھلیوں کو سطح آب پر آنے نہ دے اور لوگوں کو گناہ سے طاقت کے ذریعہ روک دے یا ایسی صورت بنا دے کہ لوگوں سے گناہ سرزد ہی نہ ہو سکے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَنَبۡلُوۡکُمۡ بِالشَّرِّ وَالۡخَیۡرِ فِتۡنَۃً ...[2]　ہم امتحان کے طور پر برائی اور بھلائی کے ذریعے تمہیں مبتلا کرتے ہیں۔

وَبَلَوۡنٰہُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ ...[3]　ہم نے آسائشوں اور تکلیفوں کے ذریعے انہیں آزمایا۔

وَ اِذۡ قَالَتۡ اُمَّۃٌ مِّنۡہُمۡ لِمَ تَعِظُوۡنَ قَوۡمَا ۙ اللّٰہُ مُہۡلِکُہُمۡ اَوۡ مُعَذِّبُہُمۡ عَذَابًا شَدِیۡدًا ؕ قَالُوۡا مَعۡذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُمۡ وَ لَعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾

۱۶۴۔ اور جب ان میں سے ایک فرقے نے کہا: ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاکت یا شدید عذاب میں ڈالنے والا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: (ہم یہ نصیحت) تمہارے رب کی بارگاہ میں عذر پیش کرنے کے لیے کرتے ہیں اور (اس لیے بھی کہ) شاید وہ تقویٰ اختیار کریں.

تفسیر آیات

اس آیت میں تین گروہ کا ذکر ہے: ایک گروہ وہ جس نے یوم سبت کے جرم کا ارتکاب کیا۔ دوسرا گروہ وہ جو اس گروہ کو ایسا نہ کرنے کی نصیحت کرتا تھا۔ تیسرا گروہ وہ جو ان کی اصلاح سے مایوس تھا اور نصیحت کے حق میں نہ تھا۔

ان تین گروہوں میں سے وہ گروہ جو امر بمعروف اور نہی از منکر کا فریضہ ادا کر رہا تھا، اس پر

---

[1] ۶ انعام: ۵۴　[2] ۲۱ الانبیاء: ۳۵　[3] ۷ اعراف: ۱۶۸

دوسرے گروہ کا اعتراض آیا کہ یہ لوگ قابل ہدایت نہیں ہیں، ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش بے ثمر رہے گی۔

ناصح گروہ نے اپنے موقف کے حق میں دو دلائل پیش کیے:

الف: مَعۡذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُمۡ: تمہارے رب کی بارگاہ میں عذر پیش کرنے کے لیے ہم ان کی نصیحت کر رہے ہیں۔ عذر کا مضمون یہ ہوگا: خدایا ہم ان کے اس عمل زشت کے حق میں نہ تھے اور انہیں نصیحت کر کے ہم نے اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔

ب: یہ کہ ہم ان نصیحتوں کے بے اثر ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان نصیحتوں کا کچھ لوگوں پر اثر ہوگا۔ اسلامی تعلیمات بھی یہی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے۔

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ ان ان ذلک اضعف الایمان۔[1]

تم میں سے کوئی کسی برائی کو دیکھ لے تو اسے اپنی طاقت سے روک دے۔ نہ ہو سکے تو اپنی زبان سے روک دے۔ نہ ہو سکے تو اپنے دل سے (بیزاری کرے)۔ یہ کمزور ترین ایمان ہے۔

اہم نکات

۱۔ وعظ و نصیحت اور امر بمعروف اور نہی از منکر نہ کرنے کی صورت میں اللہ کے سامنے معذرت کی گنجائش نہیں ہے: مَعۡذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُمۡ ....۔

۲۔ ہدایت و اصلاح سے جلدی مایوس نہیں ہونا چاہیے: وَلَعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ۔

فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُکِّرُوۡا بِہٖۤ اَنۡجَیۡنَا الَّذِیۡنَ یَنۡہَوۡنَ عَنِ السُّوۡٓءِ وَاَخَذۡنَا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا بِعَذَابٍۭ بَئِیۡسٍۭ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ﴿۱۶۵﴾

۱۶۵۔ پس جب انہوں نے وہ باتیں فراموش کر دیں جن کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے برائی سے روکنے والوں کو نجات دی اور ظالموں کو ان کی نافرمانی کی وجہ سے برے عذاب میں مبتلا کر دیا۔

تفسیر آیات

اس آیت میں دو گروہوں کا ذکر صریح لفظوں میں ہے۔ ایک وہ جو نصیحت کو ان سنی کرتے تھے اور ان پر عذاب نازل ہوا۔ دوسرا وہ جس نے وعظ و نصیحت، امر بمعروف و نہی از منکر میں اپنی ذمہ داریاں پوری کر دیں، اسے اللہ نے نجات عنایت فرمائی۔ تیسرا گروہ وہ جس نے سکوت اختیار کیا۔ اس کا حال معلوم نہیں

---

[1] مستدرک الوسائل ۱۲: ۱۹۲۔ صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث: ۷۰

ہے۔ تاہم مَعۡذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُمۡ کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس گروہ کے پاس اپنے رب کے پاس پیش کرنے کے لیے کوئی معذرت نہیں تھی۔

لِمَ تَعِظُوۡنَ قَوۡمَا ۨ اللّٰہُ مُہۡلِکُہُمۡ اَوۡ مُعَذِّبُہُمۡ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گروہ خود ان میں شامل نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ جہاں علانیہ طور پر احکام الٰہی کی نافرمانی ہو رہی ہو، وہاں سب قابل مؤاخذہ ہیں: وَ اَخَذۡنَا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا...

۲۔ مکمل یاس و نا امیدی تک امر بمعروف و نہی از منکر پر عمل کرنا واجب ہے۔

فَلَمَّا عَتَوۡا عَنۡ مَّا نُہُوۡا عَنۡہُ قُلۡنَا لَہُمۡ کُوۡنُوۡا قِرَدَۃً خٰسِئِیۡنَ ﴿۱۶۶﴾

۱۶۶۔ پس جب انہوں نے اس امر میں سرکشی کی جس سے انہیں روکا گیا تھا تو ہم نے کہا: خوار ہو کر بندر بن جاؤ۔

تفسیر آیات

اس آیت کی تفسیر کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورہ بقرۃ آیت ۶۵۔

وَ اِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبۡعَثَنَّ عَلَیۡہِمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ مَنۡ یَّسُوۡمُہُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّکَ لَسَرِیۡعُ الۡعِقَابِ ۚۖ وَ اِنَّہٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۶۷﴾

۱۶۷۔ اور (یاد کریں) جب آپ کے رب نے اعلان کیا کہ وہ ان (یہودیوں) پر قیامت تک ایسے لوگوں کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو انہیں بدترین عذاب دیں گے، آپ کا رب یقیناً جلد سزا دینے والا اور بلا شبہ وہ غفور رحیم بھی ہے۔

تفسیر آیات

سیاق آیت وَ اِذۡ تَاَذَّنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کو قدیم سے تنبیہ کی جا رہی تھی۔ چنانچہ خود توریت کے بعض مضامین سے بھی ظاہر ہوتا ہے:

> تم اپنے دشمنوں کے سامنے قتل کیے جاؤ گے اور جو تمہارا کینہ رکھتے ہیں تم پر حکومت کریں گے۔[1]

اناجیل کی مختلف عبارتوں سے بھی اسی تنبیہ کا اشارہ ملتا ہے۔ قرآن میں یہی تنبیہ متعدد مقامات پر

---

[1] احبار ۲۶:۱۴۔۱۷

مذکور ہے۔ سورہ بنی اسرائیل آیت ۸ میں اس تنبیہ کے بعد فرمایا:

عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یَّرۡحَمَکُمۡ ۚ وَ اِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا ....

امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے گا اور اگر تم نے (شرارت) دہرائی تو ہم بھی (اسی روش کو) دہرائیں گے....

اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کچھ وقفے بھی فراہم فرماتا ہے لیکن وہ اپنے جرائم کو جاری رکھیں گے۔ چنانچہ ان کو اہل بابل کا اسیر ہونا پڑا۔ اس کے بعد اہل نصاریٰ کی طرف سے ذلت وخواری اٹھانا پڑی۔ اسلام کے عہد میں مشرکوں کے ساتھ مل کر اسلام کے خلاف ہر ممکن سازش میں ملوث رہے۔ تاہم اسلام کے عدل و انصاف کے نظام میں ان سازشوں کے باوجود امن وسکون کے ساتھ رہے۔ ہماری معاصر حکومتوں میں جرمن سرفہرست ہے۔ ان کی طرف سے ان کا قتل عام ہوا اور ذلت وخواری اٹھانا پڑی۔ اسی طرح وہ ہر دور میں منفور ومکروہ قوم کی طرح پہچانی جاتی رہی۔

یہود اس وقت بھی انسانیت سوز جرائم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ قرآنی نوید وَ اِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا کے مطابق ہم مطمئن ہیں کہ اللہ ان سے انتقام لینے والے بھیج دے گا۔

اہم نکات

۱۔ یہود کو اگر اللہ کوئی وقفہ فراہم کر دے تو یہ ان پر حجت پوری کرنے کے لیے ہے۔ اس سے کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔

۲۔ اللہ جہاں ناقابل ہدایت لوگوں کے لیے سریع العقاب ہے، وہاں توبہ کرنے والوں کے لیے غفور رحیم ہے۔

وَ قَطَّعۡنٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اُمَمًا ۚ مِنۡہُمُ الصّٰلِحُوۡنَ وَ مِنۡہُمۡ دُوۡنَ ذٰلِکَ ۫ وَ بَلَوۡنٰہُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ وَ السَّیِّاٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ﴿۱۶۸﴾

۱۶۸۔ اور ہم نے انہیں زمین میں مختلف گروہوں میں تقسیم کیا، ان میں کچھ لوگ نیک اور کچھ لوگ دوسری طرح کے تھے اور ہم نے آسائشوں اور تکلیفوں کے ذریعے انہیں آزمایا کہ شاید وہ باز آ جائیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَطَّعۡنٰہُمۡ: ان کو زمین کے مختلف گوشوں میں پھیلا دیا۔ ان میں سے کچھ لوگ نیک ہیں۔ مثلاً جنہوں نے جرائم سبت سے منع کیا تھا اور جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا اور کچھ کا مقام اس سے کمتر ہے۔

۲۔ وَبَلَوۡنٰهُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ: ان کی آزمائش کے دو طریقے بیان ہوئے: ایک یہ کہ ان کو آسائش دے کر آزما لیا گیا تاکہ یہ دیکھ بھی لیا جائے کہ نعمتوں کے وفور سے ان کی بغاوت اور سرکشی میں اضافہ ہوتا ہے یا نہیں اور کبھی تکلیفوں کے ذریعے کہ سخت حالات میں یہ صابر رہتے ہیں؟ چنانچہ بعض کو مال و دولت سے مالا مال کیا جاتا ہے اور بعض کو اقتدار پر متمکن کیا جاتا ہے۔ بعض کو فقر و تنگدستی سے دوچار کیا جاتا ہے اور کچھ کو مظلومیت میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ یہ سب امتحان کی مختلف صورتیں ہیں۔ ان میں آسائش کا امتحان نسبتاً زیادہ صبر آزما ہوتا ہے۔ دولت و کرسی پر آنے کے بعد اکثر لوگوں کے سامنے قدریں بدل جاتی ہیں۔ رعونت آنا شروع ہو جاتی ہے۔ ظلم و استحصال کو جائز بلکہ ضروری سمجھنا شروع کرتے ہیں۔

وَنَبۡلُوۡکُمۡ بِالشَّرِّ وَالۡخَیۡرِ فِتۡنَۃً ...[1] اور ہم امتحان کے طور پر برائی اور بھلائی کے ذریعے تمہیں مبتلا کرتے ہیں....

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں اعراف: ۹۴۔ ۹۵

اہم نکات

۱۔ آزمائش میں کامیابی کا واحد راستہ یہ ہے کہ آسائشوں میں شاکر اور تکلیفوں میں صابر رہے۔

فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ وَّرِثُوا الۡکِتٰبَ یَاۡخُذُوۡنَ عَرَضَ هٰذَا الۡاَدۡنٰی وَیَقُوۡلُوۡنَ سَیُغۡفَرُ لَنَا ۚ وَ اِنۡ یَّاۡتِهِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُهٗ یَاۡخُذُوۡهُ ؕ اَلَمۡ یُؤۡخَذۡ عَلَیۡهِمۡ مِّیۡثَاقُ الۡکِتٰبِ اَنۡ لَّا یَقُوۡلُوۡا عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الۡحَقَّ وَدَرَسُوۡا مَا فِیۡهِ ؕ وَالدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾

۱۶۹۔ پھر ان کے بعد ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جو کتاب اللہ کے وارث بن کر اس ادنیٰ زندگی کا مال و متاع سمیٹتے تھے اور کہتے تھے: ہم جلد ہی بخش دیے جائیں گے اور اگر ایسی ہی اور متاع ان کے سامنے آ جائے تو اسے بھی اچک لیتے، کیا ان سے کتاب کا میثاق نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے بارے میں حق بات کے سوا کچھ بھی نہ کہیں گے اور جو کچھ کتاب کے اندر ہے اسے یہ لوگ پڑھ چکے ہیں اور اہل تقویٰ کے لیے آخرت کی زندگی ہی بہترین زندگی ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟

تشریح کلمات

عَرَض: (ع ر ض) ہر وہ چیز جسے ثبات نہ ہو۔ دنیا کے مال و متاع کو اسی بے ثباتی کی وجہ سے عرض

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۳۵

کہتے ہیں۔

دَرَسُوۡا: (د ر س) درس الکتاب کے معنی اصل کتاب یا علم کو حفظ کر کے اس کا اثر لینے کے ہیں اور اثر کا حاصل ہونا مسلسل قراءت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے درسُ الکتاب کے معنی مسلسل پڑھنا کے آتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ: بنی اسرائیل میں ایک زمانے تک کچھ لوگ نیک اور صالح رہے ہیں، لیکن بعد میں ان کی جگہ ایسے ناخلف لوگوں نے لی،

۲۔ وَّرِثُوا الۡکِتٰبَ: جنہوں نے کتاب خدا کو پڑھ لیا، حلال وحرام سے واقف ہوئے،

۳۔ یَاۡخُذُوۡنَ: لیکن ان سے مثبت اثر لینے کی بجائے ان لوگوں نے ناجائز ذرائع سے دنیاوی مال ومتاع سمیٹنا شروع کیا

۴۔ سَیُغۡفَرُ لَنَا: اور یہ کہ ان گناہوں کے ارتکاب پر نالاں ہونے کی بجائے وہ نازاں تھے اور کہتے تھے سَیُغۡفَرُ لَنَا ہم بخشے جائیں گے کیونکہ ہم اللہ کی برگزیدہ قوم ہیں۔ ہمیں اللہ عذاب نہیں دے گا: لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ ....[1] آتش جہنم ہمارے نزدیک نہیں آئے گی۔ یہ بات اللہ پر بہتان و افترا پردازی ہے۔ حالانکہ ان سے عہد و میثاق لیا گیا تھا کہ وہ اس قسم کی ناحق نسبت اللہ کی طرف نہ دیں۔

۵۔ وَ اِنۡ یَّاۡتِہِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُہٗ: وہ اس عمل زشت سے باز نہیں آتے اور اگر مزید مال ہاتھ آ جائے تو وہ اسے بھی اچک لیتے ہیں۔

۶۔ اَلَمۡ یُؤۡخَذۡ عَلَیۡہِمۡ مِّیۡثَاقُ الۡکِتٰبِ: حالانکہ ان سے اللہ نے اپنی کتاب یعنی توریت میں عہد و میثاق لیا تھا اور اس میثاق کا مضمون یہ تھا:

۷۔ اَنۡ لَّا یَقُوۡلُوۡا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الۡحَقَّ: اللہ کی طرف صرف حق کی نسبت دینا ہے اور کوئی ایسی نسبت اللہ کی طرف نہیں دینا جو اللہ کی طرف سے اور کتاب خدا میں نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دے رہے ہیں کہ اللہ انہیں بخش دے گا۔

۸۔ وَ دَرَسُوۡا مَا فِیۡہِ: اور اللہ کی کتاب میں جو حلال وحرام کے احکام یہ لوگ پڑھ چکے ہیں، اس کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

۹۔ وَ الدَّارُ الۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ: دنیا کی چند روز کی زندگی سے آخرت کی دائمی زندگی بہت بہتر ہے۔ اس بہتری کو حاصل کرنے والے اہل تقویٰ ہیں: لِّلَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ ....

---

[1] ۳ آل عمران: ۲۴

۱۰۔ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ: عقل کا تقاضا یہ ہے کہ چند روز کی جگہ، دائمی زندگی کو ترجیح دی جائے۔

اہم نکات

۱۔ جن کو حلال و حرام کا علم حاصل ہے۔ یہ علم اللہ کے ساتھ عہد و میثاق ہے: اَلَمۡ یُؤۡخَذۡ عَلَیۡہِمۡ مِّیۡثَاقُ الۡکِتٰبِ ... وَ دَرَسُوۡا مَا فِیۡہِ ...

۲۔ گناہ کا ارتکاب بھی جاری رکھا جائے اور بغیر توبہ کے بخشنے کی امید رکھنا ایک جسارت ہے: سَیُغۡفَرُ لَنَا...

۳۔ خود گناہ سے اس گناہ کو حقیر سمجھنا، زیادہ گناہ ہے: وَ یَقُوۡلُوۡنَ سَیُغۡفَرُ لَنَا ۔

وَ الَّذِیۡنَ یُمَسِّکُوۡنَ بِالۡکِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِیۡنَ ﴿۱۷۰﴾

۱۷۰۔ اور جو لوگ کتاب اللہ سے متمسک رہتے اور نماز قائم کرتے ہیں، ہم (ایسے) مصلحین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

تفسیر آیات

تمسک بالکتاب کا لازمہ اقامہ صلوٰۃ ہونے کے باوجود اقامہ صلوٰۃ کا جداگانہ ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نماز کو تمام اعمال میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسی لیے احادیث میں نماز کو دین کا ستون اور مؤمن کی معراج قرار دیا ہے۔ چنانچہ نماز، خالق کے کمال کا ادراک ہے۔ کمال کے سامنے سر تسلیم خم کرنا خود اپنی جگہ ایک کمال ہے اور یہی روح بندگی ہے۔

دوسرا اہم نکتہ اس آیت میں یہ ہے کہ تمسک بالکتاب کو اصلاح قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح اور تمسک کے درمیان ایک ربط ہے۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ تمسک بالکتاب نہ ہونے کی صورت میں فساد ہے۔

اہم نکات

۱۔ دینی تعلیمات کا اثر براہ راست اصلاح معاشرہ پر پڑتا ہے: اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِیۡنَ ۔

وَ اِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَہُمۡ کَاَنَّہٗ ظُلَّۃٌ وَّ ظَنُّوۡۤا اَنَّہٗ وَاقِعٌۢ بِہِمۡ ۚ

۱۷۱۔ اور (یہ بات بھی یاد کرو) جب ہم نے پہاڑ کو ان کے اوپر اس طرح اٹھایا گویا وہ سائبان ہو اور انہیں یہ گمان تھا کہ وہ ان پر گرنے ہی

خُذُوۡا مَاۤ اٰتَیۡنٰکُمۡ بِقُوَّۃٍ وَّ اذۡکُرُوۡا مَا فِیۡہِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۱﴾

والا ہے، (ہم نے ان سے کہا) جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے، پوری قوت کے ساتھ اس سے متمسک رہو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو، شاید کہ تم تقویٰ والے بن جاؤ۔

تشریح کلمات

النتق: (ن ت ق) کھینچ کر ڈھیلا کرنا۔ جڑ سے اکھاڑنا۔

ظُلَّۃٌ: (ظ ل ل) سائبان۔ سایہ دار بدلی۔ عام طور پر ناخوشگوار مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورہ بقرہ آیت ۶۳۔

وَ اِذۡ اَخَذَ رَبُّکَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُہُوۡرِہِمۡ ذُرِّیَّتَہُمۡ وَ اَشۡہَدَہُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی ۚۛ شَہِدۡنَا ۚۛ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنۡ ہٰذَا غٰفِلِیۡنَ ﴿۱۷۲﴾ۙ

۱۷۲۔ اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور ان پر خود انہیں گواہ بنا کر (پوچھا تھا:) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا تھا: ہاں! (تو ہمارا رب ہے) ہم اس کی گواہی دیتے ہیں، (یہ اس لیے ہوا تھا کہ) قیامت کے دن تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے۔

اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَکَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ کُنَّا ذُرِّیَّۃً مِّنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ۚ اَفَتُہۡلِکُنَا بِمَا فَعَلَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ﴿۱۷۳﴾

۱۷۳۔ یا یہ کہو کہ شرک تو ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد کی اولاد ہیں تو کیا اہل باطل کے قصور کے بدلے میں ہمیں ہلاکت میں ڈالو گے؟

وَ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ وَ لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۷۴﴾

۱۷۴۔ اور اس طرح ہم آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں شاید کہ یہ لوٹ آئیں۔

تفسیر آیات

قرآن کے مطابق انسان کا ابتدائی اور اصلی دین توحید ہے۔ شرک بعد میں پیدا ہوا۔ مغربی مصنفین

پہلے یہ خیال کرتے تھے کہ انسان کا ابتدائی دین شرک تھا، توحید تک بہت بعد میں پہنچا۔ اب وہ بھی اس نتیجے تک پہنچ چکے ہیں کہ انسان کا ابتدائی دین توحید تھا۔

اس آیت اور احادیث سے یہ بات تو سامنے آتی ہے کہ تخلیق اولاد آدمؑ کے موقع پر اولاد آدم سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا تھا لیکن یہ بات علماء اور مفکرین کے لیے واضح نہیں ہوئی کہ کیا یہ اقرار اور عہد و میثاق فوق شعور سے لیا تھا؟ یا اس بات کو انسان کے تحت شعور میں فطرت و جبلت کے اندر ودیعت کیا گیا تھا۔

پہلے مؤقف کے مطابق اللہ تعالیٰ نے صلب آدمؑ سے قیامت تک ہونے والی تمام نسلوں کو ذرات کی شکل میں بیک وقت پیدا کیا، ان کو عقل و شعور دیا۔ ان کو قوت گویائی عطا کی اور ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا، بعد میں ان ذرات کو صلب بنی آدم میں واپس کر دیا۔ کہتے ہیں کہ جیسا کہ کل بروز قیامت تمام انسانوں کو بیک وقت جمع کر کے ان سے حساب لیا جائے گا، بالکل اسی طرح کل عالم ذر میں بھی سب کو بیک وقت جمع کر کے ان سے عہد و اقرار لیا گیا تھا۔

دوسرے موقف کے مطابق اللہ نے تخلیق آدمؑ کے موقع پر ان کی فطرت اور سرشت میں معرفت رب ودیعت فرمائی۔ جیسا کہ فرمایا:

فِطۡرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡہَا ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ ٭ۙ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۟ۙ﴾ [1]

پس (اے نبی) یکسو ہو کر اپنا رخ دین (خدا) کی طرف مرکوز رکھیں (یعنی) اللہ کی اس فطرت کی طرف جس پر اس نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہے، یہی محکم دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اور حدیث میں بھی ہے:

کل مولود یولد علی الفطرۃ۔ [2]　　ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ (یعنی فطرت توحید پر۔)

ہمارے نزدیک یہی موقف قرین واقع ہے۔ اس موقف پر دیگر آیات قرآنی کے ساتھ احادیث کا ایک قابل توجہ مجموعہ شاہد ہے۔ لہٰذا ہم اس آیت کی اس طرح تشریح کر سکتے ہیں:

جب اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو اولاد آدم کی پشتوں سے آگے چلایا تو اس وقت ان نسلوں کی جبلت میں اس کے وجود کی جن تارہائے زندگی سے بافتگی ہوئی ہے، ان تاروں میں اپنے رب کی شناخت ودیعت فرمائی۔ ودیعت بھی ایسی راسخ کہ وہ خود اپنی ذات پر گواہ بن جائیں۔ وَ اَشۡہَدَہُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ اور اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ کی آواز پہچان کر بَلٰی کے ساتھ اقرار کریں۔

---

[1] ۳۰ الروم: ۳۰　　[2] الکافی ۲: ۱۲۔ صحیح بخاری حدیث ۱۲۰۶

حضرت علی علیہ السلام، انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے بارے میں فرماتے ہیں :

فَبَعَثَ فِيهِمْ رُسُلَهُ وَ وَاتَرَ اِلَيْهِمْ اَنْبِيَائَهُ لِيَسْتَادُوهُمْ مِيْثَاقَ فِطْرَتِهِ۔۔۔[1]

اللہ تعالیٰ نے لوگوں میں اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور اپنے انبیاء کا سلسلہ جاری رکھا تا کہ ان کو اپنی فطرت عہد و میثاق کی ادائیگی کی دعوت دیں۔

اس سلسلے میں جدید سائنسی معلومات کو اگر دلیل تسلیم نہ کیا جائے تو ان سے تائید ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔ انسان کی تخلیق میں کام آنے والے اربوں خلیوں کی پیدائش ایک خلیہ سے ہوئی ہے اور جو سبق ابتدائی خلیے میں موجود جین کو پڑھایا گیا ہے، وہ سبق آنے والے تمام خلیات میں بطور وراثت منتقل ہو جاتا ہے۔ تمام زندہ موجودات کے لیے جبلی ہدایات اللہ تعالیٰ نے خلیہ (Cell) کے مرکزی حصے D.N.A میں ودیعت فرمائی ہیں جو تین ارب نہایت چھوٹے سالموں پر مشتمل ہے اور حیات کا راز انہیں سالموں میں پوشیدہ ہے۔ D.N.A کئی سیکشن ہوتے ہیں۔ جنہیں جین (GENE) کہتے ہیں اور جین ہی میں وہ نقشہ ہوتا ہے جس پر آگے چل کر انسان کی شخصیت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

ممکن ہے اسی طرح کا کوئی عمل وقوع پذیر ہوا ہو، جس کی تفصیل اور کیفیت کا ہمیں علم نہیں ہے۔ تاہم انسان نے اب تک اس سلسلے میں جو پیشرفت کی ہے اور کسی حد تک عالم خلیات کے اندر جھانک کر دیکھا ہے اور تخلیق و تعمیر پر مامور اس محیر العقول لشکر کی حیرت انگیز کرشمہ سازیوں کا مشاہدہ کیا ہے، اس سے اس بات میں کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدمؑ کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا تو نسل انسانی کی جبلت کے ابتدائی خلیے کو اللہ کی ربوبیت کا درس پڑھایا ہو اور پھر اس سے اس کا اقرار لیا ہو۔ اس کی کیفیت کما ھو بیان نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے آیت میں تمثیلی انداز اختیار کیا گیا۔ جیسا کہ:

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ ۔۔۔[2]

ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا ۔۔۔

میں پیش کیا گیا ہے۔

انسان نفسانی خواہشات، منفی تربیت و ماحول اور دیگر عوامل کی وجہ سے فطری تقاضوں سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ مثلاً علم دوستی اور احسان دوستی سب کے نزدیک انسانی فطری تقاضوں میں شامل ہے۔ اس کے باوجود دیگر عوامل کے غالب آنے کی وجہ سے انسان، علم دوست ہوتا ہے نہ احسان پسند۔ البتہ انسان کو اگر علم و احسان کی دعوت دی جائے تو وہ فطرت کی آواز پہچان لیتا ہے۔

اگر انسان سے یہ عہد و میثاق نہ لیا گیا ہوتا تو انسان کے لیے معرفت حق ممکن نہ رہتی یا دوسرے لفظوں میں انسانی جبلت میں معرفت رب کی صلاحیت ودیعت نہ ہوئی ہوتی تو رب کی معرفت نہ ہوتی۔ دونوں

---

[1] نہج البلاغۃ [2] ۳۳ احزاب: ۷۲

دونوں مؤقفوں کا کہنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس قدیم عہد و میثاق کو یاد دلانے کے لیے آئے ہیں۔ اگر یہ قدیم عہد و میثاق نہ ہوتا تو انبیاء کی دعوت کو ہرگز پذیرائی نہ ملتی۔ یعنی اگر انسان کے وجود میں توحید کی طلب نہ ہوتی تو دعوت انبیاء کی رسد کا کوئی خریدار نہ ہوتا۔ نقاش ازل نے نقش توحید کو لوح دل پر کندہ کر دیا تھا، اس لیے آج انبیاء علیہم السلام کے یاد دلانے پر وہ اس تحریر کو پڑھ لیتا ہے۔ ورنہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت صدا بصحرا ثابت ہوتی۔

معرفت نقش ہو گئی، واقعہ بھول گئے
یعنی سبق یاد ہے، کلاس بھول گئے

روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی تو آپؑ نے فرمایا:

ثبتت المعرفة فی قلوبهم و نسوا الموقف و سیذکرونه یوماً و لو لا ذلك لم یدر احد من خالقه و لا رازقه۔[1]	لوگوں کے دلوں میں معرفت نقش ہو گئی لیکن واقعہ بھول گئے۔ ایک دن انہیں واقعہ بھی یاد آئے گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کسی کو علم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کا خالق و رازق کون ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس عہد و میثاق کی کیفیت خواہ کچھ ہو، اس سے معرفت حق، انسان کے وجود میں نقش ہو گئی اور معرفت حق کی صلاحیت آ گئی۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح کہنا چاہیے کہ اگرچہ وہ کلاس کے تفصیلی واقعات تو بھول گیا لیکن سبق یاد ہے۔

ہماری بحث بھی اسی سبق سے ہے جو انسان کو یاد ہے۔ اگر انسان کی فطرت میں سرے سے کوئی بات موجود ہی نہ ہوتی تو کسی طاقت کے بس میں نہیں تھا کہ وہ بات اس میں پیدا کرے۔ مثلاً اگر انسان میں تعلیم کی صلاحیت بالکل مفقود ہوتی تو کوئی طاقت انسان کی سرشت میں یہ صلاحیت شامل نہیں کر سکتی اور اگر یہ صلاحیت انسان کی سرشت میں موجود ہو تو کوئی طاقت اس کو ختم نہیں کر سکتی، البتہ منحرف کر سکتی ہے۔

اس وضاحت کے بعد یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اگر ایسا کوئی عہد و میثاق عمل میں آیا تھا تو وہ ہمارے شعور و حافظہ میں کیوں نہیں ہے؟ ہم میں سے کسی کو علم ہی نہیں کہ ہم نے کسی اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ کے جواب میں ہاں کہی تھی اور جب یہ یاد ہی نہیں تو ہمارے خلاف حجیت کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا کہ ہم اگر بھول گئے ہیں تو کلاس کی تفصیلات بھول گئے ہیں لیکن سبق تو ہمیں یاد ہے۔ اسی وجہ سے ہم فطرت کی آواز کو پہچانتے ہیں اور اس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔

وَ اتۡلُ عَلَیۡهِمۡ نَبَاَ الَّذِیۡۤ اٰتَیۡنٰهُ اٰیٰتِنَا ۱۷۵۔ اور انہیں اس شخص کا حال سنا دیجیے جسے

---

[1] بحار الانوار ۳:۲۸۰

فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

ہم نے اپنی آیات دیں مگر وہ انہیں چھوڑ نکلا پھر شیطان نے اس کا پیچھا کیا تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾

۱۷۶۔اور اگر ہم چاہتے تو ان (آیات) کے طفیل اس کا رتبہ بلند کرتے لیکن اس نے تو اپنے آپ کو زمین بوس کر دیا اور اپنی نفسانی خواہش کا تابعدار بن گیا تھا لہٰذا اس کی مثال اس کتے کی سی ہو گئی کہ اگر تم اس پر حملہ کرو تو بھی زبان لٹکائے رہے اور چھوڑ دو تو بھی زبان لٹکائے رکھے یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں پس آپ انہیں یہ حکایتیں سنا دیجیے کہ شاید وہ فکر کریں۔

سَآءَ مَثَلَا ۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

۱۷۷۔ بدترین مثال ان لوگوں کی ہے جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں اور خود اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں۔

تشریح کلمات

التسلخ: (س ل خ) اصل معنی کھال کھینچنا۔ زرہ اتارنا۔ مہینہ گزر جانا۔ اسی سے سانپ کے اپنی کینچلی اتارنے کو بھی سَلَخَ یا اسود سالخ کہتے ہیں۔

يَلْهَثْ: لہث سخت پیاس کی وجہ سے زبان باہر نکلنا۔ بقول بعضے اس میں پیاس کے ساتھ درماندگی بھی ہو تو لہث کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

شان نزول: تفسیر قمی میں حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت کی گئی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: بلعم باعور کو اسم اعظم کا علم دیا گیا تھا، جس سے اس کی دعائیں قبول ہوتی تھیں۔ وہ فرعون کی طرف مائل ہونا شروع ہو گیا۔ جب فرعون موسیٰ (ع) اور اس کے ساتھیوں کی طلب میں نکلا تو فرعون نے بلعم سے کہا: موسیٰ (ع) اور اس کے ساتھیوں کے خلاف یہ دعا کرو کہ ان کا راستہ بند کر دیا جائے۔ چنانچہ بلعم موسیٰ (ع) کا

پیچھا کرنے کے لیے اپنے گدھے پر سوار ہوا لیکن گدھا نہیں چلتا تھا اور اسم اعظم اس کے ذہن سے خارج ہو گیا... الی آخر۔

مفسرین و محدثین کو اختلاف ہے کہ یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی۔ بعض کے نزدیک بلعم باعور ہے اور بعض کے نزدیک امیہ بن ابی صلت ہے۔ بعض کے نزدیک عامر بن نعمان راہب ہے لیکن حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ اس آیت کا اصل شان نزول بلعم باعور کے بارے میں ہے۔[1]

۱۔ اٰتَیۡنٰہُ اٰیٰتِنَا: یہاں آیات سے مراد عرفان کا وہ مقام ہو سکتا ہے جس پر فائز ہونے والے پر بہت سے راز منکشف ہو جاتے ہیں۔

۲۔ فَانۡسَلَخَ مِنۡہَا: مگر یہ شخص اس مقام پر فائز ہونے اور عرفان کا جامہ زیب تن کرنے کے بعد اس سے ایسے نکل گیا جس طرح سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے۔ یعنی یہ آیات اس شخص کے ساتھ اس طرح مربوط ہو گئی تھیں جس طرح انسان کے ساتھ اس کی جلد۔ پھر بھی یہ شخص اپنے بداعمال کی وجہ سے الگ ہو گیا۔

۳۔ فَاَتۡبَعَہُ الشَّیۡطٰنُ: اس عمل سے اس شخص میں شیطان کو ایک ہموار فضا میسر آ گئی۔ چنانچہ اس کے دام میں پھنس گیا۔

۴۔ وَلَوۡ شِئۡنَا: اگر ہم چاہتے۔ اللہ کی مشیت اتفاقیہ کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی مشیت حکمت و مصلحت کے تحت ہوتی ہے۔ اس شخص نے اگر اپنے علم پر عمل کیا ہوتا تو اس کا رتبہ بلند ہونا تھا مگر اس نے بدعمل ہو کر اپنے آپ کو گرا دیا اور زمین بوس ہو گیا۔ جب علم رکھنے والا خواہش پرست اور دنیا دار ہو جاتا ہے تو اس کی مثال کتے کی سی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مزاج اور طبیعت میں لچک نہیں رکھتا۔ اس کو نصیحت کرو یا اسے اپنی حالت پر چھوڑ دو، وہ قابل ہدایت نہیں ہوتا۔ اس کی حرص و ہوس کی آتش بجھنے والی نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ عالم اگر اپنے علم کو طاغوت کی خدمت کے لیے استعمال کرے تو اس کی علمی صلاحیت اس سے چھن جاتی ہے: اٰتَیۡنٰہُ اٰیٰتِنَا فَانۡسَلَخَ مِنۡہَا ....

۲۔ شیطان بدعمل علماء کا زیادہ پیچھا کرتا ہے: فَاَتۡبَعَہُ الشَّیۡطٰنُ ....

۳۔ اللہ علماء کا رتبہ بلند فرمانا چاہتا ہے: وَلَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰہُ بِہَا ....

۴۔ اہل علم گمراہ ہونے کی صورت میں قابل ہدایت نہیں ہوتا: اِنۡ تَحۡمِلۡ عَلَیۡہِ یَلۡہَثۡ اَوۡ تَتۡرُکۡہُ

---

[1] مجمع البیان

يَلْهَثْ ....

۵۔ اللہ نے بدعمل عالم کو کتے کے ساتھ تشبیہ دی ہے: فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ....

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

۱۷۸۔ راہ راست وہ پاتا ہے جسے اللہ ہدایت عطا کرے اور جنہیں اللہ گمراہ کرے وہ خسارے میں ہیں۔

تفسیر آیات

حقیقی ہدایت وہ ہے جس میں اللہ کی مشیت شامل ہو۔ اللہ کی مشیت تو صرف اہل لوگوں کے بارے میں ہوتی ہے اور اس طرح گمراہ وہ ہے جس کی گمراہی میں اللہ کی مشیت شامل ہو اور اللہ کی مشیت صرف نا قابل ہدایت لوگوں کی ضلالت کے بارے میں ہوتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہدایت کا ذکر مفرد اور ضلالت کا ذکر جمع کے ساتھ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ہدایت کم اور ضلالت والے زیادہ ہوتے ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

۱۷۹۔ اور تحقیق ہم نے جن و انس کی ایک کثیر تعداد کو (گویا) جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے، ان کے پاس دل تو ہیں مگر وہ ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے، یہی لوگ تو (حق سے) غافل ہیں۔

تشریح کلمات

الذرأ: (ذ ر ء) اللہ نے جس چیز کا ارادہ کیا، اسے ظاہر کر دیا۔ پیدا کرنا، ظاہر کرنا۔ ذرأ خلق کے

معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدۡ ذَرَاۡنَا: اس آیت سے بادی النظر میں کئی ایک سوالات اٹھتے ہیں کہ اگر اللہ نے جن و انس میں سے کثیر تعداد کو پیدا ہی جہنم کے لیے کیا ہے تو اولاً یہ ظلم ہے، رحمت الٰہی کے منافی ہے۔ ثانیاً جبر لازم آتا ہے کہ جب ان کو پیدا ہی جہنم کے لیے کیا ہے تو انہیں ہر صورت میں جہنم جانا ہوگا۔

جواب یہ ہے کہ یہاں تین صورتیں قابل فرض ہیں:

اول: یہ کہ اللہ مومن، کافر، فرمانبردار اور نافرمان سب کو جنت بھیج دے۔

دوم: یہ کہ سب کو جہنم بھیج دے۔

سوم: یہ کہ مومن کو جنت اور کافر کو جہنم بھیج دے۔

پہلی اور دوسری صورت ناممکن ہونے کی صورت میں تیسری صورت ہی معقول اور عدل و انصاف کے مطابق ہوگی۔ لہٰذا جہنم میں بھیجنا اگرچہ اللہ کا مقصود بالذات نہیں ہے لیکن عدل و انصاف کا لازمہ ہے۔

لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا یَفۡقَهُوۡنَ بِهَا ...: ان کے جہنمی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ رحمت الٰہی کے لیے اہل ثابت نہیں ہوئے۔ ان میں رحمت کے لیے ظرفیت ہی نہیں ہے۔ عقل و حواس اللہ نے جن مقاصد کے لیے دیے تھے، وہ ان میں استعمال ہی نہیں کرتے۔ ایسے لوگ چوپائے کی طرح ہیں،

بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ: بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ چوپائے اپنے ذاتی تکامل و ارتقا کے لیے پیدا نہیں ہوئے بلکہ ان کی غرض خلقت دوسری اشرف و اہم مخلوق یعنی انسان کے لیے مسخر ہونا ہے۔ یہ لوگ ارتقائی منزل پر فائز ہوتے ہیں اور نہ دوسروں کے لیے مسخر ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ لوگ جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اسلام، انسانی عقل و حواس کے پاس ہے۔ جو عقل و فطرت سے رجوع نہیں کرتا وہ گمراہ ہے: لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا یَفۡقَهُوۡنَ بِهَا ...۔

۲۔ انسان جب اپنے مقصد حیات سے منحرف ہو جاتا ہے تو جانوروں سے بھی بدتر ثابت ہوتا ہے: بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ۔

وَ لِلّٰهِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی فَادۡعُوۡهُ　۱۸۰۔ اور زیبا ترین نام اللہ ہی کے لیے ہیں پس

بِهَا ۠ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٨٠﴾

تم اسے انہی (اسمائے حسنیٰ) سے پکارو اور جو اللہ کے اسماء میں کج روی کرتے ہیں انہیں چھوڑ دو وہ عنقریب اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔

تشریح کلمات

يُلْحِدُوْنَ: (ل ح د) الحاد کج روی کرنے کو کہتے ہیں۔ تیر نشانے سے ہٹ جائے تو کہتے ہیں: التحد السهم الهدف۔ تیر کا نشانہ خطا ہو گیا۔

تفسیر آیات

اسم اور مسمی میں ایک ایسا ربط پیدا ہوتا ہے جو ناقابل تفکیک ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مسمی کا اثر اسم پر بھی پڑتا ہے۔ اگر مسمی آپ کا محبوب ہے تو اس کا اسم بھی آپ کے لیے مناسب، شیرین ہوتا ہے۔ اگر مسمی آپ کا دشمن ہے تو اس کا نام بھی آپ کے لیے قابل نفرت ہوتا ہے۔ انسانی اعضاء میں سے بعض اعضاء کے نام پرکشش ہوتے ہیں۔ جیسے چشم اور بعض اعضاء کے نام انسان صریح لفظوں میں نہیں لیتے بلکہ اس کی طرف کنایہ اور اشارہ کرتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ معنی کی قباحت لفظ کی طرف سرایت کر چکی ہوتی ہے۔ اسی طرح لفظ اور اسم، مسمی اور معنی پر دلالت کرنے کے لیے ہوتا ہے اور اسم مسمی کے حسن و خوبیوں کو بیان کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ لہٰذا جیسا کہ تمام کمالات، حسن اور خوبیاں اللہ کی ذات میں جمع ہیں، اللہ کی ذات پر اطلاق ہونے والے اسماء بھی زیباترین ہیں۔ اس کے کمال ذات اور کمال صفات کی نشاندہی کرتے ہیں، جن سے اس کی عظمت و برتری کا اظہار ہوتا ہے، جن میں کسی قسم کے نقائص و عیوب کا شائبہ نہیں ہوتا اور جن سے اس کی شان میں گستاخی اور سوء ادب نہیں ہوتا۔ اس طرح کے اسمائے حسنی صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔ ان اسماء اور ان کے معانی کا حقیقی مسمی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔ مثلاً ان اسمائے حسنیٰ میں سے حی، مالك ہے۔ حقیقی حیات اور حقیقی مالکیت صرف اللہ کی ذات کو حاصل ہے۔ دوسری حیات اور مالکیت اللہ کی طرف سے عطا کردہ عارضی چیز ہے۔

فَادْعُوْهُ بِهَا: اللہ کو انہی اسمائے حسنیٰ کے ساتھ پکارو۔ آداب بندگی انہی اسماء کے ساتھ پکارنے میں ہے۔ پکارنے میں دعا اور عبادت دونوں شامل ہیں۔

ایک فقہی مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفی ہیں۔ یعنی اللہ کو صرف انہی اسماء کے ساتھ پکار سکتے ہیں جو روایات میں وارد ہیں اور شریعت کی طرف سے اجازت حاصل ہے۔ انسان خود اپنی طرف سے کوئی اسم جعل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ معانی کے تصور کے بعد اس کے مطابق لفظ وضع اور بولا جاتا ہے۔ انسان

کے لیے ان معانی قدسیہ کا تصور کماحقہ ممکن نہیں ہے جو ذات باری کے لائق ہیں۔

اسمائے الٰہی میں الحاد اور انحراف یہ ہے کہ اللہ کو ایسے ناموں سے پکارا جائے جو اس کے شایان شان نہ ہوں اور جیسے مسیحی مذہب میں اللہ کو باپ پکارتے ہیں۔

شیعہ سنی مصادر میں اسمائے حسنٰی کی تعداد کے بارے میں متعدد روایات موجود ہیں:

حضرت امام رضا علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

> حضرت علی علیہ السلام فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں۔ جو ان اسماء کے ساتھ دعا کرے اس کی دعا قبول ہو گی۔ جو ان اسماء کو شمار کرے وہ جنت میں داخل ہو گا۔[1]

تقریباً اسی مضمون کی روایت مسلم اور بخاری نے بھی ابوہریرہ سے نقل کی ہے:

> رسول اللہؐ نے فرمایا: اللہ کے ننانوے اسماء ہیں جو ان کو شمار کرے وہ جنت میں داخل ہو گا۔ وہ طاق ہے، طاق ہی کو پسند فرماتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے مخصوص اسمائے حسنی ہیں ان کو تلاش کرنا چاہیے جو احادیث و ادعیہ معصومینؑ میں مذکور ہیں: وَ لِلّٰہِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی ....۔

۲۔ اللہ نے اسمائے حسنی کے ساتھ پکارنے کا امر فرمایا ہے تو یہ امر قبولی کی ضمانت ہے: فَادۡعُوۡہُ بِہَا۔ البتہ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ دعا صرف لفظوں کا ادا کرنا نہیں ہے، اپنے پورے وجود کے ساتھ پکارنے کو دعا کہتے ہیں۔

وَ مِمَّنۡ خَلَقۡنَاۤ اُمَّۃٌ یَّہۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَ بِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱۸۱﴾

۱۸۱۔ اور جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے ان میں ایک جماعت ایسی ہے جو حق کے مطابق ہدایت کرتی ہے اور اسی کے مطابق عدل کرتی ہے۔

تفسیر آیات

یہ اس جماعت کا ذکر ہے جو مقام ہدایت و رہبری پر فائز ہے۔ چنانچہ اس جماعت کی دو اہم باتوں کا ذکر ہوا ہے: ایک رہنمائی اور دوسری عدل و انصاف۔ یہ دو ایسے اوصاف ہیں جو دینی رہنماؤں کے لیے مخصوص ہیں۔ وہ حق کی طرف ہمیشہ دعوت دیتے ہیں۔ صرف لفظی دعوت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ عملاً عدل و

---

[1] الوسائل ۷: ۱۴۰۔ صحیح بخاری کتاب الدعوات۔ صحیح مسلم حدیث: ۴۸۳۵

انصاف قائم کرتے ہیں۔ جیسا کہ امت موسیٰ (ع) کے بارے میں فرمایا کہ قوم موسیٰ (ع) میں ایک ہادی اور عادل جماعت موجود تھی۔ اسی طرح اس امت کے لیے فرمایا۔ چنانچہ اللہ کی زمین ہدایت کنندہ اور عدل قائم کرنے والی حجت سے خالی نہیں رہ سکتی۔

واضح رہے آیت میں اُمَّةٌ يَّهۡدُوۡنَ ہادیان برحق کی ایک جماعت کا ذکر۔ ہدایت یافتہ جماعت کا ذکر نہیں ہے۔ ہدایت یافتہ جماعت کے لیے يَهۡتَدُوۡنَ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے اس آیت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا: اس جماعت سے مراد ائمہ علیہم السلام ہیں۔

در منثور میں آیا ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا:

ان من امتی قوماً علی الحق حتی ینزل عیسی بن مریم متی ما نزل۔	میری امت میں ایک جماعت حق پر قائم رہے گی عیسیٰ کے نزول تک۔

تفسیر المنار ۹: ۴۵۱ میں حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

یہ امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی۔ سب جہنمی ہوں گے سوائے اس فرقے کے جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا: وَمِمَّنۡ خَلَقۡنَاۤ اُمَّةٌ يَّهۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَ بِهٖ يَعۡدِلُوۡنَ۔ اس امت میں صرف یہی جماعت نجات پائے گی۔

تفسیر البرہان میں بھی یہ روایت مذکور ہے، البتہ آیت کے ذکر کے بعد آخر میں " انا و شیعتی میں اور میرے شیعہ ہیں'' بھی مذکور ہے۔

وَالَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا سَنَسۡتَدۡرِجُهُمۡ مِّنۡ حَيۡثُ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۲﴾	۱۸۲۔ اور جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں ہم انہیں بتدریج اس طرح گرفت میں لیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہو گی۔
وَاُمۡلِيۡ لَهُمۡ ۚ اِنَّ كَيۡدِيۡ مَتِيۡنٌ ﴿۱۸۳﴾	۱۸۳۔ اور میں انہیں ڈھیل دوں گا، میری تدبیر یقیناً نہایت مضبوط ہے۔

۳۳۲

تشریح کلمات

نستدرج: (د ر ج) الاستدراج درجہ بدرجہ آہستہ قدم بقدم کے معنوں میں ہے۔

کید: (ك ی د) خفیہ تدبیر کے معنوں میں، ایک قسم کی حیلہ جوئی کے ہے۔ یہ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور برے معنوں میں بھی۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا: پہلے بھی کئی بار اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ جب کافر قابل ہدایت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اہل نہیں رہتا تو اللہ اسے اپنی حالت پر چھوڑ دیتا ہے اور وہ کافر غیر شعوری طور پر ہلاکت کے نزدیک ہوتا جاتا ہے اور اس کے وبال میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سورہ آل عمران آیت ۱۸۷۔

۲۔ وَاُمۡلِیۡ لَہُمۡ : اللہ کی تدبیر اور اس کی چال کو کوئی توڑ نہیں سکتا: فَلِلّٰہِ الۡمَکۡرُ جَمِیۡعًا[1] تمام تدبیریں اللہ کے پاس ہیں۔ اس کی تدبیر و چال کے مقابلے میں کوئی اور تدبیر یا چال کار آمد ہو نہیں سکتی۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کافروں کے خلاف تدبیر کی ایک صورت یہ ہے کہ ان کو ڈھیل دی جائے۔ اس ڈھیل کو سطحی سوچ والے نعمت اور رحمت سمجھتے ہیں۔ الٰہی تدبیر میں یہ ڈھیل سب سے بڑی سزا ہے۔ سب سے بڑی سزا اس طرح ہے کہ اللہ ڈھیل اس وقت دیتا ہے جب کسی سے ہاتھ اٹھا کر اس کو اپنے حال پر چھوڑنا ہو۔ جب اللہ کسی سے ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ اتھاہ گہرائی میں گر جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کافروں کو ناز و نعمت میں دیکھ کر غافل انسان رشک کرتا ہے۔ جب کہ آگاہ انسان خوف کھاتا ہے: اِنَّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡنٌ۔

اَوَلَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا ٜ مَا بِصَاحِبِہِمۡ مِّنۡ جِنَّۃٍ ؕ اِنۡ ہُوَ اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۸۴﴾

۱۸۴۔ کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی (محمدؐ) میں کسی قسم کا جنون نہیں ہے؟ وہ تو بس صاف صاف تنبیہ کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

انبیاء علیہم السلام جب قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے کی باتیں کرتے تو لوگ کہتے: یہ تو جن زدہ ہے۔ بھلا خاک ہونے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ ہوا جا سکتا ہے اور اللہ کے مقرب بتوں کی اجازت کے بغیر اللہ سے رابطہ کیسے ہو سکتا ہے جیسا کہ شاہی دربار میں اس کے دربانوں کے بغیر رابطہ نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں دعوت فکر دی ہے کہ انبیاء (ع) کی تعلیمات میں یہ لوگ غور نہیں کرتے۔

---

[1] ۱۳ رعد: ۴۲

بِصَاحِبِهِمۡ : رسول (ص) کو ان کا ساتھی اس لیے کہا کہ رسولؐ چالیس سال تک انہی کے درمیان رہے ہیں اور آپؐ کا اخلاق، سیرت، فکری صلاحیت اور امانت و صداقت سب دیکھ چکے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ عناد اور دشمنی ہر قسم کے کمالات کے ادراک کے لیے مانع ہوتی ہے، ورنہ رسول کریم (ص) کو جن زدہ کہنے کا تصور کیسے کر سکتے تھے۔

اَوَلَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ ۙ وَّاَنۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ قَدِ اقۡتَرَبَ اَجَلُہُمۡ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۸۵﴾

۱۸۵۔ کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اور جو چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں ان میں غور نہیں کیا اور (یہ نہیں سوچا کہ) شاید ان کی موت کا وقت نزدیک ہو رہا ہو؟ آخر اس (قرآن) کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟

تشریح کلمات

مَلَکُوۡتِ: المیزان کے مطابق مَلَکُوۡتِ اشیاء کا باطنی چہرہ ہے جو اللہ سے مربوط ہے اور اس باطنی چہرے کے مشاہدے کے بعد یقین کی منزل پر قائم ہونا اس کا لازمہ ہے۔ جیسے سورہ انعام کی آیت ۷۵ سے ظاہر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ : یہ لوگ رسول اکرم (ص) کو تو مجنون کہتے ہیں لیکن خود عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ ورنہ یہ لوگ اگر اللہ کی اس سلطنت و حکومت پر غور کرتے جو آسمانوں اور زمین پر قائم ہے اور اس کی مخلوقات میں غور و فکر کرتے تو انہیں رسولؐ کی تعلیمات کی حقانیت کا علم ہوتا کہ اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ کائنات پر حاکم نظام، سلطنت، قانون کی وحدت، خالق کی وحدت پر دلالت کرتی ہے۔

۲۔ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ : آسمانوں اور زمین پر کس کی حکومت، کس کا نظام نافذ ہے، کس کے یہ محتاج ہیں؟ کیا وہ اس بات کا مطالعہ نہیں کرتے کہ اللہ نے جن چیزوں کو پیدا کیا ہے ان پر کس کی بالادستی، سلطنت و بادشاہی ہے۔

۳۔ وَّاَنۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ قَدِ اقۡتَرَبَ اَجَلُہُمۡ : اور اس میں غور نہیں کرتے کہ ہو سکتا ہے کہ ان کی

موت نزدیک آ گئی ہو اور رسول اسلام (ص) کے فرامین مبنی برحق ہوں تو مرنے کے بعد کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس دعوت پر غور کرو۔

۴۔ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ: اگر قرآن جیسے معجزے پر تم ایمان نہیں لاتے تو کسی چیز پر بھی ایمان نہیں لاؤ گے۔ وہ دنیا کی اس ظاہری زندگی کے فریب میں بدمست ہیں۔ ورنہ یہ لوگ اگر اپنی موت کا تصور کرتے تو بھی از راہ احتیاط رسول (ص) کی تعلیمات کو مسترد نہ کرتے۔ قرآن جیسے معجزے کو یہ نہیں مانتے تو وہ کون سی ایسی بات ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں۔

اہم نکات

۱۔ آخرت پر یقین نہ بھی ہو، از راہ احتیاط بھی اس پر ایمان لانا چاہیے: وَّ اَنۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ قَدِ اقۡتَرَبَ اَجَلُہُمۡ ....۔

۲۔ فطرت کائنات اور اللہ کا ملکوتی نظام خود رسالتمآب (ص) کی صداقت پر گواہ ہے: اَوَ لَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ ....۔

مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَلَا ہَادِیَ لَہٗ ؕ وَ یَذَرُہُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ﴿۱۸۶﴾

۱۸۶۔ جسے اللہ گمراہ کرے کوئی اس کی ہدایت کرنے والا نہیں اور اللہ ایسے لوگوں کو ان کی اپنی سرکشی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ: اللہ کی طرف سے اضلال کیا چیز ہے؟ اس کا جواب خود اس آیت کے دوسرے جملے میں موجود ہے۔

۲۔ وَیَذَرُہُمۡ: وہ یہ ہے کہ اللہ اس کو اپنی سرکشی کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس سے رحمت و ہدایت کا ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ جب اللہ نے اس کو اپنے حال پر چھوڑا تو پھر ہدایت کا کوئی اور منبع نہیں ہے۔ اس سے واضح طور پر یہ بات سامنے آ گئی کہ اللہ کی طرف سے اضلال کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ بندوں کو گمراہ ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ تعالی اللّٰہ عن ذلك۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن کو ہمیشہ یہ دعا کرنی چاہیے جو معصوم کی طرف سے تعلیم شدہ ہے: رب لا تکلنی الی نفسی طرفة عین ابداً۔ پروردگار مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے حال پر نہ چھوڑ۔

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرۡسٰىهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّىۡ‌ۚ لَا يُجَلِّيۡهَا لِوَقۡتِهَاۤ اِلَّا هُوَ‌ ؔ‌ۘ ثَقُلَتۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ ؕ لَا تَاۡتِيۡكُمۡ اِلَّا بَغۡتَةً‌ ؕ يَسۡـَٔلُوۡنَكَ كَاَنَّكَ حَفِىٌّ عَنۡهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ اللّٰهِ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ‏ ﴿۱۸۷﴾

۱۸۷۔ یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ قیامت واقع ہونے کا وقت کب ہے؟ کہد یجیے: اس کا علم صرف میرے رب کے پاس ہے، قیامت کے وقت کو اللہ کے سوا کوئی ظاہر نہیں کر سکتا، (قیامت کا واقع ہونا) آسمانوں اور زمین کا بڑا بھاری حادثہ ہو گا جو ناگہاں تم پر آ جائے گا، یہ آپ سے اس طرح پوچھتے ہیں گویا آپ اس کی کھوج میں ہوں، کہد یجیے: اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تشریح کلمات

مُرۡسٰىهَا: (ر س و) رسا الشئی۔ کسی چیز کے کسی جگہ ٹھہرنے کو کہتے ہیں۔ مرسی لنگر انداز ہونے کی جگہ۔

حَفِىٌّ: (ح ف و) الاحفاء کے معنی کسی چیز کے مانگنے میں اصرار کرنے یا کوئی حالت دریافت کرنے کے لیے بحث اور کاوش میں لگے رہنے کے ہیں۔

السَّاعَةِ: زمانہ کے ایک حصے کو کہتے ہیں۔ قیامت کے دن کو ساعت کہتے ہیں کیونکہ ایک عظیم حادثہ زمانے کے ایک مختصر وقت میں رونما ہو گا۔

تفسیر آیات

شان نزول: تفسیر قمی میں آیا ہے کہ قریش نے عاص بن وائل سہمی، نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو نجران بھیجا کہ وہ یہود کے علماء سے کچھ معلومات لے کر رسول اللہؐ سے سوال کریں۔ ان میں سے ایک سوال تھا کہ قیامت کب برپا ہو گی؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

۱۔ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّىۡ: تمام انبیاء (ع) اور ادیان میں یہ بات ایک مسلمہ ہے کہ علم قیامت صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اس علم میں کوئی نبی اور کوئی مقرب فرشتہ اللہ کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ چنانچہ انجیل متی ۲۴: ۳۶ میں آیا ہے:

اس دن اور اس گھڑی کی بات کوئی نہیں جانتا، نہ آسمان کے فرشتے، نہ بیٹا، مگر

صرف باپ۔

۲۔ ثَقُلَتۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ: یعنی قیامت کا واقعہ ایک سنگین واقعہ ہو گا۔ اس کی سنگینی کا اندازہ خود قرآن کریم کی مختلف آیات سے بھی ہوتا ہے۔ جیسے سورہ حج میں فرمایا:

یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ ۚ اِنَّ زَلۡزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیۡءٌ عَظِیۡمٌ ۝ یَوۡمَ تَرَوۡنَہَا تَذۡہَلُ کُلُّ مُرۡضِعَۃٍ عَمَّاۤ اَرۡضَعَتۡ وَ تَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمۡلٍ حَمۡلَہَا وَ تَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَ مَا ہُمۡ بِسُکٰرٰی وَ لٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰہِ شَدِیۡدٌ ۝ [1]

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو کیونکہ قیامت کا زلزلہ بڑی (خوفناک) چیز ہے۔ جس دن تم اسے دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی (ماں) اپنے شیر خوار کو بھول جائے گی اور تمام حاملہ عورتیں اپنا حمل گرا بیٹھیں گی اور تم لوگوں کو نشے کی حالت میں دیکھو گے حالانکہ وہ نشے میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب بڑا شدید ہو گا۔

۳۔ لَا تَاۡتِیۡکُمۡ اِلَّا بَغۡتَۃً: قیامت کا واقعہ ایسا نہیں ہے کہ آنے کے قریب لوگوں کو اندازہ ہو جائے کہ بس آنے والی ہے بلکہ یہ ایک ایسا حادثہ ہو گا جیسے آج کل زلزلوں میں پیش آتا ہے یا آسمان سے کوئی بڑا دم دار ستارہ کرۂ ارض سے ٹکرائے گا تو ایک ہی لمحے میں زمین کا حلیہ بدل جائے گا۔ پہاڑ ریزہ ہو جائیں گے۔ وَّ بُسَّتِ الۡجِبَالُ بَسًّا ۙ فَکَانَتۡ ہَبَآءً مُّنۡۢبَثًّا ۝ [2]

۴۔ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ کَاَنَّکَ حَفِیٌّ عَنۡہَا: لوگ سوال اس طرح کرتے ہیں گویا کہ آپ اس بات کے کھوج میں ہوں کہ قیامت کب برپا ہونے والی ہے۔ جب کہ کوئی شخص خواہ وہ نبی مرسل ہو یا مقرب فرشتہ، اس بات کا کھوج لگا ہی نہیں سکتا۔

۵۔ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُہَا عِنۡدَ اللّٰہِ: یہ وہ علم جو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

اہم نکات

۱۔ قیامت کا حادثہ آسمانوں اور زمین کے لیے بھی قابل تحمل نہ ہو گا: ثَقُلَتۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ۔

۲۔ قیامت کا برپا ہونا ایسا اچانک ہو گا کہ کسی تخمین میں یہ بات نہیں آ سکتی: لَا تَاۡتِیۡکُمۡ اِلَّا بَغۡتَۃً۔

قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِکُ لِنَفۡسِیۡ نَفۡعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ؕ وَ لَوۡ کُنۡتُ

۱۸۸۔ کہد یجیے: میں خود بھی اپنے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں مگر اللہ جو چاہتا ہے (وہ ہوتا

---

[1] ۲۲ حج: ۱۔۲　[2] ۵۶ واقعۃ: ۵۔۶

اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ لَاسۡتَکۡثَرۡتُ مِنَ الۡخَیۡرِ ۚۖ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوۡٓءُ ۚۛ اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ﴿۱۸۸﴾	ہے) اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو بہت سے فائدے حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف بھی نہ پہنچتی، میں تو بس ایمان والوں کو تنبیہ کرنے اور بشارت دینے والا ہوں۔

تفسیر آیات

جس معاشرے کی طرف رسولؐ مبعوث ہوئے تھے وہ مشرکانہ مزاج کا معاشرہ تھا۔ اس لیے لوگ دعوائے نبوت سے یہ خیال کر رہے تھے کہ یہ رسولؐ بھی کار خدائی میں شریک ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ انبیاء (ع) کے بارے میں ان کی امتوں نے یہی مشرکانہ نظریات قائم کیے تھے۔

اس لیے پیامبر توحیدؐ پر یہ آیت نازل ہوئی: کہہ دیجیے کہ میں خود بھی اپنے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں، جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ یعنی میں اللہ سے مستغنی نہیں ہوں، میرے اوپر بھی اللہ کی مشیت حاکم ہے اور جس مقدار کے نفع و نقصان کا اختیار رکھتا ہوں وہ بھی اللہ کی طرف سے ہے، از خود نہیں۔

یہاں شاید یہ سوال پیدا ہو کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسولؐ بھی باقی انسانوں کی طرح اپنے نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے اور مشیت الٰہی بھی تو سب پر حاکم ہے؟

جواب یہ ہے کہ نبی اور عام بشر میں فرق کا دار و مدار اسی مشیت و منشا الٰہی پر ہے۔ اللہ کا ارادہ، اس کی منشا اور مشیت، اہلیت اور ظرفیت کے مطابق ہوتی ہے:

وَ تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ...[1]	اور تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے ...
وَاللّٰہُ یُؤۡتِیۡ مُلۡکَہٗ مَنۡ یَّشَآءُ ...[2]	اور اللہ اپنی بادشاہی جسے چاہے عنایت کرے...
نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ...[3]	جس کے ہم چاہتے ہیں درجات بلند کرتے ہیں...
اَللّٰہُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ...[4]	اللہ جسے چاہتا ہے اپنا برگزیدہ بنا لیتا ہے...

درست ہے اللہ کی مشیت و ارادہ سب پر حاکم ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ اللہ کی یہی مشیت و ارادہ رسول اللہ (ص) کو قَابَ قَوۡسَیۡنِ[5] تک لے جاتا ہے اور ابولہب کو جہنم کے اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ[6] تک۔

رسول اکرمؐ امت توحید کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کائنات پر خدائے واحد کی مشیت کارفرما ہے، باقی سب اس کی مشیت کے ذیل میں آتے ہیں۔

---

[1] ۳ آل عمران: ۲۶　[2] ۲ بقرۃ: ۲۴۷　[3] ۶ انعام: ۸۳
[4] ۴۲ شوریٰ: ۱۳　[5] ۵۳ نجم: ۹　[6] ۹۵ تین: ۵

ا۔ وَلَوۡ كُنۡتُ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ: علم غیب بذات خود صرف اللہ جانتا اور غیر اللہ علم غیب اس وقت جان سکتا ہے جب اللہ تعلیم دے۔ اس آیت میں بذات خود علم غیب کی نفی ہے، مطلق علم غیب کی نفی نہیں ہے، جیسا کہ دیگر آیات سے یہ بات واضح ہے۔ فرمایا:

عٰلِمُ الۡغَيۡبِ فَلَا يُظۡهِرُ عَلٰى غَيۡبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰى مِنۡ رَّسُوۡلٍ ... [1] — وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا سوائے اس رسول کے جسے اس نے برگزیدہ کیا ہو۔

۲۔ لَاسۡتَكۡثَرۡتُ مِنَ الۡخَيۡرِ: اگر میں غیب جانتا ہوتا تو کثرت سے الۡخَيۡرِ حاصل کر لیتا۔ اس جگہ الۡخَيۡرِ سے کیا مراد ہے؟ بعض کہتے ہیں الۡخَيۡرِ سے اعمال صالحہ مراد ہیں۔ بعض کے نزدیک الۡخَيۡرِ سے مال و دولت مراد ہے۔ یہ دونوں یقیناً مراد نہیں ہو سکتے چونکہ نہ رسول کے اعمال صالحہ میں لاعلمی کی وجہ سے کوئی کمی آ رہی تھی، نہ ہی مال و دولت کے آپؐ خواہشمند تھے کہ لاعلمی کی وجہ سے حاصل نہ کر سکے ہوں۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اگلا جملہ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوۡٓءُ قرینہ بن سکتا ہے کہ الۡخَيۡرِ سے مراد وہ بات ہے جو السُّوۡٓءُ کے مقابلے میں ہے۔ یعنی اگر میں غیب کی ہر بات براہ راست جانتا ہوتا تو زندگی کی ہر بھلائی سے بہرہ ور ہوتا اور کسی قسم کی تکلیف اور اذیت اٹھانے کی نوبت نہ آتی۔ جب کہ میں اس زندگی میں اذیت اٹھاتا ہوں۔

ما اوذی نبی مثل ما اوذیت۔ [2] — کسی نبی کو اتنی اذیت نہیں دی گئی جتنی مجھے دی گئی ہے۔

اور دوسروں کے ساتھ تکلیف اٹھاتا ہوں اور بھوک اور پیاس سے دوچار ہوتا ہوں۔ حضرت علی علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرماتے ہیں:

خرج من الدنیا خمیصا۔ [3] — رسولؐ اس دنیا سے بحالت گرسنگی کوچ کر گئے۔

(لم ار احدا فسر (الخیر) بمثل ما فسرت)

اہم نکات

۱۔ کائنات میں طاقت کا سرچشمہ صرف ذات الٰہی ہے: لَاۤ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِيۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا ....

۲۔ علم سرچشمہ خیر ہوتا ہے: وَلَوۡ كُنۡتُ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ لَاسۡتَكۡثَرۡتُ مِنَ الۡخَيۡرِ ....

هُوَ الَّذِيۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا لِيَسۡكُنَ اِلَيۡهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰهَا

۱۸۹۔ وہی تو ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ (انسان) اس سے سکون حاصل کرے پھر اس کے بعد جب مرد نے عورت کو ڈھانپ لیا (مقاربت کی)

---

[1] ۷۲ جن: ۲۶۔۲۷ [2] بحار الانوار ۳۹: ۵۵ [3] مستدرک الوسائل ۱۲: ۵۴

حَمَلَتۡ حَمۡلًا خَفِیۡفًا فَمَرَّتۡ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثۡقَلَتۡ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنۡ اٰتَیۡتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیۡنَ ﴿۱۸۹﴾

تو عورت کو ہلکا سا حمل ہو گیا جس کے ساتھ وہ چلتی پھرتی رہی، پھر جب وہ حمل بھاری ہوا تو دونوں (میاں بیوی) نے اپنے رب اللہ سے دعا کی کہ اگر تو نے ہمیں سالم بچہ دیا تو ہم ضرور تیرے شکر گزار ہوں گے۔

فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِیۡمَاۤ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۹۰﴾

۱۹۰۔ پس جب اللہ نے انہیں سالم بچہ عطا کیا تو وہ دونوں اللہ کی اس عطا میں (دوسروں کو) اللہ کے شریک ٹھہرانے لگے، اللہ ان کی مشرکانہ باتوں سے بالاتر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ: پہلے انسان کی تخلیق کا ذکر فرمایا کہ اللہ ہی نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، پھر اللہ ہی نے تمہارے سکون اور نسل آدم کو آگے بڑھانے کے لیے جوڑا بھی بنایا۔ اس کے بعد جب نسل آدم آگے چلی تو انسان کی تخلیق میں مشرکانہ نظریات وجود میں آنے لگے۔

۲۔ فَلَمَّاۤ اَثۡقَلَتۡ دَّعَوَا اللّٰهَ: چنانچہ اس آیت میں مشرکین کی ایک جاہلانہ سوچ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ والدین زمانہ حمل میں تو ساری امیدیں اللہ سے وابستہ کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں صحیح سالم بچہ عنایت فرما۔ جب اللہ ان کو صحیح و سالم بچہ عنایت فرماتا ہے تو اس بچے کو عطائے خداوندی تصور کر کے اس کی بارگاہ میں شکر گزار ہونے کی بجائے وہ اسے غیر اللہ کی عنایت گرداننے لگتے ہیں۔ مثلاً فلاں پیر نے یہ اولاد دی ہے یا فلاں دیوی اوتار یا فلاں بت یا ستارے کا عطیہ ہے اور بچہ عبد الشمس عبد العزی وغیرہ ہے۔

واضح رہے اگر یہ تصور کیا جائے کہ فلاں بزرگ کی دعا سے اللہ نے یہ بچہ عنایت فرمایا ہے تو یہ شرک نہیں ہے، کیونکہ اللہ سے دعا تو عین توحید ہے یا کسی برگزیدہ ہستی کو وسیلہ بنا کر دعا کی جائے تو یہ عقیدہ بھی درست ہے کہ اس وسیلے کی وجہ سے میری دعا قبول ہوئی اور اللہ نے بچہ عنایت فرمایا۔

تشریح کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورۂ مائدہ آیت ۳۵۔

اس آیت کے ذیل میں ایسی روایات تفسیروں میں ملتی ہیں جو اسرائیلیات پر مبنی یہودی سوچ کی آئینہ دار ہیں کہ انبیاء کی طرف ہر قسم کے جرائم کی نسبت دیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں حضرت آدمؑ کی طرف شرک کی نسبت دینے سے بھی گریز نہیں کیا۔

اہم نکات

۱۔ اضطرار کے وقت انسان اللہ کو پکارتا ہے۔ مقصد کے حصول کے بعد اللہ بھول جاتا ہے: دَّعَوَا اللّٰہَ رَبَّہُمَا ... جَعَلَا لَہٗ شُرَکَآءَ ....۔

۲۔ انسانی تخلیق میں غیر اللہ کے دخل کا تصور کرنا شرک ہے: شُرَکَآءَ فِیۡمَاۤ اٰتٰہُمَا....۔

۳۔ مادی، جسمانی، دماغی اور روحانی ہر لحاظ سے شریک زندگی وسیلہ راحت و سکون ہے کیونکہ لِیَسۡکُنَ اِلَیۡہَا کی تعبیر مطلق ہے۔

اَیُشۡرِکُوۡنَ مَا لَا یَخۡلُقُ شَیۡئًا وَّ ہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ ﴿۱۹۱﴾

۱۹۱۔ کیا یہ لوگ ایسوں کو اللہ کا شریک بناتے ہیں جو کوئی چیز خلق نہیں کر سکتے بلکہ خود مخلوق ہوتے ہیں؟

وَ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ لَہُمۡ نَصۡرًا وَّ لَاۤ اَنۡفُسَہُمۡ یَنۡصُرُوۡنَ ﴿۱۹۲﴾

۱۹۲۔ اور جو نہ تو ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی خود اپنی مدد کرنے پر قادر ہیں۔

وَ اِنۡ تَدۡعُوۡہُمۡ اِلَی الۡہُدٰی لَا یَتَّبِعُوۡکُمۡ ؕ سَوَآءٌ عَلَیۡکُمۡ اَدَعَوۡتُمُوۡہُمۡ اَمۡ اَنۡتُمۡ صَامِتُوۡنَ ﴿۱۹۳﴾

۱۹۳۔ اور اگر تم انہیں راہ راست کی طرف بلاؤ تو وہ تمہاری اطاعت نہیں کریں گے، تمہارے لیے یکساں ہے خواہ تم انہیں دعوت دو یا تم خاموشی اختیار کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ اَیُشۡرِکُوۡنَ مَا لَا یَخۡلُقُ: انسانی عقل و شعور کے لیے دعوت فکر ہے کہ ایسی ذات کے سامنے جھکنا چاہیے جو مؤثر فی الوجود ہو۔ جو خالق ہے، اس کی پرستش ہو۔ جن کو یہ لوگ شریک مانتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ مؤثر فی الوجود نہیں ہیں بلکہ وہ خود متاثر اور مخلوق ہیں۔

۲۔ وَ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ لَہُمۡ نَصۡرًا: دوسری آیت میں بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا: وہ تو نہ صرف اپنے پرستاروں کی مدد نہیں کرتے بلکہ خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے۔

۳۔ وَ اِنۡ تَدۡعُوۡہُمۡ اِلَی الۡہُدٰی: تیسری آیت میں مشرکین کی مزید حماقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ جن کو تم شریک خدا بناتے ہو وہ تمہاری رہنمائی کرنا تو درکنار، اگر تم ان شریکوں کی رہنمائی کرنا چاہو تو وہ کسی کی رہنمائی قبول کرنے کے بھی اہل نہیں ہیں۔ تمہاری پکار کا جواب تک دینے کے قابل نہیں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ خالق، ناصر اور پکار کا جواب دینے والا، معبود ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمۡثَالُکُمۡ فَادۡعُوۡہُمۡ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾

۱۹۴۔ اللہ کے سوا تم جنہیں پکارتے ہو وہ تمہاری طرح کے بندے ہیں، پس اگر تم سچے ہو تو تم انہیں ذرا پکار کر تو دیکھو، انہیں چاہیے کہ تمہیں (تمہاری دعاؤں کا) جواب دیں۔

اَلَہُمۡ اَرۡجُلٌ یَّمۡشُوۡنَ بِہَاۤ ۫ اَمۡ لَہُمۡ اَیۡدٍ یَّبۡطِشُوۡنَ بِہَاۤ ۫ اَمۡ لَہُمۡ اَعۡیُنٌ یُّبۡصِرُوۡنَ بِہَاۤ ۫ اَمۡ لَہُمۡ اٰذَانٌ یَّسۡمَعُوۡنَ بِہَا ؕ قُلِ ادۡعُوۡا شُرَکَآءَکُمۡ ثُمَّ کِیۡدُوۡنِ فَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۱۹۵﴾

۱۹۵۔ کیا ان کے پیر ہیں جن سے وہ چلتے ہیں؟ کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں؟ کیا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں؟ کیا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں؟ کہد یجیے: تم اپنے شریکوں کو بلاؤ پھر میرے خلاف (جو) تدبیریں (کر سکتے ہو) کرو اور مجھے مہلت تک نہ دو۔

اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰہُ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡکِتٰبَ ۫ۖ وَ ہُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۹۶﴾

۱۹۶۔ بے شک میرا آقا تو وہ اللہ ہے جس نے کتاب نازل کی اور جو صالحین کا کارساز ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ: جن غیر اللہ کو تم پکارتے ہو وہ تمہاری طرح مخلوق اور محتاج ہیں۔ یہ تمہاری پکار تک سننے کے اہل نہیں ہیں بلکہ جو اعضا و جوارح خود تمہارے پاس ہیں، وہ بھی تمہارے ان شریکوں کے پاس نہیں ہیں۔ لہٰذا یہ شریک خود تم سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ نہایت حیرت کی بات ہے کہ ایسی بے بس چیزوں کو معبود مانتے ہو۔

۲۔ اَلَہُمۡ اَرۡجُلٌ یَّمۡشُوۡنَ بِہَاۤ: اس آیت میں انسان کو ان بتوں سے افضل قرار دیا گیا ہے کہ انسان کے پاس تو اپنے اغراض و مقاصد کے لیے اپنے اعضاء کو استعمال کرنے کا اختیار ہے، تمہارے بتوں کے پاس اس قدر بھی اختیار نہیں ہے بلکہ ہر طرح سے بے بس ہیں۔ ایسے بے بسوں کو اپنا معبود بناتے ہو۔

۳۔ ثُمَّ کِیۡدُوۡنِ: اس کے بعد ان نادان، کم عقل اور جاہل لوگوں کو ایک چیلنج کے ذریعے اس

پُرحماقت مسئلے کو سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اے رسولؐ! ان سے کہدیجیے: تم اپنے معبودوں سے مل کر میرے خلاف جو کچھ کر سکتے ہو کرو اور اپنے معبود کی قدرت و طاقت کا مظاہرہ میرے خلاف کر کے دکھاؤ۔ چیلنج میں اتنا اعتماد ظاہر کریں کہ ان سے کہیں کہ میرے خلاف پورا زور لگائیں اور مہلت بھی نہ دیں۔ میرا والی اور میرا کارساز میری مدد کرے گا۔

۴۔ اِنَّ وَلِیّۦَ اللّٰہُ: میں اس ہستی کی پناہ میں ہوں جس نے کتاب ہدایت نازل کی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے وہ میری رہنمائی فرماتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کی عقل پر پردہ پڑتا ہے تو اپنے سے بھی کمتر چیزوں کو معبود بناتا ہے۔

۲۔ جو اللہ کے ساتھ ہے اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا: کِیۡدُوۡنِ فَلَا تُنۡظِرُوۡنِ۔

۳۔ جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، اللہ اس کی ہر حالت میں مدد کرتا ہے: اِنَّ وَلِیّۦَ اللّٰہُ ....

وَ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ نَصۡرَکُمۡ وَ لَاۤ اَنۡفُسَہُمۡ یَنۡصُرُوۡنَ﴿۱۹۷﴾

۱۹۷۔ اور اللہ کے سوا جنہیں تم پکارتے ہو وہ نہ تو تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی خود اپنی مدد کر سکتے ہیں۔

وَ اِنۡ تَدۡعُوۡہُمۡ اِلَی الۡہُدٰی لَا یَسۡمَعُوۡا ؕ وَ تَرٰىہُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡکَ وَ ہُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ﴿۱۹۸﴾

۱۹۸۔ اور اگر تم انہیں ہدایت کے لیے بلاؤ تو وہ تمہاری بات بھی نہیں سن سکتے اور تم انہیں دیکھتے ہو کہ بظاہر وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں جب کہ وہ کچھ بھی دیکھ نہیں سکتے۔

تفسیر آیات

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا کہ ان کے معبودوں کی ناتوانی اور بے بسی کو ظاہر کرتے ہوئے ان کو چیلنج کرو کہ وہ نہ صرف یہ کہ تمہاری ہدایت نہیں کرتے بلکہ تم ان کی ہدایت کرنا چاہو تو وہ تمہاری بات تک سننے کی اہلیت نہیں رکھتے، نہ وہ تمہیں دیکھ سکتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ جدید جاہلیت کے بتوں کا بھی یہی حال ہے۔ نہ وہ اپنے پرستاروں کو سن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں۔

خُذِ الۡعَفۡوَ وَاۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰهِلِیۡنَ﴿۱۹۹﴾

۱۹۹۔(اے رسول) درگزر سے کام لیں نیک کاموں کا حکم دیں اور جاہلوں سے کنارہ کش ہو جائیں۔

تفسیر آیات

یہ خطاب رسول کریم (ص) کو اس وقت مل رہا ہے جب آپؐ مکہ میں ہر طرف سے دشمنوں کے نرغے میں تھے اور ہر طرف سے آزار پہنچ رہا تھا۔ اس وقت اسلامی اقدار و آداب کا مظاہرہ کرنے کا حکم ہے کہ ان کے مظالم کا مقابلہ کرنے سے گریز کریں اور درگزر کو اپنا شیوہ بنائیں۔ اس آیت میں دعوت و تبلیغ کے اہم عناصر بتائے ہیں۔

i۔ اس دعوت کی راہ میں پیش آنے والی زیادتیوں اور عوام کے منفی ردعمل کے نتیجے میں جو مظالم توڑے جائیں گے، ان کا مقابلہ عفو و درگزر سے کیا جائے۔

ii۔ شدائد اور تکالیف کی پرواہ کیے بغیر بھلائی کی دعوت و تبلیغ جاری رکھی جائے۔

iii۔ جاہلوں (بے علم، نادان و سفیہانہ حرکات کے حامل لوگوں) کے ساتھ الجھنے سے پرہیز کیا جائے۔ الجھنے سے مسائل سلجھتے نہیں بلکہ مزید پیچیدہ ہوتے ہیں اور نفرتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

وَ اِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّهٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ﴿۲۰۰﴾

۲۰۰۔ اور اگر شیطان آپ کو اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگیں، یقیناً وہ بڑا سننے والا، جاننے والا ہے۔

تشریح کلمات

یَنۡزَغَنَّکَ: (ن ز غ) النزغ کے معنی بقول راغب کسی کام کو بگاڑنے کے لیے اس میں خلل انداز ہونے کے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنی اکسانے اور تنگ کرنے کے ہیں اور ایسا غصے کی حالت میں ہوا کرتا ہے۔

تفسیر آیات

شیطان کو اکسانے کا موقع اس وقت میسر آتا ہے جب جاہل لوگ صاحب دعوت کی اہانت کرتے ہیں۔ اس وقت انسان میں جذبہ انتقام ابھر آتا ہے اور الجھ پڑتا ہے۔ یہاں اللہ کی مدد کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر یہاں انسان کو علم ہو کہ اللہ اس کی آواز سن رہا ہے اور اس کی حالت زار سے واقف بھی ہے تو

ہمت و حوصلہ کے لیے یہی بات کافی ہے۔

واضح رہے شیطان کے اکسانے کی نوبت حضورؐ کے لیے نہیں آ سکتی۔ یہ خطاب رسولؐ سے ہے اور سمجھانا امت کو مقصود ہے۔ سر دلبران در حدیث دیگران کے طور پر ہے۔

اہم نکات

۱۔ جاہلوں کا جواب سکوت و کنارہ کشی ہے: اَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰہِلِیۡنَ ....

۲۔ مدمقابل دشمن غصہ دلا کر آپ کو ناکام بنائے گا، اس وقت اللہ کی پناہ میں جاؤ: وَ اِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ ....

اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّہُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ تَذَکَّرُوۡا فَاِذَا ہُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۰۱﴾

۲۰۱۔ بے شک جو لوگ اہل تقویٰ ہیں انہیں جب کبھی شیطان کی طرف سے کسی خطرے کا احساس ہوتا ہے تو وہ چوکنے ہو جاتے ہیں اور انہیں اسی وقت سوجھ آ جاتی ہے۔

وَ اِخۡوَانُہُمۡ یَمُدُّوۡنَہُمۡ فِی الۡغَیِّ ثُمَّ لَا یُقۡصِرُوۡنَ ﴿۲۰۲﴾

۲۰۲۔ اور ان کے (شیطانی) بھائی انہیں گمراہی میں کھینچتے لیے جاتے ہیں پھر وہ (انہیں گمراہ کرنے میں) کوتاہی بھی نہیں کرتے۔

تشریح کلمات

طٰٓئِفٌ: (ط و ف) طاف۔ گردش۔ خطرہ لاحق ہونا۔

تفسیر آیات

شیطان جب کسی کو مس کرتا ہے تو عام انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ شیطان انسان سے بصیرت سلب کرتا ہے لیکن اہل تقویٰ کا حال ہی دوسرا ہے۔ وہ شیطان کے چھونے سے زیادہ ہوشیار ہو جاتے ہیں اور نہ صرف شیطان انہیں اندھا نہیں کر سکتا بلکہ ان کی بصیرت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے: فَاِذَا ہُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ۔

... وَ مَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا [1]　　اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے۔

دوسری جگہ اہل تقویٰ کے بارے میں فرمایا:

---

[1] ۶۵ طلاق: ۲

... وَمَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مِنۡ اَمۡرِہٖ یُسۡرًا ۔[1]
اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس کے معاملے میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّکُمۡ فُرۡقَانًا ...[2]
اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمہیں (حق وباطل میں) تمیز کرنے کی طاقت عطا کرے گا۔

وَ اِخۡوَانُہُمۡ یَمُدُّوۡنَہُمۡ : یعنی ان مشرکین کے شیطانی بھائی بند ان کو گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں پھر ان کو گمراہ کرنے کے لیے اپنی پوری سعی صرف کرتے ہیں۔ اِخۡوَانُہُمۡ کی ضمیر مشرکین کی طرف ہے۔ اگرچہ مشرکین لفظاً مذکور نہیں ہے تاہم سیاق کلام مشرکین کے بارے میں ہے۔

اہم نکات

ا۔ نادان لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ تقویٰ ایک قید و بند ہے۔ نہیں بلکہ تقوی حریت ہے، طاقت ہے اور بصیرت ہے۔

وَ اِذَا لَمۡ تَاۡتِہِمۡ بِاٰیَۃٍ قَالُوۡا لَوۡ لَا اجۡتَبَیۡتَہَا ؕ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ مِنۡ رَّبِّیۡ ۚ ہٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃٌ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾

۲۰۳۔ اور جب آپ ان کے سامنے کوئی معجزہ نہیں لاتے تو کہتے ہیں: تم نے خود اپنے لیے کسی نشانی کا انتخاب کیوں نہ کیا؟ کہد یجیے: میں یقیناً اس وحی کا پابند ہوں جو میرے رب کی جانب سے میری طرف بھیجی جاتی ہے، یہ (قرآن) تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے باعث بصیرت اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

تفسیر آیات

کفار نے طنز و استہزاء کے لہجے میں کہا: اگر آپؐ نے نبی کا دعویٰ کرنا تھا تو ادھر ادھر سے کوئی معجزہ بھی گڑھ کر بنا لاتے۔

عرب جاہل حضورؐ سے بھی اسی طرح کا معجزہ طلب کرتے تھے جو قرون وسطی کے لوگوں کو دکھایا گیا تھا اور جو محدود شریعت کے حامل انبیاء (ع) کو دیا گیا تھا۔ اسلام اس وقت آیا، جب انسانیت تمدن و تہذیب کے قابل ہو گئی ۔ اس کی عقل و شعور بلوغ کو پہنچنے والا تھا۔ قرآن ایک ابدی دستور اور دائمی نظام حیات ہے۔ اس لیے کل عہد طفولیت کے محسوس پرست لوگوں کے لیے محسوس معجزہ دیا گیا تھا تو آج عہد تمدن و روشنی کے لیے معقول معجزہ لے کر آیا ہوں، وہ قرآن ہے۔

---

[1] ۶۵ طلاق: ۴ [2] ۸ انفال: ۲۹

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ : اس کے اندر بصیرت اور روشنیاں ہیں اور ہدایت و رحمت سے پر ایک جامع نظام حیات ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآن قیامت تک کے لیے بصیرت افروز معجزہ ہے: هٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ....

وَ اِذَا قُرِئَ الۡقُرۡاٰنُ فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ وَاَنۡصِتُوۡا لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۲۰۴﴾

۲۰۴۔اور جب قرآن پڑھا جائے تو پوری توجہ کے ساتھ اسے سنا کرو اور خاموش رہا کرو، شاید تم پر رحم کیا جائے۔

تفسیر آیات

شان نزول: بعض روایت میں آیا ہے کہ شروع میں لوگ نماز میں باتیں کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض دیگر روایت میں آیا ہے: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے تو کچھ لوگوں نے پیچھے قرآن پڑھنا شروع کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

۱۔ محسوس معجزہ طلب کرنے کی بجائے قرآن کو توجہ سے سنا کرو۔ قرآن کی تلاوت کے وقت کانوں میں انگلیاں نہ ٹھونسو۔ اس قرآن کے سننے اور تعصب کی عینک اتارنے کے بعد تم پھر محسوس معجزوں کا مطالبہ نہیں کرو گے۔ تم پر بھی اللہ کی رحمت نازل ہو گی۔

۲۔ وَاِذَا قُرِئَ الۡقُرۡاٰنُ: بعض کے نزدیک تلاوت قرآن کے موقع پر خاموشی سے سننا صرف نماز میں واجب ہے۔ بعض نے خطبہ جمعہ میں واجب کہا ہے۔ فقہ جعفریہ کے مطابق صرف ماموم کے لیے واجب ہے کہ امام کی تلاوت خاموشی سے سنے۔ قرآن کی تلاوت کے موقع پر ماموم پر خاموشی سے سننا واجب ہے۔ یعنی امام کی قرأت قرآن کے موقع پر ماموم پر واجب ہے کہ وہ خاموشی سے سنے، بشرطیکہ نماز جہری ہو اور امام کی آواز آ رہی ہو۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

یَجِبُ الْاِنْصَاتُ لِلْقُرْآنِ فِی الصَّلَاۃِ وَ غَیْرِھَا.[1]

قرآن کا خاموشی سے سننا واجب ہے۔ نماز میں ہو یا نہ ہو۔

فقہاء نے غیر صلوۃ میں خاموشی اختیار کرنے کو دیگر روایات کے تناظر میں مستحب قرار دیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآن کو توجہ سے سننے والوں پر اللہ رحم فرماتا ہے: لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ۔

---

[1] وسائل الشیعۃ ۶: ۲۱۴

وَ اذۡكُرۡ رَّبَّكَ فِیۡ نَفۡسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِیۡفَةً وَّ دُوۡنَ الۡجَهۡرِ مِنَ الۡقَوۡلِ بِالۡغُدُوِّ وَ الۡاٰصَالِ وَ لَا تَكُنۡ مِّنَ الۡغٰفِلِیۡنَ ﴿۲۰۵﴾

۲۰۵۔ (اے رسول) اپنے رب کو تضرع اور خوف کے ساتھ دل ہی دل میں اور دھیمی آواز میں صبح و شام یاد کیا کرو اور غافل لوگوں میں سے نہ ہوں۔

تشریح کلمات

تَضَرُّعًا: (ض ر ع) التضرع عجز و تذلل کا اظہار کرنا۔

بِالۡغُدُوِّ: (غ د و) الغداوۃ، دن کا ابتدائی حصہ۔

الۡاٰصَالِ: (ا ص ل) اصیل کی جمع۔ عصر و مغرب کا درمیانی وقت۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ: اس آیت میں ذکر کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ذکر قلبی کہ انسان کا دل ہمیشہ یاد خدا میں رہے۔ اپنے خالق سے ہمیشہ اتصال میں رہے۔ ذکر قلبی کے آداب میں بتایا کہ جب دل اللہ کی یاد میں ہو گا تو تضرع و تذلل بھی ہونا چاہیے، جو اللہ کی عظمت کے سامنے ایک طبیعی امر ہے۔ تضرع میں ایک قسم کا شوق پایا جاتا ہے کہ جس کے سامنے زاری کی جاتی ہے اس کے ساتھ اشتیاق بھی ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ خوف و بیم کا شائبہ بھی ہونا چاہیے کہ اس کی عظمت و جلالت کا لازمہ ہے۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ انسان اللہ کو دل میں یاد کرے تو خوف و رجاء، امید و بیم کے ساتھ ہونا چاہیے۔

۲۔ وَّدُوۡنَ الۡجَهۡرِ: دوسرا ذکر لسانی و قولی ہے۔ اس کے آداب میں بتایا گیا ہے کہ ہلکی آواز میں یہ ذکر ہونا ہی آداب بندگی ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ اللہ تمہارے نہایت قریب ہے۔ اس کو آہستہ آواز میں پکارو۔

صبح و شام کے وقت کو خصوصیت کے ساتھ اس لیے بیان کیا ہو کہ ان اوقات میں آفاقی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ لیل و نہار اور صبح و شام کی تبدیلیوں میں قدرت کے مظاہر ہوتے ہیں۔ ان اوقات میں ذکر خدا اپنا منفرد اثر رکھتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ذکر خدا کے لیے دل اور زبان میں اتفاق اور صبح و شام میں اتصال ہو تو غافل شمار نہیں ہوتا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّكَ لَا

۲۰۶۔ جو لوگ آپ کے رب کے حضور میں ہوتے

یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِہٖ وَ یُسَبِّحُوۡنَہٗ وَ لَہٗ یَسۡجُدُوۡنَ ﴿۲۰۶﴾

ہیں وہ یقیناً اس کی عبادت کرنے سے نہیں اکڑتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز رہتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّکَ: قلب و لسان اور صبح و شام کا ذکر کرنے کا حکم دینے کے بعد فرمایا کہ ذکر خدا کا یہ وطیرہ ان لوگوں کا ہے جو اللہ کے حضور میں رہتے ہیں اور ان کو درگاہ الٰہی میں تقرب حاصل ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر خدا سے عبد اور معبود میں فاصلہ کم ہو جاتا ہے۔ خاصان خدا، کمال مطلق کے سامنے جھکنے کو اپنا کمال تصور کرتے ہیں، لہٰذا اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے بلکہ اس کمال مطلق کی تسبیح و تمجید کرنے میں اپنی ارتقا سمجھتے اور اس کے حضور میں سجدہ ریز ہونے کو اپنی بلندی تصور کرتے ہیں۔

تفسیر قمی میں آیا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّکَ سے مراد انبیاء و رسل اور ائمہ (ع) ہیں۔

اہم نکات

۱۔ انسان اعلیٰ قدروں کا مالک ہو تو عبادت حق میں تکبر نہیں کرتا: لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ ....

۲۔ اللہ کا تقرب حاصل ہونے کا لازمہ عبادت و تسبیح و سجود ہے: عِنۡدَ رَبِّکَ ... یَسۡجُدُوۡنَ۔

سُورَةُ الأنفَال
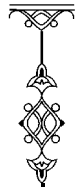
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ سورۃ المبارکۃ مدنی ہے اور کوفی قرائت کے مطابق ۷۵ آیات پر مشتمل ہے۔ واضح رہے کوفی قرائت سب سے زیادہ مستند ہے چونکہ یہ قرائت عاصم کی ہے۔ عاصم نے یہ قرائت ابوعبد الرحمٰن سلمی سے اخذ کی ہے اور سلمی نے حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام سے اخذ کی ہے۔

یہ سورۃ جنگ بدر کے بعد سنہ ۲ ہجری میں نازل ہوئی، چنانچہ اس سورہ میں بدر کی تاریخ ساز جنگ کے بارے میں بہت سے نکات بیان ہوئے ہیں۔

اس سورۃ کے مباحث اکثر جنگ بدر اور اس سے پیدا شدہ مسائل کے بارے میں ہیں چونکہ پیش آمدہ واقعات کے روشنی میں قانون سازی آسان ہو جاتی ہے، اس لیے غنائم جنگی کے بارے میں اسلام کا یہ موقف واضح کیا گیا کہ جنگی غنیمت، اسلامی ریاست کی ملکیت ہوتی ہے۔

پھر صلح و جنگ کے بارے میں بھی قانون سازی ہوگئی تا کہ جاہلی تصورات کی جگہ اسلامی، انسان ساز قانون ذہین نشین ہو جائے۔

جنگی اخلاقیات کا ذکر ہے کہ اسلام نے اس تصور کو مسترد کیا کہ ’’جنگ میں ہر کام جائز ہے۔‘‘

مسلمانوں کو یہ باور کرایا کہ جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لیے کون سا اسلحہ زیادہ مؤثر ہے۔ آہنی اسلحہ یا آہنی ارادے۔ ارادوں کے آہنی ہونے کے لیے تائید غیبی درکار ہوتی ہے اور تائید غیبی کے حصول کے لیے بھی ایمان کی ایک خاص کیفیت درکار ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَنۡفَالِ ؕ قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَیۡنِکُمۡ ۪ وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ①

بنام خدائے رحمن و رحیم

۱۔ (اے رسول) لوگ آپ سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں، کہد یجیے: یہ انفال اللہ اور رسول کے ہیں پس تم لوگ اللہ کا خوف کرو اور باہمی تعلقات مصالحانہ رکھو اور اگر تم مومن ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

تشریح کلمات

الۡاَنۡفَالِ: (ن ف ل) نفل کی جمع ہے۔ اس کے معنی زائد کے ہیں اور جو واجب کے علاوہ ہو اس کو نفل، نافلہ کہتے ہیں۔ جنگی غنیمت کو انفال اس لیے کہتے ہیں کہ مسلمان غنیمت کے لیے نہیں، راہ خدا میں لڑتے ہیں لیکن غنیمت ایک اضافی انعام ہے یا اس لیے ہوسکتا ہے کہ راہ خدا میں جہاد کا صلہ تو ان کو اجر و ثواب کے ذریعے اللہ کے ہاں سے ملے گا لیکن غنیمت دنیا میں ایک اضافی اجر و ثواب ہے۔

تفسیر آیات

شان نزول: مسلمانوں نے بدر میں پہلی مرتبہ جنگ لڑی تھی۔ جنگ سے پیدا شدہ مسائل کے بارے میں اسلام کا کیا مؤقف ہے؟ لڑنے والوں کو اس سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ صرف جاہلیت کے تصورات ذہنوں میں تھے کہ جس نے جو لوٹا وہی اس کا مالک بن گیا۔ چنانچہ کافروں کی شکست کے موقع پر مسلمانوں کے تین گروہ بن گئے تھے:

ایک گروہ کفار کا تعاقب کر رہا تھا۔
دوسرا گروہ رسولؐ کی حفاظت کر رہا تھا۔
تیسرا گروہ مال غنیمت لوٹ رہا تھا۔

یہ تیسرا گروہ عرب کے پرانے جنگی رواج کے تحت اپنے آپ کو اس کا مالک تصور کر رہا تھا جب کہ دوسرے گروہ کا کہنا تھا ہم بھی اس میں برابر کے شریک ہیں کیونکہ ہم نے رسول اللہؐ کی حفاظت کی ہے اور ہمیں خوف تھا کہ کہیں رسول اللہؐ پر دشمن اچانک حملہ نہ کر دے اور پہلے گروہ کا کہنا تھا کہ ہم نے دشمن کو بھگا دیا اور اسے شکست دی۔ ہم اس مال غنیمت میں برابر کے شریک ہیں۔[1]

بعض دیگر روایات میں آیا ہے کہ حضرت عبادہ نے کہا:

ففینا اصحاب بدر نزلت حین اختلفنا فی النفل و ساء ت فیه اخلاقنا فنزعه اللّٰه من ایدینا فجعله الی رسول اللّٰه فقسمه رسول اللّٰه بین المسلمین علی السوآء۔[2]

یہ آیت ہم اصحاب بدر کے بارے میں نازل ہوئی جب ہم نے غنیمت کے بارے میں آپس میں اختلاف کیا۔ اس سلسلے میں ہمارے اخلاق بگڑ گئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے چھین کر رسول اللہؐ کو دیا۔ چنانچہ آپؐ نے مسلمانوں میں برابر تقسیم کیا۔

نیز وَاَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَیۡنِکُمۡ آپس میں صلح و آشتی قائم رکھو سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت کسی اختلاف کے موقع پر نازل ہوئی ہے۔

انفال کے موارد اور حکم: انفال اگرچہ جنگ بدر کی غنیمت کے بارے میں نازل ہوئی اور سوال بھی بدر کی غنیمت کے بارے میں ہوا تھا تاہم تفسیر میں ایک مسلمہ کلیہ ہے کہ العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص المورد۔ لفظ کی تعبیر معتبر ہے، شان نزول کی خصوصیت معتبر نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں جائے سوال یا محل نزول آیت خاص ہو تو لفظی تعبیر کی تخصیص نہیں ہوتی۔ لہٰذا آیت کی تعبیر میں ہر قسم کے انفال یعنی اموال زائد شامل ہیں۔ مثلاً آبادیاں جو متروک ہو چکی ہوں، پہاڑوں کی چوٹیاں، جنگل، بادشاہوں کی جاگیریں، غیر آباد زمینیں، لاوارث املاک وغیرہ۔ جو بھی کسی کی ملکیت میں نہیں ہے، وہ اللہ اور رسولؐ کی ملکیت ہے۔ یعنی یہ حکومتی ملکیت (سٹیٹ پراپرٹی) ہے۔

لہٰذا جنگی غنیمت اسلامی حکومت کی ملکیت ہے۔ اس کی تقسیم کا اختیار اسلامی حکومت کے قانونی سربراہ کے اختیار میں ہے۔ اس طرح قانون شریعت کے تحت یہ لازم ہو گیا کہ تمام مال غنیمت امامؑ کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کے بعد آیہ خمس میں اس مال کی تقسیم کا قانون بتا دیا کہ پانچواں حصہ سرکاری ملکیت میں جائے گا اور باقی چار حصے لڑائی میں شریک فوج میں تقسیم کر دیے جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں جو حصہ

---

[1] مسند احمد بن حنبل ۵: ۳۲۳ میں اس مضمون کی روایت موجود ہے۔
[2] محاسن التاویل ۸: ۶

کسی سرباز کے حصہ میں آئے، اس کا پانچواں حصہ سرکاری ملکیت میں جائے گا، چار حصے اس کی ذاتی ملکیت ہو گی۔ لہٰذا آیہ انفال اور آیہ خمس میں کوئی تضاد نہیں کہ آیہ خمس کو جس میں چار حصے سرباز کو ملنے کا حکم ہے، ناسخ اور آیۂ انفال جس میں سارا مال اللہ و رسولؐ کے لیے قرار دیا ہے، کو منسوخ سمجھا جائے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَیۡنِکُمۡ : تقویٰ کی نصیحت سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اصحاب بدر سے مال غنیمت کے بارے میں تقویٰ کے خلاف کوئی لغزش واقع ہوگئی ہے اور وَاَصۡلِحُوۡا سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان میں غنیمت کے بارے میں نزاع واقع ہو گیا تھا۔

وَاَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗۤ : اللہ اور رسول کی اطاعت سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ اور رسول نے جو حکم دیا ہے کہ انفال تمہاری ملکیت نہیں ہے بلکہ اللہ اور رسول کی ملکیت ہے، اس کی اطاعت کرو۔ چنانچہ اس اطاعت کے وقوع پزیر ہونے کی وجہ سے نزاع ختم ہو گیا۔

اہم نکات

۱۔ ہر وہ چیز جس کا کوئی مالک نہ ہو، وہ اسلامی حکومت کی ملکیت ہے: قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ.

۲۔ تقویٰ اور آپس میں صلح و آشتی اور اطاعت خدا و رسولؐ ایمان کے ارکان ہیں: فَاتَّقُوا اللّٰهَ... اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ۔

۲۔ مومن تو صرف وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ جاتے ہیں اور جب انہیں اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔

۳۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

جہاد اصغر، یعنی جنگ وجدال سے فارغ ہونے کے بعد۔ جہاد اکبر یعنی مال و متاع کی نوبت آئی تو اس جہاد کے لیے پختہ ایمان کی زیادہ ضرورت تھی۔ چونکہ غنیمت کی ملکیت کو اس پر قابض لوگوں سے چھین کر اللہ اور رسولؐ کی ملکیت قرار دیا جا رہا تھا، اس وقت ضعیف الایمان لوگوں میں تزلزل کا احتمال تھا۔ اس لیے انفال کا حکم مختصر لفظوں میں بیان فرمانے کے بعد فرمایا:

اگرتم مومن ہوتو :

i۔ اللہ سے ڈرو: فَاتَّقُوااللّٰہَ

ii۔ آپس میں صلح و آشتی قائم رکھو: وَاَصۡلِحُوۡاذَاتَ بَیۡنِکُمۡ

iii۔ اللہ اوراس کے رسولؐ کی اطاعت کرو:وَاَطِیۡعُوااللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗۤ

سچے مومن وہ ہیں :

iv۔ جن کے دل ذکر خدا کے موقع پر کانپ جاتے ہیں: اِذَاذُکِرَاللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ

v۔ کلام اللہ کی تلاوت سے ان کے ایمان میں اضافہ ہوجاتا ہے:زَادَتۡہُمۡ اِیۡمَانًا

vi۔ اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وَّعَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ

vii۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ

viii۔ راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ

آیئے ان اوصاف کی وضاحت کرتے ہیں:

i۔ خدا ترسی: اس کا مطلب ہے کہ اگرچہ ذات خدا ارحم الراحمین ہے۔ اس رحیم ذات سے خوف کی کوئی بات نہیں بلکہ اس خوف کا تعلق خود بندے کی ذات وعمل سے ہے کہ ایک طرف اللہ کی عظمت وجلالت ہے، دوسری طرف اس کا عدل و انصاف ہے، تیسری طرف بندے کی کوتاہیاں اور گناہ ہیں۔

ii۔ ایمان کے درجات ہیں۔ ادنیٰ درجہ ایمان حاصل کرنے سے کفر سے خارج ہوتا ہے۔ اس کے بعد مراحل ہیں۔ یہ انسان کے تعقل، غور وفکر، دلیل و برہان اور بحث وتحقیق کے ساتھ مربوط ہیں۔ روایت میں آیا ہے کہ اللہ نے قرآن میں تجلی فرمائی ہے۔ لہٰذا کلام خدا سے ان کے ایمان میں پختگی آ جاتی ہے۔ ایمان زیادہ ہونے سے مال ومتاع کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

iii۔ ایمان کے درجات اور کمال سے توکل اور بھروسہ مربوط ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان جتنا مضبوط ہوگا، اس کی ذات و صفات پر علم و یقین بڑھے گا، اتنا ہی اس ذات پر بھروسا اور توکل زیادہ ہوگا۔ مؤمن مال ومتاع سے زیادہ اللہ پر بھروسا کرتا ہے۔

iv۔ یہ بات بھی اپنی جگہ واضح ہے کہ اللہ کے وجود کا یقین آنے سے اس کی محبت دل میں زیادہ ہوتی، عبادت میں فروتنی آتی اور گناہ سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایمان کی آخری منزل پر فائز ہونے کے بعد عصمت کی منزل آ جاتی ہے۔

v۔ مؤمن مال و زر سے اتنا تعلق رکھتا ہے کہ اس سے اللہ کی رضایت حاصل ہوجائے: وَمِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مؤمن کے یہ تمام اوصاف اس اعلیٰ و ارفع مقصد کی طرف توجہ دلانے کے لیے بتائے جا رہے ہیں جس کے لیے یہ جنگ لڑی گئی تاکہ اسلامی افواج کے ذہنوں میں یہ الٰہی قدریں راسخ ہو جائیں اور ان کے مقابلے میں مال غنیمت حقیر نظر آنے لگے۔

اہم نکات

۱۔ ذکر وہ ہے جس سے دلوں میں لرزہ آئے اور مؤمن وہ ہے جو اس قسم کا ذکر کرے: اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ....

۲۔ مؤمن کا ایمان ارتقا پذیر ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ غور و فکر میں ہوتا ہے: زَادَتۡہُمۡ اِیۡمَانًا ....

اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا ؕ لَہُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ وَ مَغۡفِرَۃٌ وَّ رِزۡقٌ کَرِیۡمٌ ۚ﴿۴﴾

۴۔ یہی لوگ حقیقی مؤمن ہیں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس درجات ہیں اور مغفرت اور باعزت روزی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا: انسان مذکورہ اوصاف کا مالک ہو تو سچے مؤمن کی منزل پر فائز ہو کر قرب الٰہی کے اعلیٰ درجات پر فائز ہو جاتا ہے۔ حقیقی ایمان کی منزل پر فائز ہونے کے لیے مذکورہ اوصاف کی حقیقت سے متصف ہونا ضروری ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ بھی نہیں ہے کہ ان اوصاف سے جو متصف نہ ہو وہ سرے سے مؤمن ہی نہیں ہے۔ چنانچہ ذکر خدا سے دلوں کا کانپنا کامل مؤمن کی علامت ہے۔ نہیں کانپتا ہے تو کمال کی نفی ہوتی ہے، ایمان کی نہیں ہوتی۔ البتہ صرف اللہ کا ذکر کرنے سے کسی کا دل متنفر ہو جاتا ہے تو یہ نفی ایمان کی علامت ہے۔ فرمایا:

وَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَحۡدَہُ اشۡمَاَزَّتۡ قُلُوۡبُ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ ۔[۱]

اور جب صرف اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل متنفر ہو جاتے ہیں۔

۲۔ وَ مَغۡفِرَۃٌ: ایمان کے مذکورہ اوصاف سے متصف ہونے کے بعد انسان گناہوں سے مبرا نہیں ہوتا لیکن اللہ سچے مومن کے گناہوں سے درگزر، اس کی لغزشوں سے چشم پوشی فرماتا ہے اور اس کے نیک اعمال کا اجر و ثواب دیتا ہے۔

۳۔ وَّ رِزۡقٌ کَرِیۡمٌ: کریم کے معنی عظیم سے بھی کیے گئے ہیں۔ کریم الاخلاق اسے کہتے ہیں جس کے اخلاق قابل ستائش ہو۔

----
[۱] ۳۹ الزمر: ۴۵

اہم نکات

۱۔　　درجات اور مغفرت سچے مؤمن کے لیے ہے۔

كَمَآ اَخۡرَجَكَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَيۡتِكَ بِالۡحَقِّ ۪ وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لَكٰرِهُوۡنَ ۙ﴿۵﴾

۵۔ (انفال کے بارے میں صورت حال ویسے ہی ہے) جیسے آپ کے رب نے آپ کو حق کے ساتھ گھر سے (جنگ کے لیے) نکالا جب کہ (یہ امر) مومنوں کی ایک جماعت پر سخت گراں گزرا تھا۔

يُجَادِلُوۡنَكَ فِى الۡحَـقِّ بَعۡدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوۡنَ اِلَى الۡمَوۡتِ وَهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ ؕ﴿۶﴾

۶۔حق ظاہر ہو چکنے کے بعد یہ لوگ آپ سے الجھ رہے تھے گویا وہ سامنے نظر آنے والی موت کی طرف ہانکے جا رہے ہوں۔

بَيۡتِكَ:　　سے مراد مدینہ ہے۔

بِالۡحَقِّ:　　سے مراد بالوَحی۔ بعض حق سے مراد جہاد لیتے ہیں۔

تفسیر آیات

انفال کو اللہ اور رسولؐ کی ملکیت قرار دینا بعض لوگوں کو سخت ناگوار تھا۔ اسی طرح جنگ بدر کے موقع پر لشکر قریش کے مقابلے پر جانا سخت ناگوار گزرا اور اسے خودکشی تصور کرتے تھے لیکن دونوں جگہ حق کا تقاضا یہ تھا کہ خطرے کا مقابلہ کیا جائے اور مال غنیمت اللہ اور رسولؐ کے لیے چھوڑ دیا جائے۔

يُجَادِلُوۡنَكَ فِى الۡحَـقِّ بَعۡدَ مَا تَبَيَّنَ: وہ اس حق کے بارے میں آپؐ سے الجھ رہے تھے جب کہ حق ان پر ظاہر ہو چکا تھا کہ یہ حکم خدا ہے اور آپؐ سچے ہیں۔

اس آیت میں نہایت شدید ترین لہجے میں ان لوگوں کی سرزنش فرمائی جو جنگ میں شرکت کے حق میں نہ تھے اور اللہ کی طرف سے وعدہ فتح کے باوجود رسول اللہؐ سے مجادلہ کرتے تھے۔ اگر یہ مجادلہ وعدہ فتح سے پہلے ہوتا تو کسی حد تک قابل فہم تھا، چونکہ سرزنش و عتاب کا جو لہجہ یہاں اختیار کیا گیا ہے، وہ ایسا ہے جیسا مشرکین کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا بعض علماء نے تو یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ یہ آیت مشرکین کے بارے میں ہے۔

صاحب المنار لکھتے ہیں:

یہ مشرکین ہی کے لیے سزاوار ہے۔

لیکن بعد میں دلیل دیتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے بارے میں ہی ہے۔ چونکہ آیت میں مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کی صراحت موجود ہے۔

واقعہ یہ تھا کہ قریش کا ایک بڑا تجارتی قافلہ شام سے مکہ واپس جاتے ہوئے مدینہ کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اس قافلے کے سردار ابوسفیان کو خطرہ تھا کہ مسلمانوں کا کوئی دستہ ان پر حملہ نہ کر دے۔ چنانچہ اس نے مکہ کی طرف ایک آدمی کو روانہ کر دیا کہ وہاں سے مدد لے آئے۔ چنانچہ قریش مکہ نہ صرف اپنے قافلے کو بچانے کے لیے بلکہ مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کی نیت سے نکلے۔ مدینے سے نکلتے وقت مسلمانوں کو یہ علم نہ تھا کہ ان کا سامنا تجارتی قافلے سے ہو گا، جس کے صرف چالیس محافظ تھے یا لشکر قریش سے ہو گا۔ اس وقت اللہ کی طرف سے یہ نوید نازل ہوئی:

وَاِذۡ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحۡدَی الطَّآئِفَتَیۡنِ اَنَّہَا لَکُمۡ ....[1]	اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ تم لوگوں سے وعدہ فرما رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک تمہارے ہاتھ آ جائے گا...

اس الٰہی نوید کے باوجود جب رسول اللہؐ نے قافلے کی بجائے لشکر قریش سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تو (قرآنی تعبیر کے مطابق) ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ سامنے نظر آنے والی موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں۔ اس موقع پر بعض اہل قلم نے خوب لکھا ہے:

> اس لیے چند سرفروش فدائیوں کے سوا اکثر لوگ جو اس خطرناک مہم میں شریک تھے، دلوں میں سہم رہے تھے اور انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جانتے بوجھتے موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ مصلحت پرست لوگ جو اگرچہ دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے، مگر ایسے ایمان کے قائل نہ تھے جس میں جان و مال کا زیاں ہو، اس مہم کو دیوانگی سے تعبیر کر رہے تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ دینی جذبے نے ان لوگوں کو پاگل بنا دیا ہے۔[2]

اہم نکات

۱۔ پیغمبر اسلامؐ کی جنگی حکمت عملی سے ایک ہزار کے مقابلے میں صرف ۳۱۳ پر مشتمل کمزور لشکر نے فتح حاصل کی اور ان میں سے بہت سے لوگوں کا یہ حال تھا:

الف: جنگ سے کراہت کر رہے تھے: وَاِنَّ فَرِیۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ لَکٰرِہُوۡنَ ....

ب: اللہ کی طرف سے نوید فتح کے بعد بھی رسول اللہؐ سے الجھ رہے تھے: یُجَادِلُوۡنَکَ فِی الۡحَقِّ ....

ج: ان کو فتح کی کوئی امید نہ تھی بلکہ ان کو موت نظر آ رہی تھی: کَاَنَّمَا یُسَاقُوۡنَ اِلَی الۡمَوۡتِ ....

---

[1] ۸ انفال: ۷ [2] تفہیم القرآن ۲: ۱۲۶

وَ اِذۡ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحۡدَی الطَّآئِفَتَیۡنِ اَنَّہَا لَکُمۡ وَ تَوَدُّوۡنَ اَنَّ غَیۡرَ ذَاتِ الشَّوۡکَۃِ تَکُوۡنُ لَکُمۡ وَ یُرِیۡدُ اللّٰہُ اَنۡ یُّحِقَّ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَ یَقۡطَعَ دَابِرَ الۡکٰفِرِیۡنَ ۙ﴿۷﴾	۷۔اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ تم لوگوں سے وعدہ فرما رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک تمہارے ہاتھ آ جائے گا اور تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہارے ہاتھ آ جائے جب کہ اللہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنے فرامین (وعدہ) کے ذریعے ثبات بخشے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے
لِیُحِقَّ الۡحَقَّ وَ یُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۚ﴿۸﴾	۸۔ تاکہ حق کو ثبات مل جائے اور باطل نابود ہو جائے خواہ مجرموں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔

تشریح کلمات

الشَّوۡکَۃِ: (ش و ك) الشوك اصل میں یہ لفظ کانٹے کے معنی میں ہے لیکن یہ طاقت اور اسلحہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اِذۡ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحۡدَی: اللہ کی طرف سے یہ اجمالی وعدہ تھا کہ تجارتی قافلے اور مسلح لشکر میں سے ایک تمہارے ہاتھ آئے گا۔ مسلمان تجارتی قافلہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے اور رسول اللہؐ مسلح لشکر کا رخ کرنا چاہتے تھے۔

۲۔ وَ یُرِیۡدُ اللّٰہُ: اللہ کی منشا یہ تھی کہ اس مرحلے میں حق کو ثبات ملے۔

۳۔ بِکَلِمٰتِہٖ: یہاں کلمات سے مراد، وعدہ ہائے نصرت ہو سکتے ہیں۔ جیسے فرمایا:

وَ لَقَدۡ سَبَقَتۡ کَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿ۚۖ﴾ اِنَّہُمۡ لَہُمُ الۡمَنۡصُوۡرُوۡنَ ﴿۪﴾ وَ اِنَّ جُنۡدَنَا لَہُمُ الۡغٰلِبُوۡنَ ﴿﴾[1]	اور بتحقیق ہمارے بندگان مرسل سے ہمارا یہ وعدہ ہو چکا ہے۔ یقیناً وہ مدد کیے جانے والے ہیں، اور یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب آ کر رہے گا۔

۴۔ وَ یَقۡطَعَ دَابِرَ الۡکٰفِرِیۡنَ: اور کافروں کی جڑ کٹ جائے۔ چنانچہ جنگ بدر کے بعد ابوجہل جیسے کفر کی جڑیں کٹ گئیں۔

اس آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ ایک فیصلہ کن جنگ تھی جس میں یہ فیصلہ ہونا تھا کہ اسلام اور جاہلیت میں سے کس نے زندہ رہنا ہے۔ حق اور باطل میں سے کس کو ثبات ملنا ہے اور کس نے مٹ جانا ہے۔ اس میں لوگوں کی خواہش اور اللہ کے ارادے میں نمایاں فرق بتایا گیا ہے کہ لوگ قافلے پر حملہ

[1] ۳۷ صافات: ۱۷۱ تا ۱۷۳

کرنا چاہتے تھے جہاں مال و متاع ہے اور خطرہ جان بھی نہیں ہے لیکن عاقبت کے اعتبار سے یہ فیصلہ کن اقدام نہ ہوتا اور لوگ مال و دولت کے لالچ میں آ کر اصل مقصد سے دور نکل جاتے جیسا کہ احد کی جنگ میں دیکھنے میں آیا اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اس موقع پر حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے اور یہ لشکر کا مقابلہ کرنے میں ہے۔ جیسا کہ بعد کے حالات نے بتایا۔

اہم نکات

۱۔ اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے سہل طلبی درست نہیں ہے: وَتَوَدُّوۡنَ اَنَّ غَیۡرَ ذَاتِ الشَّوۡکَۃِ تَکُوۡنُ لَکُمۡ ....

اِذۡ تَسۡتَغِیۡثُوۡنَ رَبَّکُمۡ فَاسۡتَجَابَ لَکُمۡ اَنِّیۡ مُمِدُّکُمۡ بِاَلۡفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ مُرۡدِفِیۡنَ ﴿۹﴾

۹۔ (یاد کرو) جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری سن لی اور فرمایا: میں یکے بعد دیگرے آنے والے ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا۔

تشریح کلمات

تَسۡتَغِیۡثُوۡنَ: (غ و ث) الغوث کے معنی مدد طلب کرنے کے ہیں۔

مُرۡدِفِیۡنَ: (ر د ف) الردف۔ تابع یعنی ہر وہ چیز جو دوسرے کے پیچھے ہو۔

تفسیر آیات

مشرکین کی کثرت اور مسلمانوں کی قلت دیکھ کر حضورؐ نے اللہ کی بارگاہ میں دعا فرمائی:

اللّٰھم انجزلی ما وعدتنی اللّٰھم ان تھلك ھذہ العصابۃ لا تعبد فی الارض.[1]

اے اللہ! جس فتح و نصرت کا تو نے وعدہ فرمایا ہے، اسے پورا فرما۔ اگر یہ گروہ نابود ہو جائے تو روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔

فَاسۡتَجَابَ لَکُمۡ: حضورؐ کی دعا کے ان جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جنگ موت و حیات کی جنگ تھی۔ چنانچہ ایک ہزار فرشتے مدد کے لیے بھیجے گئے۔ ان فرشتوں کی شرکت کی نوعیت کیا تھی، وہ اگلی آیتوں میں بتایا جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہر مشکل حالت میں اللہ کی بارگاہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے: اِذۡ تَسۡتَغِیۡثُوۡنَ رَبَّکُمۡ ....

----

[1] مجمع البیان

وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشۡرٰی وَ لِتَطۡمَئِنَّ بِهٖ قُلُوۡبُكُمۡ ۚ وَ مَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۝۱۰

۱۰۔اور اس مدد کو اللہ نے بس تمہارے لیے بشارت اور اطمینان قلب کا باعث بنایا اور (یہ باور کرایا کہ) نصرت تو صرف اللہ کی جانب سے ہے، بے شک اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ: اس آیت سے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے کہ فرشتوں کی شرکت کی نوعیت روحانی تقویت دینا اور مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس نکال کر ان کو حوصلہ دلانا تھی۔ ورنہ کفر کے لشکر کو تباہ کرنے کے لیے صرف ایک فرشتہ کافی تھا۔ جیسا کہ قوم لوط کی ہلاکت صرف جبرائیل سے ہوگئی تھی۔

۲۔ وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ: فتح نصرت کا اصل سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ خواہ فرشتوں کے ذریعے یا دیگر ذرائع سے۔

اہم نکات

۱۔ ظاہری اسباب و وسائل ذریعہ ہیں، واقعی نصرت اللہ کی طرف سے ملتی ہے: وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ۔

۲۔ فرشتوں کا نزول اطمینان کا سبب بنا، جس سے فتح نصیب ہوئی: وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشۡرٰی وَ لِتَطۡمَئِنَّ بِهٖ قُلُوۡبُكُمۡ ....

۳۔ کسی ہدف میں کامیابی کے لیے مادی وسائل سے زیادہ معنوی اور نفسیاتی قوت و طاقت زیادہ اہم ہے۔

اِذۡ يُغَشِّيۡكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنۡهُ وَ يُنَزِّلُ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمۡ بِهٖ وَ يُذۡهِبَ عَنۡكُمۡ رِجۡزَ الشَّيۡطٰنِ وَ لِيَرۡبِطَ عَلٰى قُلُوۡبِكُمۡ وَ يُثَبِّتَ بِهِ الۡاَقۡدَامَ ۝۱۱

۱۱۔ (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ امن دینے کے لیے تم پر غنودگی طاری کر رہا تھا اور آسمان سے تمہارے لیے پانی برسا رہا تھا تاکہ اس سے تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطانی نجاست دور کرے اور تمہارے دلوں کو مضبوط بنائے اور تمہارے قدم جمائے رکھے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذۡ یُغَشِّیۡکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَۃً مِّنۡہُ: اپنے سے کئی گنا بڑے لشکر کا مقابلہ ہے اور امن وسکون کی نیند سو رہے ہیں۔ اَمَنَۃً مِّنۡہُ: اگر مِنۃُ کی ضمیر دشمن کی طرف ہے تو دشمن سے امن مراد ہے اور اگر مِنۃُ کی ضمیر اللہ کی طرف ہے تو اللہ کی طرف سے امن مراد ہے۔

انتہائی نامساعد حالات میں جنگ لڑی جا رہی ہے اور اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقتور دشمن سے مقابلہ ہے، اس کے باوجود اللہ کی طرف سے یہ تائید تھی کہ لشکر اسلام امن وسکون سے سو رہا تھا۔

۲۔ وَیُنَزِّلُ عَلَیۡکُمۡ: جس صبح کو جنگ بدر ہونا تھی، اس رات بارش ہوئی۔ اس سے مسلمانوں کو کئی ایک فائدے ہوئے۔

۳۔ لِّیُطَہِّرَکُمۡ: ایک یہ کہ مشرکین، بدر کے پانی پر پہلے قابض ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے پاس پانی نہ تھا، بارش سے پانی میسر آیا۔

۴۔ وَلِیَرۡبِطَ: دوسرا یہ کہ بارش سے سکون اور دلوں کی مضبوطی آئی چونکہ نہا دھو کر انسان میں خود اعتمادی آ جاتی ہے اور تعفن سے بیزاری آتی ہے۔

۵۔ وَیُثَبِّتَ بِہِ الۡاَقۡدَامَ: تیسرا یہ کہ بارش سے ریت جم گئی، زمین مضبوط ہو گئی اور قدم جم گئے۔ ورنہ بارش سے پہلے ریت پر چلنا پھرنا مشکل ہو رہا تھا۔ چوتھا یہ کہ دشمن نشیبی علاقے میں تھا، اس لیے بارش سے کیچڑ ہو گیا اور دشمن کے لیے چلنا مشکل ہو گیا۔

اہم نکات

۱۔ جنگ جیتنے کے لیے انسان کے اپنے اندر امن ہونا ضروری ہے: اِذۡ یُغَشِّیۡکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَۃً۔

۲۔ وسوسوں سے پاک، مضبوط دل چاہیے۔

۳۔ ثبات قدم کی ضرورت ہے۔

۴۔ میدان جنگ میں موجود ظاہری موانع کو بھی دور کرنا چاہیے۔

اِذۡ یُوۡحِیۡ رَبُّکَ اِلَی الۡمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیۡ مَعَکُمۡ فَثَبِّتُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ سَاُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الرُّعۡبَ فَاضۡرِبُوۡا فَوۡقَ الۡاَعۡنَاقِ

۱۲۔ (وہ وقت بھی یاد کرو) جب آپ کا رب فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ تم ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو میں تمہارے ساتھ ہوں عنقریب میں کافروں کے دلوں میں رعب ڈالوں گا، لہٰذا تم ان کی گردنوں کے اوپر ضرب لگاؤ اور ان

وَاضۡرِبُوۡا مِنۡہُمۡ کُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾ کے ہاتھ اور پاؤں کے پوروں پر وار کرو۔

تشریح کلمات

بَنَانٍ: (ب ن ن) پورے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذۡ یُوۡحِیۡ رَبُّکَ: فرشتوں کو وحی کی کہ تم ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو۔ یہ کام فرشتوں کے ذمے لگایا۔

۲۔ اَنِّیۡ مَعَکُمۡ: مؤمنوں کو ثابت قدمی دینے کے لیے فرشتوں کو اللہ کی معیت کی ضرورت ہے۔

۳۔ سَاُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الرُّعۡبَ: کافروں کے دلوں میں رعب ڈالنا اور ان کو خوف و ہراس میں مبتلا کرنا اللہ نے اپنے ذمے لیا۔ چنانچہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ کفار کے دلوں میں ایک عجیب قسم کا خوف، وحشت طاری تھی۔ مسلمانوں میں قربانی کے جذبات، ان کے شجاعانہ نعرے، عاتکہ کا خواب، طوفانی باد و باران، مکہ میں مسلمانوں کی استقامت کی داستانیں، یہ سب باتیں ان کے دلوں میں رعب و وحشت ڈالنے کا باعث بنیں۔

۴۔ فَاضۡرِبُوۡا فَوۡقَ الۡاَعۡنَاقِ: اس کے بعد رخ کلام مؤمنین کی طرف ہو جاتا ہے۔ اگرچہ سیاق کلام فرشتوں کے ساتھ ہے تاہم ثابت قدمی مسلمانوں کی طرف اور رعب و وحشت کافروں کی طرف، ایسے سازگار حالات تھے جس میں گردنوں پر ضرب اور ہاتھوں پر چوٹ لگانے کا بہترین موقع میسر آیا۔ اس لیے یہ خطاب مؤمنین کے لیے ہوسکتا ہے۔

۵۔ وَاضۡرِبُوۡا مِنۡہُمۡ کُلَّ بَنَانٍ: یعنی جسم کے اطراف کو نشانہ بناؤ۔ واضح رہے ہاتھوں اور پاؤں کے زخمی ہونے کی صورت میں انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ حرکت و جنبش کے لیے پاؤں اور حملہ کرنے کے لیے ہاتھوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جب یہ دونوں زخمی حالت میں ہوں تو دشمن بے بس ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ثبات قدم کے لیے ایمان شرط ہے: فَثَبِّتُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ....

ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ شَآقُّوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ ۚ وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ فَاِنَّ ۱۳۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ اور اس کے رسول کی

اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۱۳﴾
ذٰلِکُمۡ فَذُوۡقُوۡہُ وَ اَنَّ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

مخالفت کرے تو اللہ یقیناً سخت عذاب دینے والا ہے۔
۱۴۔ یہ ہے تمہاری سزا پس اسے چکھو اور بتحقیق کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔

تفسیر آیات

کفار قریش کا ایک قلیل جماعت کے ہاتھوں شکست کھانا نہایت ذلت و خواری ہے۔ اس لشکر کو دیکھ کر ابو جہل نے کہا تھا: یہ تو ایک وقت کا کھانا ہے۔ اگر ہم اپنے غلاموں کو روانہ کر دیں تو وہ ان کو ہاتھ سے پکڑ لائیں۔ یہ ننگ و ذلت ان کو دنیا میں ملی اور آخرت میں تو ابدی اور دائمی عذاب ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا لَقِیۡتُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا زَحۡفًا فَلَا تُوَلُّوۡہُمُ الۡاَدۡبَارَ ﴿ۚ۱۵﴾

۱۵۔ اے ایمان والو! جب میدان جنگ میں کافروں سے تمہارا سامنا ہو جائے تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا۔

وَ مَنۡ یُّوَلِّہِمۡ یَوۡمَئِذٍ دُبُرَہٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوۡ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ فَقَدۡ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ مَاۡوٰىہُ جَہَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ اور جس نے اس روز پیٹھ پھیری مگر یہ کہ جنگی چال کے طور پر ہو یا کسی فوجی دستے سے جا ملنے کے لیے تو وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا اور بہت بری جگہ ہے۔

تشریح کلمات

زَحۡفًا: (ز ح ف) زحف۔ اصل میں چھوٹے بچوں کے پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چلنے کے معنوں میں ہے۔ لشکر بھی ہجوم کی وجہ سے آہستہ گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتا ہے۔

مُتَحَرِّفًا: التحریف (ح ر ف) کنارہ کشی کرنا۔ ایک طرف ہٹ کر کمین گاہ میں بیٹھنا۔

مُتَحَیِّزًا: حیز (ح ی ز) جگہ بنانا۔ ٹھکانا تلاش کرنا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَا تُوَلُّوۡہُمُ الۡاَدۡبَارَ: جنگ کے میدان سے اپنی جان بچانے کے لیے فرار ہونا، دنیا کے حربی

قانون میں بہت بڑا جرم ہے۔ اسلامی جنگوں میں دو خصوصیات اور ہوتی ہیں جو باقی جنگوں میں نہیں ہے:

اول یہ کہ اسلامی جنگیں دفاعی ہوتی ہیں، جارحانہ نہیں ہوتیں۔ لہٰذا ایسی جنگ سے فرار ہونا دفاع وطن، دفاع ناموس اور دفاع مذہب یعنی اللہ کو پشت دکھانے کے مترادف ہوتا ہے۔

دوسری یہ کہ اسلامی جنگیں نظریاتی ہوتی ہیں، جس کے تحت مؤمن اِحدی الحُسنیَیْن دونیکیوں میں سے ایک، فتح یا شہادت کا متمنی ہوتا ہے۔ یہ دونوں قابل رشک ہیں۔ فرار کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ان چیزوں پر اس کا ایمان نہیں ہے۔ اس کا فتح سے سروکار ہے نہ شہادت سے کوئی مطلب ہے۔ اس لیے میدان جنگ سے فرار ہونے والا اللہ کے غضب اور جہنم کا سزاوار ہے۔ دو صورتیں فرار کی جائز ہیں جو بظاہر فرار ہے، حقیقتاً فرار نہیں ہے اور وہ یہ ہیں:

الف: پہلی صورت: مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ جنگی چال اور حربی حکمت عملی کے طور پر وقتی پسپائی اختیار کرنا۔ تاکہ دشمن کو نرغے میں لیا جا سکے۔

ب: دوسری صورت میں مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ: فوجی دستے سے جا ملنے کے لیے اگر لڑنے والے منتشر ہو جائیں تو اپنے دستے سے جا ملنے کے لیے واپس آنا فرار نہیں ہے۔ یہ دونوں جنگی حکمت عملی کا حصہ ہیں۔

نہایت ناانصافی کرتے ہیں وہ لوگ جو فرار از جنگ کی حرمت کو صرف جنگ بدر کے ساتھ مخصوص گردانتے ہیں اور اس آیت میں يَوْمَئِذٍ سے مراد یوم الزحف ہے، نہ یوم بدر۔ کیونکہ جنگ بدر میں اول تو کسی نے فرار نہیں کیا۔ ثانیاً یہ سورہ جنگ بدر کے بعد نازل ہوا۔ ثالثاً اعتبار لفظ کے عموم کا کیا جاتا ہے، نہ سبب کے خصوص کا۔ رابعاً احادیث بھی ہمارے موقف کی تائید میں ہیں۔

رسول کریمؐ سے روایت ہے کہ تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کے ساتھ نیکی کا کوئی فائدہ نہیں: ایک شرک، دوسرا والدین کا حق ادا نہ کرنا اور تیسرا جہاد فی سبیل اللّٰہ سے فرار۔

دیگر احادیث میں فرار از جنگ سات ایسے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے جن کا ارتکاب کرنے والا تباہ و ہلاک ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو وسائل الشیعہ۔ ۱۵: ۳۳۰۔ صحیح بخاری کتاب الوصایا۔

اہم نکات

۱۔ اسلامی نظریاتی دفاعی جہاد میں میدان جنگ سے فرار گناہ ہے: فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ....

۲۔ حربی حکمت عملی کے تحت وقتی طور پر پسپائی جائز ہے: اِلَّا مُتَحَرِّفًا ....

۳۔ اسلامی جہاد سے فرار انسان کو جہنمی بناتا ہے: فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ....

۴۔ یہ حکم ایک قانون کلی ہے، بدر سے مختص نہیں۔

فَلَمۡ تَقۡتُلُوۡهُمۡ وَ لٰکِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمۡ ۪ وَ مَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰهَ رَمٰی ۚ وَ لِیُبۡلِیَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۷﴾	۱۷۔ پس انہیں تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا اور (اے رسول) جب آپ کنکریاں پھینک رہے تھے اس وقت آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے کنکریاں پھینکی تھیں تاکہ اپنی طرف سے مؤمنین کو بہتر آزمائش سے گزارے، بے شک اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔
ذٰلِکُمۡ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوۡهِنُ کَیۡدِ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۸﴾	۱۸۔ یہ تھی تمہاری بات اور رہی کافروں کی بات تو اللہ ان کی مکاری کا زور توڑ دینے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَمۡ تَقۡتُلُوۡهُمۡ: ربط کلام اس طرح ہے کہ تم میدان جنگ سے فرار نہ کرو۔ تم کو کافروں سے زیادہ استقامت دکھانی چاہیے کیونکہ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہے، جس نے تمہارے اطمینان قلب اور ثابت قدمی کے اسباب فراہم کیے۔ اس طرح ایک بے سہارا چھوٹے سے لشکر نے بہت بڑی طاقت کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا ہے تو یہ تمہاری قوت بازو سے نہیں، اللہ کی طرف سے ہے۔ لہٰذا جن کافروں کو تم نے قتل کیا ہے ان کو درحقیقت اللہ نے قتل کیا ہے۔

الواقدی متوفی ۲۰۷ھ نے اپنی کتاب المغازی ۱: ۶۸ میں لکھا ہے۔ خلاصہ یہ ہے:

لشکر قریش سے عتبہ، شیبہ اور ولید آگے بڑھے اور مبارزہ طلب کیا تو انصار کے تین جواں مقابلے میں نکلے تو رسول اللہؐ نے شرمساری کا اظہار کیا اور اس بات کو ناپسند فرمایا کہ مشرکین کے ساتھ پہلی لڑائی میں انصار کو آگے کیا جائے بلکہ اپنے قوم کے افراد کو آگے کرنا پسند فرمایا۔ مشرکین نے بھی پکارا: اے محمد ہماری اپنی قوم سے ہمارے مدمقابل کے لوگ آگے آئیں۔ تو رسول اللہؐ نے بنی ہاشم کے افراد کو حکم دیا: مقابلے کے لیے نکلو۔ چنانچہ حمزہ بن عبد المطلب۔ علی بن ابی طالب، عبیدہ بن حارث بن عبد المطلب نکلے۔ عتبہ نے اپنے بیٹے ولید سے کہا اٹھو لڑو۔ اس کے مقابلے میں علی (علیہ السلام) اٹھے جو سب سے عمر میں چھوٹے تھے اور ولید کو قتل کیا۔ پھر عتبہ خود آگے آیا تو حمزہ مقابلے میں آئے اور عتبہ کو قتل کیا۔ پھر شیبہ آگے آیا۔ اس کے مقابلے میں عبیدہ بن حارث آئے۔ شیبہ نے عبیدہ کے پاؤں پر وار کیا تو حمزہ اور علی نے مل کر اس پر حملہ کیا اور اسے قتل کیا۔

۲۔ وَمَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی: روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا:

ناولنی کفا من حصباء فناولہ[1] مجھے مٹھی بھر کنکریاں دے دو۔ حضرت علیؑ نے دے دیں.

حضورؐ نے یہ کنکریاں دشمن کی طرف پھینکیں تو سب کی آنکھوں میں ریزے بھر گئے۔[2]

اسلامی افواج نے دشمنوں کا جو قتل کیا ہے اس کی نفی فرما کر یہ نہیں فرمایا: اذ قتلتم جب کہ رسول کریمؐ نے جو کنکریاں پھینکیں، اس کے بارے میں فرمایا: اِذۡ رَمَیۡتَ۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ افواج کے قتل کی صرف نفی فرمائی اور اثبات نہیں فرمایا، جب کہ رسول کریمؐ کے عمل کا اثبات بھی فرمایا۔ اس قرآنی تعبیر سے عمل افواج اور عمل رسولؐ میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ ممکن ہے اس میں یہ نکتہ پنہاں ہو کہ اگرچہ قتل اللہ نے کیا اور کنکریاں بھی اللہ نے پھینکیں لیکن یہاں قتل میں افواج اسلام اور کنکریاں پھینکنے میں رسول اسلامؐ ذریعہ ہیں مگر قتل کا ذریعہ قابل اثبات نہیں اور عمل رسول (ص) کو عمل خدا کے ساتھ مؤثر قرار دیا ہے۔ و اللّٰہ اعلم بالصواب۔ اس طرح عمل رسول (ص) عمل خدا قرار پایا۔

۳۔ وَلِیُبۡلِیَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡہُ بَلَآءً حَسَنًا: تاکہ اللہ کی طرف سے مؤمنین کی بہتر آزمائش ہو جائے۔ نہایت نامساعد حالات میں اپنے سے کئی گنا طاقتور دشمن کے خلاف جنگ میں جھونک دینا بہت بڑی آزمائش ہے۔ ہوسکتا ہے غنیمت میں اختلاف ایک آزمائش ہو نیز ممکن ہے بہتر آزمائش سے مراد فتح ہو کہ بدر کی فتح سے مؤمنین کی آزمائش بھی مقصود تھی۔ کیا وہ اس سے غرور میں آتے ہیں اور اسے اپنا کارنامہ قرار دیتے ہیں یا اسے اللہ کی طرف سے عنایت تصور کرتے ہیں۔

۴۔ ذٰلِکُمۡ وَاَنَّ اللّٰہَ مُوۡہِنُ کَیۡدِ الۡکٰفِرِیۡنَ: چونکہ اللہ کا وعدہ ہے کہ کافر کی مؤمن پر بالادستی نہ ہو گی۔ کافروں کی ہر مکاری کا زور توڑ دیا جائے گا۔ اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ کافر کے مقابلے میں مؤمن ہو۔

اہم نکات

۱۔ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی سچے ایمان اور اللہ کی نصرت کی وجہ سے ہوئی: فَلَمۡ تَقۡتُلُوۡہُمۡ..

۲۔ رسول اللہؐ کا عمل، اللہ کا عمل ہے: مَا رَمَیۡتَ ....

۳۔ اللہ مؤمنین سے جو بھی امتحان لے، وہ بہترین آزمائش ہوتی ہے: وَلِیُبۡلِیَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ....

۴۔ کفار کی سازشوں کو اللہ ناکام بناتا ہے بشرطیکہ ہم سچے مؤمن ہوں: وَاَنَّ اللّٰہَ مُوۡہِنُ ....

اِنۡ تَسۡتَفۡتِحُوۡا فَقَدۡ جَآءَکُمُ ۱۹۔ (کافروں سے کہدو کہ) اگر تم فیصلہ چاہتے

---

[1] بحار الانوار ۹۱: ۳۲۴ [2] تفسیر البرھان۔ تفسیر روح المعانی ۹: ۱۸۴

الْفَتْحُ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾

ہوتو فیصلہ تمہارے سامنے آ گیا، اب اگر تم باز آ جاؤ تو تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم نے (اس جرم کا) اعادہ کیا تو ہم بھی (اس سزا کا) اعادہ کریں گے اور تمہاری جماعت کثیر ہو بھی تو تمہارے کسی کام نہ آئے گی اور اللہ مؤمنوں کے ساتھ ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنۡ تَسۡتَفۡتِحُوۡا: روایت میں آیا ہے کہ ابوجہل نے جنگ بدر کے موقع پر یہ دعا کی تھی: اے اللہ! ہمارے قدیم دین اور محمدؐ کے جدید دین میں سے جس سے تجھے محبت ہے اور جس کو تو پسند کرتا ہے، اس کے ماننے والوں کو نصرت عطا فرما۔[1] چنانچہ اللہ نے اپنے پسندیدہ دین کی نصرت فرمائی اور مستقبل میں مؤمنوں کے لیے دائمی فتح اور کافروں کے لیے دائمی شکست کی نوید بھی سنائی۔

۲۔ وَاِنۡ تَنۡتَهُوۡا: اس فیصلے کے سننے کے بعد اگر تم باز آ جاؤ تو اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ دوبارہ شکست و خواری کا منہ دیکھنا نہیں پڑے گا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جنگیں کفار کی طرف سے جارحانہ عزائم کی وجہ سے لڑی جا رہی ہیں۔

۳۔ وَاِنۡ تَعُوۡدُوۡا نَعُدۡ: اگر تم نے پھر جنگ کرنے میں پہل کی تو ہم بھی جواب دیں گے۔ آیت کے اس جملے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اس وقت تک کسی سے جنگ نہیں کرتا جب تک دشمن نے پہل نہیں کی یا جنگ کرنے کے لیے تیاری شروع نہ کرے۔

اہم نکات

۱۔ ناحق کو کثرت فائدہ نہیں دیتی: وَلَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡکُمۡ فِئَتُکُمۡ شَیۡـًٔا وَّلَوۡ کَثُرَتۡ ...۔

۲۔ جہاں جرم ہوگا، زود یا بہ دیر اس کا مکافات عمل ضرور ملے گا: وَاِنۡ تَعُوۡدُوۡا نَعُدۡ ...۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور تم (حکم) سننے کے بعد اس سے روگردانی نہ کرو۔

---

[1] مجمع البیان

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾

۲۱۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے یہ تو کہدیا کہ ہم نے سن لیا مگر درحقیقت وہ سنتے نہ تھے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: کافروں کو ان کے انجام بد کی خبر دینے کے بعد مؤمنین سے خطاب فرمایا: اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو۔

۲۔ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ: اس کے بعد خصوصی طور پر فرمایا: رسولؐ کے حکم سے روگردانی نہ کرو۔ یہاں اگرچہ تعبیر عام ہے مگر گفتگو جنگ سے مربوط ہے، لہٰذا بحیثیت سپہ سالار اعظم رسولؐ کی حکم عدولی ناقابل عفو جرم ہو گا.

۳۔ وَلَا تَكُوْنُوْا: یعنی ان منافقین یا ان کافروں کی طرح نہ ہونا جو کہتے ہیں ہم نے محمد کا کلام سن کر رد کیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ انہوں نے سنے بغیر رد کیا ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ یقیناً اللہ کے نزدیک تمام جانداروں میں بدترین وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

۲۳۔ اور اگر اللہ ان میں بھلائی (کا مادہ) دیکھ لیتا تو انہیں سننے کی توفیق دیتا اور اگر انہیں سنوا دیتا تو وہ بے رخی کرتے ہوئے منہ پھیر لیتے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ: یہاں کافروں کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ تمام جانداروں میں بدتر وہ لوگ ہیں جو عقل و شعور کے باوجود عقل سے کام نہیں لیتے۔

۲۔ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ: اس کی وجہ یہ بتائی کہ ان میں خیر کی استعداد اور قبول حق کے لیے کسی قسم کی صلاحیت و آمادگی نہیں ہے۔ اگر ان میں کسی قسم کی خوبی ہوتی (خَيْرًا) تو اللہ ضرور اس کو سنوا دیتا (لَّاَسْمَعَهُمْ) لیکن ان میں کلام حق سننے کے لیے آمادگی نہ ہونے کے باوجود ان کو سنوا دیا جائے تو وہ حق سے منہ پھیر لیں گے: لَتَوَلَّوْا....

اہم نکات

۱۔ مؤمن کے لیے توفیق، رحمت کا باعث اور کافر کے لیے اتمام حجت ہوتی ہے: وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ

لتَوَلَّوْا ....

۲۔ جن لوگوں میں خوبی کا مادہ نہیں ہوتا ان کو اللہ اپنی حالت پر چھوڑ دیتا ہے: لَوۡ عَلِمَ اللّٰہُ فِیۡہِمۡ خَیۡرًا.

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ ۚ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یَحُوۡلُ بَیۡنَ الۡمَرۡءِ وَ قَلۡبِہٖ وَ اَنَّہٗۤ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ﴿۲۴﴾	۲۴۔ اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہو جب وہ تمہیں حیات آفرین باتوں کی طرف بلائیں اور جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور یہ بھی کہ تم سب اسی کی طرف جمع کیے جاؤ گے۔

تفسیر آیات

۱۔ اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰہِ: اسلامی تعلیمات ایک جامع دستور حیات ہی نہیں بلکہ اس دستور میں حیات ہے۔ دنیوی حیات، اخروی حیات، اقدار کی حیات، اخلاق کی حیات، ابدی حیات، ہر قسم اور ہر نوع کی حیات، غرض ہمہ گیر اور کامل ترین حیات، دعوت رسولؐ میں مضمر ہے۔ رسول اسلامؐ کی دعوت کا ہر لفظ، ہر جملہ، ہر حرف، حیات ابدی کے لیے زندہ خلیوں کی مانند ہے جن سے ایک زندہ اور فعال وجود سامنے آتا ہے۔

حیات کے مقابلہ میں ہلاکت اور موت ہے:

لِّیَہۡلِکَ مَنۡ ہَلَکَ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ وَّ یَحۡیٰی مَنۡ حَیَّ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ ...[1]	ہلاک ہونے والا واضح دلیل کے بعد ہلاک ہو اور زندہ رہنے والا واضح دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔

لہٰذا اسلامی دعوت حیات آفرین دعوت ہے، جس کے مقابلے میں ہلاکت اور موت ہے۔

زندگی اور موت دونوں کے اپنے اپنے آثار ہیں۔ مثلاً جو چیز فاقد حیات ہے، اس کا اپنا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ وہ ہوا اور پانی کی لہروں کو چیر کر اپنے لیے راستے کا تعین نہیں کر سکتی بلکہ وہ ان لہروں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ حیات اپنی بقا کے لیے مدد و معاون چیزوں کا انتخاب کر لیتی ہے۔ لہٰذا حیات اور اس کے آثار کو سمجھنے کے لیے ہم موت کے ساتھ اس کا تقابل کرتے ہیں:

i۔ موت جمود ہے، حیات متحرک ہے۔

ii۔ موت ظلمت ہے اور حیات نور ہے۔

iii۔ موت بے استقلالی ہے، حیات استقلال ہے۔

iv۔ موت بے ارادہ ہے، حیات ارادہ ہے۔

---

[1] ۸ انفال: ۴۲

v۔ موت بے اختیاری ہے، حیات خود مختاری ہے۔
vi۔ موت بے فیض ہے، حیات فیاض ہے۔
vii۔ موت نا بینا ہے اور حیات بینائی ہے۔
viii۔ مردہ سے تعفن پھیلتا ہے، حیات سے برکتیں پھیلتی ہیں۔
ix۔ موت سکوت ہے، حیات رونق ہے۔
x۔ موت وحشت ہے، حیات انس و محبت ہے۔
xi۔ موت افسردگی ہے، حیات فرحت و شادمانی ہے۔
xii۔ موت ھادم اللذات[1] ہے، حیات لذت ہے۔
xiii۔ موت انہدام ہے، حیات تعمیر ہے۔
xiv۔ موت شر ہے، حیات خیر ہے۔
xv۔ موت عدم ہے، حیات سرچشمہ وجود ہے۔
xvi۔ موت فنا ہے، حیات بقا ہے۔

لہٰذا جس شریعت کی طرف رسول اسلامؐ نے دعوت دی ہے، اس میں حیات ہے اور اس کے آثار موجود ہیں۔ تعبیر لِمَا يُحۡيِيۡكُمۡ مطلق ہے۔ اس میں ہر قسم کی حیات اور حیات کے تمام آثار شامل ہیں اور جو مؤمن اس حیات آفرین دعوت پر لبیک کہتا ہے وہ حیات کے تمام آثار رکھتا ہے۔ وہ ابدی حیات کا مالک ہے اور دنیا میں بھی حقیقی حیات کا مالک ہے۔

اَنَّ اللّٰهَ يَحُوۡلُ بَيۡنَ الۡمَرۡءِ وَقَلۡبِهٖ: ربط کلام یہ ہے کہ جب رسولؐ تمہیں حیات آفرین تعلیمات کی طرف دعوت دیں تو تم اس پر لبیک کہو۔ اللہ تمہارے نہایت قریب ہے۔ تمہارا وہ مالک حقیقی ہے۔ تم پر کامل تصرف رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ جو دل تمہارے ارادوں، تمہارے وجدان اور ضمیر کا مرکز ہے، اس سے بھی زیادہ اللہ تم پر تصرف رکھتا ہے اور خود تمہارے ارادوں (قلب) سے زیادہ اللہ کی مالکیت اور حاکمیت نافذ ہے۔

لہٰذا اگر تم نے اس حیات آفرین آواز پر دل سے لبیک نہ کہی تو اللہ تو خود تمہارے دل اور تمہارے درمیان تمہاری نیتوں اور ارادوں کو دیکھ رہا ہے کہ تم کو اس مقام کی طرف پھیر دیتا ہے جس کے تم اہل ہو۔ اگر کسی وجہ سے اسلامی دعوت پر لبیک نہ کہہ سکے تو اللہ اس کا دل ایمان کی طرف پھیر دیتا ہے کیونکہ وہ اس قابل ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص بظاہر اس حیات بخش دعوت کو قبول کر رہا ہے لیکن وہ حقیقت میں منکر ہے اور اس قابل نہیں ہے کہ وہ اہل ایمان میں شمار ہو تو اللہ اس کا دل پھیر دیتا ہے اور اس کا انجام ضلالت ہوتا ہے۔

لہٰذا اس آیت میں مؤمنین کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے اور گمراہوں کے لیے نوید امید ہے۔ دوسرے

---

[1] فرمان رسولؐ منقول ہے جس کا معنی، لذتوں کو ختم کرنے والی ہے۔ وسائل الشیعۃ ۲: ۴۳۵

دوسرے لفظوں میں خوف و رجا اور امید وبیم کے ساتھ رہنے کے حکم کو جامع ترین لفظوں میں بیان کیا ہے۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ حیات آفرین دعوت سے مراد ولایت علی علیہ السلام ہے۔[1]

علامہ طباطبائی فرماتے ہیں کہ یہ روایت ایک کلی کی تطبیق ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

> اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اس بات میں حائل ہوتا ہے کہ باطل حق کی شکل میں نہ آنے پائے۔

اہم نکات

۱۔ اسلامی تعلیمات، تمام حیات آفرین قدروں کا مجموعہ ہیں: لِمَا يُحْيِيكُمْ ....

۲۔ مؤمن کو اپنی عاقبت اور انجام بخیر ہونے کی فکر میں رہنا چاہیے: اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ ....

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

۲۵۔ اور اس فتنے سے بچو جس کی لپیٹ میں تم میں سے صرف ظلم کرنے والے ہی نہیں (سب) آئیں گے اور یہ جان لو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

تفسیر آیات

یہ مسلمانوں سے من حیث الامّۃ خطاب ہے کہ جہاں انفرادی طور پر گناہوں اور نافرمانیوں سے بچنا ضروری ہے، وہاں اجتماعی طور پر ایسے فتنوں سے بچنا ضروری ہے جس کے منفی اثرات صرف مجرموں تک محدود نہیں رہتے بلکہ پوری امت اس کی لپیٹ میں آ جاتی ہے۔ یعنی اسلامی معاشرے میں انفرادی ذمہ داری کے ساتھ ہر فرد پر اجتماعی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ جیسا کہ مشہور حدیث ہے:

> کلّکم راع و کلّکم مسئول عن رعیتہ۔[2]
>
> تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اپنی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

ذیل میں ہم چند ایسے فتنوں کی مثال پیش کرتے ہیں جو اس آیت کا مصداق بن سکتے ہیں:

i۔ حکمرانوں کی خیانت ایسے فتنوں میں سر فہرست ہے کہ جس کی وجہ سے ایک امت اقتصادی، عسکری اور ثقافتی میدانوں میں دوسرے کی محتاج، دست نگر اور پسماندہ رہ جاتی ہے۔ جیسا کہ ہماری معاصر تاریخ کی مسلم امہ کا حال ہے، جس میں مسلم حکمرانوں کی خیانت کی وجہ سے مسلم امہ پر اغیار کی ہر میدان میں بالادستی ہے اور ان کا ہر میدان میں استحصال ہو رہا ہے۔

---

[1] اصول الکافی ۸ : ۲۴۸ [2] بحار الانوار ۷۲ : ۳۸

ii۔ تفرقہ بازی: اس میں اگرچہ چند تنگ نظر لوگ ملوث ہوتے ہیں مگر ان کے منفی اثرات پوری قوم پر مترتب ہوتے ہیں اور امت مسلمہ کی فکری اور مادی طاقتوں کا ایک بہت بڑا معتد بہ حصہ آپس کی نفرتوں اور تفرقہ بازوں کی نذر ہو جاتا ہے۔

iii۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ متروک ہونے کی صورت میں اخلاقی فسادات عام ہو جاتے ہیں اور لوگوں میں اجتماعی شعور بیدار نہ ہونے کی وجہ سے ظالم حکمرانوں کا استبدادی نظام قائم ہو جاتا ہے۔

الدر المنثور میں آیا ہے۔ زبیر نے کہا: ہم ایک مدت تک یہ آیت پڑھتے رہے اور ہمارا خیال نہ تھا کہ ہم اس کے مصداق ہیں۔ ابھی معلوم ہوا کہ نحن المعنیون بھااس آیت کا اشارہ ہماری طرف ہے۔

اہم نکات

۱۔ امتوں کا زوال وانحطاط ایسے جرائم سے ہوتا ہے جس کے اثرات پوری امت پر مترتب ہوتے ہیں۔

۲۔ زوال و انحطاط میں مجرم کے ساتھ، اس پر سکوت اختیار کرنے والا بھی شامل ہے۔

وَ اذۡکُرُوۡۤا اِذۡ اَنۡتُمۡ قَلِیۡلٌ مُّسۡتَضۡعَفُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ تَخَافُوۡنَ اَنۡ یَّتَخَطَّفَکُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىکُمۡ وَ اَیَّدَکُمۡ بِنَصۡرِہٖ وَ رَزَقَکُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم تھوڑے تھے، تمہیں زمین میں کمزور سمجھا جاتا تھا اور تمہیں خوف رہتا تھا کہ کہیں لوگ تمہیں ناپید نہ کر دیں تو اللہ نے تمہیں پناہ دی اور اپنی نصرت سے تمہیں تقویت پہنچائی اور تمہیں پاکیزہ روزی عطا کی تاکہ تم شکر کرو۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذۡ اَنۡتُمۡ قَلِیۡلٌ: مسلمانوں کو مکی زندگی یاد دلائی جا رہی ہے کہ جہاں معدودے چند مسلمان ہمیشہ کفار کے خطرے میں گھرے ہوئے ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت فاطمہ الزہراء سلام اللہ علیہا خطبہ فدک میں فرماتی ہیں:

وَ کُنۡتُمۡ عَلٰی شَفَا حُفۡرَۃٍ مِّنَ النَّارِ مذقة الشارب ونهزة الطامع و قبسة

تم تو آگ کے گڑھے میں گرنے والے ہی تھے اور (اپنے دشمنوں کے مقابلے میں) تم پینے والے کے لیے گھونٹ بھر پانی، حریص حملہ آور کا ایک تر نوالہ،

العجلان و موطی الاقدام.[1]	ایک چنگاری اور قدموں کے نیچے پامال ہونے والے خس و خاشاک سے زیادہ تمہاری حیثیت نہ تھی۔

۲۔ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ : اللہ نے ان کو مدینہ میں امن کی جگہ دے دی اور کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کی مدد فرمائی اور جنگی غنائم سے ان کو روزی عطا فرمائی۔

۳۔ وَرَزَقَكُمْ : اللہ نے مسلمانوں کو پاک و پاکیزہ نعمتوں سے نوازا جب کہ عہد جاہلیت میں یہی لوگ بہت ہی بدحالی کا شکار تھے۔ جیسا کہ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں:

تشربون الطرق و تقتاتون الورق اذلة خاسئین۔[2]	تم بدبودار کیچڑ والے پانی سے پیاس بجھاتے تھے اور گھاس پھوس سے بھوک مٹاتے تھے اور ذلت و خواری کی زندگی گزارتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ تعداد میں اضافہ، امن، فتح و نصرت اور پاک روزی، اللہ کے احسانات ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾	۲۷۔ اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو اور اپنی امانتوں میں بھی خیانت نہ کرو درحالیکہ تم جانتے ہو۔

تفسیر آیات

شان نزول: روایت ہے کہ قریظہ کے یہود جب محاصرے میں تھے تو ابولبابہ انصاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایلچی کے طور پر بھیجے گئے۔ انہوں نے یہود کو رسول اللہؐ کے ایک راز سے آگاہ کیا۔ جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس خیانت پر ابولبابہ نے اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے توبہ قبول ہونے تک باندھے رکھا۔

خیانت ایک غیر انسانی اور غیر اخلاقی عمل ہے۔ خصوصاً اس خیانت کا تعلق اللہ اور اس کے رسولؐ سے ہو اور معاشرے کے کسی فرد سے بھی خیانت کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ انسانی قدروں کو نہیں جانتا۔ امانت و خیانت کی مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ نساء آیت ۵۸۔

۱۔ لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ : اللہ کے ساتھ جو عہد باندھا گیا ہے اس میں خیانت نہ کرو۔

۲۔ وَالرَّسُوْلَ : رسول نے جو راز تمہارے حوالے کیا ہے اسے فاش نہ کرو اور صرف یہی نہیں بلکہ کسی بھی حوالے سے رسولؐ کی نافرمانی خیانت ہے۔

---

[1] بحار الانوار ۲۹: ۲۲۳ [2] حوالہ سابق

۳۔ وَتَخُوۡنُوۡۤا اَمٰنٰتِکُمۡ : اور جو امانتیں تمہارے سپرد کی ہیں ان میں خیانت نہ کرو۔ جو اللہ اور رسول کی امانت میں خیانت کرے گا وہ خود مؤمنین کی عمومی مصلحت کے خلاف ہے، لہٰذا یہ خود اپنے ساتھ خیانت ہے۔

۴۔ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ: حالانکہ تمہیں اس خیانت کی حرمت اور اس کے مقاصد کا علم بھی ہے۔ یعنی موضوع اور حکم دونوں کا علم ہے۔ موضوع اور حکم سے مراد یہ ہے کہ انہیں علم ہے یہ کام جو میں کر رہا ہوں خیانت ہے اور خیانت حرام ہے۔

اہم نکات

۱۔ خیانت کا تعلق حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں سے ہے: لَا تَخُوۡنُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ وَتَخُوۡنُوۡۤا اَمٰنٰتِکُمۡ ....۔

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُکُمۡ وَ اَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَۃٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗۤ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۲۸﴾	۲۸۔ اور جان لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں اور بے شک اللہ ہی کے ہاں اجر عظیم ہے۔

تفسیر آیات

روایت کے مطابق ابولبابہ نے یہ خیانت اس لیے کی تھی کہ اس کے بال بچے یہودیوں کے پاس تھے۔ اللہ نے متعدد آیات میں فرمایا کہ ہم مختلف طریقوں سے تمہاری آزمائش کرتے ہیں:

نَبۡلُوۡکُمۡ بِالشَّرِّ وَالۡخَیۡرِ فِتۡنَۃً ....[1]	اور ہم امتحان کے طور پر برائی اور بھلائی کے ذریعے تمہیں مبتلا کرتے ہیں....

اموال اور اولاد بھی آزمائش ہیں کہ کیا ان کو انسان زندگی کا مقصد مقصود قرار دیتا ہے یا ان چیزوں کو رضائے رب کے لیے ذریعہ بناتا ہے۔ اس کی رضامندی کی صورت میں انسان اجر عظیم کا مستحق بنتا ہے۔ مال و دولت کی مثال پانی اور کشتی کی ہے کہ پانی اگر کشتی کے نیچے رہے تو یہ کشتی پار ہونے کے لیے ذریعہ ہے اور اگر یہ پانی کشتی کے اندر آ جائے تو اسے غرق کر دیتا ہے۔ اسی طرح اگر مال و اولاد ایک مقدس مقصد کے لیے ذریعہ بنیں تو بہترین وسیلہ ہیں اور اگر انسان انہیں مقصد قرار دے تو انسان ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔

اَنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗۤ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ : یہ اجر عظیم ان لوگوں کو مل سکتا ہے جو اس مال و اولاد کی آزمائش میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

---

[1] ۲۱ انبیاء: ۳۵

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

يَا ابْنَ آدَمَ اِذَا رَاَيْتَ رَبَّكَ سُبْحَانَهُ يُتَابِعُ عَلَيْكَ نِعَمَهُ وَ اَنْتَ تَعْصِيهِ فَاحْذَرْهُ ۔[1]

اے آدم کے بیٹے! جب تو دیکھے کہ اللہ سبحانہ تجھے پے در پے نعمتیں دے رہا ہے اور تو اس کی نافرمانی کر رہا ہے تو اس سے ڈرتے رہنا۔

اہم نکات

۱۔ مال اور اولاد کی محبت انسانوں کو اکثر گمراہ کر دیتی ہے۔

۲۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو مال و اولاد کی قربانی دے کر کمال کو پہنچ جائیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

۲۹۔ اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمہیں (حق و باطل میں) تمیز کرنے کی طاقت عطا کرے گا اور تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

تفسیر آیات

تقویٰ کی تین اہم خصوصیات ہیں: پہلی خصوصیت، حق و باطل میں تمیز: حق و باطل کی تمیز کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود میں ایک کسوٹی رکھی ہے جسے ضمیر اور وجدان کہتے ہیں لیکن اکثر اوقات خواہشات نفسانی اس کسوٹی پر اپنا کثیف پردہ ڈال دیتی ہیں جس کی وجہ سے حق اور باطل، کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کی یہ قوت ماند پڑ جاتی ہے۔ اب دلیل و منطق اس پر اثر نہیں کرتی۔ اس کو حق، باطل اور باطل، حق دکھائی دیتا ہے۔ دعوت حق پر لبیک کہنے کی بجائے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے مگر اہل تقویٰ کا ضمیر شفاف، وجدان صاف ہوتا ہے۔ اس کا زندہ احساس، بیدار عقل، اس کی بصیرت اور اس کا صاف و شفاف ضمیر ہر موڑ، ہر مشکل، ہر اختلاف اور ہر تفرقہ کی صورت میں انہیں بتا دیتا ہے کہ کون سا راستہ باطل کی طرف جاتا ہے اور کون سا راستہ حق کی طرف۔ کس قدم میں اللہ کی رضایت ہے اور کس میں اس کی رضایت نہیں ہے۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت ہے:

اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللّٰهِ ۔[2]

مؤمن کی فراست سے ڈرو، کیونکہ وہ نور خدا کے ذریعے دیکھتا ہے۔

اس کی آنکھوں کے سامنے پردہ نہیں ہوتا۔ وہ راہ گم نہیں کرتا۔

---

[1] نہج البلاغۃ حکمت ۲۵ [2] اصول الکافی ۱: ۲۱۸ باب ان المتوسمین ذکرھم...۔

مولانا روم کہتے ہیں:

چونکه تقویٰ بست دو دست هوا　　حق کشاید هر دو دست عقل را

تقویٰ نے خواہشات کے دونوں ہاتھ باندھ دیے تو اللہ تعالیٰ نے عقل کے دونوں ہاتھ کھول دیے۔

۱۔ وَّیُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ: تقویٰ کی دوسری خصوصیت گناہوں کو مٹا دینا ہے۔ گناہ کو مٹانے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ گناہ کے محرک کو مٹا دیتا ہے۔ جس کے پاس تقویٰ جیسا شعور موجود ہو۔ اس پر گناہ کی رغبت غالب نہیں آتی اور دوسری یہ کہ اللہ گناہ کے اثرات کو مٹا دیتا ہے۔ یعنی تقویٰ والے سے اگر کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو چونکہ اس کا ضمیر زندہ ہے فوراً اس گناہ کی تلافی کرتا ہے۔

۲۔ وَیَغۡفِرۡ لَکُمۡ: تیسری خصوصیت یہ ہے کہ تقویٰ والے سے اگر کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اللہ خود معاف فرماتا ہے۔ چونکہ باتقویٰ انسان صرف چھوٹے گناہوں کا ارتکاب کرے گا جن کے بارے میں اللہ کا وعدہ ہے کہ معاف کر دیا جائے گا۔

۳۔ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ: تقوی والے ہی اللہ کے عظیم فضل کے لیے اہل بن سکتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

فَاِنَّ تَقْوَی اللّٰہِ مِفْتَاحُ سِدَادٍ وَ ذَخِیرَۃُ مَعَادٍ وِ عِتْقٌ مِنْ کُلِّ مَلَکَۃٍ وَ نَجَاۃٌ مِنْ کُلِّ ہَلَکَۃٍ بِھَا یَنْجَحُ الطَّالِبُ وَ یَنْجُو الْھَارِبُ وَ تُنَالُ الرَّغَائِبُ۔[1]

بے شک تقوائے الٰہی ہدایت کی کلید اور آخرت کا ذخیرہ ہے۔ (خواہشوں کی) ہر غلامی سے آزادی اور ہر تباہی سے رہائی کا باعث ہے۔ اس کے ذریعہ طلبگار منزل مقصود تک پہنچتا اور (سختیوں سے) بھاگنے والا نجات پاتا ہے اور مطلوبہ چیزوں تک پہنچ جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ بندے کو تقویٰ کے ذریعے اپنے اندر اہلیت پیدا کرنا ہوگی تا کہ وہ فرقان (حق و باطل میں تمیز کی کسوٹی) اور فضل عظیم کا سزاوار بن جائے: اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّکُمۡ ....

وَ اِذۡ یَمۡکُرُ بِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِیُثۡبِتُوۡکَ اَوۡ یَقۡتُلُوۡکَ اَوۡ یُخۡرِجُوۡکَ ؕ وَ یَمۡکُرُوۡنَ وَ یَمۡکُرُ

۳۰۔ اور (وہ وقت یاد کریں) جب یہ کفار آپ کے خلاف تدبیر سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو نکال دیں،

---

[1] نہج البلاغۃ خطبہ ۲۳۰

اللّٰہُ ؕ وَ اللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ ﴿۳۰﴾ وہ اپنی چال سوچ رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

یہ آیت اسلامی تاریخ کے عظیم واقعہ ہجرت کے بارے میں ہے۔

مکہ کے سرداروں نے دار الندوہ میں جمع ہو کر رسالتمآب (ص) کو قید یا جلا وطن یا قتل کرنے کی تدبیروں پر غور کیا۔ آخر میں ابوجہل کی اس تجویز پر اتفاق ہوا کہ تمام قبیلوں میں سے ایک ایک فرد کا انتخاب کیا جائے اور یہ سب مل کر دفعتاً محمدؐ پر ٹوٹ پڑیں اور انہیں قتل کر دیں۔ اس طرح بنوعبد مناف سب قبیلوں سے انتقام لینے پر قادر نہ ہوں گے اور خون بہا لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس کام کے لیے افراد کا انتخاب ہو گیا اور وقت کا بھی تعین ہو گیا اور قاتلوں کا گروہ اپنے مقررہ وقت پر مقررہ جگہ پر پہنچ بھی گیا۔ ادھر جبریل امین نے رسول اللہؐ سے کہا: آج کی رات آپ اپنے بستر پر نہ سوئیں اور اپنی جگہ علی بن ابی طالب علیہ السلام کو سلائیں۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا:

نم علی فراشی و اتشح ببردی ھذہ الحضرمی الاخضر فنم فیہ۔[1] میرے بستر پر سو جاؤ اور میرا حضرمی سبز لحاف اوڑھ لو اور اس میں سو جاؤ۔

رسول اللہؐ ان کی آنکھوں میں خاک جھونک کر نکل گئے۔ اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام نے بستر رسولؐ پر سونے اور ان پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہونے پر ان لفظوں سے اظہار افتخار کیا:

وقیتُ بنفسی خیر من وطئ الحصی و من طاف بالبیت العتیق و بالحجر
رسول اللّٰہ خاف ان یمکروا بہ فنجاہ ذوا الطول الا لہ من المکر
و بات رسول اللّٰہ فی الغار آمنا موقی و فی حفظ الالہ و فی ستر
وبت اراعیھم وما یثبتوننی وقدوطنت نفسی علی القتل والأسر[2]

میں نے اس ہستی پر جان کا نذرانہ پیش کیا جو روئے زمین پر چلنے والوں اور کعبہ و حجر کے طواف کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔ رسول اللہؐ کو جب کفار کا خطرہ لاحق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو کافروں کے مکر و فریب سے نجات دی اور رسول اللہؐ غار میں امن و سلامتی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں رہے اور میں نے کافروں کی تاک میں رات گزاری اور قتل و اسیری کے لیے اپنے آپ کو آمادہ رکھا۔

بستر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حضرت علی علیہ السلام کے سونے کی حدیث کے بارے میں ملاحظہ ہو

---

[1] شواھد التنزیل ۱: ۱۲۹۔ روح المعانی ذیل آیت
[2] شواھد التنزیل ۱: ۱۳۱۔ روح المعانی ذیل آیت

مسند احمد بن حنبل ا: ۳۳۱ ط مصر۔ تفسیر طبری۔ مستدرك حاکم وغیرہ۔

اہم نکات

۱۔ توکل بر خدا کر کے اس کی تدبیر کے تحت داخل ہونے کی صورت میں دشمن کی ہر چال سے انسان محفوظ رہتا ہے: وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ اور جب انہیں ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں: ہم نے سن لیا ہے، اگر ہم چاہیں تو ایسی باتیں ہم بھی بنا سکتے ہیں، یہ تو وہی داستان ہائے پارینہ ہیں۔

تفسیر آیات

صرف لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹانے اور اس معجزہ کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے کہتے تھے: ہم بھی ایسی عبارت اور ایسا مضمون بنا سکتے ہیں۔ اگر وہ اس پر قادر ہوتے تو ایسا ضرور کرتے اور ایک نہیں کئی ایک عبارتیں یکے بعد دیگرے ہر سو سے بن کر آ جاتیں اور قرآن کے خلاف جنگ کرنے اور جانی قربانیاں دینے کی نوبت نہ آتی۔

اہم نکات

۱۔ دشمن جب عاجز آ جاتا ہے تو وہ اپنی عاجزی چھپانے کے لیے جھوٹے نعروں سے سہارا لیتا ہے۔

وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ اور (یہ بھی یاد کرو) جب انہوں نے کہا: اے اللہ! اگر یہ بات حق ہے، تیری طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر کوئی دردناک عذاب نازل کر۔

تفسیر آیات

یہ ایک چیلنج تھا جو رسالتمآبؐ کی دعوت کی حقانیت کے خلاف کیا گیا۔ یہ چیلنج کرنے والا کون تھا؟ مفسرین میں اختلاف ہے۔

علامہ امینی نے الغدیر جلد اول صفحہ ۲۳۹ ۔ ۲۶۶ میں شیعہ سنی متعدد مصادر سے ذکر کیا ہے کہ یہ چیلنج غدیر کے موقع پر کیا گیا اور چیلنج کرنے والا حارث بن نعمان فہری تھا۔ جب رسول خداؐ نے غدیر کے موقع پر فرمایا: من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ تو حارث فہری نے، جو منافق تھا، کہا: آپؐ نے توحید کا حکم دیا ہم نے مان لیا، بتوں سے بیزاری کا حکم دیا، ہم نے مان لیا، آپؐ کی رسالت کی تصدیق کرنے کے لیے کہا ہم نے تصدیق کی، پھر جہاد، حج، روزہ، نماز اور زکوۃ کا حکم دیا، ہم نے مان لیا۔ آپؐ نے ان پر اکتفا نہ کیا اور اس لڑکے کو اپنا خلیفہ بنا دیا اور کہدیا: من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ۔ کیا یہ آپؐ کی اپنی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے؟ رسول خداؐ نے فرمایا: اللہ کی طرف سے ہے۔ نعمان لوٹا اور کہا: اے اللہ! اگر یہ بات حق ہے اور آپ کی طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے۔ اتنے میں ایک پتھر آسمان سے اس پر گرا اور وہ مر گیا۔

آیہ سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ[1] اسی سلسلے میں نازل ہوئی۔

اس واقعہ کو ابو عبیدہ ہروی متوفی ۲۲۳ھ نے اپنی تفسیر غریب القرآن، ابوبکر نقاش موصلی متوفی ۳۵۱ھ نے اپنی تفسیر شفاء الصدور، ابو اسحاق ثعلبی متوفی ۴۲۷ھ نے اپنی تفسیر، حاکم حسکانی نے دعاۃ الھداۃ، ابوبکر یحییٰ قرطبی متوفی ۵۶۷ھ نے سورۃ المعارج کی تفسیر، سبط ابن جوزی متوفی ۶۵۴ھ نے تذکرہ، حموینی متوفی ۷۲۲ھ نے فراید السمطین میں و دیگر ۳۰ کے قریب علماء نے ذکر کیا ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں الغدیر جلد اول ص ۲۳۹۔ ۲۶۶۔ یہاں آپ کو اس بارے میں ہونے والے تمام اعتراضات کے جواب بھی ملیں گے۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اور اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کرے گا جب تک آپ ان کے درمیان موجود ہیں اور نہ ہی اللہ انہیں عذاب دینے والا ہے جب وہ استغفار کر رہے ہوں۔

وَ مَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْۤا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

۳۴۔ اور اللہ ان پر عذاب کیوں نہ نازل کرے جب کہ وہ مسجد الحرام کا راستہ روکتے ہیں حالانکہ وہ اس مسجد کے متولی نہیں ہیں؟ اس کے متولی تو صرف تقویٰ والے ہیں لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

---

[1] ۷۰ معارج:۱

تفسیر آیات

۱۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ : رسول رحمتؐ کا وجود امان ہے ان لوگوں کے لیے جو مستحق عذاب ہیں اور دوسری امان استغفار و توبہ ہے۔ اللہ کی یہ سنت رہی ہے کہ کوئی بھی نبی کسی امت کے درمیان دعوت الی الحق میں مصروف ہو تو اس امت کو مہلت دی جاتی ہے۔ ان کے جرائم کی پاداش میں فوری عذاب نازل نہیں فرماتا۔ اسی طرح اگر اس امت میں کچھ لوگ اپنے سابقہ جرائم پر نادم ہوں اور توبہ و استغفار کی حالت میں ہوں تو بھی اللہ ان پر عذاب نازل نہیں فرماتا۔

۲۔ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ : لیکن اگر ان کے درمیان رسولؐ موجود نہ ہوں اور وہ استغفار کی بجائے جرائم میں مشغول ہوں تو ان پر عذاب نازل نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ جیسا کہ رسول خداؐ اور دیگر مسلمانوں کی ہجرت کے بعد کفار مکہ کا حال تھا کہ نہ ان میں رسول خداؐ موجود تھے، نہ وہ استغفار کر رہے تھے بلکہ وہ مسجد الحرام کا راستہ روکنے جیسے بڑے جرائم میں ملوث تھے۔ چنانچہ ان کو قتل و اسیری، رسوائی جیسے عذاب میں مبتلا کیا گیا۔

۳۔ وَمَا كَانُوْۤا اَوْلِيَآءَهٗ : اللہ کے ساتھ شرک کرنے والوں کو اللہ کی عبادت کی جگہ کی تولیت نہیں مل سکتی۔

۴۔ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ : مسجد کے متولی تو صرف متقی لوگ بن سکتے ہیں، چونکہ اسلام میں مساجد، اسلامی معاشرے کی تشکیل اور تربیت و تعلیم نیز امور مملکت کی تنظیم و ترویج اور تبلیغ احکام و ابلاغ عامہ جیسے اہم امور کا مرکز ہیں۔ اگر مسجد کی تولیت اہل تقویٰ کے پاس نہ ہو تو وہ اپنے مفادات کے تحفظ میں مسجد کو اپنے حقیقی کردار ادا کرنے سے روک لیں گے بلکہ اس سے بھی بدتر کہ وہ ان مساجد کو فکری انحراف کا مرکز بنائیں گے۔ چنانچہ اس افسوسناک صورت حال سے ہم دوچار بھی ہیں۔

مساجد کے متولی وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو مسجد کے مقاصد، جو اللہ تعالیٰ نے متعین فرمائے ہیں، کا کا علم رکھتے ہوں اور ان کے پابند ہوں۔ امامت کے لیے لائق عالم کا انتخاب کرنے والے ہوں۔ بیان احکام میں امام مسجد کو آزادی دیں۔ شریعت کے مسلمات کے خلاف کسی کو بات کرنے اجازت نہ دیں۔ آپس میں اختلاف کر کے عبادت کو گناہ میں بدلنے والے نہ ہوں۔ علم اور عالم کے خلاف نہ ہوں۔ حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے:

العالم لا ینتصف من الجاھل۔[۱] عالم کو جاہل سے انصاف نہیں ملتا۔

۵۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ : مسجد کے آداب و حقوق سے آگاہی نہ ہونے کی وجہ سے وہ قابض رہنا چاہتے ہیں۔

مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے:

---

[۱] غرر الحکم ص ۴۶ باب النوادر

كَانَ فِي الْاَرْضِ اَمَانَان مِنْ عَذَاب اللّٰهِ وَ قَدْ رُفِعَ اَحَدُهُمَا فَدُونَكُمُ الْآخَرَ فَتَمَسَّكُوا بِهِ۔ اما الامان الذی رفع فھو رسول اللّٰہ ص و اما الامان الباقی فالاستغفار. قال اللّٰہ تعالی.. (و قرأ ھذہ الآیۃ) [1]

دنیا میں عذاب خدا سے دو چیزیں باعث امان تھیں۔ ایک ان میں سے اٹھ گئی مگر دوسری تمہارے پاس موجود ہے لہٰذا اسے مضبوطی سے تھامے رہو۔ وہ امان جو اٹھا لی گئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور وہ امان جو باقی ہے وہ توبہ و استغفار ہے۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ نے فرمایا۔ (پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی)

اہم نکات

۱۔ گناہ سے تائب ہو کر استغفار کی صورت میں عفو کی امید رکھی جاتی ہے، نہ یہ کہ گناہ کا ارتکاب جاری رکھ کر عفو کی امید رکھی جائے۔

۲۔ مسجد کا متولی ہونے کے لیے بھی تقویٰ شرط ہے: اِنۡ اَوۡلِیَآؤُہٗۤ اِلَّا الۡمُتَّقُوۡنَ ...۔

وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمۡ عِنۡدَ الۡبَیۡتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصۡدِیَۃً ؕ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡفُرُوۡنَ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ اور خانہ کعبہ کے پاس ان کی نماز سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی، پس اب اپنے کفر کے بدلے عذاب چکھو۔

تشریح کلمات

مُكَآءً: (م ك و) کے معنی پرندے کے سیٹی بجانے کے ہیں۔

تَصۡدِیَۃً: (ص د ی) الصدی۔ صدائے بازگشت، جو کسی شفاف مکان سے ٹکرا کر کے واپس آئے۔ التصدیۃ ہر اس آواز کو کہتے ہیں۔ جو الصدی کی طرح ہو جس کا کوئی مفہوم نہ ہو۔

تفسیر آیات

وہ مسجد الحرام کے متولی کیسے ہو سکتے ہیں جب کہ مسجد الحرام کے آداب سے بھی نابلد ہیں۔ وہ تو سیٹیاں اور تالیاں بجانے جیسے لہویات کو عبادت قرار دیتے ہیں۔ ابن عباس سے ایک روایت میں آیا ہے کہ مشرکین عریاں حالت میں سیٹیاں اور تالیاں بجاتے ہوئے طواف کرتے تھے۔ [2] دوسری روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہؐ جب حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان نماز پڑھتے تھے تو بنی سہم (قریش) کے دو افراد آپ کے دائیں اور بائیں طرف کھڑے ہو جاتے اور سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے۔ [3]

---

[1] نہج البلاغۃ خ ۸۸ [2] المنار: ۹: ۶۶۰ [3] المیزان ذیل آیت

ان دو آیات میں دو باتوں کی صراحت ہے:

i۔ یہ لوگ جرائم کے مرتکب ہیں اور مسجد الحرام کا راستہ روکنے کے ساتھ اس کا احترام بھی ملحوظ نہیں رکھتے، لہٰذا یہ مستحق عذاب ہیں۔

ii۔ آیت میں اس غلط فہمی کا ازالہ ہے کہ عرب، قریش کو خانہ کعبہ کا جائز اور قانونی متولی سمجھتے تھے۔

اہم نکات

۱۔ مسجد کے متولی کو آداب مسجد کا علم ہونا چاہیے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ لِیَصُدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ فَسَیُنۡفِقُوۡنَہَا ثُمَّ تَکُوۡنُ عَلَیۡہِمۡ حَسۡرَۃً ثُمَّ یُغۡلَبُوۡنَ ۬ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِلٰی جَہَنَّمَ یُحۡشَرُوۡنَ ﴿ۙ۳۶﴾

۳۶۔ جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ اپنے اموال (لوگوں کو) راہ خدا سے روکنے کے لیے خرچ کرتے ہیں، ابھی مزید خرچ کرتے رہیں گے پھر یہی بات ان کے لیے باعث حسرت بنے گی پھر وہ مغلوب ہوں گے اور کفر کرنے والے جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَسَیُنۡفِقُوۡنَہَا: اس آیت میں کفار کے مستقبل کے عزائم اور ان کے انجام کی پیشگوئی ہے کہ وہ مستقبل میں اسلام کے خلاف اپنا سارا سرمایہ صرف کر دیں گے۔

۲۔ ثُمَّ تَکُوۡنُ عَلَیۡہِمۡ حَسۡرَۃً: پھر یہ بات ان کے لیے باعث حسرت بنے گی۔ سورہ انفال چونکہ جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے تو ممکن ہے اس حسرت کا اشارہ جنگ احد و دیگر جنگوں کی طرف ہو جن پر مشرکین نے کثیر سرمایہ خرچ کیا۔

۳۔ ثُمَّ یُغۡلَبُوۡنَ: پھر وہ شکست کھائیں گے۔ ممکن ہے اس سے مراد وہ فیصلہ کن شکست ہو جو فتح مکہ کے موقع پر مشرکین کو اٹھانا پڑی۔

یہ ایک جامع پیشگوئی ہے کہ دشمن اس دین کے خلاف اپنا سارا سرمایہ کھپا دیں گے اور اپنے سرمائے کے بل پر وہ اہل اسلام کے خلاف کسی بھی سازش سے باز نہیں آئیں گے۔

اہم نکات

۱۔ دشمنان اسلام کی طرف سے مالی حربہ زیادہ استعمال کیا جائے گا: فَسَیُنۡفِقُوۡنَہَا ....

۲۔ تمام سازشوں کے باوجود دشمن ناکام رہیں گے: ثُمَّ يُغۡلَبُوۡنَ ....۔

لِيَمِيۡزَ اللّٰهُ الۡخَبِيۡثَ مِنَ الطَّيِّبِ	۳۷۔ تاکہ اللہ ناپاک کو پاکیزہ سے الگ کر دے
وَيَجۡعَلَ الۡخَبِيۡثَ بَعۡضَهٗ عَلٰى	اور ناپاکوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باہم ملا
بَعۡضٍ فَيَرۡكُمَهٗ جَمِيۡعًا فَيَجۡعَلَهٗ	کر یکجا کر دے پھر اس ڈھیر کو جہنم میں جھونک
فِىۡ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾	دے، (دراصل) یہی لوگ خسارے میں ہیں۔

تشریح کلمات

یرکمه: الرکم (ر ك م) کسی چیز کو اوپر تلے رکھنا۔ جیسے سحاب مرکوم۔

تفسیر آیات

۱۔ لِيَمِيۡزَ اللّٰهُ: دشمنان اسلام کو اپنے سرمائے کے بل بوتے پر ہر ناروا سازش کے لیے اللہ مہلت دیتا ہے۔ اس مہلت کے ذریعے ہی تو ناپاک اور پاکیزگی میں تمیز ہوتی ہے اور ناپاک عناصر ایک مرکز پر جمع ہوتے ہیں اور ہر خاک اپنے خمیر تک پہنچ کر رہتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے انجام بد کو پہنچ جاتے ہیں۔ یہ دیوالیہ پن کی انتہا ہے کہ اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد نتیجہ تباہی نکل آئے۔

۲۔ وَيَجۡعَلَ الۡخَبِيۡثَ بَعۡضَهٗ عَلٰى بَعۡضٍ: ناپاک اموال کو، جو دین الٰہی کے خلاف استعمال ہوا ہے، باہم ملا کر ایک ڈھیر بنا دیا جائے گا۔ پھر اس ڈھیر کو جہنم میں مشرکین کے عذاب کے لیے استعمال میں لایا جائے گا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

يَّوۡمَ يُحۡمٰى عَلَيۡهَا فِىۡ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكۡوٰى	جس روز وہ مال آتش جہنم میں تپایا جائے گا اور اسی
بِهَا جِبَاهُهُمۡ وَجُنُوۡبُهُمۡ ....[۱]	سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پشتیں داغی جائیں گی.

اور ہوسکتا ہے کہ مراد یہ ہو کہ ناپاک لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اس ڈھیر کو جہنم میں جھونک دے۔

اہم نکات

۱۔ مہلت اور فرصت مؤمن کے لیے نعمت اور کافر کے لیے عذاب و نقمت ہے: لِيَمِيۡزَ اللّٰهُ ....۔

۲۔ ہر فرع اپنے اصل سے جا ملتی ہے: وَيَجۡعَلَ الۡخَبِيۡثَ بَعۡضَهٗ عَلٰى بَعۡضٍ ....۔

قُلۡ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ يَّنۡتَهُوۡا	۳۸۔ کفار سے کہدیجیے کہ اگر وہ باز آ جائیں تو جو

---

[۱] ۹ توبۃ: ۳۵

يُغۡفَرۡ لَهُمۡ مَّا قَدۡ سَلَفَ ۚ وَ اِنۡ يَّعُوۡدُوۡا فَقَدۡ مَضَتۡ سُنَّتُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۳۸	کچھ پہلے (ان سے سرزد) ہو چکا اسے معاف کر دیا جائے گا اور اگر انہوں نے (پچھلے جرائم کا) اعادہ کیا تو گزشتہ اقوام کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ (ان کے بارے میں بھی) نافذ ہو گا۔

تفسیر آیات

۱۔ يُغۡفَرۡ لَهُمۡ : اسلام تطہیر کا ذریعہ ہے۔ جس طرح پانی ظاہری نجاستوں کو دور کرتا ہے، اسی طرح اسلام قبول کرنے سے باطنی نجاست دور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسلام قبول کرنے کی صورت میں سابقہ ترک کردہ عبادات کی قضا بھی لازم نہیں ہے۔

۲۔ وَ اِنۡ يَّعُوۡدُوۡا: تمام اقوام کے لیے سنت الٰہی یہ رہی ہے کہ ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ذریعہ فراہم فرماتا ہے، ان پر حجت پوری کرتا ہے، پھر ان کو مہلت دی جاتی ہے۔ اس میں اگر وہ راہ راست پر نہ آئیں تو ان کو ہلاکت میں ڈال دیا جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کافروں کو مغفرت کی نوید کے ساتھ دعوت دی گئی ہے: اِنۡ يَّنۡتَهُوۡا يُغۡفَرۡ لَهُمۡ ....

۲۔ پہلے نوید مغفرت، بعد میں ہلاکت کی خبر دینے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کی رحمت پہلے اور غضب بعد میں ہے۔

وَ قَاتِلُوۡهُمۡ حَتّٰى لَا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ وَّ يَكُوۡنَ الدِّيۡنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انۡتَهَوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ۳۹	۳۹۔ اور تم لوگ کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارا اللہ کے لیے خاص ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ یقیناً ان کے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔
وَ اِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوۡلٰىكُمۡ ؕ نِعۡمَ الۡمَوۡلٰى وَ نِعۡمَ النَّصِيۡرُ ۴۰	۴۰۔ اور اگر وہ منہ پھیر لیں تو جان لو کہ اللہ تمہارا سرپرست ہے، جو بہترین سرپرست اور بہترین مددگار ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ قَاتِلُوۡهُمۡ : جس فتنے کا اسلام خاتمہ چاہتا ہے، وہ ہے جس میں لوگوں کو امن و امان نہ ملے،

عقیدے اور نظریے کی آزادی نہ ہو، مذہب کی بنیاد پر انسانیت سوز مظالم روا رکھے جائیں، جنگ مسلط کی جائے اور معاہدوں کی خلاف ورزی کی جائے۔ یعنی مسلمانوں کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اس فتنے کے خاتمے تک جنگ کرو تا کہ لوگ آزادانہ طور پر اپنے لیے مذہب کا انتخاب کر سکیں۔ آزادی کے لیے لڑو، جبر و اکراہ کے خلاف لڑو، نہ یہ کہ جنگ کے ذریعے تم بھی جبر و اکراہ کرو۔ ہم نے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ[1] کے ذیل میں یہ بات واضح کی ہے کہ اسلامی جنگیں سلب شدہ آزادی کے حصول کے لیے تھیں، نہ کہ آزادی کو سلب کرنے کے لیے۔ اس آیت سے بھی اسلامی انسانیت ساز نظریے کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ اسلام فتنہ کے خاتمے کے لیے جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے، نہ کہ جنگ کے ذریعے فتنہ قائم کرنے کا۔

چنانچہ ان کافروں کے ساتھ اسلام کی کوئی جنگ نہیں ہے جو فتنہ انگیزی میں ملوث نہیں ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ امن سے رہنا چاہتے ہیں۔ جو اہل ذمہ ہیں، جن کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ ہے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ [2]	جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کرنے سے اللہ تمہیں نہیں روکتا اللہ تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

۲۔ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ: جب صرف اللہ ہی کی پرستش ہو گی تو زمین سے فساد کا خاتمہ ہو گا۔ یہاں اللہ کے علاوہ کسی ظالم، کسی خودسر استبدادی طاقت کی حکومت نہ ہو گی۔ کسی شرک و بدعت کی طرف سے رکاوٹ نہ ہو گی تو لوگوں کو اپنی پسند کا دین اختیار کرنے کی آزادی ہو گی اور دین پورا اللہ کے لیے ہو جائے گا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

لم یجئ تاویل هذه الآیة ولو قد قام قائمنا بعده سیری من یدرکه ما یکون من تاویل هذه الآیة ...[3]	اس آیت کی تاویل ابھی نہیں آئی۔ جب ہمارا قائم (حضرت مہدیؑ) ظہور فرمائیں گے تو جو ان کے زمانے میں موجود ہوں گے وہ اس آیت کی تاویل کو سمجھ پائیں گے....

اہم نکات

۱۔ جب تک روئے زمین پر اسلام دشمن عناصر موجود ہیں فتنہ موجود ہے: حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ....

۲۔ جب تک اللہ کے علاوہ دیگر معبودوں کا خاتمہ نہیں ہوتا جنگ جاری ہے: وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ..

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ　　۴۱۔ اور جان لو کہ جو غنیمت تم نے حاصل کی ہے

---

[1] ۲ بقرة: ۲۵۶　[2] ۶۰ ممتحنة: ۸　[3] تفسیر العیاشی ۲: ۵۶۔ مجمع البیان

فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوۡلِ وَلِذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ ۙ اِنۡ کُنۡتُمۡ اٰمَنۡتُمۡ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا یَوۡمَ الۡفُرۡقَانِ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۴۱﴾	اس کا پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول اور قریب ترین رشتے داروں اور یتیموں اور مساکین اور مسافرین کے لیے ہے، اگر تم اللہ پر اور اس چیز پر ایمان لائے ہو جو ہم نے فیصلے کے روز جس دن دونوں لشکر آمنے سامنے ہو گئے تھے اپنے بندے پر نازل کی تھی اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

تشریح کلمات

غَنِمۡتُمۡ : الغنیمة۔ (غ ن م) یہ مادہ اصل میں بھیڑ بکریوں کے ہاتھ لگنے اور ان کو حاصل کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔ پھر یہ لفظ ہر اس چیز پر بولا جانے لگا جو دشمن یا غیر دشمن سے حاصل ہو۔ (راغب) غیر دشمن سے حاصل شدہ چیز کے لیے قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔

تَبۡتَغُوۡنَ عَرَضَ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ۫ فَعِنۡدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ کَثِیۡرَةٌ ...۔[1]	تم دنیاوی مفاد کے طالب ہو جب کہ اللہ کے پاس غنیمتیں بہت ہیں ...۔

عصر رسولؐ میں یہ لفظ مطلق عائد ہونے والے فائدے کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

لَا یُغْلِقِ الرَّاهِنُ الرَّهْنُ مِنْ صِاحِبِهِ الَّذِی رَهَنَهُ لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَیْهِ غُرْمُهُ۔[2]	رہن جس کے پاس رکھا گیا ہے، نفع اس کے لیے ہے اور نقصان بھی اس پر ہے۔

دوسری حدیث میں زکوۃ کی تقسیم کے موقع پر فرمایا:

اللّٰھم اجعلھا مغنماً۔	اے اللہ اسے فائدہ مند قرار دے۔

نیز فرمایا:

غنیمة مجالس الذکر الجنة۔	مجلس ذکر کا منافع جنت ہے۔

رمضان کے بارے میں فرمایا:

هو غنم المؤمن	رمضان مومن کے لیے غنیمت ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں معالم المدرستین۔

---

[1] نساء: ۹۴ [2] مستدرک الوسائل ۱۳: ۴۴۲

اہل لغت نے بالاجماع کہا ہے کہ مادہ ''غ ن م'' الفوز بالشیٔ بلا مشقة کسی چیز کے بغیر مشقت کے حاصل کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں لسان العرب، تاج العروس وغیرہ۔

لہٰذا یہ بات نہایت واضح ہے اور اس پر کسی دلیل و برہان قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ لغت قرآن وسنت میں غنم ہر عائد ہونے والے فائدے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

اسلامی جنگوں کے بعد یہ لفظ جنگی غنیمت میں بیشتر استعمال ہونے لگا۔ اس طرح اسلامی جنگوں کے ایک مدت بعد یہ لفظ نئے معنی میں راسخ ہو گیا۔

لہٰذا جب قرآن وسنت میں یہ لفظ استعمال ہوا ہو گا تو ہم اسے لغوی اور قدیم معنوں میں لیں گے یعنی غنم سے مراد مطلق فائدہ لیں گے اور اگر اسلامی جنگوں کے بعد اہل اسلام نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے تو ہم اس سے جنگی غنیمت مراد لیں گے۔

ورنہ اصل لغت میں جنگی غنیمت کے لیے اسلام سے پہلے درج ذیل الفاظ استعمال ہوتے تھے:

سلب: مقتول کے جسم پر موجود اسلحہ ولباس کو قبضے میں لینے کو کہتے تھے۔

حرب: مقتول کے تمام اموال کو قبضے میں لینے کو کہتے تھے۔

نُھبة: لوٹ مار کو کہتے تھے جو تقریباً غنیمت کے مترادف ہے۔

اسلام نے دشمن کے اموال کو سلب، حرب اور لوٹ مار کے ذریعے قبضہ کرنے کو ممنوع قرار دیا بلکہ ان تمام اموال کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی ملکیت میں دے دیا اور یہاں سے غنیمت کا لفظ استعمال ہونا شروع ہو گیا اور ایک مدت کے بعد یہ لفظ اس جدید معنی میں مستقر ہو گیا۔ چنانچہ قرطبی اپنی تفسیر میں غنم کا لغوی معنی بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ولکن عرف الشرع قید اللفظ بھذا النوع۔

شریعت نے کافروں سے ہاتھ میں آنے والے مال کو دو نام دیے: ایک غنیمت اور دوسرا فیٔ۔ جو مال کافروں سے لڑائی میں حاصل کیا گیا، اسے غنیمت کہنے لگے اور شریعت کے عرف میں یہ نام راسخ ہو گیا اور لڑائی کے بغیر جو مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا ہے اسے فیٔ کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ آیت اور احادیث میں اگر لفظ غنم استعمال ہوا ہے تو مطلق درآمد مراد لیں گے، چونکہ عصر رسولؐ میں اسی معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ البتہ عصر رسالت کے بعد یا عصر رسالت کے اواخر میں اسلامی جنگوں کی وجہ سے یہ لفظ جدید معنی یعنی جنگی غنیمت میں مستقر ہو گیا۔

خمس اور غنیمت: گزشتہ تحقیقات سے واضح ہو گیا کہ خمس صرف جنگی غنیمت میں نہیں ہے بلکہ مطلق غنیمت میں ہے، البتہ جنگی غنیمت سرفہرست ہے۔ چنانچہ آیت میں جو تعبیر اختیار کی گئی ہے، اس سے عام غنیمت یعنی ہر درآمد شامل ہے۔ اَنَّمَا غَنِمۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ میں ما اور شیٔ کی دلالت مطلق درآمد پر ہے۔

البتہ سنت رسولؐ نے کہہ دیا کل درآمد پر خمس نہیں بلکہ اس میں سے بچت پر ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیت میں غنیمت میں سے صرف خمس (پانچویں حصہ) کی تقسیم کا ذکر ہے، بقیہ چار حصوں کا ذکر ہی نہیں ہے نیز خطاب مومنوں سے ہے۔ اَنَّمَا غَنِمۡتُمۡ یعنی جو کچھ تم نے غنیمت میں حاصل کیا۔ اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ خمس کے علاوہ باقی چار حصے، حاصل کرنے والوں کے ہیں، جب کہ جنگی غنیمت کے بارے میں ابتدائے سورہ میں فرمایا: قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ غنیمت اللہ کے ہیں اور اس کے رسول کے۔ یعنی خود کوئی اس کا حقدار یا مالک نہیں۔[1]

اور اگر فرض کر لیا جائے کہ اس آیت سے مطلق درآمد پر خمس ثابت نہیں ہوتا تو اس سے یہ بات بھی ثابت نہیں ہوتی کہ غنیمت کے علاوہ کسی چیز پر خمس نہیں ہوتا، کیونکہ تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ غنیمت کے علاوہ دیگر بعض چیزوں پر بھی خمس ہے:

۱۔ معدنیات: چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

قضی رسول اللّٰہ فی الرکاز الخمس[2] رسول اللہؐ نے فیصلہ فرمایا ہے کہ معدنیات پر خمس ہے۔

چنانچہ رسول اللہؐ سے پوچھا گیا کہ الرکاز کیا چیز ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا:

الذھب والفضۃ الذی خلقہ اللّٰہ فی الارض یوم خلقت۔[3] رکاز سے مراد سونا اور چاندی ہے جسے اللہ نے زمین کی تخلیق کے ساتھ پیدا کیا۔

۲۔ خزانہ: خزانے یا دفینے پر بھی خمس ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ رسول اللہؐ سے پوچھا گیا کہ جو دفینے ہمیں خرابوں اور جنگلوں میں ملتے ہیں، ان کا کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا:

فَفِیهِ وَ فِی الرِّکَازِ الْخُمُسْ۔[4] اس میں اور معدنیات میں خمس ہے۔

۳۔ آبی دولت: غوطہ خوری کے ذریعے یا دوسرے ذرائع سے نکالے جانے والے آبی ذخائر پر بھی خمس ہے۔[5]

ان چیزوں پر خمس واجب ہونے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خمس صرف جنگی غنیمت میں منحصر نہیں ہے۔

تفسیر آیات

خمس: اسلام کے جامع نظام حیات کا ایک اہم باب ہے۔ ہر نظام کی طرح اسلام کا مالی نظام ہے اور ہر مالی نظام کے عادلانہ ہونے کی ضمانت اس کا نظام تقسیم ہے کیونکہ معاشرے کو مالی لحاظ سے تین گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

---

[1] تعارف القرآن ۴: ۱۷۶ [2] صحیح مسلم باب جرح العجاء، صحیح بخاری باب فی الرکاز خمس [3] سنن بیھقی ۴: ۱۵۲
[4] کتاب الجراح ابو یوسف صفحہ ۸۳ [5] عوالی اللآلی ۳: ۱۲۵ باب الخمس

i۔ وہ لوگ جو اپنی ضرورت سے زیادہ کما سکتے ہیں وہ فکری و عملی طاقت زیادہ رکھتے ہیں۔

ii۔ وہ لوگ جو صرف اپنی ضرورت کی حد تک کما سکتے ہیں۔

iii۔ وہ لوگ جو کسی رکاوٹ کی وجہ سے اپنی ضرورت سے کم کما سکتے ہیں یا بالکل نہیں کما سکتے۔

ان تین گروہوں میں دولت کی تقسیم کے لیے درج ذیل نظریات قابل ذکر ہیں:

کمیونزم: اس مکتب فکر کے نزدیک تقسیم کا کلیہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنی طاقت کے مطابق کام کرے اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق حصہ دیا جائے۔

اس مکتب فکر میں ملکیت کو تقسیم میں کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ وہ ضرورت سے زیادہ کا مالک ہی نہیں بنتا، بلکہ یہاں تقسیم دولت کی اساس صرف ضرورت ہے۔

سوشلزم: اس نظام کے نزدیک تقسیم کا قانون یہ ہے کہ ہر شخص اپنی طاقت کے مطابق کام کرے اور ہر شخص کو اس کی محنت کے مطابق حصہ دیا جائے۔ یہاں تقسیم کی اساس محنت ہے۔ ضرورت کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

کیپیٹلزم: اس نظام میں ضرورت کو تقسیم میں کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہاں ضرورت جس قدر بڑھ جاتی ہے، تقسیم دولت میں اس کا حصہ گھٹ جاتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں حاجتمندوں کو رسد اور طلب کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا جس قدر حاجتمند زیادہ ہوں گے، کام اور محنت کی رسد زیادہ ہو گی اور طلب کم۔ اس طرح ضرورت مندوں کی مزدوری (حصہ) کم ہو جائے گی اور آخر میں جب یہ محنت کے قابل نہ ہوں گے، ان کا کوئی حصہ باقی نہیں رہتا۔

اسلامی نظام میں تقسیم دولت میں محنت، ضرورت اور ملکیت سب کو دخل ہے۔ اسلامی نظام اقتصاد میں تقسیم دولت کی بنیاد محنت ہے۔ محنت پر ملکیت مترتب ہوتی ہے اور تقسیم کی دوسری بنیادی چیز ضرورت ہے۔ جس سے پہلے گروہ کے لوگ تیسرے گروہ کی ضرورت پوری کریں گے۔ اس پہلے گروہ سے اسلام تیسرے گروہ کا حق لے کر دیتا ہے کیونکہ تیسرے گروہ کا حق پہلے گروہ پر عائد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ [1]

اور جن کے اموال میں معین حق ہے، سائل اور محروم کے لیے۔

دولت کی عادلانہ تقسیم میں خمس اور زکوٰۃ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ خمس کے تحت پہلے گروہ کی سالانہ بچت کا پانچواں حصہ تیسرے گروہ کا حق ہوتا ہے۔

خمس عہد رسالت کی تحریر میں: یہ بات ان ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ خمس صرف جنگی غنیمت میں ہے۔ ہم عہد نبویؐ کی ان تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں جن میں رسول

---

[1] ۷۰ معارج: ۲۴۔ ۲۵

اسلامؐ نے مختلف علاقوں سے آنے والے وفود اور مختلف قبائل کو دینے والے امان ناموں میں، جہاں اطاعت رسولؐ اور برائت از مشرکین، نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا ہے، وہاں ادائے خمس کا بھی حکم صادر فرمایا ہے:

۱۔ قبیلہ عبد القیس کا ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے بنی مضر کے مشرکین حائل ہیں۔ ہم صرف حرمت والے چار مہینوں میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا آپؐ ہمیں ان باتوں کا حکم دیں جن پر عمل کرنے سے ہم جنت میں داخل ہوں۔ آپؐ نے فرمایا:

آمرکم باربع و انهاکم عن اربع آمرکم بالایمان باللّٰه و هل تدرون ما الایمان باللّٰه شهادة ان لا اله الا اللّٰه و اقام الصلوة و ایتاء الزکوة و تعطوا الخمس من الغنم ....[1]

چار چیزوں کا حکم دیتا ہوں۔ چار چیزوں سے منع کرتا ہوں۔ حکم دیتا ہوں ایمان باللہ کلمہ کا۔ جانتے ہو ایمان باللہ کیا ہے؟ لا الہ الا اللہ کی شہادت۔ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا اور منافع پر خمس دینا....۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ جو لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہونے سے قاصر ہیں، وہ مشرکین سے لڑ کر مال غنیمت تو حاصل نہیں کر سکتے تھے جس کا وہ خمس دیں۔ لہٰذا حتماً منافع کا خمس مراد ہے۔

۲۔ عمرو بن حزم انصاری کو یمن روانہ کرتے ہوئے حضورؐ نے خمس اور زکوٰۃ جمع کرنے کا حکم دیا۔[2]

۳۔ قبائل سعد اور جزام کے نام آپؐ نے ایک حکم نامہ تحریر فرمایا کہ اپنے واجب الادا خمس، حضورؐ کے دو نمائندوں اُبی اور عنبسہ کے حوالے کریں۔[3]

۴۔ حارث بن عبد الکلال اور نعمان حمیر کے حکمرانوں کے نام ایک تحریر میں ادائے خمس پر حضورؐ نے ان کی توصیف فرمائی۔[4]

۵۔ قبیلہ بنی طی کی شاخ بن جوین کے نام ایک امان نامہ میں دیگر احکام کے ساتھ خمس کی ادائیگی کی شرط عائد فرمائی۔[5]

۶۔ نهشل بن مالك وائلی قبیلہ باهله کے سردار کے نام ایک امان نامہ میں دیگر احکام کے ساتھ خمس اور سہم رسولؐ کی ادائیگی کی شرط عائد فرمائی۔[6]

۷۔ عمرو بن معبد الجهنی بنی حرقه اور بنی جُرمز کے نام ایک امان نامے میں دیگر احکام کے ذکر کے ساتھ ادائے خمس کی شرط بھی عائد فرمائی۔[7]

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان حدیث ۲۵، صحیح بخاری کتاب التوحید باب واللّٰه خلقکم

[2] فتوح البلدان ۱: ۸۴۔ سیرة هشام ۴: ۲۶۵　[3] طبقات ابن سعد ۱: ۲۷۰

[4] فتوح البلدان ۱: ۸۵۔ سیرة هشام ۴: ۲۵۸۔ مستدرك حاکم ۱: ۳۹۵　[5] طبقات ابن سعد ۱: ۲۶۹

[6] طبقات ابن سعد ۱: ۳۳　[7] طبقات ابن سعد ۱: ۲۴

۸۔ مالك بن احمد جذامی اور اس کے پیروکاروں کے نام ایک امان نامہ عطا فرمایا۔ اس میں بھی نماز، زکوٰۃ اور مشرکین سے قطع تعلقات کے ساتھ ادائے خمس کی بھی شرط عائد فرمائی ہے۔[۱]

۹۔ بنی زهیر بن اقیش کو آپؐ نے ایک امان نامہ عنایت فرمایا، جس میں کلمہ توحید کا اقرار، نماز، زکوٰۃ اور مشرکین سے لاتعلقی کے ساتھ خمس اور پیغمبرؐ کے خاص حقوق کی ادائیگی کی شرط عائد فرمائی۔[۲]

۱۰۔ صیفی بن عامر قبیلہ بنی ثعلبہ کے سردار کے نام ایک امان نامے میں دیگر احکام کے ساتھ خمس و حق رسولؐ کی ادائیگی کی شرط عائد فرمائی۔[۳]

۱۱۔ جناده اردی اور اس کی قوم کے نام ایک امان نامے میں حضورؐ نے نماز، زکوٰۃ اور اطاعت رسولؐ کے ساتھ خمس کی ادائیگی کی شرط عائد فرمائی ۔[۴]

۱۲۔ فُجیع بن عبد اللّٰہ قبیلہ بنی عامر کے وفد کے سربراہ کو ایک دستاویز مرحمت فرمائی، جس میں نماز، زکوٰۃ اور اطاعت رسولؐ کے ساتھ خمس کی شرط کا بھی ذکر فرمایا۔[۵]

۱۳۔ جهينه بن زید قبیلہ قحطان کی سرآوردہ شخصیت کے نام ایک خط میں حضورؐ نے ان کو بعض سہولتوں کی فراہمی کا ذکر فرمایا۔ اس میں یہ شرط عائد فرمائی کہ وہ خمس ادا کریں۔[۶]

۱۴۔ بنی معاویه بن جروَل کے نام ایک امان نامے میں خمس اور سہم رسولؐ کی آپؐ نے شرط عائد فرمائی۔[۷]

ان تمام تحریروں میں خمس کا جو حکم رسول اللہؐ نے صادر فرمایا ہے، وہ ان قبائل، اقوام کے بارے میں ہے جو کسی قسم کی جنگ و غنیمت جنگ کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ثانیاً اسلامی جنگوں میں ضروری ہے کہ سربراہ اسلام کی اجازت سے جنگ لڑی جائے۔ ہر شخص اور ہر قبیلے کو یہ اجازت ہی نہیں کہ وہ اپنے مقابل کافر قبیلے سے جب چاہے جنگ کرے اور غنیمت پر خمس ادا کرے بلکہ اعلان جنگ اور غنیمت دونوں کا اختیار خود رسول اللہؐ کے پاس تھا۔ آپؐ کے حکم سے ہی جنگ لڑی جاتی تھی۔

بچت پر خمس: قدیم اور متاخر علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بچت پر خمس ہے۔ یہاں اس مسئلے میں کسی کی طرف اختلاف کی نسبت نہیں دی گئی، سوائے ابن جنید اور ابن ابی عقیل کے۔ ان دونوں کی طرف اختلاف کی نسبت اگر صحیح بھی ہے تو وہ اس لیے ہے کہ ان سے جو عبارت نقل کی گئی ہے اس میں عبارت واضح نہیں ہے۔ لہٰذا یہ نسبت اجماع قائم ہونے میں حائل نہیں بن سکتی۔[۸]

---

۱ اسد الغابۃ ۴: ۱۷۱ ۲ سنن نسائی ۲: ۱۷۹۔ سنن ابی دائود ۲: ۲۔ سنن بیهقی ۶: ۳۰۳

۳ الاصابۃ ۲: ۱۸۹۔ اسد الغابۃ ۳: ۳۴۔ طبقات ابن سعد ۱: ۲۹۸ ۴ کنز العمال ۵: ۳۲۰۔ طبقات ابن سعد ۱: ۲۷۰

۵ طبقات ابن سعد ۱: ۳۰۵ ۶ کنز العمال ۷: ۶۵۔ اسد الغابۃ ۴: ۱۷۴ ۔ جمع الجوامع ۷ طبقات ابن سعد ۱: ۲۶۹

۸ مستند العروۃ کتاب الخمس امام خوئیؒ

شیعہ سنی سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بنی ہاشم پر صدقہ حرام ہے۔ یہاں تک ان کو صدقات و زکوٰۃ کے محصل کے طور پر بھی ملازم بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ اس بات پر شیعہ سنی دونوں طریقوں سے متواتر روایات موجود ہیں۔ ان میں سے بعض میں اس بات کی صراحت بھی ہے کہ زکوٰۃ کی بجائے ان کے لیے خمس مقرر کیا گیا ہے۔

چنانچہ فضل بن عباس اور عبد المطلب بن ربیعہ کی ازدواج کے بارے میں رسول اللہؐ سے درخواست کی گئی کہ ان دونوں کو زکوٰۃ و صدقات جمع کرنے کا کام سونپا جائے تا کہ اس کی اجرت سے وہ شادی کر سکیں۔ حضورؐ نے فرمایا:

ان الصدقة لا تنبغی لآل محمد انما هی أوساخ الناس۔[1] آل محمد کے لیے صدقہ جائز نہیں ہے یہ تو لوگوں کا میل کچیل ہے۔

اس کے بعد خمس کے خزانہ دار جناب محمدیہ کو حکم دیا کہ ان کی شادی کے اخراجات خمس سے پورے کریں.

اگر خمس صرف جنگی غنیمت پر واجب ہے تو بنی ہاشم کے فقراء کی ضرورت کہاں سے پوری ہوگی اور اسلام کی عادلانہ تقسیم دولت میں اس خلا کو کیسے پر کیا جائے گا؟ جب کہ اسلام امن کا پیغام دیتا ہے۔ اس نے دائماً جنگ تو نہیں لڑنی کہ جنگی غنیمت سے اس خلا کو پر کیا جا سکے۔

بچت پر خمس۔ احادیث کی روشنی میں: اس سلسلے میں سب سے اہم دلیل معصومین علیہم السلام کے ارشادات ہیں:

سماعہ راوی ہیں کہ میں نے حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام سے خمس کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

فِی کُلِّ مَا اَفَادَ النَّاسُ مِنْ قِلِیلٍ أَوْ کَثِیرٍ۔[2] جو آمدنی انسان کو حاصل ہو چاہے وہ کم ہو یا زیادہ اس پر خمس ہے۔

علی بن مہزیار کی صحیح السند روایت میں معصومؑ نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ ہر قسم کی کمائی پر خمس ہے۔

اس سلسلے میں آپؑ نے فرمایا:

عَلَیهِ الْخُمُسُ بَعدَ مَئُونَتِهِ وَ مَئُونَةِ عِیَالِهِ وَ بَعدَ خَرَاجِ السُّلْطَانِ ۔[3] ہاں اس پر خمس ہے اپنا اور اپنے اہل وعیال کے سال بھر کے اخراجات اور حکومت کا ٹیکس ادا کرنے کے بعد.

---

[1] صحیح مسلم باب تحریم الزکوة لآل النبی۔ سنن نسائی باب استعمال آل النبی۔ سنن ابی دائود کتاب الخراج باب بیان مواضع الخمس۔

[2] وسائل الشیعة ۹ : ۵۰۳۔ باب ۸ وجوب الخمس فیما یفضل ...۔

[3] وسائل الشیعة ۹ : ۵۰۰ باب ۸ وجوب الخمس فیما یفضل ...۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

لَا یَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ یَشْتَرِیَ مِنَ الْخُمُسِ شَیْئاً حَتّٰی یَصِلَ اِلَیْنَا حَقُّنَا۔[1]

خمس سے جب تک ہمارا حق ادا نہ کرے، کوئی چیز خریدنا حلال نہیں ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

لَا یُعْذَرُ عَبْدٌ اشْتَرَی مِنَ الْخُمُسِ شَیْئاً اَنْ یَقُولَ یَا رَبِّ اشْتَرَیْتُهُ بِمَالِی حَتَّی یَأْذَنَ لَهُ اَهْلُ الْخُمُسِ۔[2]

خمس کی رقم سے کوئی چیز خریدنے والا یہ کہنے سے نہیں چھوٹ جائے گا: اے رب یہ خریداری تو میں نے اپنے مال سے کی تھی مگر یہ کہ خمس کے حقدار اس کی اجازت دے دیں۔

اِذۡ اَنۡتُمۡ بِالۡعُدۡوَۃِ الدُّنۡیَا وَ ہُمۡ بِالۡعُدۡوَۃِ الۡقُصۡوٰی وَ الرَّکۡبُ اَسۡفَلَ مِنۡکُمۡ ؕ وَ لَوۡ تَوَاعَدۡتُّمۡ لَاخۡتَلَفۡتُمۡ فِی الۡمِیۡعٰدِ ۙ وَ لٰکِنۡ لِّیَقۡضِیَ اللّٰہُ اَمۡرًا کَانَ مَفۡعُوۡلًا ۬ۙ لِّیَہۡلِکَ مَنۡ ہَلَکَ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ وَّ یَحۡیٰی مَنۡ حَیَّ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَسَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ (وہ وقت یاد کرو) جب تم قریبی ناکے پر اور وہ دور کے ناکے پر تھے اور قافلہ تم سے نیچے کی جانب تھا اور اگر تم باہمی مقابلے کا عہد کر چکے ہوتے تب بھی مقررہ وقت میں تم ضرور اختلاف کرتے لیکن (جو کچھ ہوا وہ) اس لیے تھا کہ اللہ اس امر کو پورا کرے جس کا فیصلہ کر چکا تھا تاکہ ہلاک ہونے والا واضح دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور زندہ رہنے والا واضح دلیل کے ساتھ زندہ رہے اور یقیناً اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

تشریح کلمات

عُدوۃ: (ع د و) ایک جانب ناکہ۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں جنگ بدر کا نقشہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان مدینہ سے قریب ترین تھے، جہاں ریت تھی، حرکت کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی، پانی بھی میسر نہ تھا اور دشمن میدان کے دورترین نشیبی علاقے میں تھا، جہاں زمین سخت تھی اور قافلہ ابوسفیان نشیبی علاقے، سمندر کے قریب سے گزر رہا تھا۔ لہٰذا جنگی

---

[1] وسائل الشیعۃ ۹: ۴۸۴۔ باب وجوبہ۔ العروۃ الوثقی خمس

[2] وسائل الشیعۃ ۹: ۵۴۲۔ باب ۳ وجوب ایصال حصۃ الامام۔۔۔

حکمت عملی کے اعتبار سے مسلمان نہایت نامساعد مقام پر اور دشمن نہایت مناسب مقام پر تھا اور ساتھ مشرکین کو یہ اطمینان بھی حاصل ہو گیا تھا کہ ان کا قافلہ مسلمانوں کی دست رسی سے نکل چکا ہے۔ وہ اب مشرکین کی کمک کر سکتے ہیں اور مسلمانوں کے لیے کسی قسم کی کمک کا امکان بھی نہیں ہے اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ مسلمان تو ایک تجارتی قافلے کا راستہ روکنے اور کافروں کی طاقت کو توڑنے کے لیے نکلے تھے۔ اچانک ۳۱۳ کا مختصر اور بے سروسامان لشکر، ایک ہزار افراد پر مشتمل مسلح طاقتور لشکر کے مقابلے میں آ گیا۔

غرض مسلمان کسی اعتبار سے بھی جنگ لڑنے کی پوزیشن میں نہ تھے اور نہ ہی مسلمان کسی جنگ کے لیے نکلے تھے۔

۱۔ وَلَوۡ تَوَاعَدۡتُّمۡ لَاخۡتَلَفۡتُمۡ فِی الۡمِیۡعٰدِ: ایسے نامساعد حالات میں اگر جنگ کا فیصلہ کر لیتے تو آپس میں پھوٹ پڑ جاتی اور اختلاف کا شکار ہونے کے باعث اس جنگ کی نوبت نہ آتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ طرفین کو سوچنے کا موقع میسر آئے بغیر یہ فیصلہ کن جنگ ہو جائے۔

۲۔ لِّیَقۡضِیَ اللّٰہُ اَمۡرًا کَانَ مَفۡعُوۡلًا: تاکہ اللہ اس امر کو پورا کر دے جس کا وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ یہ تھا کہ اس جنگ کے دن کو یوم الفرقان قرار دیا جائے۔ یعنی اسلام کی واضح فتح اور کفر کی عبرتناک شکست کا دن۔

۳۔ لِّیَہۡلِکَ مَنۡ ہَلَکَ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ وَّ یَحۡیٰی مَنۡ حَیَّ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ: تاکہ ہلاک ہونے والا واضح دلیل کے ساتھ ہلاک ہو۔ اس پر حجت پوری ہونے کی وجہ سے کوئی عذر باقی نہ رہے اور زندہ رہنے والا واضح دلیل کے ساتھ زندہ رہے یعنی پختہ یقین کے ساتھ ایمان پر قائم رہے۔

بدر کا واقعہ ایک معجزہ ایک واضح دلیل اور حق کا ایک بین ثبوت تھا۔ جو کافر کے لیے حجت اور ہلاکت کا باعث اور مؤمن کے لیے سامان حیات و ایمان ثابت ہوا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کوتاہ بین انسان حکمیت الٰہیہ کا ادراک نہیں کر سکتا: وَلَوۡ تَوَاعَدۡتُّمۡ لَاخۡتَلَفۡتُمۡ ....

۲۔ اللہ بہتر نتائج کے لیے مؤمنوں کو مشکلات میں ڈال دیتا ہے: لِّیَقۡضِیَ اللّٰہُ اَمۡرًا کَانَ مَفۡعُوۡلًا۔

۳۔ اللہ دلیل دینے کے بعد ہلاکت میں ڈال دیتا ہے یا ایمان کے درجہ پر فائز فرماتا ہے۔

اِذۡ یُرِیۡکَہُمُ اللّٰہُ فِیۡ مَنَامِکَ قَلِیۡلًا ؕ وَ لَوۡ اَرٰىکَہُمۡ کَثِیۡرًا لَّفَشِلۡتُمۡ وَ لَتَنَازَعۡتُمۡ فِی

۴۳۔ (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ نے آپ کے خواب میں (کافروں کے لشکر کو) تھوڑا دکھلایا اور اگر آپ کو ان کی مقدار زیادہ دکھلاتا تو (اے مسلمانو) تم ہمت ہار جاتے اور اس معاملے میں

الۡاَمۡرِ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ سَلَّمَ ؕ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۴۳﴾

جھگڑا شروع کر دیتے لیکن اللہ نے (تمہیں) بچا لیا، بے شک وہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

وَ اِذۡ یُرِیۡکُمُوۡہُمۡ اِذِ الۡتَقَیۡتُمۡ فِیۡۤ اَعۡیُنِکُمۡ قَلِیۡلًا وَّ یُقَلِّلُکُمۡ فِیۡۤ اَعۡیُنِہِمۡ لِیَقۡضِیَ اللّٰہُ اَمۡرًا کَانَ مَفۡعُوۡلًا ؕ وَ اِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم مقابلے پر آ گئے تھے تو اللہ نے کافروں کو تمہاری نظروں میں تھوڑا کر کے دکھایا تا کہ اللہ کو جو کام کرنا منظور تھا وہ کر ڈالے اور تمام معاملات کی بازگشت اللہ کی طرف ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذۡ یُرِیۡکَہُمُ اللّٰہُ: یہاں دو حالتوں، خواب اور بیداری میں کافروں کی تعداد کو تھوڑا کر کے دکھانے کا ذکر ہے۔ مدینے سے نکل رہے تھے، راستے میں کسی جگہ حضورؐ نے خواب میں دشمنوں کے لشکر کو دیکھا کہ ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ آپؐ نے یہ خواب مسلمانوں کو سنایا، جس سے ان میں ہمت بڑھی۔ انبیاء (ع) کے خواب سچے ہوتے ہیں۔ یہاں کافروں کی قلت سے مراد تعدادی نہیں، استعدادی ہے کہ وہ قوت و ہمت اور جنگی اعتبار سے بے وزن اور کھوکھلے ہیں۔

۲۔ اِذۡ یُرِیۡکُمُوۡہُمۡ: دوسری آیت میں عالم بیداری میں جب مسلمانوں کا کافروں سے مقابلہ ہوا تو کافروں کو مسلمانوں کی نظر میں کم کر کے دکھایا تا کہ مسلمانوں کا حوصلہ بلند رہے اور ساتھ کافروں کی نظر میں مسلمانوں کو بھی کم کر کے دکھایا تا کہ وہ اس جنگ کو آسان سمجھیں اور زیادہ منظم اور طاقت صرف کرنے کی ضرورت محسوس نہ کریں۔ اس طرح کافروں کی شکست کے سامان فراہم ہو جائیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ کو جو کام کرنا منظور ہوتا ہے، اسے انجام دینے کے لیے علل و اسباب کا راستہ اختیار فرماتا ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا لَقِیۡتُمۡ فِئَۃً فَاثۡبُتُوۡا وَ اذۡکُرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا لَّعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿ۚ۴۵﴾

۴۵۔ اے ایمان والو! جب کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

تفسیر آیات

ان آیات میں جنگ و جدال کے لیے ایسی ہدایات کا ذکر ہے جن پر کامیابی کا انحصار ہے:

۱۔ ثبات قدم: جنگ میں سب سے زیادہ ثابت قدمی فیصلہ کن کردار کرتی ہے کیونکہ ثابت قدم نہ ہونے کی صورت میں لغزش قدم یعنی میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کی نوبت آتی ہے۔ ثبات قدم کی صورت میں دوسرے جنگی وسائل بروئے کار لائے جا سکتے ہیں، ورنہ لرزتے ہاتھوں میں دنیا کا بہترین اسلحہ بھی صحیح کام نہیں کر سکتا۔

۲۔ ذکر خدا: طاقت و قوت کے اصل سرچشمہ سے مربوط اور منسلک رہنا۔ جنگ میں ذکر خدا کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کے عوامل کیا ہیں؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ کس لیے یہ جنگ لڑی جا رہی ہے؟ ان تمام مراحل میں اللہ کو یاد رکھا جائے۔ کہیں انسان اللہ کو فراموش کر کے دوسرے عوامل کو سامنے نہ رکھے۔ اگر جنگ اللہ کے لیے لڑی جائے تو اس پر توکل اور بھروسا ہو گا۔ فتح و نصرت کی نوید پر اعتماد آئے گا۔ خدا کے لیے لڑی جانے والی جنگ میں فتح یا شہادت نصیب ہو گی اور یہ ایسی جنگ ہے جس میں کامیابی یقینی ہے۔ ایسی جنگ میں ثابت قدمی بھی یقینی ہو جاتی ہے۔ اگر جنگ میں ذکر خدا جیسی روحانی طاقت کارفرما نہ ہو تو مال و اولاد، دنیاوی زندگی اور دوسرے غیر خدائی عوامل انسان کے قدموں میں لغزش پیدا کرتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ ذکر خدا امر قلبی ہے جو انسان سے ایک توجہ کے سوا وقت اور طاقت نہیں مانگتا۔ اس لیے کثرت سے ذکر خدا کرنے کا حکم دیا ہے۔ کسی اور عبادت کے لیے کَثِیۡرًا کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

۲۔ جہاد کے وقت ذکر خدا کا بہترین نمونہ عمل، سیرت علی علیہ السلام ہے کہ دشمن نے آپؑ کے منہ پر تھوکا تو اس کے سینہ سے اتر آئے اور اسے چھوڑ دیا کہ کہیں یہ قتل ذاتی انتقام کے تحت عمل میں نہ آئے۔

وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ لَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَ تَذۡہَبَ رِیۡحُکُمۡ وَ اصۡبِرُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿ۚ۴۶﴾

۴۶۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں نزاع نہ کرو ورنہ ناکام رہو گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر سے کام لو بے شک اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔

تشریح کلمات

فَتَفۡشَلُوۡا: الفشل (ف ش ل) کے معنی کمزوری کے ساتھ بزدلی کے ہیں۔

تفسیر آیات

۳۔ اطاعت اور تعمیل حکم: دوسرے لفظوں میں تنظیم اور ڈسپلن کو جنگی حکمت عملی میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جیسا کہ تمام عسکری قوانین میں اس بات کو اولیت دی جاتی ہے۔

۴۔ باہمی نزاع سے احتراز کرنا: اگرچہ ہر معاشرے کو اتحاد کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے. تاہم اس کی ضرورت جنگ میں زیادہ ہوتی ہے۔ باہمی نزاع اطاعت اور قیادت کے فقدان کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

قیادت اور اطاعت ہونے کی صورت میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے مگر نزاع نہیں ہوتا۔ اطاعت نہ ہونے کی صورت میں نزاع اور نزاع ہونے کی صورت میں دو نتائج سامنے آئیں گے: ناکامی اور کمزوری۔

چنانچہ احد کی جنگ میں قیادت کے احکام کی پابندی نہ کرنے کی صورت میں شکست سامنے آ گئی۔

۱۔ وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ: خدا اور رسول کی طرف سے جو جنگی احکام اور حربی قوانین تم کو بتائے جائیں گے ان کی اطاعت کرو۔

۲۔ وَلَا تَنَازَعُوۡا: عدم اطاعت کی صورت میں عسکری نظام، اختلاف پھر نزاع کا شکار ہو جائے گا۔ نزاع کی صورت میں دو ایسے نتائج سامنے آئیں گے جو اسلامی نظام کے لیے قابل تحمل نہیں ہیں:

الف۔ فَتَفۡشَلُوۡا: نزاع کا پہلا نتیجہ ناکامی اور شکست ہے۔ نزاع میں آراء متصادم ہوتی ہیں اور کوئی رائے قابل عمل نہیں رہتی۔

ب۔ وَتَذۡهَبَ رِيۡحُكُمۡ: دوسرا نتیجہ، قوت و شوکت کی ہوا اکھڑ جاتی ہے جس سے اسلامی لشکر میں کمزوری اور دشمن کو تقویت مل جاتی ہے۔

۳۔ وَاصۡبِرُوۡا: میدان حرب ہے، جہاں مسائل و مشکلات کے علاوہ کسی اور چیز کی کیا توقع رکھی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے واحد اسلحہ صبر ہے۔

۴۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ: صبر و ثبات کو اللہ پسند فرماتا اور ساتھ دیتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ نزاع ہمیشہ اطاعت خدا و رسول کے مقابلے میں نفس پرستی سے پیش آتا ہے۔

۲۔ مسلمان ناکام اور کمزور، اطاعت و تنظیم کے فقدان کی وجہ سے ہیں۔

وَلَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ

۴۷۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لیے

وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ مُحِیۡطٌ ﴿۴۷﴾	لیے نکلے ہیں اور اللہ کا راستہ روکتے ہیں اور اللہ ان کے اعمال پر خوب احاطہ رکھتا ہے۔

تشریح کلمات

بَطَرًا: البطر۔ (ب ط ر) وہ حالت، جو خوشحالی کے غلط استعمال اور حق نعمت میں کوتاہی سے انسان کو لاحق ہوتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا تَکُوۡنُوۡا: کفار قریش جس حال میں نکلے تھے، اس کی طرف اشارہ ہے۔ وہ رقص و سرود، مے نوشی کی محفلیں جماتے ہوئے غرور وتکبر کے ساتھ نکلے تھے اور ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو کر انہیں واپس جانا پڑا۔

جنگی تاریخ میں اس بات پر بے شمار شواہد موجود ہیں کہ جو لشکر خود بینی و تکبر اور غرور کا شکار رہا وہ شکست سے دوچار ہوا ہے۔

بدر کی فتح کے بعد مسلمانوں کو تکبر و غرور سے بچانے کے لیے اس تنبیہ کی ضرورت پیش آئی۔

۲۔ وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ: ان لوگوں کی طرح بھی مت ہونا جو اللہ کی طرف جانے کا راستہ روکنے کے لیے جنگ کرنے نکلتے ہیں۔ یعنی ان کا عزم و ارادہ بھی مجرمانہ ہے۔ لہٰذا اسلامی لشکر کو ان دونوں باتوں سے پاک ہونا چاہیے۔ یعنی تکبر وغرور نہیں ہونا چاہیے اور ارادہ بھی پاکیزہ ہونا چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ تکبر وغرور کا انجام ذلت وخواری ہے۔

وَاِذۡ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَہُمۡ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَکُمُ الۡیَوۡمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیۡ جَارٌ لَّکُمۡ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الۡفِئَتٰنِ نَکَصَ عَلٰی عَقِبَیۡہِ وَقَالَ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّنۡکُمۡ اِنِّیۡۤ اَرٰی مَا لَا تَرَوۡنَ اِنِّیۡۤ اَخَافُ	۴۸۔ اور جب شیطان نے ان کے اعمال آراستہ کر کے انہیں دکھائے اور کہا: آج لوگوں میں سے کوئی تم پر فتح حاصل کر ہی نہیں سکتا اور میں تمہارے ساتھ ہوں، پھر جب دونوں گروہوں کا مقابلہ ہوا تو وہ الٹے پاؤں بھاگ گیا اور کہنے لگا: میں تم لوگوں سے بیزار ہوں میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے، میں تو اللہ سے ڈرتا

اللّٰہَ ؕ وَاللّٰہُ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۴۸﴾　　ہوں اور اللہ یقیناً سخت عذاب دینے والا ہے۔

تشریح کلمات

نَکَصَ: (ن ك ص) النکوص۔ کسی چیز سے پیچھے ہٹنا۔

الفئة: (ف ی ء) اس جماعت کو کہتے ہیں، جس کے افراد تعاون کے لیے ایک دوسرے کی طرف لوٹ کر آئیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاِذۡ زَیَّنَ: اس آیت میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ شیطان نے نہ صرف وسوسۂ قلبی کے ذریعے بلکہ محسوس انداز میں مشرکین کو جنگ کے لیے آمادہ کیا۔

۲۔ وَقَالَ لَا غَالِبَ: اور یہ باور کرایا کہ حجاز میں اس وقت کون سی طاقت ہے جو قریش پر غالب آ سکے۔

۳۔ وَاِنِّیۡ جَارٌ لَّکُمۡ :اور کسی ذریعے سے اس نے یہ باور کرایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ چنانچہ شیطان اس مقصد کے لیے مشرکین میں سے اپنے شیطانی لوگوں کو استعمال کرتا ہے۔ وہ آگے آتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم تمہاری مدد کے لیے تیار ہیں۔

۴۔ فَلَمَّا تَرَآءَتِ: بعد میں جب فرشتوں کو دیکھا یا دوسرے آثار سے شیطان کو علم ہوا کہ مسلمانوں کی فتح ہو رہی ہے تو اظہار بیزاری کر کے وہ بھاگ گیا۔ جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس نے یہ کام بنی کنانہ کے سردار سراقہ بن مالك کی شکل میں آ کر کیا۔

اہم نکات

۱۔ شیطان وہ کچھ دیکھتا ہے جو عام انسان نہیں دیکھ سکتا: اِنِّیۡۤ اَرٰی مَا لَا تَرَوۡنَ ....

۲۔ علم، خوف کا سبب ہے، خواہ شیطان ہی کیوں نہ ہو: اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ ....

۳۔ برائی کے ارتکاب کے لیے شیطان حوصلہ دیتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جب ارتکاب کر چکتا ہے تو شیطان ساتھ چھوڑ دیتا ہے: وَقَالَ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّنۡکُمۡ ....

اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِیۡنُهُمۡ ؕ وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ

۴۹۔ جب (ادھر) منافقین اور جن کے دلوں میں بیماری تھی، کہ رہے تھے: انہیں توان کے دین نے دھوکہ دے رکھا ہے، جب کہ اگر کوئی اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے تو اللہ یقیناً بڑا غالب آنے

فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝٤٩ والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ : اس آیت میں دو گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک منافقین کا جو دل میں کفر رکھتے ہیں اور بظاہر اسلام کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو ایمان کی منزل پر فائز نہیں ہیں تاہم وہ انکار بھی نہیں کرتے بلکہ اس جدید دین کے بارے میں شک و تردد کا شکار ہیں۔ یہ دونوں گروہ واقعات کو صرف ظاہری و مادی علل و اسباب کے پیمانے پر تولتے تھے۔ وہ ان ظاہری علل و اسباب کے ماوراء میں موجود دیگر علل و اسباب کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ پھر وہ ان سب کے ماوراء میں موجود علت العلل کو کیسے سمجھ سکتے تھے۔

۲۔ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ : وہ طنز و استہزاء کے طور پر کہتے تھے: مٹھی بھر مسلمانوں کا نہایت بے سر و سامانی میں قریش کے طاقتور لشکر کے مقابلے میں آنا خودکشی، بیوقوفی اور حماقت ہے۔ ان کو اس نظریے نے دھوکہ میں ڈالا ہے کہ ہم مسلمان ہیں، ہم حق پر ہیں وغیرہ۔ یہ بیچارے اس غلط فہمی میں مارے جائیں گے۔ اپنے آپ کو تباہ کریں گے۔

۳۔ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ : آیت کے دوسرے حصے میں اس کا جواب ہے کہ جو اللہ پر توکل کرتا ہے تو اللہ غالب آنے والا ہے۔ اللہ طاقت کا سرچشمہ ہے اور حکیم ہے۔ اس کا کوئی بھی عمل حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔

اہم نکات

۱۔ حق والے ہمیشہ نفاق اور اہل شک کے طنز و استہزاء کا ہدف بنتے رہتے ہیں: غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ..

۲۔ کامیابی و ناکامی کے لیے مادی علل و اسباب کے ساتھ غیر مادی علل و اسباب بھی کارفرما ہوتے ہیں: وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ....

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝٥٠

۵۰۔ اور کاش آپ (اس صورت حال کو) دیکھ لیتے جب فرشتے (مقتول) کافروں کی روحیں قبض کر رہے تھے، ان کے چہروں اور پشتوں پر ضربیں لگا رہے تھے اور (کہتے جا رہے تھے) اب جلنے کا عذاب چکھو۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ

۵۱۔ یہ عذاب تمہارے اپنے ہاتھوں آگے بھیجے

لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ ﴿۵۱﴾	ہوئے کا نتیجہ ہے ورنہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ یَتَوَفَّی: التوفی۔ پورا حق وصول کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ قرآن میں بیشتر قبض روح کے لیے استعمال ہوا ہے۔

۲۔ الۡمَلٰٓئِکَۃُ: یہ قبض روح کرنے والے فرشتے ہوتے ہیں جب کہ سورہ سجدہ آیت ۱۱ میں فرمایا:

قُلۡ یَتَوَفّٰىکُمۡ مَّلَکُ الۡمَوۡتِ الَّذِیۡ وُکِّلَ بِکُمۡ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ	کہدیجیے: موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تمہاری روحیں قبض کرتا ہے ....

ان دونوں آیتوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ملک الموت (عزرائیل) کے کارندے، دیگر فرشتے ہوتے ہیں جو لوگوں کی روحیں قبض کرتے ہیں۔

معرکہ بدر کی فتح و نصرت میں ظاہری علل و اسباب کے ماوراء میں غیر مرئی علل و اسباب کا ذکر ہے کہ فرشتے کافروں کی روحیں قبض کر رہے ہیں اور ذلت و خواری کے ساتھ ان کو آتش جہنم کی طرف لے جا رہے ہیں۔

۳۔ یَضۡرِبُوۡنَ: فرشتے روحیں قبض کرنے کے وقت سے ان پر عذاب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

۴۔ وَ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ: جلنے کا عذاب چکھو۔ اس سے معلوم ہوا حالت قبض روح سے برزخ کا عذاب شروع ہو جائے گا۔

۵۔ ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتۡ: یہ سزا خود ان کی حرکتوں کا لازمی نتیجہ اور مکافات عمل ہے۔ بلاوجہ عذاب دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ایسا کرنا ظلم ہے۔ ظلم وہ کرتا ہے جسے اس کی ضرورت ہو یا اس کے ذریعے وہ اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کرے۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے مبرا ہے۔ لہٰذا اس سے ظلم صادر نہیں ہوتا۔

اہم نکات

۱۔ قبض روح کے لیے ملک الموت کے کارندے، فرشتے ہوتے ہیں: یَتَوَفَّی الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الۡمَلٰٓئِکَۃُ ....

۲۔ عذاب کا سبب انسان کا اپنا عمل ہے: قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ ....

کَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ۙ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ	۵۲۔ ان کا حال فرعونیوں اور ان سے پہلوں کی طرح ہے، انہوں نے اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوۡبِهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۵۲﴾

تو اللہ نے ان کے گناہوں کے باعث انہیں پکڑ لیا بے شک اللہ قوت والا سخت عذاب دینے والا ہے.

تفسیر آیات

۱۔ کَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ: معرکہ بدر میں مشرکین کو جو ہزیمت اٹھانا پڑی ہے، وہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ سنت تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ یہ قانون تاریخ کی دفعات کے عین مطابق ہے،

۲۔ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ: جس کے تحت آل فرعون اور اس سے پہلے کے لوگوں کو بھی ان کے اپنے کرتوتوں کی پاداش میں اسی قسم کی ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمۡ یَكُ مُغَیِّرًا نِّعۡمَةً اَنۡعَمَهَا عَلٰی قَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِیۡعٌ

۵۳۔ ایسا اس لیے ہوا کہ اللہ جو نعمت کسی قوم کو عنایت فرماتا ہے اس وقت تک اسے نہیں بدلتا جب تک وہ خود اسے نہیں بدلتے اور اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت سے ایک نہایت قابل توجہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے جو بہت سے ذہنوں کے لیے پیچیدہ ہے۔ وہ یہ کہ کیا انسان تقدیر کے ہاتھوں یا مارکسزم کے نظریہ کے تحت پیداواری وسائل کے ہاتھوں یا دوسرے نظریات کے مطابق جبر تاریخ کے ہاتھوں مجبور ہے یا یہ انسان آزاد و خود مختار ہے۔

اس آیت میں یہ بات واضح ہو گئی کہ انسان کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس پر کوئی بات اس کے دائرۂ عمل کے باہر سے مسلط نہیں ہوتی۔ وہ کسی نعمت کو اپنے لیے جاری رکھ سکتا ہے اور اپنے ہی عمل سے ختم بھی کر سکتا ہے۔ لہٰذا انسان اپنی تقدیر خود اپنے عمل کے قلم سے لکھتا ہے اور اپنے ارادے کی روشنائی سے اس کی تدوین کرتا ہے۔

اللہ کی نعمت اور اس کی رحمت عام ہے اور اس کا فیض لامحدود ہے۔ تاہم اس نعمت کے لیے ظرفیت اور اہلیت بھی ضروری ہے اور یہ ظرفیت اور اہلیت عمل اور کردار سے بنتی ہے۔ مزید وضاحت سورۂ رعد کی آیت ۱۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

ان اللّٰہ قضی قضاءً حتماً لا ینعم علی العبدفیسلبها ایّاہ حتّی یحدث العبد ذنباً یستحق بذلك النقمة.[1]	اللہ نے یہ حتمی فیصلہ فرمایا ہے کہ وہ کسی بندے کو جب نعمت دیتا ہے تو اس وقت تک اس نعمت کو اس سے سلب نہیں فرماتا جب تک وہ ایسے گناہ کا ارتکاب نہ کرے جس سے وہ عذاب کا مستحق بنے۔

اہم نکات

۱۔ یہ انسان کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے کہ اس کا مقدر خود اس کے ہاتھ میں دیا ہے۔

۲۔ انسانی ارادہ وعمل کی عظمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے جن سے انسانی تقدیر سازی ہوتی ہے۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ۙ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ فَاَهۡلَكۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوۡا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۵۴﴾	۵۴۔ جیسے فرعون والوں اوران سے پہلوں کا حال ہے، انہوں نے اپنے رب کی نشانیوں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے گناہوں کے سبب انہیں ہلاکت میں ڈال دیا اور فرعونیوں کو غرق کر دیا کیونکہ وہ سب ظالم تھے۔

تفسیر آیات

سابقہ آیت میں تذلیل وتحقیر اور عذاب کے سلسلے میں سنت الٰہی کے لیے فرعونیوں کو بطور مثال پیش فرمایا اور اس آیت میں تغیر نعمت کے سلسلے میں سنت الٰہی کے لیے پھر فرعونیوں کا ذکر آیا کیونکہ سنت تاریخ کے اہم ابواب فرعونیوں کے دور میں مرتب ہوئے۔

اہم نکات

۱۔ ہلاکت گناہ کا مکافات ہے اور غرق ظلم کا نتیجہ ہے۔

۲۔ اللہ نہ کسی سے نعمت سلب کرتا ہے، نہ کسی کو عذاب دیتا ہے، مگر اینکہ وہ ظالم ہو۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۵﴾	۵۵۔ یقیناً اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والوں میں بدترین وہ لوگ ہیں جو کافر ہیں، پس وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

----

[1] الکافی: ۲: ۲۷۳

اَلَّذِیۡنَ عٰهَدۡتَّ مِنۡهُمۡ ثُمَّ یَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَهُمۡ فِیۡ کُلِّ مَرَّۃٍ وَّ هُمۡ لَا یَتَّقُوۡنَ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ جس سے آپ نے عہد لیا پھر وہ اپنے عہد کو ہر بار توڑ ڈالتے ہیں اور وہ ڈرتے نہیں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ: اس آیت اور اس کے بعد کی چند آیات میں چند ایک عسکری معاملات اور معاہدوں کا ذکر ہے۔ جو لوگ معاہدوں کی پاسداری نہیں کرتے، وہ اسلام کے نزدیک انسانی قدروں کے مالک نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ تمام زندہ موجودات اور زمین پر رینگنے والوں میں سب سے بدتر ہیں۔ لہٰذا اس شر کو جڑ سے کاٹ پھینکنا چاہیے۔

انسان جب انسانی قدروں کا مالک نہیں ہوتا تو وہ حیوانی قدروں سے بھی گیا گزرا ہوتا ہے کیونکہ جانوروں کا فطری تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کے لیے مسخر ہوں اور جانور تسخیری تقاضے پورے کرتے ہیں لیکن انسان جب انسانی قدروں سے عاری ہو جاتا ہے تو وہ کوئی بھی تقاضا پورا نہیں کرتا۔ اسی مطلب کو دوسری آیت میں اس طرح بیان فرمایا:

اِنۡ هُمۡ اِلَّا کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِیۡلًا ﴿﴾[1]

وہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

۲۔ فَهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ: ان لوگوں کے اندر موجود شر اس درجہ کا ہے کہ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ورنہ صرف کافر ہونے کی وجہ سے ایمان نہ لانا ضروری نہیں کیونکہ تقریباً ایمان لانے والے، ایمان لانے سے پہلے کافر ہی تھے۔

۳۔ اَلَّذِیۡنَ عٰهَدۡتَّ مِنۡهُمۡ: ایمان نہ لانے والے کافر، وہی لوگ ہیں جن کے ساتھ آپ نے معاہدہ کیا پھر ان کافروں نے اس عہد کو توڑ ڈالا۔ فِیۡ کُلِّ مَرَّۃٍ: ''ہر بار'' سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد توڑنے کا واقعہ کئی مرتبہ وقوع پذیر ہوا ہے۔ چنانچہ ابن عباس کی روایت کے مطابق بنی قریظہ کے لوگ مراد ہیں جنہوں نے رسول اللہؐ کے ساتھ معاہدہ کرنے کے بعد بدر کے موقع پر مشرکین کی کمک کی۔ اس پر بعد میں ان لوگوں نے معذرت کی کہ ہم سے غلطی ہوگئی دوبارہ ایسا نہ کرنے کا عہد کیا۔ پھر اس عہد کو جنگ خندق کے موقع پر توڑ دیا۔

اہم نکات

۱۔ معاہدوں کا احترام باہمی زندگی کے لیے بنیادی بات اور انسان کا ایک امتیاز ہے۔

[1] ۲۵ فرقان: ۴۴

۲۔ اس کی پاسداری نہ کرنے والے شَرَّ الدَّوَآبِّ، جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔

فَاِمَّا تَثۡقَفَنَّهُمۡ فِى الۡحَرۡبِ فَشَرِّدۡ بِهِمۡ مَّنۡ خَلۡفَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ يَذَّكَّرُوۡنَ﴿۵۷﴾

۵۷۔ اگر یہ لوگ لڑائی میں آپ کے ہاتھ آ جائیں تو (انہیں کڑی سزا دے کر) ان کے ذریعے بعد میں آنے والوں کو بھگا دیں، اس طرح شاید یہ عبرت حاصل کریں۔

تشریح کلمات

تَثۡقَفَنَّهُمۡ: الثقف (ث ق ف) تیزی کے ساتھ ہاتھ میں آنا اور درک کرنا۔

شرد: (ش ر د) بھگا دینا۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاِمَّا تَثۡقَفَنَّهُمۡ: اگر یہ عہد شکن لوگ لڑائی میں آپ کے ہاتھ آ جائیں تو ان کو ایسی عبرت ناک سزا دیں کہ آئندہ نہ صرف یہی لوگ عہد شکنی نہ کریں بلکہ ان کا حشر دیکھ کر ان کے بعد والے اس قسم کی حرکت کرنے کی جرات نہ کریں۔

۲۔ لَعَلَّهُمۡ يَذَّكَّرُوۡنَ: شاید آنے والے لوگ عبرت حاصل کریں۔ اس سے معلوم ہوا سزاؤں کی نظر صرف مجرم پر نہیں ہوتی بلکہ جرم پر ہوتی ہے۔

۳۔ عہد شکن لوگوں کے پاس انسانی قدریں نہیں ہوتیں، اس لیے اسلامی لشکر کو چاہیے کہ وہ اپنی طاقت و قوت کا مظاہرہ کرے اور ان لوگوں کا مقابلہ کرتے ہوئے صرف ان کو نظر میں نہ رکھے بلکہ آنے والے تمام عہد شکنوں کو سامنے رکھے اور ان کو عہد شکنی کی ایسی سزا دے کہ جو نہ صرف ان کے لیے عبرت ہو بلکہ آنے والے تمام بدعہدوں کے لیے بھی اس میں سبق ہو۔

اہم نکات

۱۔ سزاؤں کا مطمح نظر فردی نہیں، نوعی اور کلی ہوتا ہے: فَشَرِّدۡ بِهِمۡ مَّنۡ خَلۡفَهُمۡ ....۔

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِيَانَةً فَانۡۢبِذۡ اِلَيۡهِمۡ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

۵۸۔ اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا خوف ہو تو ان کا عہد اسی طرح مسترد کر دیں جیسے انہوں نے کیا ہے، بے شک اللہ خیانت کاروں کو

لَا یُحِبُّ الۡخَآئِنِیۡنَ ﴿۵۸﴾ دوست نہیں رکھتا۔

تفسیر آیات

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ: اسلام خیانت کو پسند نہیں کرتا اور اس کو بطور انسانی مسئلہ پیش کرتا ہے۔ لہٰذا جیسا کہ ایک مسلمان کے ساتھ خیانت درست نہیں ہے، کافر کے ساتھ بھی خیانت جائز نہیں ہے۔ خواہ مقصد کتنا ہی نیک اور مقدس ہو، اس کے لیے خیانت جیسی مذموم چیز کو ذریعہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اسلام ان اعلیٰ قدروں کا درس اس زمانے میں دے رہا ہے جس زمانے میں جنگل کا قانون رائج تھا۔ معاہدوں کی پاسداری کے سلسلے میں اسلام نے جو قوانین وضع کیے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

i۔ زمانہ عہد میں کسی قسم کا معاندانہ طرز عمل اختیار کرنا جائز نہیں ہے اور ایسا عمل خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔

ii۔ اگر دشمن نے معاندانہ طرز عمل اختیار کیا اور ایسے قطعی دلائل سامنے آ گئے کہ دشمن معاہدہ توڑنے والا ہے تو اس وقت ضروری ہے کہ کسی قسم کے حملے یا جنگی کاروائی سے قبل معاہدہ کے غیر مؤثر ہونے کا اعلان کیا جائے۔ یکطرفہ معاہدہ فسخ کر کے اعلان جنگ کے بغیر حملہ کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اس حکم کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

iii۔ اگر دشمن علی الاعلان معاہدہ فسخ کر دے اور معاندانہ طرز عمل شروع کر دے، ایسی صورت میں اسلام، دشمنی کے اسی طرز عمل کو اعلان جنگ تصور کرتا ہے، مزید کسی اعلان کے بغیر حملہ کرنا جائز قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ فتح مکہ کے موقع پر عمل میں آیا۔

کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے رسالتمآبؐ سے روایت فرمائی ہے۔ فرمایا:

> تین چیزیں اگر کسی شخص میں موجود ہوں تو وہ منافق ہے، خواہ نمازی، روزہ دار اور مسلم ہونے کا مدعی کیوں نہ ہو: جب اسے امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔[1]

اہم نکات

۱۔ مقصد خواہ کتنا ہی مقدس ہو، اس کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

وَ لَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَبَقُوۡا ؕ اِنَّہُمۡ لَا یُعۡجِزُوۡنَ ﴿۵۹﴾

۵۹۔ کفار یہ خیال نہ کریں کہ وہ بچ نکلے ہیں، وہ (ہمیں) عاجز نہ کر سکیں گے۔

---

[1] الکافی: ۲: ۳۹۰

تفسیر آیات

اس آیت میں مسلمانوں کے لیے نوید فتح دی گئی ہے کہ عہد شکن عناصر اپنی غیر انسانی سازشوں میں ناکام رہیں گے۔ وہ غضب الٰہی سے بچ نہیں سکیں گے۔

واضح رہے ان آیات کا شان نزول، مدینہ اور اس کے اطراف میں موجود یہودی قبائل ہیں جن کے ساتھ حضورؐ نے مدینے کی طرف ہجرت کے بعد بہتر ہمسائیگی اور باہمی امان و آشتی و تعاون کا معاہدہ کیا تھا لیکن نبی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ و دیگر یہودی قبائل مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے اور ایک طرف اوس اور خزرج کی پرانی دشمنی کو اٹھاتے تھے اور مدینے کے منافقین کو وہ اس مقصد کے لیے استعمال کرتے تھے، دوسری طرف مشرکین مکہ کے ساتھ بھی ان لوگوں نے سازباز کرنا شروع کر دی اور بعد کی شکست کے بعد تو ان لوگوں نے مکہ کے مشرکین کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کی کوششیں تیز کر دیں۔ یہ سب کچھ اس معاہدے کے باوجود ہو رہا تھا، جس کے مطابق امن کے ساتھ رہنا ان کے لیے لازم تھا۔

یہ آیات ایسے زمانے میں نازل ہو رہی ہیں کہ مسلمان ایک نہایت ہی نازک ترین دور سے گزر رہے تھے:

☆ ایک طرف مسلمان مدینے میں اپنی نوخیز اور مختصر جمعیت کی ترکیب و تشکیل کے دور سے گزر رہے تھے،

☆ دوسری طرف بدر کی شکست کے بعد دشمن کی طرف سے معاندانہ کوشش تیز تر ہو گئیں اور جذبۂ حسد و انتقام میں اور اضافہ ہو گیا،

☆ تیسری طرف مدینہ کے اطراف کے یہود کی سازشیں مزید گہری ہوتی گئیں،

☆ چوتھی طرف خود مسلمانوں کے اندر منافقین نے بھی ففتھ کالم کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن دشمن کے مقابلے میں نکلتا ہے تو اس الٰہی طاقت کے ساتھ نکلتا ہے جس کے بارے میں فرمایا: اِنَّهُمۡ لَا یُعۡجِزُوۡنَ ....۔

وَ اَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّ مِنۡ رِّبَاطِ الۡخَیۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمۡ وَ اٰخَرِیۡنَ

۶۰۔ اور ان (کافروں) کے مقابلے کے لیے جہاں تک تم سے ہو سکے طاقت مہیا کرو اور پلے ہوئے گھوڑوں کو مستعد رکھو تاکہ تم اس سے اللہ

مِنۡ دُوۡنِہِمۡ ۚ لَا تَعۡلَمُوۡنَہُمۡ ۚ اَللّٰہُ یَعۡلَمُہُمۡ ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ یُوَفَّ اِلَیۡکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۰﴾	کے اور اپنے دشمنوں نیز دوسرے دشمنوں کو خوفزدہ کرو جنہیں تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے اور راہ خدا میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا تمہیں پورا ثواب ملے گا اور تم پر زیادتی نہ ہوگی۔

تشریح کلمات

رِّبَاطِ الۡخَیۡلِ: ربط الفرس کے معنی گھوڑے کو کسی جگہ حفاظت کے لیے باندھ دینے کے ہیں اور وہ مقام جہاں حفاظتی دستے متعین رہتے ہوں اسے رباط کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

امت اسلام کو عسکری اعتبار سے چند ضروری اصول وقواعد بیان کیے جا رہے ہیں:

i۔ وَ اَعِدُّوۡا لَہُمۡ: دفاع ایک فطری حق ہے، ہر ذی روح اپنا دفاعی حق رکھتا ہے اور ہر جاندار کے پاس فطری طور پر دفاعی وسائل و اوزار موجود ہوتے ہیں۔

ii۔ یہاں خطاب پوری امت سے ہے جب کہ اس سے پہلے کی آیات میں خطاب رسول کریمؐ سے تھا۔ اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ معاہدوں کا برقرار رکھنا یا فسخ کا اعلان کرنا سربراہان مملکت کی ذمہ داری ہے۔ سامان حرب اور دفاعی وسائل فراہم کرنا پوری امت اور عوام کی ذمہ داری ہے۔

iii۔ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ: جہاں تک تم سے ہوسکتا ہے۔ اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں:

اول یہ کہ اس مسئلہ میں کوتاہی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ جہاں تک ممکن ہے سامان حرب کا مہیا کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ کسی امت کی زندگی، عزت و وقار، تحفظ و ناموس اور قومی استقلال و خودمختاری کا مسئلہ ہے۔

دوم یہ کہ اس میں ہر زمانے کی استطاعت شامل ہے۔ اس جملے کی تعبیر میں ایسی عمومیت ہے جس میں ہر زمانے کا ہر حربی سامان شامل ہے۔

iv۔ مِّنۡ قُوَّۃٍ: اپنی طاقت و قوت کو مستعد رکھو۔ قوت میں اسلحے کی قوت، مہارت و تربیت اور تجربے کی قوت سب شامل ہیں۔

v۔ رِّبَاطِ الۡخَیۡلِ: اس زمانے میں گھوڑے سامان حرب میں شامل ہونے کے ساتھ سریع ترین مواصلاتی ذریعہ تھے۔ جنگ میں خبر رسانی اور مواصلات کو آج بھی سب سے زیادہ اہمیت حاصل

ہے۔ لہٰذا جدید ترین اور سریع ترین حربی و مواصلاتی قوت کا مالک بننا چاہیے۔

vi۔ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ: اسلحہ کی فراہمی میں استعمال ضروری نہیں ہے بلکہ اکثر اسلحہ امن کا ذریعہ ہوتا ہے اور اس سے دشمن خوفزدہ ہو کر اسلام کے خلاف آسانی سے سازشیں نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا تقتلون بہ تا کہ اس اسلحہ سے تم دشمن کو قتل کرو، بلکہ فرمایا: تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ تا کہ اس اسلحہ سے تم دشمن کو خوفزدہ کرو۔ چنانچہ استعمار صرف اسلحہ اور عسکری بالادستی سے تیسری دنیا کا استحصال کر رہا ہے۔

vii۔ وَاٰخَرِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ: دشمن کو مرعوب کرنا جب مقصد ہے تو اس میں ایک طویل المیعاد عسکری تکنیک کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ دشمن کی صرف موجودہ پوزیشن کو مدنظر نہیں رکھنا ہو گا اور اس عسکری منصوبہ بندی میں صرف موجودہ صورتحال پر نظر نہیں کرنی ہو گی بلکہ دشمن کی محسوس قوت کے ساتھ غیر محسوس قوت کا بھی اندازہ کرنا ہو گا اور دشمن کی ان نامرئی طاقتوں کو بھی پیش نظر رکھ کر کچھ ریزرو طاقت و قوت کی بھی ضرورت ہے۔ اس عسکری اہم تکنیک کی طرف جملہ وَاٰخَرِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ سے اشارہ فرمایا ہے۔

viii۔ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ: مادی وسائل کی فراہمی کے لیے بھی پوری امت کا حصہ لینا ضروری ہے۔ عوام کی شرکت کے بغیر صرف فوج نہیں لڑ سکتی، اس سلسلے میں عوام کی طرف سے مالی معاونت بھی ضروری ہے۔

اہم نکات

۱۔ امن و سکون اور دشمن کو مرعوب رکھنے کے لیے طاقتور رہنا ضروری ہے۔

۲۔ ایمان و توکل کے ساتھ مادی وسائل کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

وَ اِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَ تَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۶۱﴾

۶۱۔ اور (اے رسول) اگر وہ صلح و آشتی کی طرف مائل ہو جائیں تو آپ بھی مائل ہو جائیے اور اللہ پر بھروسا کیجیے، یقیناً وہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

تفسیر آیات

اسلام امن و آشتی کا دین ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ　　اے ایمان لانے والو! تم سب کے سب (دائرہ)

كَآفَّةً ....[1] امن و آشتی میں آ جاؤ....

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ صلح و آشتی کا یہ حکم آیہ فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَيۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡهُمۡ[2] ''مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کرو'' سے منسوخ ہو گیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ حکم منسوخ نہیں ہوا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورہ برائت کے نزول کے بعد اہل نجران کے ساتھ صلح کی ہے۔

جنگ کسی صورت میں بھی اچھی چیز نہیں ہے۔ اگر صلح و آشتی کے لیے کوئی صورت موجود ہو تو صلح کو ہر صورت میں ترجیح دینی چاہیے۔ اسلامی اخلاق و اقدار کا بھی یہی تقاضا ہے کہ دشمن اگر صلح کے لیے ہاتھ بڑھائے تو اس کے جواب میں ہاتھ بڑھایا جائے۔ مصالحت کا یہ حکم ممکن ہے اس صورت میں ہے، جب کافروں کی مکاریاں اور سازشیں سامنے نہیں آئیں، بعد میں جب کافر اسلام کو ختم کرنے پر تل گئے تو اسلام نے ان کفار کے بارے میں یہ مؤقف اختیار کیا کہ وہ یا اسلام قبول کریں یا جنگ کے لیے آمادہ ہوں یا جزیہ دے کر معاہدہ کریں۔

وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ: صلح اور امن میں آنے کے بعد یہ فکر نہ کرو کہ دشمن کو اپنی قوت مجتمع کرنے کا موقع ملے گا، وہ ایک طاقت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کرے گا بلکہ اللہ پر توکل کرو۔ دشمن کی ہر چال اللہ کے سامنے ہے۔ وہ سمیع و علیم ہے۔

اہم نکات

۱۔ ظاہری اسباب (صلح) پر عمل کرنے کے بعد ہی توکل کرنا ہوتا ہے۔

وَاِنۡ يُّرِيۡدُوۡۤا اَنۡ يَّخۡدَعُوۡكَ فَاِنَّ حَسۡبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيۡۤ اَيَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۙ﴿۶۲﴾

۶۲۔ اور اگر وہ آپ کو دھوکہ دینا چاہیں تو آپ کے لیے یقیناً اللہ کافی ہے وہی تو ہے جس نے اپنی نصرت اور مؤمنین کے ذریعے آپ کو قوت بخشی ہے۔

وَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيۡنَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ اور اللہ نے ان کے دلوں میں الفت پیدا کی ہے، آپ روئے زمین کی ساری دولت خرچ کرتے تو بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہیں کر سکتے تھے لیکن اللہ نے ان (کے دلوں) کو جوڑ دیا، یقیناً اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

---

[1] ۲ بقرۃ: ۲۰۸ [2] ۹ توبۃ: ۵

تفسیر آیات

۱۔ اَنۡ یَّخۡدَعُوۡكَ: اگر کافروں کی طرف سے صلح کی پیشکش فریب اور دھوکہ پر مبنی ہو تو بھی خوف کی کوئی بات نہیں۔ جس طرح اس نے ماضی میں آپ کی مدد کی، مستقبل میں بھی مدد کرے گا۔ چنانچہ کسی موقع پر بھی رسول اسلامؐ کافروں کے دھوکے میں نہیں آئے۔ جس نے ماضی میں لوگوں سے نسلی، قبائلی اور لسانی اختلافات ختم کر کے ان کو اسلام کے پرچم تلے جمع کیا ہے، وہ آئندہ بھی انہی لوگوں کے ذریعے آپؐ کی مدد کرے گا۔ ماضی میں اللہ نے ایسے گروہوں میں الفت پیدا کی جن پر تمہارے ہاتھ میں موجود کوئی مادی سبب مؤثر نہ ہونا تھا۔

۲۔ بِنَصۡرِہٖ: اپنی غیبی کمک کے ذریعے اور دیگر اسباب فراہم کر کے اللہ نے اپنے رسول کی تائید فرمائی۔

۳۔ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ: اور مؤمنین کے ذریعے اللہ نے آپؐ کی کمک کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کمک اللہ کی طرف سے تھی اور ذریعہ مؤمنین تھے۔ اس آیت کا مصداق اول وہ مؤمن ہے کہ جو تائید رسولؐ میں صف اول میں تھے۔ چنانچہ الدار المنثور ۲: ۱۹۹ میں ابو ہریرہ کی روایت ہے:

مکتوب علی العرش لا الہ الا انا وحدی لا شریك لی محمد عبدی و رسولی ایدته بعلی هُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ۔

عرش پر لکھا ہے: میرے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ میرا کوئی شریک نہیں۔ محمد میرا بندہ اور میرا رسول ہے میں نے ان کی تائید کی ہے علی سے۔ وہی تو ہے جس نے اپنی نصرت اور مؤمنین کے ذریعے آپ کو قوت بخشی ہے۔

نیز حافظ ابو نعیم نے کتاب ما نزل من القرآن فی علی میں ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ کتاب خصائص الوحی المبین صفحہ ۱۱۱ میں مذکور ہے۔ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں حدیث نمبر ۹۱۸، گنجی نے کفایۃ الطالب باب ۱۲ میں۔ شواهد التنزیل ذیل آیت۔ انس کی روایت: اس حدیث کو انس نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو شواهد التنزیل ذیل آیت۔ ابن عساکر نے تاریخ دمشق ۸: ۴۴، خطیب نے تاریخ بغداد میں عیسی بن بنی محمد کے حالات میں ۱۱: ۱۷۳ میں اسے نقل کیا ہے۔ دوسری روایت میں انس بن مالک کہتے ہیں: ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو شدید گرسنگی لاحق ہوئی تو جبرئیل جنت سے ایک سرخ اخروٹ لے کر آئے اور عرض کیا: اسے کھول دیجیے۔ رسول اللہؐ نے اسے کھولا تو اس کے اندر لکھا ہوا تھا: بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ ایدته بعلیٍ و نصرته به۔ شواهد التنزیل ذیل آیت۔ جابر بن عبد اللہؓ اور

خادم رسول ابو الحمراء سے بھی یہی حدیث مروی ہے۔ ابن عباسؓ راوی ہیں کہ ہم رسول اللہؐ کی خدمت میں تھے تو ایک پرندے نے ایک سرخ اخروٹ اپنے منہ سے رسول اللہؐ کی گود میں گرایا تو رسول اللہؐ نے اس کو چوم لیا۔ پھر کھولا تو اس کے اندر سے سرخ ورق نکل آیا جس پر لکھا تھا: لا اله الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه نصرته بعلّي۔ یعنی کلمہ کے بعد لکھا تھا کہ میں نے علیؑ کے ذریعے رسولؐ کی نصرت کی۔ ملاحظہ ہو کتاب سمط النجوم ۲: ۴۸۵ بحوالہ حاشیہ شواھد التنزیل۔

۴۔ اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ : اللہ نے ان کے دلوں میں الفت پیدا کی۔ یہ الفت صرف اوس وخزرج میں منحصر نہیں جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں۔ سب لوگ بھی آپس میں جنگ و قتال اور نزاع و اختلاف میں گرفتار رہتے تھے۔

۵۔ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ: اس سے یہ اشارہ مل جاتا ہے کہ انفاق کو تالیف قلوب میں ایک اہم اثر حاصل ہے۔ چنانچہ اللہ نے اس مقصد کے لیے زکات میں تالیف قلوب کے لیے ایک مد مختص کی ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان کو ان الٰہی علل و اسباب پر بھروسا کرنا چاہیے جو ظاہری علل و اسباب کے ماوراء میں ہیں: لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ ....

۲۔ اللہ کی تائید کے لیے مؤمنین ذریعہ بن جاتے ہیں ہُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِهٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ ....

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسۡبُکَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ اے نبی آپ کے لیے اللہ اور مؤمنین میں سے جس نے آپ کی پیروی کی ہے کافی ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت کے دو ترجمے ہیں۔ پہلا: اے نبی آپ کے لیے اور آپ کی اتباع کرنے والے مؤمنین کے لیے اللہ کافی ہے۔ دوسرا ترجمہ یہ ہے: اے نبی آپ کے لیے اللہ اور مؤمنین میں سے جس نے آپ کی پیروی کی ہے کافی ہے۔

پہلے ترجمے کو کچھ مفسرین اس بنا پر ترجیح دیتے ہیں کہ یہ توحیدی مزاج کے عین مطابق ہے۔ ان کے نزدیک یہاں اللہ کے ساتھ مؤمنین کو شامل کرنا توحید کے منافی ہو گا حالانکہ گزشتہ آیت ۶۲ میں اللہ کی نصرت کے ساتھ مؤمنین کو شامل کیا ہے: ہُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَکَ بِنَصۡرِهٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ۔ اللہ نے اپنی نصرت اور مؤمنین کے ذریعے آپ کو قوت بخشی ہے، تو اس آیت میں نصرت الٰہی کے ساتھ مؤمنین کی شرکت کو توحید کے منافی نہیں سمجھا گیا، زیر نظر آیت میں اسے کیوں منافی سمجھا جائے جب کہ مطلب دونوں آیات کا ایک

ہے۔ فرق صرف اسلوب کا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ توحید کے منافی اس لیے نہیں ہے کہ مؤمنین کی مدد، اللہ کی مدد کے ذیل میں آتی ہے۔ توحید کے منافی اس وقت قابل تصور ہے جب اللہ کے مقابلے میں ہو۔

سیاق کلام بھی دوسرے ترجمہ کے ساتھ سازگار ہے۔ چونکہ آیت میں سب مؤمنین کا ذکر نہیں ہے بلکہ مؤمنین میں سے ایسے شخص کا ذکر ہے جس نے رسولؐ کی اتباع کی ہے۔ اتَّبَعَكَ مفرد صیغہ ہے۔ یعنی جس نے اتباع کا حق ادا کیا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی کا فارسی ترجمہ بھی اسی طرح ہے: اے پیغمبر کفایت کنندہ است ترا خدا و کفایت کنند ترا انانکہ پیروی تو کردند از مسلمانان۔

زمخشری اور بغوی نے دونوں معنی کو یکساں قرار دیا ہے۔ فراء دوسرے معنی کو ترجیح دیتے ہیں۔

حافظ ابونعیم کی روایت ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی۔[1]

اور عز الدین الحنبلی محدث نے اپنی کتاب میں[2]، الحاکم الحسکانی نے تنزیل الایات ۴: ۲۳۰ میں، فضل بن احمد نے نزول قرآن (خطی) میں[3] ذکر کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں ہے۔

اہم نکات

۱۔ بعض مؤمنین کو یہ منزلت حاصل ہے کہ ان کی مدد اللہ کی مدد ہے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ اے نبی! مومنوں کو جنگ کی ترغیب دیں، اگر تم میں بیس صابر (جنگجو) ہوں تو وہ دو سو (کافروں) پر غالب آ جائیں گے اور اگر تم میں سو افراد ہوں تو وہ ایک ہزار کافروں پر غالب آ جائیں گے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ: اے نبی! مؤمنوں کو جنگ کی ترغیب دیں۔ اس ترغیب کے مضمون کی طرف اگلی عبارت میں اشارہ مل رہا ہے۔ جو نفسیاتی ترغیب پر مشتمل ہے۔ یعنی مسلمانوں کو بہتر اور

---

[1] الغدیر ۲: ۵۱ [2] کشف الغمۃ صفحہ ۹۲ [3] احقاق الحق ۳: ۲۴۷

لائق فوج کے طور پر پیش فرمایا، تم ہی بالا دست اور فاتح فوج ہو۔ البتہ صبر و استقامت کی شرط عائد فرمائی اور فرمایا صبر و استقامت سے طاقت اور قوت میں دس گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ یَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفًا: اس آیت سے اس بات کو نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں کہ فتح و غلبے کے لیے جو طاقت درکار ہوتی ہے وہ مادی سے زیادہ معنوی قوت ہے۔ یہی قوت بیرونی عضلاتی قوت کے لیے قوت محرکہ ہے۔ ظاہر ہے طاقت کا توازن قوت محرکہ کے پاس ہے اور اس معنوی قوت کا سرچشمہ شعور اور سمجھ بوجھ ہے۔ دوسری اہم بات اس داخلی معنوی قوت پر تکیہ اور اس سے استفادہ ہے۔ چنانچہ اس معنوی طاقت پر تکیہ کرنے سے صبر آتا ہے۔ یعنی صبر دو عناصر پر قائم ہے: ایک فہم و شعور اور دوسرا اس پر بھر پور تکیہ۔ اگر فہم و شعور نہیں ہے تو صبر نہیں ہو سکتا:

وَ کَیۡفَ تَصۡبِرُ عَلٰی مَا لَمۡ تُحِطۡ بِہٖ خُبۡرًا ۝[۱] بھلا اس بات پر آپ صبر کیسے کر سکتے ہیں جو آپ کے احاطہ علم میں نہیں ہے۔

لہٰذا یہ ممکن ہے کہ فہم و شعور ہو لیکن اس پر تکیہ اور اس سے استفادہ کم ہو یا بالکل نہ ہو، اس صورت میں صبر کی طاقت وجود میں نہیں آئے گی۔ دوسری آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ قَوۡمٌ لَّا یَفۡقَہُوۡنَ: ان کافروں پر غالب آنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ فہم و شعور سے عاری ہیں۔ تمہیں اسلام نے فہم و شعور سے مالا مال کیا ہے۔ مسلمان کو یہ فہم و شعور ہے کہ فی سبیل اللہ جنگ میں ناکامی نہیں ہے۔ اسے فتح یا شہادت، جہاد کی فضیلت، ایمان باللہ کی طاقت اور توکل علی اللہ کا اعتماد حاصل ہے۔ مسلمان جنگ کا ایک معقول ہدف رکھتا ہے۔ جب کہ مشرکین کے پاس اس قسم کا فہم و شعور نہیں ہے۔

اَلۡـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنۡکُمۡ وَ عَلِمَ اَنَّ فِیۡکُمۡ ضَعۡفًا ؕ فَاِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ ۚ وَ اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ اَلۡفٌ یَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفَیۡنِ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۶۶﴾

۶۶۔ اب اللہ نے تم لوگوں سے ہلکا کر دیا ہے اور اللہ کو علم ہوا ہے کہ اب تم میں کمزوری آ گئی ہے، لہٰذا اب اگر تم میں سو صابر افراد ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں ایک ہزار ہوں ہزار ہوں تو دو ہزار پر باذن خدا غالب آئیں گے، یقیناً اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔

تفسیر آیات

اَلۡـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنۡکُمۡ: یہ ضعف اور کمزوری اس معنوی قوت پر تکیے اور اس پر بھروسے کی

----

[۱] ۱۸ کہف: ۶۸

کمزوری سے وجود میں آئی ہے اور معنوی قوت پر بھروسے کی کمزوری دیگر قوتوں پر بھروسہ زیادہ ہونے کی وجہ سے آتی ہے۔ چنانچہ دیگر بیرونی وسائل و ذرائع پر بھروسہ کرنے کی وجہ سے انسانی دماغی صلاحیت میں کمزوری آ جاتی ہے۔ اس طرح مسلمانوں میں اپنی ایمانی اور الٰہی طاقت پر اعتماد کرنے میں کمزوری آئی اور ظاہری اور مادی قوت پر اعتماد بڑھ گیا تو طاقت اور قوت کا توازن دس گنا سے گھٹ کر دو گنا پر آ گیا۔ اس طرح جیسے جیسے ظاہری کثرت و شوکت میں اضافہ ہوتا رہا اسی تناسب سے روحانی اور ایمانی قوت میں کمزوری آتی رہی۔ چنانچہ جنگ حنین کے بارے میں فرمایا:

لَقَدۡ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ فِیۡ مَوَاطِنَ کَثِیۡرَۃٍ ۙ وَّ یَوۡمَ حُنَیۡنٍ ۙ اِذۡ اَعۡجَبَتۡکُمۡ کَثۡرَتُکُمۡ فَلَمۡ تُغۡنِ عَنۡکُمۡ شَیۡئًا وَّ ضَاقَتۡ عَلَیۡکُمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ ثُمَّ وَلَّیۡتُمۡ مُّدۡبِرِیۡنَ ﴿ۚ﴾ [1]

بہت سے مقامات پر اللہ تمہاری مدد کر چکا ہے اور حنین کے دن جب تم کو اپنی کثرت نے غرور میں ڈالا تھا مگر وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین باایں ہمہ وسعت تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔

اہم نکات

۱۔ تمام مشکلات کا سرچشمہ خود انسان کے اندر ہے اور ان سب کا حل بھی انسان کے اندر ہے۔

مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنۡ یَّکُوۡنَ لَہٗۤ اَسۡرٰی حَتّٰی یُثۡخِنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ تُرِیۡدُوۡنَ عَرَضَ الدُّنۡیَا ٭ۖ وَ اللّٰہُ یُرِیۡدُ الۡاٰخِرَۃَ ؕ وَ اللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ یہ کسی نبی کے شایان نہیں ہے کہ زمین میں دشمن کو کچل دینے سے پہلے اس کے پاس قیدی ہوں تم لوگ دنیاوی مفاد چاہتے ہو جب کہ اللہ (تمہارے لیے) آخرت چاہتا ہے یقیناً اللہ بڑا غالب آنے والا حکمت والا ہے۔

تشریح کلمات

اسیر: (ا س ر) کے معنی قید میں جکڑ لینے کے ہیں۔ یہ اَسَرْتُ الْقَتَبَ سے لیا گیا ہے، جس کے معنی پالان کو مضبوطی سے باندھنا ہیں۔

ثخن (ث خ ن) کے معنی ہیں کسی چیز کا گاڑھا ہو جانا، اس طرح کہ بہنے سے رک جائے۔ اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے: اثخنته ضربا و استخفافاً۔ میں نے اسے اتنا پیٹا کہ وہ اپنے مقام سے حرکت نہ کر سکا۔ اس طرح اثخن کے معنی کچلنے کے بنتے ہیں۔

----

[1] ۹ توبۃ: ۲۵

تفسیر آیات

اسلامی جنگی حکمت عملی کے مطابق یہ دستور پہلے دیا جا چکا تھا کہ جنگ کے دوران دشمن کی طاقت کو کچلنے پر پوری توجہ مرکوز ہونی چاہیے اور قیدی بنانے کا عمل اس کے بعد شروع ہونا چاہیے۔ جیسا کہ سورہ محمد میں فرمایا:

فَاِذَا لَقِیۡتُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَضَرۡبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثۡخَنۡتُمُوۡہُمۡ فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ ٭ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰی تَضَعَ الۡحَرۡبُ اَوۡزَارَہَا ....[1]

پس جب کفار سے تمہارا سامنا ہو تو (ان کی) گردنیں مارو یہاں تک کہ جب انہیں خوب قتل کر چکو تو (بچنے والوں کو) مضبوطی سے قید کر لو، اس کے بعد احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر (چھوڑ دو) تاوقتیکہ لڑائی تھم جائے.

لیکن بدر میں اس ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور عین گردن مارنے اور دشمن کو کچل دینے کے موقع پر ان کو اسیر بنانے کا عمل شروع کیا گیا۔ چنانچہ جب مشرکین مکہ کی فوج فرار ہونے لگی تو مسلمانوں میں سے اکثر نے غنیمت جمع کرنے اور کفار کے افراد کو پکڑ کر قیدی بنانے پر اپنی پوری توانائیاں مرکوز کر دیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے کہ آپؑ نے کسی کو اسیر نہیں بنایا بلکہ آپؑ نے ساری توجہ دشمن کو کچلنے پر مرکوز رکھی۔ اس لیے قریش کے ستر افراد جو مارے گئے، ان میں سے ستائیس افراد صرف حضرت علی علیہ السلام نے قتل کیے، باقی ۴۳ افراد کل مسلمانوں نے۔

اثنائے حرب میں اسیروں کے پیچھے پڑنا ایک سنگین غلطی تھی جو جنگی حکمت عملی اور اسلامی جہاد کے مقاصد کے بالکل منافی تھا اور اس کے دور رس منفی اثرات مرتب ہوئے تھے۔

مولانا مودودی نے اس آیت کے ذیل میں انصاف سے کام لیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> جنگ میں جب قریش کی فوج بھاگ نکلی تو مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ غنیمت لوٹنے اور کفار کے آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر باندھنے میں لگ گیا اور بہت کم آدمیوں نے دشمنوں کا کچھ دور تک تعاقب کیا حالانکہ اگر مسلمان پوری طاقت سے ان کا تعاقب کرتے تو قریش کا اسی روز خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ عتاب فرما رہا ہے اور یہ عتاب نبی صلی اللہ علیہ (و آلہ) وسلم پر نہیں ہے بلکہ مسلمانوں پر ہے۔ فرمان مبارک کا منشا یہ ہے کہ تم لوگ ابھی نبی کے مشن کو اچھی طرح نہیں سمجھے ہو۔ نبی کا اصل کام یہ نہیں کہ فدیے اور غنائم وصول کر کے خزانے بھرے بلکہ اس کے نصب العین سے جو چیز براہ راست تعلق رکھتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ کفر کی طاقت ٹوٹ جائے مگر تم لوگوں پر بار بار دنیا کا لالچ غالب آ جاتا ہے۔ پہلے دشمن کی اصل طاقت کی بجائے قافلے پر حملہ کرنا چاہا، پھر دشمن کا سر کچلنے

----

[1] ۴۷ محمد: ۴

کی بجائے غنیمت لوٹنے اور قیدی پکڑنے میں لگ گئے۔ پھر غنیمت پر جھگڑنے لگے...

سید شرف الدین عاملی اپنی کتاب النص و الاجتہاد میں یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو بدر میں جنگ لڑنے کی جگہ قریش کے تجارتی قافلے کو اسیر بنانا چاہتے تھے۔ ان کی سرزنش ہوئی کہ نبی کے لیے سزاوار نہیں اپنا قدم جمانے سے پہلے اسیر بنائے۔

اہم نکات

۱۔ عصر رسالت ہی سے طمع اور مفاد پرستیوں نے اسلامی مشن کو نقصان پہنچایا ہے: تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ....

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ اگر اللہ کی طرف سے ایک بات لکھی نہ جا چکی ہوتی تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس کی تمہیں بڑی سزا ہو جاتی۔

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۹﴾

۶۹۔ بہرحال اب تم نے جو مال حاصل کیا ہے اسے حلال اور پاکیزہ طور پر کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

فدیہ لینا جائز ہونے پر پہلے فیصلہ نہ ہوا ہوتا تو تمہیں بڑی سزا ملتی۔ ممکن ہے سورہ محمد کی طرف اشارہ ہو جس میں فدیہ لینے کو حلال قرار دیا تھا۔ اس طرح اصل فدیہ لینا پہلے سے حلال کیا جا چکا تھا۔ عتاب اس بات پر ہو رہا ہے کہ مسلمانوں نے دشمن کا تعاقب کرنے پر اسیر کرنے کو ترجیح دی۔ اس عمل سے دشمن کا خاتمہ ہونے سے رہ گیا۔ یہ ایسا ہے کہ کوئی شخص نماز کے وقت نماز چھوڑ کر حلال شکار پکڑ لے تو نماز پر شکار پکڑنے کو ترجیح دینا بڑا جرم ہے، تاہم شکار حلال ہے۔

قاسمی اپنی تفسیر محاسن التاویل ۸: ۹۹ میں لکھتے ہیں:

> قاضی نے کہا ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اجتہاد کرتے ہیں اور کبھی غلطی کر جاتے ہیں، مگر وہ اس غلطی پر قائم نہیں رہتے۔

قاسمی کی یہ بات درست نہیں کیونکہ اسیر لینے کا عمل رسولؐ کے حکم سے نہیں ہوا تھا۔ یہ عمل لوگوں سے سرزد ہوا ہے اور سرزنش بھی لوگوں کی ہو رہی ہے۔ جیسا کہ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ قرینہ ہے کہ یہ حرکت لوگوں سے سرزد ہوئی تھی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

۷۰۔ اے نبی! جو قیدی تمہارے قبضے میں ہیں ان سے کہدیں کہ اگر اللہ کو علم ہوا کہ تمہارے دلوں میں کوئی اچھائی ہے تو جو تم سے لیا گیا ہے وہ اس سے بہت بہتر تمہیں دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مِّنَ الْاَسْرٰۤى: ان اسیروں سے کہد یجئے جن سے فدیہ وصول کیا گیا ہے کہ

۲۔ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا: تمہارے دلوں میں کسی اچھائی کا پتہ چل جائے۔ خَيْرًا سے مراد ایمان ہے جو اس وقت یا مستقبل میں ظاہر ہونے والا ہے۔ تو جو مال تم سے لیا گیا ہے اس سے کہیں بہتر تم کو دیا جائے گا یعنی خیر کے بدلے خیر دیا جائے گا۔ ایمان کے بدلے مغفرت اور اجر وثواب دیا جائے گا، جو مال سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

مجمع البیان میں آیا ہے کہ عباس بن عبد المطلب نے کہا یہ آیت میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی اور بعض دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریمؐ نے فدیہ کی رقم سے کئی گنا زیادہ ان کو ادا کیا۔

اہم نکات

۱۔ جن کے دلوں میں خیر کا مادہ ہوتا ہے، ان کو خیر دنیا و آخرت مل جاتی ہے: يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ...۔

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

۷۱۔ اور اگر یہ لوگ آپ سے خیانت کرنا چاہیں تو اس سے پہلے وہ اللہ کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں پس اس نے انہیں (آپ کے) قابو میں کر دیا اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

یہ لوگ اگر آپ سے خیانت کرنا چاہیں گے تو جیسا کہ اللہ کے ساتھ خیانت کا نتیجہ خود ان کے

خلاف نکلا ہے، اسی طرح آپ کے ساتھ خیانت کریں تو بھی آپ کو اس سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو گا۔

چنانچہ ابو سرح، مقیس بن صبابہ اور ابن کطل جیسے لوگوں نے خیانت کی تو ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قابو میں کر دیا۔ ان میں کچھ کو معاف فرمایا، کچھ کو قتل کر دیا گیا۔

لیکن اکثر مفسرین کے نزدیک خَانُوا اللّٰہَ مِنۡ قَبۡلُ سے مراد ان کا کفر، رسولؐ کے خلاف سازش اور اسلام کے خلاف جنگ ہے۔

اہم نکات

۱۔ خیانت کار ہمیشہ خسارے میں رہتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ ہَاجَرُوۡا وَ جٰہَدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ الَّذِیۡنَ اٰوَوۡا وَّ نَصَرُوۡۤا اُولٰٓئِکَ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَمۡ یُہَاجِرُوۡا مَا لَکُمۡ مِّنۡ وَّلَایَتِہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ حَتّٰی یُہَاجِرُوۡا ۚ وَ اِنِ اسۡتَنۡصَرُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ فَعَلَیۡکُمُ النَّصۡرُ اِلَّا عَلٰی قَوۡمٍۭ بَیۡنَکُمۡ وَ بَیۡنَہُمۡ مِّیۡثَاقٌ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور وطن سے ہجرت کر گئے اور انہوں نے اپنے اموال اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے پناہ دی اور مدد کی وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں اور جو لوگ ایمان تو لائے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں ان کی ولایت سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے البتہ اگر انہوں نے دینی معاملے میں تم لوگوں سے مدد مانگی تو ان کی مدد کرنا تم پر اس وقت فرض ہے جب یہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف نہ ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہے اور اللہ تمہارے اعمال پر خوب نظر رکھتا ہے۔

تشریح کلمات

اٰوَوۡا: (ا و ی) کسی کے ساتھ مل جانا۔ ایواء کسی کو جگہ دینا۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں مسلمانوں کے درمیان رشتۂ ولایت کا ذکر ہے۔ یہ ولایت مہاجرین اور انصار کے درمیان قائم تھی۔

۱۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: مہاجرین اور انصار کے درمیان حضورؐ نے مؤاخاۃ کے ذریعے جو رشتہ ولایت قائم کیا تھا، اس کے تحت مہاجرین و انصار کی صلح و جنگ ایک، یعنی ایک کا مخالف، سب کا مخالف، ایک نے کسی کافر کو امن دیا، سب کی طرف سے امن بلکہ شروع میں تو ایک دوسرے کے وارث بھی بن جاتے تھے، مگر بعد میں وراثت کا حکم منسوخ ہو گیا۔

۲۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَمۡ یُہَاجِرُوۡا: مہاجرین و انصار اور دار الحرب میں موجود مسلمان جو ابھی ہجرت نہیں کر سکے، ان کے درمیان کلی ولایت قائم نہیں ہے۔ لہٰذا اگر دار الکفر میں موجود مسلمانوں نے کسی سے معاہدہ کیا ہے تو اسلامی ریاست کے مسلمان اس کے پابند نہیں ہیں۔ اسی طرح جن کافروں نے اسلامی ریاست کے مسلمانوں سے معاہدہ کیا ہے، وہ معاہدہ دار الکفر میں موجود مسلمانوں کی وجہ سے متاثر نہیں ہوتا۔

یعنی اگر دار الکفر کے مسلمان ایسے لوگوں سے برسرپیکار ہو گئے جن کے ساتھ اسلامی ریاست کا معاہدہ امن ہے تو اسلامی ریاست ان کے خلاف مسلمانوں کی مدد نہیں کرے گی، یہاں تک کہ مدت معاہدہ ختم نہ ہو جائے۔ اگر ان کے ساتھ معاہدہ امن نہیں ہے تو مقدور بھر مدد کرنی چاہیے۔

۳۔ وَ اِنِ اسۡتَنۡصَرُوۡکُمۡ: اگر دار الکفر میں موجود مسلمان تم سے مدد مانگیں تو فَعَلَیۡکُمُ النَّصۡرُ تم پر مدد کرنا فرض ہے۔ یعنی اگر اس پر کسی کافر کا حملہ ہوتا ہے تو اس مسلمان کی مدد کرنی چاہیے۔

۴۔ اِلَّا عَلٰی قَوۡمٍۭ: البتہ اس قوم کے خلاف مسلمانوں کی مدد نہیں کر سکو گے جس قوم سے تمہارا معاہدہ ہے۔

۵۔ مَا لَکُمۡ مِّنۡ وَّلَایَتِہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ حَتّٰی یُہَاجِرُوۡا: اگر فتح مکہ سے پہلے ایمان لے آیا لیکن اس کا ایمان اس کے کردار پر اثر نہ کر سکا اور ہجرت نہیں کی تو اس بنا پر وہ اس امت کے ساتھ رشتہ ولایت میں منسلک نہیں ہو سکتا۔ عباسی بادشاہ ہارون رشید نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے پوچھا: آپ لوگ وارث رسول کیسے ہیں؟ چچا کی موجودگی میں چچا کی اولاد وارث نہیں بن سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے وقت ابو طالبؑ زندہ نہ تھے، عباس زندہ تھے۔ امامؑ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو وارث نہیں بناتے جنہوں نے ہجرت نہیں کی، نہ ان کے لیے ولایت حاصل ہے۔ (عباس نے ہجرت نہیں کی) پھر امام نے دلیل میں اس آیت کی تلاوت کی۔

نہایت قابل توجہ ہے کہ جب ایمان کے باوجود ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے امت مسلمہ کے ساتھ کوئی رشتہ ولایت میں منسلک نہیں ہو سکتا تو فتح مکہ تک ایمان بھی نہ لانے والے کیسے منسلک ہو سکتے ہیں؟

اہم نکات

۱۔ فتح مکہ کے بعد ہجرت کا یہ حکم باقی نہ رہا۔ حدیث ہے: لا ھجرۃ بعد الفتح...۔[1] فتح مکہ

---

[1] الکافی ۹: ۴۴۳ باب انہ لا رضاع بعد فطام

کے بعد ہجرت کا مسئلہ ختم ہوا ہے، لہٰذا وہ لوگ مثلاً ابوسفیان اور اس کا بیٹا وغیرہ حق ولایت سے محروم ہیں جنہوں نے ہجرت نہیں کی۔

۲۔ معاہدہ خواہ کافروں کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، واجب الاحترام ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ؕ اِلَّا تَفۡعَلُوۡہُ تَکُنۡ فِتۡنَۃٌ فِی الۡاَرۡضِ وَ فَسَادٌ کَبِیۡرٌ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اور جنہوں نے کفر کیا ہے وہ ایک دوسرے کے مددگار ہیں، اگر تم لوگ اس (دستور) پر عمل نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو گا۔

تفسیر آیات

اسلامی ریاست کے لیے مؤمنوں کی آپس میں اس ولایت کا قائم رکھنا ضروری ہے کیونکہ ان کے مقابلے میں کافر لوگ اسلامی ریاست کے خلاف انفرادی طور پر قیام نہیں کرتے بلکہ وہ الکفر ملة واحدة کے طور پر مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو بھی بطور ایک امت واحدہ ان کا مقابلہ کرنا ہو گا۔

اِلَّا تَفۡعَلُوۡہُ: اگر تم بھی امت واحدہ کے طور پر دشمن کے مقابلے میں نہ اٹھو تو مسلمان ایسے فتنہ و فساد سے دوچار ہوں گے، جسے اللہ تعالیٰ نے کبیر فرمایا ہے۔ فساد کبیر کی بنیاد یہ ہو گی کہ مسلمانوں پر ایک مرتبہ پھر جاہلیت کا غلبہ ہو گا۔ اللہ کے قانون کی جگہ غیر اللہ کا بنایا ہوا قانون نافذ ہو گا۔ تمام الٰہی اور انسانی قدریں پامال ہوں گی۔

اہم نکات

۱۔ آج کل کے مسلمان مغرب و مشرق کے خلاف امت واحدہ نہ ہونے کی وجہ سے اسی فساد کبیر سے دوچار ہیں۔

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ ہَاجَرُوۡا وَ جٰہَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ الَّذِیۡنَ اٰوَوۡا وَّ نَصَرُوۡۤا اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا ؕ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ رِزۡقٌ کَرِیۡمٌ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور مہاجرت کی اور راہ خدا میں جہاد کیا نیز جنہوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں، ان کے لیے مغفرت اور باعزت رزق ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: ایمان کے لیے صرف زبانی دعویٰ کافی نہیں ہے۔ ایمان حقیقی وہ ہے جس پر ترک وطن اور جہاد فی سبیل اللہ جیسے عملی گواہ موجود ہوں۔ اس آیہ شریفہ میں ان مہاجرین اولین اور انصار کی فضیلت اور ان کے ایمان کی حقانیت کی گواہی ہے، جو ایمان کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ میں پیش پیش رہے ہیں۔ یہ مؤمنین وَالسّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ ہیں۔ جن کے بارے میں فرمایا:

وَالسّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُہٰجِرِیۡنَ وَالۡاَنۡصَارِ ....[1] اور مہاجرین وانصار میں سے جن لوگوں نے سب سے پہلے سبقت کی ....

۲۔ وَہَاجَرُوۡا: مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے ذکر سے اس آیت سے وہ لوگ خارج ہو گئے جنہوں نے ہجرت نہیں کی۔

۳۔ وَجٰہَدُوۡا: رسول کے ساتھ جہاد کیا۔ اس سے وہ لوگ اس آیت سے خارج ہو گئے جنہوں نے جہاد نہیں کیا اور ایک کافر کو بھی نہیں مارا۔

۴۔ وَالَّذِیۡنَ اٰوَوۡا: وہ انصار اس آیت میں شامل ہو گئے جنہوں نے مہاجروں کو پناہ دی۔

۵۔ وَّنَصَرُوۡۤا: انصار میں ان لوگوں کو شامل کیا جنہوں نے رسول کی نصرت کی۔ چنانچہ انصار ہی کی نصرت سے اسلامی جہاد کا آغاز ہو سکا۔

۶۔ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا: جن میں یہ اوصاف پائے جاتے ہوں وہ برحق مؤمن ہیں۔ ان کے ایمان کی سچائی ان کے قربانیوں سے ثابت ہوتی ہے۔

۷۔ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ رِزۡقٌ کَرِیۡمٌ: ان اوصاف کے مالک مہاجرین و انصار کے لیے مغفرت کی نوید اور قابل ستائش رزق ہے جس میں سرفہرست علم ہے۔

۸۔ جن شخصیات میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں ان کی کسی تقصیر و کوتاہی کی بنا پر طعن و تشنیع درست نہیں ہے۔ کلام ان اوصاف کی تطبیق میں ہو سکتا ہے۔ چونکہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض معاصرین پر یقیناً ان اوصاف کی تطبیق نہیں ہوتی اور بعض پر یقیناً تطبیق ہوتی ہے۔ رہ جاتے ہیں بعض، جن پر گہرا مطالعہ کیا جائے تو تطبیق مشکوک ہو جاتی ہے اور اگر جذبات کے ساتھ مطالعہ کیا جائے یا اصلاً سرسری مطالعہ بھی نہ کیا جائے تو پھر تطبیقات او رمصادیق میں اختلاف رہے گا۔

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَ ہَاجَرُوۡا وَ جٰہَدُوۡا مَعَکُمۡ فَاُولٰٓئِکَ

۷۵۔ اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ہمراہ جہاد کیا وہ بھی تم میں شامل

مِنْكُمْ ۭ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

ہیں اور اللہ کی کتاب میں خونی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، بے شک اللہ ہر چیز کا خوب علم رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

جن مسلمانوں کے درمیان کلی ولایت ہے، ان کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہیں جو بعد میں ایمان لے آئے اور مہاجرین اولین کے ساتھ جہاد میں شریک رہے۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ: اس جملے میں وراثت کا ایک کلیہ بیان فرمایا ہے کہ خونی رشتہ ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔اس آیت سے مہاجرین و انصار میں توارث کا حکم منسوخ ہو گیا اور وراثت کا انحصار صرف قرابتداری پر قائم ہو گیا۔ جس کی تفصیل سورۂ نساء میں آ گئی۔

سُورَةُ التَّوبَة
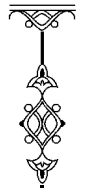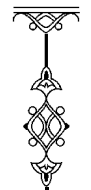
بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا سورۂ برائت ایک مستقل سورہ ہے یا سورہ انفال کا حصہ ہے؟ مفسرین کو اس میں اختلاف ہے اور احادیث میں بھی اس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ دونوں سورتوں کے مطالب بھی تقریباً ایک جیسے ہیں اور اگر کوئی فرق ہے تو صرف اجمال و تفصیل کا ہے۔

سورہ کا نام: اس سورہ کو سورہ برائت، سورہ توبہ، سورة الفاضحة اور سورة العذاب کہتے ہیں۔

شروع میں بسم اللّٰہ نہ لکھنے کی وجہ: سورہ برائت کے شروع میں بسم اللّٰہ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ خود زمان رسالتمآبؐ میں آپؐ کے حکم سے اس کی ابتداء میں بسم اللّٰہ نہیں لکھی گئی۔

حاکم نے مستدرك میں ابن عباس کی یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضرت علی علیہ السلام سے سوال کیا کہ سورہ برائت میں بسم اللہ کیوں نہیں لکھی گئی تو آپؑ نے فرمایا:

لانھاامانو براء ة نزلت بالسیف.[1] بسم اللّٰہ امان ہے اور سورۂ براء ت تلوار لے کر نازل ہوا ہے۔

اس سے دو مطلب ثابت ہوتے ہیں:

الف: قرآن کی تدوین عصر رسالت میں ہو چکی تھی اور ہمارے ہاتھ میں اسی شکل میں موجود ہے جیسے رسول اللہؐ امت کے حوالے کر گئے تھے۔

ب: بسم اللّٰہ ہر سورے کا جز ہے جیسا کہ مذہب امامیہ کا مؤقف ہے۔ ہر سورہ کے ساتھ بسم اللّٰہ کا لکھا جانا اور صرف سورہ براء ت کے ساتھ نہ لکھا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ بسم اللّٰہ سورہ براء ت کے علاوہ باقی سورہ ہائے قرآن کا جز ہے۔

غیر شیعہ مصادر میں ابن عجلان اور سعید بن جبیر سے روایت ہے: سورہ برائت (توبہ) سورۂ بقرہ کے برابر تھا۔ اس کا ایک حصہ ضائع ہو گیا۔ اس کے ساتھ بسم اللہ بھی ضائع ہو گئی۔ تفسیر قرطبی ۸: ۶۲

حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے:

---

[1] محاسن التاویل ۸: ۱۲۱

ماتقرون ثلثها یعنی سورة توبه۔ | تم سورۂ توبہ کے ایک تہائی کو پڑھتے ہو۔

دوسری روایت میں انہوں نے کہا:

لا تقرؤن منها مما کنا نقرأ الاربعها۔[1] | جو سورۂ توبہ ہم پڑھتے تھے اس میں سے تم صرف ایک چوتھائی کو پڑھتے ہو۔

مالک سے روایت ہے:

ان اولها سقط، سقط بعه البسملة فقد ثبت انها کانت تعدل البقره لطولها۔[2] | سورۂ توبہ کا ابتدائی حصہ ضائع ہوگیا۔ جس کے ساتھ بسم اللہ بھی ضائع ہوگئی۔ چنانچہ یہ بات ثابت ہے سورۂ توبہ سورۂ بقرہ کے برابر تھا طوالت میں۔

شیعہ اس قسم کی روایات کو سرے سے ہی قبول نہیں کرتے جب کہ غیر شیعہ ایسی روایات کو قبول کرتے ہیں، پھر ایک متنازعہ نظریے (نسخ تلاوت) کے ذریعے ان کی قرآنی حیثیت سے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ تفصیل کے لیے مقدمہ تفسیر میں تحریف کا عنوان ملاحظہ فرمائیں۔

زمانہ نزول: خود سورہ کے مضامین کی گواہی کے مطابق اس سورہ کا ایک حصہ جنگ تبوک سے پہلے، کچھ جنگ کی تیاریوں کے دوران اور کچھ حصہ جنگ کے بعد نازل ہوا اور ایک حصہ ۹ ہجری کے اواخر میں موسم حج کے قریب نازل ہوا۔ موسم حج کے قریب نازل ہونے والا حصہ، نزول ترتیب کے اعتبار سے آخر میں نازل ہوا لیکن تدوینی ترتیب میں یہ حصہ سب سے پہلے ہے۔ اس سے بھی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آیات کی ترتیب رسول کریمؐ کی طرف سے ہے۔

مضامین: یہ سورہ رسول کریمؐ کی زندگی کے اواخر میں نازل ہوا، اس لیے اس میں بہت سے احکام کو آخری شکل دے دی گئی ہے۔

فتح مکہ کے بعد عرب کافروں نے جنگ حنین میں اس اسلامی تحریک کو کچلنے کی آخری کوشش کی۔ جب وہ اس جنگ میں بھی شکست کھا گئے تو وہ مایوس ہوگئے اور اسلامی ریاست کو اب عرب کافروں کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہ رہا لیکن اس سے دو نئے مسائل اور سامنے آگئے:

i۔ مسلمان تساہل پرست ہوگئے تھے اور داخلی خطرات سے فارغ ہونے کے بعد بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو رہے تھے۔ چنانچہ رومیوں کے خلاف تبوک کی جنگ کے لیے نکلنے کا حکم دیا گیا تو اس وقت مسلمانوں کی عدم آمادگی کا اندازہ اس سورہ کی اس آیت سے لگایا جا سکتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَا لَکُمۡ اِذَا قِیۡلَ لَکُمُ انۡفِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اثَّاقَلۡتُمۡ اِلَی الۡاَرۡضِ | اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے اللہ کی راہ میں نکلو تو تم زمین سے چمٹ جاتے

---

[1] الدار المنثور ۳: ۲۰۸ [2] محاسن التاویل ۵: ۳۴۵

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ....[1]

ہو؟ کیا تم آخرت کی جگہ دنیاوی زندگی کو زیادہ پسند کرتے ہو؟ دنیاوی زندگی کی متاع تو آخرت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کرے گا....

ii۔ فتح مکہ اور غزوہ حنین کی فتح اور جنگ موتہ میں بیرونی دشمن کے مقابلے میں فتح کے بعد عرب جاہلیت پر مایوسی چھا گئی تھی۔ اب وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی جنگی محاذ کھولنے کے قابل نہ رہے۔ کیونکہ جاہلی قوت کے دو ستون تھے: ایک قریش دوسرا ہوازن و ثقیف کے قبائل۔ قریش کا ستون فتح مکہ کے موقع پر گر گیا اور قبائل ہوازن و ثقیف کا ستون غزوۂ حنین میں۔ لہٰذا لوگ بڑی تعداد میں طاعۃً نہیں کراہۃً بظاہر اسلام میں داخل ہو گئے لیکن وہ اپنے دلوں میں نہ صرف یہ کہ ایمان نہیں رکھتے تھے بلکہ اسلام کے خلاف عداوت اور عناد ان کے دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اسلام میں اس طرح داخل ہونے والوں کی تعداد بڑی تیزی سے خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ ان منافقین نے اسلام کے خلاف ایک منظم سازش شروع کی تھی۔ ان کی طرف سے مسلمانوں کے حساس مقامات پر جاسوس متعین تھے۔ چنانچہ اسی سورہ کی آیت ۴۷ میں اس بات کی صراحت موجود ہے: وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ .... تمہارے اندر ان کے جاسوس موجود ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے ہیڈ کوارٹر بھی قائم کیا تھا جسے مسجد کا نام دے کر وہ اپنی سازشوں کو چھپانا چاہتے تھے اور اس مسجد کو اپنی کمین گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے، جسے رسول اللہؐ نے تبوک سے واپسی پر گرا دیا۔ اب بیرونی خطرات کو کچلنے کے بعد اسلام کو داخلی خطرات کا سامنا ہے۔

سورہ برائت اس داخلی دشمن کے چہرے سے پردہ اٹھاتا ہے اور اس کے عزائم فاش کرتا ہے۔ اس سورہ کے نزول کے بعد منافقین اس قدر رسوا ہوئے کہ وہ کسی سازش کو بروئے کار لانے کے قابل نہ رہے۔ ان میں سے بہت سے چہرے ہنوز فاش نہیں ہوئے تھے۔ ان کو یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ کہیں ہم بھی فاش نہ ہو جائیں۔ چنانچہ صاحب سر رسولؐ حضرت حذیفہؓ کے پاس یہ راز موجود تھا۔ حضرت حذیفہؓ نے حکم رسولؐ کی پاسداری کرتے ہوئے ان چہروں کو بے نقاب نہیں کیا تاہم اس سے ہمیں اجمالاً یہ علم ہو گیا کہ کچھ چہرے تا آخر پردے میں رہ گئے۔

---

[1] ۹ توبۃ: ۳۸۔ ۳۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ① فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ②

۱۔ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے (اعلان) بیزاری ہے ان مشرکوں کی طرف جن سے تمہارا معاہدہ تھا۔
۲۔ پس تم لوگ اس ملک میں چار مہینے چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

مشرکین کے ساتھ معاہدہ، حدیبیہ میں ہوا تھا اور اس کی مدت دس سال تھی۔ اس معاہدے کے بعد بنی بکر اور قبیلہ خزاعہ میں لڑائی چھڑ گئی۔ بنی بکر کا قریش کے ساتھ اور قبیلہ خزاعہ کا رسالتمآب کے ساتھ معاہدہ تھا۔ قریش نے اس لڑائی میں بنی بکر کا ساتھ دیا۔ جس سے حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا اور یہی عہد شکنی فتح مکہ کا سبب بن گئی۔ صلح حدیبیہ کے دو سال بعد مکہ فتح ہو گیا۔

یہ اعلان اس کلیے کے تحت ہے جو قرآن نے قائم کیا ہے کہ اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا خوف ہو تو ان کا عہد اس طرح مسترد کر دیں جیسے انہوں نے کیا ہے۔[۱] یعنی کسی جنگی کارروائی سے پہلے معاہدہ ختم ہونے کا اعلان کرنا ضروری ہے ورنہ خیانت شمار ہو گی اور اگر نقض عہد کا عمل مخالف کی طرف سے سرزد نہ ہوا ہو تو اسلامی ضابطۂ اخلاق کے مطابق بلا جواز یکطرفہ طور پر معاہدہ کا ختم کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ اسی سورہ کی آیت چار میں فرمایا:

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○

البتہ جن مشرکین سے تمہارا معاہدہ تھا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی قصور نہیں کیا اور نہ ہی تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ایسے لوگوں کے ساتھ جس مدت کے لیے معاہدہ ہوا ہے اسے پورا کرو، بتحقیق اللہ اہل تقویٰ کو دوست رکھتا ہے۔

اس کے باوجود مشرکوں کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے جس میں وہ یا تو معاہدہ ختم ہونے کے نتائج کے لیے آمادہ ہو جائیں یا اسلام میں داخل ہو جائیں۔ اس سے اسلام کے اس ضابطہ اخلاق کا علم ہوتا ہے کہ کسی کمزور قوم پر اعلان و مہلت کے بغیر حملہ کرنا بزدلی ہے اور شریفانہ عمل نہیں ہے۔ اگرچہ انہوں نے نقض عہد میں پہل کی ہو تاہم رحمت و ہدایت کا تقاضا یہی ہے کہ ان کو پھر بھی مہلت دی جائے اور اپنے آخری فیصلہ کے لیے ان پر کوئی غیر انسانی دباؤ نہ ہو۔

چار مہینے کی مہلت ان لوگوں کو دی گئی جن کے ساتھ معاہدے کی مدت معین نہیں ہے اور جن کے معاہدے میں مدت کا تعین ہو، ان کے ساتھ مقررہ مدت تک معاہدہ برقرار رہے گا۔

۸ھ میں مکہ فتح ہوا۔ اسی سال شوال کے مہینے میں قبائل ہوازن کے ساتھ حنین کی جنگ واقع ہوئی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حنین کی فتح کے بعد چند ایام طائف میں قیام فرمایا۔ اس کے بعد مدینہ واپس تشریف لے گئے۔ اسی سال مسلمانوں نے حضرت عتاب بن اسید کی امارت میں حج کیا اور یہ پہلا حج تھا جو اسلامی طریقے پر ہوا اور عتاب بن اسیدؓ اسلام کے پہلے امیر الحاج تھے۔ رسول کریمؐ نے طائف سے واپس تشریف لانے کے بعد رجب تک مدینے میں قیام فرمایا اور رجب ۹ ہجری کو آپ رومیوں کے خلاف جنگ کے لیے تبوک تشریف لے گئے جو رسول کریمؐ کی آخری جنگ ہے۔ تبوک سے واپسی پر آپؐ نے اس سال حج نہیں کیا چونکہ ابھی جزیرۃ العرب کے اطراف میں مشرکین کی معتدبہ تعداد آباد تھی، وہ بھی حج میں شرکت کر رہے تھے۔

اس سال حضرت ابوبکر کو امیر الحاج بنا کر بھیجا اور سورہ براءت کی ابتدائی آیات جو براءت از مشرکین پر مشتمل ہیں، ان کے حوالے کیں۔ بعد میں حضرت رسولؐ پر جبرئیل نازل ہوئے اور اللہ کا یہ پیغام پہنچایا:

لایؤدی عنك الا انت او رجل منك۔[1]

اعلان براءت کی آپ کی اس ذمہ داری کو یا تو خود آپ بنفس نفیس انجام دیں گے یا ایسا شخص جو آپ سے ہو۔

چنانچہ رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کو اپنی عضباء نامی ناقہ پر روانہ کیا اور فرمایا براءت کی آیات ابوبکر سے لے کر مکہ جاؤ اور اعلان کرو۔ چنانچہ حضرت علیؑ نے حضرت ابوبکر کو جحفہ یا حلیفہ یا فجنان میں سے ایک جگہ پر پا لیا اور رسول اللہؐ کا حکم نامہ دیا تو حضرت ابوبکر مدینہ واپس آ گئے اور رسول اللہؐ سے پوچھا کہ کیا میرے بارے میں کوئی آیت نازل ہوئی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، صرف یہ حکم نازل ہوا ہے کہ اس اعلان کو یا خود میں انجام دوں یا ایسا شخص جو مجھ سے ہو۔

[1] تفسیر ابن کثیر ۲: ۳۳۳

اس مضمون کو مختلف لفظوں میں درج ذیل اصحاب رسولؐ نے روایت کیا ہے:

۱۔ حضرت علی علیہ السلام	تفسیر ابن کثیر ۲: ۳۳
۲۔ حضرت ابو بکر	مسند احمد ۱: ۳
۳۔ ابن عباس	سنن ترمذی ۲: ۱۳۵۔ سنن بیہقی
۴۔ جابر بن عبد اللہ انصاری	سنن دارمی ۲: ۶۷
۵۔ انس بن مالک	سنن ترمذی ۲: ۱۳۵ و مسند احمد ۳: ۲۱۲
۶۔ ابو سعید خدری	الدر المنثور ۳: ۲۰۹
۷۔ ابو رافع	الدر المنثور ۳: ۲۱۰۔ فتح الباری ۸: ۲۵۶
۸۔ سعد بن ابی وقاص	فتح الباری ۸: ۲۵۵۔ الدر المنثور ۳: ۲۰۹
۹۔ ابوہریرہ	سنن دارمی ۲: ۳۳۷
۱۰۔ عبد اللہ بن عمر	فتح الباری ۸: ۲۵۶
۱۱۔ حبشی بن جنادہ	صحیح ترمذی ۲: ۲۱۳
۱۲۔ عمران بن حصین	تذکرۃ سبط ابن الجوزی
۱۳۔ ابو ذر غفاری	مطالب السئول: ۱۸

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الغدیر ۶: ۳۳۸۔

تبلیغ کا ابتدائی مرحلہ یہ ہے کہ خود رسول کریمؐ اللہ کا حکم لوگوں تک پہنچا دیں۔ رسول کریمؐ سے تبلیغ احکام عمل میں آنے اور اللہ کا حکم لوگوں تک پہنچ جانے کے بعد دوسرا مرحلہ آتا ہے۔

پہلا مرحلہ یعنی اللہ کا حکم لوگوں تک پہنچانا رسول کریمؐ کی رسالت اور ان کا فرض منصبی ہے، کیونکہ اللہ کی طرف سے احکام رسولؐ پر نازل ہوتے ہیں اور رسولؐ ہی یہ احکام لوگوں تک پہنچائیں گے۔

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب رسولؐ کی طرف سے تبلیغ احکام کا عمل وجود میں آ گیا اور رسولؐ نے لوگوں میں ایک مرتبہ اعلان کر دیا تو دوسرے مرحلے میں اعلان رسالت سننے والوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں تک بھی یہ احکام پہنچا دیں۔ چنانچہ خود رسول خداؐ تبلیغ احکام کے بعد فرماتے تھے:

فلیبلغ الشاھد الغائب۔[1] حاضرین پر فرض ہے کہ وہ اس حکم کو غیر حاضر لوگوں تک پہنچا دیں۔

براءت از مشرکین کا اعلان پہلے مرحلے میں تھا۔ یعنی خود رسول اللہؐ کا فرض منصبی تھا کہ اس اعلان کو مشرکین تک خود پہنچائیں اور اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو یہ ذمہ داری وہ شخص انجام دے جو رسول اللہؐ کے

---

[1] بشارۃ المصطفیٰ ص ۷۰

بعد دوسرے درجے پر ہے۔ چنانچہ نص احادیث میں بھی یہی حکم آیا ہے: لا یؤدی عنك الا انت او رجل منك.... یعنی یہ اعلان اس مشن کی پہلی شخصیت کرے یا دوسری شخصیت۔ یہی وہ مقام ولایت ہے جو حضرت علی علیہ السلام کو حاصل ہے۔

چنانچہ مسند احمد بن حنبل کی روایت میں آیا ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام کو اعلان براء ت کے لیے جانے کا حکم فرمایا تو عرض کیا: یا نبی اللہؐ میں تیز زبان اور خطیب نہیں ہوں تو رسول کریمؐ نے فرمایا:

مابد ان اذهب بها انا او تذهب بها انت۔[1]	اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ یا میں خود اسے لے جاؤں یا آپ لے جائیں۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی تیسرا شخص یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔

مقام افسوس ہے کہ علی علیہ السلام کی اس منزلت کو گھٹانے کے لیے یہ تاویل کی جاتی ہے کہ ایسا صرف عرب جاہلیت کی ایک رسم کی پابندی میں کیا گیا کہ وہ جب عہد توڑتے تھے، خود عہد کرنے والا یا اس کے خاندان کا کوئی فرد معاہدہ ختم کرنے کا اعلان کیا کرتا تھا۔ گویا یہ سارا اہتمام اس رسم جاہلیت پر عمل کرنے کے لیے کیا گیا اور جبرئیل بھی وحی لے کر اسی مقصد کے لیے نازل ہوئے۔

ثانیاً اس قسم کی کسی رسم کا ذکر صرف اس جگہ ملتا ہے، اس کا کوئی مدرک بھی نہیں ہے۔

ثالثاً رسولؐ کے خاندان کے دیگر افراد سے بھی یہ رسم پوری ہو سکتی تھی، صرف علی علیہ السلام پر انحصار نہ کرتے۔

اہم نکات

۱۔ عہد توڑنے والوں کو بھی اسلام اپنی رحمت میں لیتا ہے اور مہلت دیتا ہے: فَسِيۡحُوۡا فِى الۡاَرۡضِ..

۲۔ حجت تمام ہونے کے بعد ہی اللہ کافروں کو رسوا کرتا ہے۔ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخۡزِى الۡكٰفِرِيۡنَ ۔

وَ اَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوۡمَ الۡحَجِّ الۡاَكۡبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىۡٓءٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۙ وَرَسُوۡلُهٗ ؕ فَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ ۚ وَاِنۡ تَوَلَّيۡتُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّكُمۡ غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ	۳۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن لوگوں کے لیے اعلان ہے کہ اللہ اور اس کا رسول بھی مشرکین سے بیزار ہے اور پس اگر تم توبہ کر لو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر منہ پھیر لو گے تو جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور کافروں کو دردناک عذاب

---

[1] تفسیر العیاشی ۲ : ۷۵

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ③ کی خوشخبری سنا دو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ: سابقہ آیت میں رخ کلام مشرکین کی طرف تھا۔ اس آیت میں کلام کا رخ عام لوگوں کی طرف ہے۔ یعنی سابقہ آیت میں اس اعلان سے خود مشرکین کو اور دوسری آیت میں تمام لوگوں کو آگاہ کیا تاکہ اس اعلان میں کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔

۲۔ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ: یہ اعلان ۱۰ ذی الحجہ کو ہوا تھا، جسے یوم النحر کہتے ہیں۔ چنانچہ ائمہ اہل البیت (ع) سے روایت ہے کہ یوم النحر کو حج اکبر کا یوم کہا گیا ہے۔[1]

۳۔ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ: یعنی مشرکین کے ساتھ جو معاہدہ ہے اللہ اور اس کا رسول اس سے بری اور آزاد ہیں۔

۴۔ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ: اعلان برائت کے ساتھ ساتھ تبلیغ و دعوت بھی جاری ہے کہ ہنوز کفر و شرک کو ترک کر کے اسلام کے دائرے میں آنے کی گنجائش باقی ہے۔

۵۔ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ: اگر تم نے اس دعوت سے منہ پھیر لیا اور کفر و شرک پر قائم رہے تو تم اللہ کی طرف اپنی رسوائی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتے۔

اہم نکات

۱۔ حج کا اجتماع، اسلام کی اپنی خارجہ و داخلہ پالیسی کے اعلان کے لیے بھی ہے: وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ ....

۲۔ اعلان براءت کے ساتھ ترغیب اور دعوت جاری رہتی ہے: فَاِنْ تُبْتُمْ ....

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ④

۴۔ البتہ جن مشرکین سے تمہارا معاہدہ تھا پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی قصور نہیں کیا اور نہ ہی تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ایسے لوگوں کے ساتھ جس مدت کے لیے معاہدہ ہوا ہے اسے پورا کرو بتحقیق اللہ اہل تقویٰ کو دوست رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ: یہ اعلان برائت ان مشرکین کو شامل نہیں کرتا جنہوں نے عہد شکنی نہیں کی،

نہ براہ راست نہ بالواسطہ۔

۲۔ لَمۡ یَنۡقُصُوۡکُمۡ شَیۡـًٔا: براہ راست عہد شکنی تو یہ ہے کہ کسی مسلمان کو قتل کر دیں۔

۳۔ وَّلَمۡ یُظَاہِرُوۡا عَلَیۡکُمۡ اَحَدًا: بالواسطہ عہد شکنی یہ ہے کہ مسلمانوں کے دشمنوں کی حمایت اور مدد کریں۔

۴۔ فَاَتِمُّوۡۤا اِلَیۡہِمۡ عَہۡدَہُمۡ اِلٰی مُدَّتِہِمۡ: معاہدہ کی مدت ختم ہونے تک اس معاہدے کی پابندی کرو۔

۵۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُتَّقِیۡنَ: عہد و میثاق کی پابندی متقی لوگوں کا اصول ہے۔

چنانچہ بنی کنانہ اور بنی ضمرہ نے عہد شکنی نہیں کی۔ اسی طرح اہل بحرین، ایلہ، دومۃ الجندل کے ساتھ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال تک معاہدہ قائم رہا۔

اہم نکات

۱۔ یہ بات تقویٰ کے خلاف ہے کہ جن لوگوں نے عہد شکنی نہیں کی ان کے ساتھ عہد شکنی کی جائے۔

فَاِذَا انۡسَلَخَ الۡاَشۡہُرُ الۡحُرُمُ فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِکِیۡنَ حَیۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡہُمۡ وَ خُذُوۡہُمۡ وَ احۡصُرُوۡہُمۡ وَ اقۡعُدُوۡا لَہُمۡ کُلَّ مَرۡصَدٍ ۚ فَاِنۡ تَابُوۡا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوۡا سَبِیۡلَہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۵﴾

۵۔ پس جب حرمت کے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو تم جہاں پاؤ قتل کرو اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات پر ان کی تاک میں بیٹھو پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بے شک اللہ بڑا درگزر کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

انۡسَلَخَ: السلخ کے اصل معنی کھال کھینچنے کے ہیں، پھر اسی سے استعارہ کے طور پر زرہ اتارنے اور مہینہ گزرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

مَرۡصَدٍ: الرصد گھات لگا کر بیٹھنا۔

تفسیر آیات

حرمت کے مہینوں سے مراد وہ چار مہینے ہیں جن کی مہلت دی گئی ہے۔ مہلت کے یہ چار مہینے گزر

جائیں تو مسلمانوں کو یہ حکم ملتا ہے کہ وہ مشرکین کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں اور اللہ کی زمین کو ان کے ناپاک وجود سے پاک کریں۔ اس مقصد کے لیے درج ذیل طریقے اختیار کرنے کا حکم ہوا:

۱۔ فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِکِیۡنَ: ان کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ یعنی ان کی طرف سے عہد شکنی کے بعد اعلان براءت ہوتا ہے۔ اعلان براءت کے موقع پر چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس کے بعد بھی وہ اپنے پرانے رویے پر قائم رہتے ہیں تو وہ مفسد ہیں اور ان کے جان و مال کی حرمت ختم ہے۔

۲۔ وَ خُذُوۡهُمۡ: اگر کسی وجہ سے قتل ممکن نہیں ہے تو ان کو گرفتار کر لیا جائے۔

۳۔ وَ احۡصُرُوۡهُمۡ: اگر یہ دونوں باتیں ممکن نہیں ہیں تو ان کو اپنے قلعوں اور ٹھکانوں کے محاصرے میں رکھا جائے تاکہ دیگر لوگوں کے ساتھ ان کی معاشرت ختم ہو جائے۔

۴۔ وَ اقۡعُدُوۡا لَهُمۡ کُلَّ مَرۡصَدٍ: اگر ان کے ٹھکانوں کا علم نہ ہو تو ہر گھات پر ان کی تاک میں بیٹھا جائے تاکہ ان کو قتل کیا یا پکڑا جا سکے۔

یہ وہ مشرکین ہیں جن کو گذشتہ ۲۲ سالوں سے اسلام کی دعوت دی جا رہی ہے۔ اس دوران ان لوگوں نے مسلمانوں کو ہر قسم کی اذیت دی۔ ان کو گھروں سے نکالا۔ ان کے خلاف کئی جنگیں لڑیں اور کوئی ایسا ظلم و زیادتی نہیں چھوڑی جو وہ کر سکتے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود آج مسلمانوں کو یہ حکم مل رہا ہے کہ

۵۔ فَاِنۡ تَابُوۡا: اگر وہ توبہ کریں اور اسلامی شعائر پر عمل پیرا ہوں تو ان سے متعرض نہ ہوں۔ ان کو امن دیں۔ ان کو آزادی دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین کو قتل کرنے کا حکم کوئی انتقامی یا نسل کشی کا عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک حکمت عملی ہے مخلوق خدا کو امن و سکون دینے کے لیے اور لوگوں کو راہ راست کی طرف دعوت دینے کا ایک اسلوب ہے۔

۶۔ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ: شرک چھوڑ کر اسلام کی طرف آنے کے بعد دو باتیں دیکھی جائیں گی: اقامۃ نماز اور ادائے زکوۃ۔ اگر ان دونوں پر عمل نہیں ہے تو اگلا حکم فَخَلُّوۡا سَبِیۡلَهُمۡ (ان کا راستہ چھوڑ دو) کا حکم نافذ نہ ہوگا۔ یعنی بے نماز کو مسلمان نہیں سمجھا جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ اسلامی حکومت کو چاہیے کہ معاشرے سے فساد کو جڑ سے کاٹنے کے لیے تمام وسائل بروئے کار لائے۔

۲۔ مفسد و مشرک کے لیے بھی توبہ و ہدایت کا دروازہ ہر وقت کھلا رکھنا چاہیے۔

وَ اِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ　۶۔ اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے

اسۡتَجَارَكَ فَاَجِرۡهُ حَتّٰى يَسۡمَعَ	پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دیں تا کہ وہ کلام اللہ
كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبۡلِغۡهُ مَاۡمَنَهٗ ؕ	کو سن لے پھر اسے اس کی امن کی جگہ پہنچا دیں
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ۝	ایسا اس لیے ہے کہ یہ لوگ جانتے نہیں ہیں۔

تفسیر آیات

اسلامی جنگوں کا مقصد اپنے نظریات کو جبر و اکراہ کے ساتھ بزور شمشیر مسلط کرنا نہیں ہے بلکہ یہ جنگیں جبر و اکراہ کے خلاف لڑی گئیں۔ ان لوگوں کے خلاف اسلام نے تلوار اٹھائی جو طاقت کے ذریعے لوگوں کو آزادانہ سوچنے، کسی دعوت پر غور کرنے سے روکتے تھے اور جونہی یہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے اور دعوت اسلام اور دعوت قرآن پر آزادانہ غور وفکر کرنے کا موقع میسر آ جاتا ہے، اسلام ایسے لوگوں کو نہ صرف امن فراہم کرتا ہے بلکہ انہیں ان کی اپنی امن گاہ تک پہنچا دیتا ہے، پورا تحفظ فراہم کرتا ہے اور ان کو پوری آزادی فراہم کرتا ہے کہ وہ بغیر کسی جبر واکراہ کے کوئی بھی مذہب اپنائیں۔ اس سے اسلام کا ضابطہ اخلاق معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت پر غور کرنے کے لیے جبر نہیں، امن وتحفظ فراہم کرتا ہے۔

۱۔ وَاِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ اسۡتَجَارَكَ: اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو۔ فَاَجِرۡهُ۔ اس کو تحفظ دے دو کیونکہ یہ مشرک، اسلام کے خلاف طاقت استعمال کرنے کے پوزیشن میں نہیں ہے۔ ایسے مشرک کو بھی تحفظ دے دو

۲۔ حَتّٰى يَسۡمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ: تا کہ وہ کلام الٰہی کو سن لے۔ اسلامی دعوت کو آزادانہ ماحول میں سن اور سمجھ لے۔ شاید راہ راست پر آ جائے۔ شاید اس دین کو سمجھ لے۔

۳۔ ثُمَّ اَبۡلِغۡهُ مَاۡمَنَهٗ: پھر اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچا دیں۔ اس مشرک کو تحفظ دو اور امن کی جگہ پہنچا دو جس نے اس دین کے خلاف ہر حربہ استعمال کیا مسلمانوں پر ہر قسم کا ظلم روا رکھا۔

۴۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ: یہ تحفظ اس لیے دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس دعوت کی حقیقت کو نہیں جانتے۔ جاہل اگر حق کو قبول نہیں کرتا ہے تو اس کو سمجھاؤ، آزاد اور امن کے ماحول میں سمجھاؤ، جبر واکراہ کے ماحول میں نہیں۔ البتہ اگر یہی جاہل اس دعوت کے خلاف طاقت استعمال کرتا ہے تو اس صورت میں اس کے خلاف طاقت استعمال کرو۔

اہم نکات

۱۔ نہ جاننے والوں کے ساتھ ہمدردانہ روش اختیار کرنی چاہیے: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ....

۲۔ دعوت اسلامی پر غور وفکر کرنے کے لیے سازگار اور آزاد ماحول فراہم کرنا چاہیے: فَاَجِرۡهُ حَتّٰى

یَسۡمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ ....

کَیۡفَ یَکُوۡنُ لِلۡمُشۡرِکِیۡنَ عَہۡدٌ عِنۡدَ اللّٰہِ وَ عِنۡدَ رَسُوۡلِہٖۤ اِلَّا الَّذِیۡنَ عٰہَدۡتُّمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ۚ فَمَا اسۡتَقَامُوۡا لَکُمۡ فَاسۡتَقِیۡمُوۡا لَہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۷﴾

۷۔ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد مشرکین کے لیے کیسے ہو سکتا ہے بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد الحرام کے پاس معاہدہ کیا ہے؟ پس جب تک وہ تمہارے ساتھ (اس عہد پر) قائم رہیں تو تم بھی ان کے ساتھ قائم رہو، یقیناً اللہ اہل تقویٰ کو دوست رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ کَیۡفَ یَکُوۡنُ لِلۡمُشۡرِکِیۡنَ عَہۡدٌ: عہد شکن مشرکین کے ساتھ کسی معاہدہ کے برقرار رہنے کی نفی ہے۔ چونکہ مشرکین ان اقدار کے مالک نہیں ہیں جن سے کسی عہد و میثاق پر قائم رہنے کو ضروری اور عہد شکنی کو قبیح تصور کریں۔

۲۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ عٰہَدۡتُّمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ: عہد توڑنے والوں کے ساتھ ایک بار ان مشرکین کا ذکر فرمایا جو عہد و پیمان پر قائم ہیں جنہوں نے معاہدہ کی پابندی کی تھی۔

۳۔ فَمَا اسۡتَقَامُوۡا لَکُمۡ: ان کے بارے میں حکم ہے جب تک وہ اس عہد پر قائم ہیں تم بھی قائم رہو۔ کبھی بھی مسلمانوں کی طرف سے عہد شکنی نہیں ہونی چاہیے۔ چونکہ عہد و میثاق کی پابندی اسلام کے نزدیک ایک انسانی مسئلہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ صلح پسند لوگوں کے ساتھ صلح قائم رکھنا تقویٰ ہے۔

کَیۡفَ وَ اِنۡ یَّظۡہَرُوۡا عَلَیۡکُمۡ لَا یَرۡقُبُوۡا فِیۡکُمۡ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّۃً ؕ یُرۡضُوۡنَکُمۡ بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَ تَاۡبٰی قُلُوۡبُہُمۡ ۚ وَ اَکۡثَرُہُمۡ فٰسِقُوۡنَ ۚ﴿۸﴾

۸۔ (ان سے عہد) کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اگر وہ تم پر غلبہ حاصل کر لیں تو وہ نہ تو قرابتداری کا لحاظ کریں گے اور نہ عہد کا؟ وہ زبان سے تو تمہیں خوش کر دیتے ہیں مگر ان کے دل انکار پر تلے ہوئے ہیں اور ان میں اکثر لوگ فاسق ہیں۔

تشریح کلمات

اِلًّا: ہر وہ صاف اور ظاہری حالت جس کا انکار ناممکن ہے۔ عہد قرابتداری۔

ذِمَّۃً: عہد و پیان۔

تفسیر آیات

۱۔ کَیۡفَ وَ اِنۡ یَّظۡہَرُوۡا عَلَیۡکُمۡ: یعنی یہ لوگ درحقیقت معاہدہ نہیں کرتے بلکہ عجز و ناتوانی کی صورت میں زبانی طور پر معاہدے کا نام لیتے ہیں۔ چنانچہ جیسے ہی ان کو تم پر بالادستی حاصل ہو گی وہ کسی معاہدے یا قرابتداری کی پاسداری نہیں کریں گے۔

۲۔ یُرۡضُوۡنَکُمۡ بِاَفۡوَاہِہِمۡ: زبان سے خوش کرتے ہیں کہ ہم معاہدے کی پاسداری کریں گے مگر وہ دل سے کسی پاسداری کے ارادے میں نہیں ہوتے۔ یعنی یہ لوگ ایسے نہیں ہیں کہ معاہدہ کیا ہو بعد میں توڑ دیا ہو بلکہ شروع سے معاہدے کو بھی ان لوگوں نے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔

اہم نکات

۱۔ ایسے لوگوں کے معاہدے پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے جو طاقت کی قدروں کو مانتے ہیں: وَ اِنۡ یَّظۡہَرُوۡا عَلَیۡکُمۡ ....

اِشۡتَرَوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیۡلًا فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ؕ اِنَّہُمۡ سَآءَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹﴾

۹۔ انہوں نے اللہ کی آیات کے عوض تھوڑی سی قیمت وصول کر لی ہے پس وہ اللہ کے راستے سے ہٹ گئے ہیں، یہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں یقیناً وہ بہت برا ہے۔

لَا یَرۡقُبُوۡنَ فِیۡ مُؤۡمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّۃً ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُعۡتَدُوۡنَ ﴿۱۰﴾

۱۰۔ نہ تو یہ کسی مومن کے حق میں قرابتداری کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ عہد کا اور یہی لوگ زیادتی کا ارتکاب کرنے والے ہیں۔

تشریح کلمات

فَصَدُّوۡا: الصد (ص د د) منہ موڑ لینا۔ اذا کان من الصدود فمعناہ اعرضوا و اذا کان من الصدّ فمعناہ منعوا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِشۡتَرَوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ: عہد شکنی کے پیچھے موجود عوامل و محرکات کا ذکر ہے کہ یہ لوگ جس نفسیات کے مالک ہیں، اس کے تحت نہایت حقیر مالی مفادات کی خاطر آیات الٰہی کو نظرانداز کرتے ہیں اور راہ حق سے ہٹ جاتے ہیں اور زیادتی و تجاوز کو ان لوگوں نے اپنا شیوہ بنا رکھا ہے۔ ان سے عہد و پیمان کی پاسداری کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔

۲۔ فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِہٖ: وہ اسی معمولی مفاد کے تحت راہ خدا سے منحرف ہو جاتے ہیں۔

۳۔ اِنَّہُمۡ سَآءَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ: راہ خدا کو دنیاوی مفاد سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ اس کے باوجود مفادات کو ترجیح دینا کتنا برا عمل ہے۔

۴۔ لَا یَرۡقُبُوۡنَ: اس قسم کے کمزور نفسیات کے مالک مثبت قدم اٹھانے کے اہل نہیں ہوتے کہ ان سے قرابتداری یا عہد کی پاسداری کی توقع کی جائے۔

اہم نکات

۱۔ مفاد پرست ذہنیت کے لوگوں کا معاہدہ بھی قابل بھروسا نہیں ہے: اِشۡتَرَوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ..

فَاِنۡ تَابُوۡا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ ؕ وَ نُفَصِّلُ الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱﴾

۱۱۔ پس اگر یہ لوگ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور علم رکھنے والوں کے لیے ہم آیات کو واضح کر کے بیان کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاِنۡ تَابُوۡا: جن لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ ایک عمر ظلم و زیادتی کی، آج توبہ کرنے سے وہ ان کے برابر بلکہ بھائی بن گئے۔ ان کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو قدیم ظلم سہنے والوں کے ہوتے ہیں۔ معاشرتی قانونی حیثیت سے ان میں کوئی فرق نہیں ہو گا۔

۲۔ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ: نماز قائم کرنے اور زکوۃ ادا کرنے سے وہ اسلامی بھائی چارے میں داخل ہو جاتے ہیں: فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ۔

اہم نکات

۱۔ مسلم دینی برادری میں داخل ہونے کے لیے توبہ کے ساتھ عمل، نماز و زکوٰۃ بھی ضروری ہے۔

۲۔ برادر کی تعبیر اسلامی مساوات کا اہم ترین نمونہ ہے: فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ...۔

وَ اِنۡ نَّکَثُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ عَہۡدِہِمۡ وَ طَعَنُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ فَقَاتِلُوۡۤا اَئِمَّۃَ الۡکُفۡرِ ۙ اِنَّہُمۡ لَاۤ اَیۡمَانَ لَہُمۡ لَعَلَّہُمۡ یَنۡتَہُوۡنَ ﴿۱۲﴾

۱۲۔اور اگر عہد کرنے کے بعد یہ لوگ اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمہارے دین کی عیب جوئی کرنے لگ جائیں تو کفر کے اماموں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں شاید وہ باز آ جائیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاِنۡ نَّکَثُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ: کفر کی امامت کرنے والوں میں دو باتیں ہوتی ہیں: ایک بدعہدی اور دوسری دین کی عیب جوئی۔

۲۔ فَقَاتِلُوۡۤا اَئِمَّۃَ الۡکُفۡرِ: دین کی عیب جوئی میں قرآن کی عیب جوئی، رسولؐ کی عیب جوئی وغیرہ بھی شامل ہے۔ اس عیب جوئی کی وجہ سے دوسرے لوگ اسلام سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ ضلالت کا سرچشمہ قرار پاتے ہیں اور کفر کے امام ثابت ہوتے ہیں۔

۳۔ اِنَّہُمۡ لَاۤ اَیۡمَانَ لَہُمۡ: مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ کفر کی اس جڑ اور اس سرچشمے کا مقابلہ کرو۔ فساد کے اصل منبع کو سامنے رکھ کر جہاد کرو۔ ان کے ساتھ کسی معاہدے کے بھروسے میں نہیں رہنا چاہیے۔

۴۔ لَعَلَّہُمۡ یَنۡتَہُوۡنَ: شاید وہ اس اقدام سے باز آ جائیں۔ یعنی اس مقابلہ کا اصل مقصد کفر کو جارحیت سے باز رکھنا ہے۔ ان کے خلاف جارحیت کرنا مقصود نہیں ہے۔

واضح رہے کہ آیات قرآنی کسی قوم کے بارے میں نازل ہوتی ہیں لیکن وہ اس قوم تک محدود نہیں رہتیں بلکہ بفرمان حدیث:

یجری فیمن بقی کما یجری فی من مضی۔[1]

آیات قرآنی آنے والوں پر ایسے ہی صادق آتی ہیں جیسے گزشتگان پر صادق آتی ہے۔

اور ایک تفسیری کلیہ ہے۔

العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص السبب۔

لفظ کے عموم کو دیکھا جاتا ہے (نزول آیت کے) سبب خاص کو نہیں۔

اس واضح مطلب کی روشنی میں ہم درج ذیل احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام

---

[1] الکافی ۱: ۱۹۱

نے بصرہ میں اس آیت کی تلاوت فرمائی، پھر فرمایا:

اما واللّٰہ لقد عھد الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم وقال: یا علی لتقاتلن الفئۃ الناکثۃ والفئۃ الباغیۃ والفئۃ المارقۃ ....[1]

آگاہ رہو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے وصیت فرمائی اور فرمایا: اے علی آپ کو جنگ لڑنا ہو گی عہد شکن گروہ سے، باغی گروہ سے، خارجی گروہ سے۔

الدرالمنثور میں آیا ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس اس آیت کی تلاوت ہوئی تو انہوں نے فرمایا: ماقوتل اھل ھذہ الایۃ بعد. ابھی اس آیت کے مصداق لوگوں سے قتال عمل میں نہیں آیا اور قرب الاسناد صفحہ ۴۶ میں امالی مفید ۳۳۴ میں، تفسیر عیاشی میں، امالی شیخ طوسی ۱۱۳ میں اس موضوع پر قابل مطالعہ روایات موجود ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اسلامی نظام و دستور پر نکتہ چینی وعیب جوئی کرنا کفر کی رہنمائی کرنا ہے: وَطَعَنُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ ....

۲۔ مسلمانوں کو کفر کے اس سرچشمے کا مقابلہ کرنا چاہیے: فَقَاتِلُوۡۤا اَئِمَّۃَ الۡکُفۡرِ ....

اَلَا تُقَاتِلُوۡنَ قَوۡمًا نَّکَثُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ وَ ہَمُّوۡا بِاِخۡرَاجِ الرَّسُوۡلِ وَ ہُمۡ بَدَءُوۡکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ؕ اَتَخۡشَوۡنَہُمۡ ۚ فَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشَوۡہُ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۳﴾

۱۳۔ کیا تم ایسے لوگوں سے نہیں لڑو گے جو اپنی قسمیں توڑ دیتے ہیں اور جنہوں نے رسول کو نکالنے کا ارادہ کیا تھا؟ پہلی بار تم سے زیادتی میں پہل بھی انہوں نے کی تھی، کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ اگر تم مؤمن ہو تو اللہ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلَا تُقَاتِلُوۡنَ قَوۡمًا: اس آیت میں مشرکین کی طرف سے گزشتہ ۲۲ سالوں میں ہونے والی زیادتیوں کا ذکر ہے جن کی بنا پر آج ان سے کسی قسم کی نرمی برتنے کا جواز نہیں رہا اور نہ ہی یہ لوگ کسی رعایت کے قابل رہے:

i۔ نَّکَثُوۡۤا اَیۡمَانَہُمۡ: ان لوگوں نے حدیبیہ میں جس معاہدے کی پاسداری کرنے کی قسمیں کھائی تھیں ان کو توڑ دیا اور اس معاہدے کی خلاف ورزی کی۔

---

[1] مجمع البیان ذیل آیت۔ مستدرک الوسائل ۱۱: ۶۴ باب حکم قتال البغاۃ....

ii۔ وَهَمُّوۡا بِاِخۡرَاجِ الرَّسُوۡلِ: رسول اللہؐ کو مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا بلکہ ان کو مکہ جیسے حرم الٰہی اور امن کی جگہ پر قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ بعض کے نزدیک وَهَمُّوۡا بِاِخۡرَاجِ الرَّسُوۡلِ رسولؐ کو نکالنے کا ارادہ کیا سے مراد مدینہ سے نکالنے کا ارادہ ہے جو مشرکین نے جنگ احد کے موقع پر کیا تھا۔ بعض دیگر مفسرین کہتے ہیں اس سے مراد فتح مکہ کے موقع پر مشرکین نے رسولؐ کو مکہ سے نکالنے کا قصد کیا تھا۔ اس سے مراد ہجرت نہیں ہو سکتی چونکہ یہ معاہدہ توڑنے کے بعد کا واقعہ ہے۔

iii۔ وَهُمۡ بَدَءُوۡكُمۡ: جتنی بھی جنگیں لڑی گئیں، سب میں ان لوگوں نے پہل کی۔ اس میں مستشرقین کے معاندانہ الزام کا رد ہے کہ اسلام کی جنگیں جارحانہ تھیں۔ اس جملے سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام جنگوں میں مشرکین نے پہل کی تھی۔ اسلام نے اپنے دفاع کی جنگ لڑی ہے۔

۲۔ اَتَخۡشَوۡنَهُمۡ: لہٰذا آج مشرکین کو اگرچہ آئندہ حج کرنے سے منع کیا ہے اور تمام مشرکوں سے معاہدوں کو بہ یک جنبش قلم منسوخ کیا ہے، اس سے یہ امکان ہنوز باقی ہے کہ پورے ملک کے مشرکین جمع ہو جائیں اور مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ تاہم تمہیں ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ کل بے سر و سامانی میں وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے، آج تم ملک کے بڑے حصے پر قابض ہو اور مشرکین میں کوئی قابل توجہ طاقت بھی باقی نہیں رہی، اس کے باوجود اَتَخۡشَوۡنَهُمۡ کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ ڈرنا اس ذات کی ناراضگی سے چاہیے جس کے ہاتھ میں کل کائنات کی حکومت ہے۔

اہم نکات

۱۔ کافر جنگ و جارحیت میں پہل کرتا ہے: وَهُمۡ بَدَءُوۡكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ ....۔

۲۔ صرف مؤمن کے دل میں خوف خدا پیدا ہوتا ہے: اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ۔

قَاتِلُوۡهُمۡ يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ بِاَيۡدِيۡكُمۡ وَيُخۡزِهِمۡ وَيَنۡصُرۡكُمۡ عَلَيۡهِمۡ وَ يَشۡفِ صُدُوۡرَ قَوۡمٍ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۴﴾

۱۴۔ ان سے لڑو تاکہ تمہارے ہاتھوں اللہ انہیں عذاب دے اور انہیں رسوا کرے اور ان پر تمہیں فتح دے اور مومنین کے دلوں کو ٹھنڈا کرے۔

وَيُذۡهِبۡ غَيۡظَ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ وَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۱۵﴾

۱۵۔ اور ان کے دلوں کا غصہ نکالے اور اللہ جس کی چاہتا ہے توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

ان سے جنگ کرو۔ اللہ تعالی اپنی مشیت و ارادے کے لیے سبب بنائے گا اور تمہارے ہاتھوں اللہ ان کو عذاب دے گا۔ اس سے ان مسلمانوں کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچے گی جن کو ان مشرکوں نے آزار پہنچایا تھا اور مسلمانوں کی فتح و نصرت دیکھ کر ان ظالموں کے بارے میں جو غیظ و غضب ہے، وہ فرو ہو جائے گا۔

کفر کے ساتھ مقابلہ کرنے، دوسرے لفظوں میں کفار کے خلاف جہاد کرنے کے درج ذیل نتائج ہیں:

الف: يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ : مسلمانوں کے ہاتھوں اللہ ان کو عذاب دے گا۔

ب: وَيُخۡزِهِمۡ : جیسا کہ بدر و دیگر جنگوں میں کافروں کو رسوائی اٹھانا پڑی۔

ج: وَيَنۡصُرۡكُمۡ عَلَيۡهِمۡ : کفار کے خلاف اللہ کی نصرت و یاری حاصل ہو گی۔

د: يَشۡفِ صُدُوۡرَ قَوۡمٍ مُّؤۡمِنِيۡنَ : مؤمنین کے دلوں کو ٹھنڈا کرے گا۔

ہ: وَيُذۡهِبۡ غَيۡظَ قُلُوۡبِهِمۡ : یہ فتح و نصرت ان مؤمنین کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچائے گی جو کفار کے مظالم کی وجہ سے غم و غصے میں بھرے ہوئے تھے۔

و: وَيَتُوۡبُ اللّٰهُ : با این ہمہ توبہ کا دروازہ بند نہیں ہے۔ اگر کفر چھوڑ کر ایمان کی طرف آ جائیں تو ان کی توبہ قبول کی جائے گی۔

لطیفہ: انسان اپنے افعال میں خودمختار ہیں یا مجبور۔ اہل سنت کے ہاں دو نظریے ہیں: ایک اشعری مذہب کا جو جبر کا قائل ہے اور اہل سنت کا اکثریتی مذہب ہے، دوسرا معتزلہ کا، جو خودمختاری اور تفویض کا نظریہ رکھتا ہے۔ یہ مذہب آج کل تقریبا متروک ہو چکا ہے۔

اشعری مذہب والے اپنے نظریہ جبر پر اس آیت کے جملہ يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ بِاَيۡدِيۡكُمۡ سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں: دیکھیے عذاب کو اللہ نے اپنا فعل قرار دیا ہے اور یہ فعل مسلمانوں کے ہاتھ سے صرف آلہ کے طور پر صادر ہو رہا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ تمام افعال اللہ کے ہیں۔ بندے تلواروں اور نیزوں کی طرح صرف آلہ ہیں۔

امام معتزلہ جبائی نے جواب دیا ہے: اگر تمام افعال اللہ کے ہیں اور انسان صرف آلہ ہیں تو کیا یہ کہنا بھی درست ہو گا کہ اللہ مؤمنوں کو کافروں کے ہاتھوں عذاب دیتا ہے۔ اللہ کافروں کی زبان سے انبیاء کی تکذیب کرتا ہے اور ان کی زبان سے اللہ مؤمنوں پر لعنت بھیجتا ہے کیونکہ تمام افعال کا خالق تمہارے نزدیک صرف اللہ ہے۔ بندے تو تلواروں اور نیزوں کی طرح صرف آلہ ہیں۔

فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر ۱۶: ۳ میں اس آیت کے ذیل میں اس کا یہ جواب دیا ہے جو کہ ایک لطیفہ ہے۔ کہتے ہیں:

اما الذی الزمتموہ علینا فالامر کذلك الا انا لا نقولہ باللسان۔

اوپر کی باتیں جو ہمارے نظریے کے لیے لازم آتی ہیں ہمیں قبول ہیں کہ بات ایسی ہی ہے تاہم ان باتوں کو ہم زبان پرنہیں لاتے۔

ہم نے مقدمہ تفسیر میں ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے مصری اساتذہ کہتے ہیں کہ ہم نظریہ جبر کو سرے سے اپنے عوام کے لیے بیان نہیں کرتے۔

میں کہتا ہوں: جب خود نظریہ جبر نا قابل بیان ہے تو اس نظریے کو لازم آنے والی باتیں امام رازی کے لیے کیسے قابل بیان ہوں گی۔

امامیہ کا موقف یہ ہے کہ نہ جبر ہے، نہ تفویض۔ طاقت اللہ کی طرف سے، استعمال بندے کی طرف سے۔ امکان اللہ کی طرف سے، انتخاب بندے کی طرف سے۔ بازو اللہ کی طرف سے ہے، اس سے غرق ہونے والے کو بچانا یا یتیم کے منہ پر طمانچہ مارنا بندے کے اختیار میں ہے۔ اختیار دینے کے بعد امتحان ہوتا ہے۔ دو راستے ہوں تو اختیار ہوتا ہے۔ راستہ ایک ہی ہو تو جبر ہوتا ہے۔ جبر کے ساتھ امتحان نہیں ہوسکتا۔ امتحان نہیں ہوسکتا تو بندے کو مکلّف نہیں بنایا جا سکتا۔ ہاتھ پیر باندھ کر دریا میں پھینک دیا جائے پھر اس کو حکم دیا جائے: خبردار جسم کا کوئی حصہ بھیگ نہ جائے، نامعقول ہے۔

اہم نکات

۱۔ مؤمنین ارادہ الٰہی کے نفاذ کا ذریعہ بنتے ہیں: یُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ بِاَیۡدِیۡكُمۡ ...۔

۲۔ اللہ کو مومن کی خوشی عزیز ہے: یَشۡفِ صُدُوۡرَ قَوۡمٍ مُّؤۡمِنِیۡنَ ...۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَکُوۡا وَ لَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَ لَمۡ یَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَ لَا رَسُوۡلِهٖ وَ لَا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَلِیۡجَةً ؕ وَ اللّٰهُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۶﴾

۱۶۔ کیا تم لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیے جاؤ گے؟ حالانکہ اللہ نے ابھی یہ بھی نہیں دیکھا ہے کہ تم میں سے کس نے جہاد کیا اور کس نے اللہ اس کے رسول اور مؤمنین کے سوا کسی اور کو اپنا بھیدی نہیں بنایا اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ: اظہار ایمان وعقیدے کے لیے زبان ہلانا نہایت آسان کام ہے مگر اس زبانی دعویٰ کے پیچھے دل میں کیا نظریہ چھپا ہوا ہے، اس کا اظہار صرف آزمائش ہی کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ لہٰذا

ضمیروں کا فاش کرنا اور دلوں میں چھپے ہوئے کافرانہ بھیدوں کو طشت از بام کرنا، اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت میں ہے۔

۲۔ وَلَمۡ یَتَّخِذُوۡا: اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول کریمؐ کی زندگی کے آخر میں منافقوں اور کمزور ایمان والوں کی قابل توجہ تعداد میں افراد مشرکین کے ساتھ رابطے میں تھے اور بہت سے لوگوں کی کرتوتوں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ لہٰذا یہ بات ضروری تھی کہ کسی ذریعے سے یہ بات سب کے سامنے آ ہی جائے کہ سچے مؤمن کون ہیں اور صرف دعویٰ ایمان کرنے والے کون ہیں؟

چنانچہ یہ بات اپنی جگہ ثابت ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ جو کہ اصحاب بدر میں سے تھے، کا مشرکین مکہ کے ساتھ رابطہ تھا اور انہوں نے اہل مکہ کو اطلاع دے دی تھی کہ ان کی طرف سے حدیبیہ کا معاہدہ توڑنے کے بعد رسول اللہؐ ان کے ساتھ جنگ کرنے کا قصد رکھتے ہیں۔ جب اصحاب بدر کا یہ حال ہو تو دوسرے عام لوگوں، خصوصاً منافقوں کا کیا حال ہوگا۔[1]

اہم نکات

۱۔ آزمائش سے صالح افراد کی صلاحیتیں نکھرتی ہیں اور غیر صالح افراد کے اسرار فاش ہو جاتے ہیں۔

مَا کَانَ لِلۡمُشۡرِکِیۡنَ اَنۡ یَّعۡمُرُوۡا مَسٰجِدَ اللّٰہِ شٰہِدِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ بِالۡکُفۡرِ ؕ اُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ ۚۖ وَ فِی النَّارِ ہُمۡ خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۷﴾

۱۷۔ مشرکین کو یہ حق حاصل نہیں کہ مساجد کو آباد کریں درحالیکہ وہ خود اپنے کفر کی شہادت دے رہے ہیں، ان لوگوں کے اعمال برباد ہو گئے اور وہ آتش میں ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر آیات

شرک باللہ چونکہ عبادت اور عبودیت کے بالکل منافی ہے، لہٰذا مشرکوں کو کسی طرح بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کی عبادت کے لیے مسجدیں آباد کریں۔

۱۔ اَنۡ یَّعۡمُرُوۡا: عمارۃ المساجد سے مراد، کیا مساجد کی عمارت کی دیکھ بال، مرمت کرنا ہے یا ان مساجد میں عبادت کرنا ہے۔ میرے نزدیک اس میں دونوں معنی شامل ہیں۔ یعنی مشترک معنوں میں ہے۔ عمارۃ المساجد، آباد کرنے کو کہتے ہیں۔ عبادت اور دیکھ بھال دونوں آباد کرنے میں آتے ہیں لہٰذا اس تعبیر میں مساجد کی تولیت اور ان میں عبادت دونوں شامل ہیں۔

---

[1] المنار ۱۰: ۲۰۲

اس سورہ میں چونکہ مشرکین سے براءت اور جزیرۃ العرب کو مشرکین سے پاک کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے، اس لیے ان کی تولیت سے مسجد الحرام کو بھی پاک کرنا ضروری تھا تاکہ مشرکین کی تولیت ختم کر کے اہل توحید کی تولیت قائم کی جائے۔

۲۔ اُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ : مشرک کی کوئی قیمت نہیں ہوتی لہٰذا اس کے عمل کی بھی کوئی قیمت نہ ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ جو توحید کی تعمیر نہیں کرتا، وہ مسجد کی تعمیر نہیں کر سکتا: شٰہِدِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ بِالۡکُفۡرِ ....

۲۔ عقیدہ صحیح نہیں ہے تو عبادت صحیح نہیں ہے: اُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ ....

اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ وَ لَمۡ یَخۡشَ اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰۤی اُولٰٓئِکَ اَنۡ یَّکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُہۡتَدِیۡنَ ﴿۱۸﴾

۱۸۔ اللہ کی مسجدوں کو یقیناً وہی لوگ آباد کر سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور نماز قائم کرتے ہوں نیز زکوٰۃ ادا کرتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے خوف نہ کھاتے ہوں، پس امید ہے کہ یہ لوگ ہدایت پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنۡ اٰمَنَ : اللہ کی مسجدوں کو آباد اور ان کی تولیت رکھنے کا حق اصولاً ان لوگوں کو پہنچتا ہے جو ایمان لاتے ہیں اور شرک کر کے اللہ کی شان میں جسارت نہیں کرتے۔

۲۔ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ : آخرت کے دن اللہ کے حضور میں جانے پر ایمان رکھتے ہیں۔

۳۔ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ : اسی ایمان کی وجہ سے نماز و زکوٰۃ کے پابند رہتے ہیں۔

۴۔ وَ لَمۡ یَخۡشَ اِلَّا اللّٰہَ : غیر اللہ سے خوف کھانا بھی ایک قسم کا شرک خفی ہے۔ یہ بھی ان میں نہ ہو تو خانۂ خدا کے معمار بن سکتے ہیں۔

آیت کے اس جملے کی روشنی میں وہ شخص مسجد کا متولی نہیں بن سکتا جو دنیاوی مصلحتوں پر دینی قدروں کو قربان کر دیتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ جو نماز و زکوٰۃ کا پابند نہیں اور اللہ کے علاوہ سب کا خوف دل میں رکھتا ہو، وہ فرد یا کمیٹی، مسجد کے متولی نہیں بن سکتے۔

اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ وَ عِمَارَۃَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ جٰہَدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۹﴾

۱۹۔ کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد الحرام کی آبادکاری کو اس شخص کے برابر قرار دیا ہے جس نے اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا اور راہ خدا میں جہاد کیا؟ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ ہَاجَرُوۡا وَ جٰہَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ ۙ اَعۡظَمُ دَرَجَۃً عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ﴿۲۰﴾

۲۰۔ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے اموال سے اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں جہاد کیا وہ اللہ کے نزدیک نہایت عظیم درجہ رکھتے ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔

یُبَشِّرُہُمۡ رَبُّہُمۡ بِرَحۡمَۃٍ مِّنۡہُ وَ رِضۡوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّہُمۡ فِیۡہَا نَعِیۡمٌ مُّقِیۡمٌ ﴿ۙ۲۱﴾

۲۱۔ ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور خوشنودی کی اور ان جنتوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے دائمی نعمتیں ہیں۔

خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗۤ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۲۲﴾

۲۲۔ ان میں وہ ابد تک ہمیشہ رہیں گے، بے شک اللہ کے پاس عظیم ثواب ہے۔

شان نزول: عباس بن عبد المطلب اور شیبہ آپس میں مفاخرہ کر رہے تھے۔ عباس اس بات پر فخر کر رہے تھے کہ مجھے حاجیوں کو آب زم زم پلانے کا شرف حاصل ہے۔ شیبہ کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ کعبہ کا معمار ہے۔ اسی اثنا میں حضرت علی علیہ السلام کا وہاں سے گزر ہوا۔ آپؑ نے فرمایا: اگرچہ میں آپ دونوں سے کم عمر ہوں مگر جو شرف مجھے حاصل ہے، وہ آپ دونوں کو حاصل نہیں ہے۔ دونوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ آپؑ نے فرمایا: وہ یہ ہے کہ میں نے تلوار سے آپ دونوں کی ناک رگڑوا دی جس کی وجہ سے آپ دونوں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے.... اس پر یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کے مؤقف کی تائید میں نازل ہوئی۔

اس مضمون کی روایت کو مختلف الفاظ کے ساتھ خود عباس، ابوذر، بریدہ، محمد بن کعب اور انس وغیرھم نے نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر طبری ۱۰:۵۹، اسباب النزول صفحہ ۱۸۲، تفسیر خازن، تفسیر معالم التنزیل، جامع الاصول ابن اثیر ۹: ۴۷۷، تفسیر نیشاپوری، تفسیر قرطبی، تفسیر ابن کثیر، فتح القدیر در ذیل آیہ۔

تفسیر آیات

۱۔ اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ: حاجیوں کو پانی پلانا، قابل فخر منصب سمجھا جاتا تھا۔ یہ منصب عبد مناف کی اولاد میں رہا۔ چنانچہ عباس بن عبد المطلب اس منصب پر فائز تھے۔ آج بھی سقایۃ العباس کی جگہ چاہ زم زم کے جنوب میں معروف ہے۔

آیت میں پانی پلانے کے ساتھ ایمان کا ذکر نہیں ہے جب کہ دوسری طرف ایمان کا ذکر ہے۔ لہٰذا یہاں ایمان قبول کرنے سے پہلے کے عمل اور ایمان کے ساتھ بجا لانے والے عمل کے درمیان موازنہ ہے۔ شان نزول کے مطابق چونکہ طرفین ایمان لانے والے تھے۔ اس لیے دوسری آیت میں ایمان کے ساتھ ہجرت کا بھی ذکر فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ موازنہ ایسے دو طرفین میں ہے، جن میں سے ایک نے ہجرت کی ہے، دوسرے نے ہجرت نہیں کی اور ساتھ جہاد کا بھی ذکر آیا۔ سقایت حجاج سے جہاد بہتر ہے۔ ایمان اگر ہجرت کے ساتھ ہو تو وہ ایمان بہتر ہے۔

۲۔ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ ہَاجَرُوۡا: اس آیت میں واضح لفظوں میں فیصلہ ہے۔ ایمان کے بغیر عمل کی کوئی قیمت اور وزن نہیں ہے اور ہجرت سے عمل کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ایمان و خلوص سے خالی تعمیر مسجد اور حاجیوں کی خدمت پر ایمان و جہاد کو فضیلت دیتے ہوئے اس مؤمن و مجاہد کے لیے درج فضائل بھی بیان ہوئے:

i۔ وہ نہایت عظیم درجہ رکھتے ہیں: اَعۡظَمُ دَرَجَۃً ....۔

ii۔ کامیابی انہیں کو حاصل ہے: وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ۔

iii۔ جنت و رضوان رحمت کی نوید: یُبَشِّرُہُمۡ رَبُّہُمۡ بِرَحۡمَۃٍ مِّنۡہُ وَ رِضۡوَانٍ ....۔

iv۔ ابدی نعمت کی نوید: لَّہُمۡ فِیۡہَا نَعِیۡمٌ مُّقِیۡمٌ ۔

v۔ جنت میں دائمی زندگی کی نوید: خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ....۔

vi۔ اجر عظیم کی بشارت اس کے علاوہ: اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗۤ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ۔

اہم نکات

۱۔ فاعل میں اگر حسن نہیں ہے تو فعل کا حسن فائدہ نہیں دیتا: اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ وَ عِمَارَۃَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ....۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰبَآءَکُمۡ وَ اِخۡوَانَکُمۡ اَوۡلِیَآءَ

۲۳۔ اے ایمان والو! تمہارے آبا اور تمہارے بھائی اگر ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کریں تو

اِنِ اسۡتَحَبُّوا الۡکُفۡرَ عَلَی الۡاِیۡمَانِ ؕ وَ مَنۡ یَّتَوَلَّہُمۡ مِّنۡکُمۡ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ﴿۲۳﴾	انہیں اپنا ولی نہ بناؤ اور یاد رکھو کہ تم میں سے جولوگ انہیں ولی بنائیں گے پس ایسے ہی لوگ تو ظالم ہیں۔

تفسیر آیات

خطاب اہل ایمان سے ہے کہ اگر تمہارے دلوں میں ایمان کا شائبہ موجود ہے تو اس دل میں ایمان کے منافی چیزوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ یہ عقیدہ کسی کے دل میں ہو گا تو بلا شرکت غیرے ہو گا۔ دل پر صرف اسی کی حاکمیت ہو گی۔ اس عقیدے کے ساتھ کسی اور چیز کی ولایت اور حاکمیت کا مطلب اس عقیدے کی نفی ہو گا۔

یہاں چونکہ ایمان کی ولایت اور حاکمیت کے مقابلے میں قریبی غیر مؤمن رشتہ داروں کی بالادستی کا ذکر ہے۔ اس لیے باپ اور بھائی کے ذکر پر اکتفا کیا گیا اور بیٹوں و دیگر دنیاوی مال و متاع کا ذکر نہیں آیا کیونکہ بالادستی اور حاکمیت باپ اور بھائی کی طرف سے قائم ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔ کافروں کی ولایت کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورہ مائدہ آیت ۵۱۔ کافر باپ اور بھائی کی بالادستی اور ولایت قبول نہ کرنے کا حکم ہے۔ کافر والدین سے قطع تعلق کرنے کا حکم نہیں فرمایا۔ چنانچہ سورۂ لقمان میں مشرک والدین کی اطاعت نہ کرنے کا حکم فرمایا اور ساتھ یہ حکم دیا:

وَ صَاحِبۡہُمَا فِی الدُّنۡیَا مَعۡرُوۡفًا .... [۱] البتہ دنیا میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھنا....

اور سورہ ممتحنۃ آیت ۸ میں تو ان کافروں سے نیکی اور عدل و انصاف سے پیش آنے کو بھی ممنوع قرار نہیں دیا جو مسلمانوں سے حالت جنگ میں نہیں ہیں۔

اہم نکات

۱۔ دل میں ایمان ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ وہ دل غیر اللہ کا محکوم نہیں ہوتا۔

قُلۡ اِنۡ کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَ اَبۡنَآؤُکُمۡ وَ اِخۡوَانُکُمۡ وَ اَزۡوَاجُکُمۡ وَ عَشِیۡرَتُکُمۡ وَ اَمۡوَالُۨ اقۡتَرَفۡتُمُوۡہَا	۲۴۔ کہد یجیے: تمہارے آبا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور تمہارے وہ اموال جو تم کماتے ہو

----

[۱] ۳۱ لقمان: ۱۵

وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾	اور تمہاری وہ تجارت جس کے بند ہونے کا تمہیں خوف ہے اور تمہاری پسند کے مکانات اگر تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور راہ خدا میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو ٹھہرو! یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ فاسقوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔

تشریح کلمات

کساد: (ك س د) کَسَدَ۔ کسی وجہ سے (تجارتی مال کی طرف) لوگوں کی رغبت نہ ہونا۔ضد نَفَاق ہونا۔

(التحقیق فی کلمات القرآن)

تفسیر آیات

مومن کی ترجیحات: مؤمن کو اپنے غیر مؤمن رشتہ داروں کے ساتھ دو حالتیں پیش آ سکتی ہیں:

i۔ خالصتاً انسانی حالت، جس میں ان رشتے داروں کے ساتھ تعلقات قائم کرنا اپنے کسی دینی مؤقف کے ساتھ متصادم ہونے کا باعث نہیں بنتا۔ اس صورت میں ان قریبی رشتے داروں کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنا اور انسانی جذبات کا پاس کرنا، ان پر احسان اور نیکی کرنا، نہ صرف اپنے دینی مؤقف کے ساتھ متصادم نہیں ہے بلکہ مؤمن کی دینی تعلیمات میں یہ شامل ہے کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ اور نیک سلوک کیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ...[1] البتہ دنیا میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھنا....

ii۔ وہ حالت جس میں ان قریبی رشتے داروں کے ساتھ تعلقات قائم رکھنا، ان کی رضاجوئی کرنا دینی مؤقف کے ساتھ متصادم ہونے کا باعث بن جاتا ہے، یہاں اسے دین یا رشتے داروں میں سے ایک کو اختیار کرنا ہوگا۔

یہی مسئلہ دنیاوی مال و متاع کے بارے میں بھی پیش آتا ہے کہ مال و متاع، کاشانہ و تجارت کبھی دینی اصول کے ساتھ متصادم ہوتے ہیں تو اس صورت میں مال یا دین میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ مال و متاع دنیا کی مذمت اسی صورت میں ہے۔

اور اگر متصادم نہیں ہے یا دینی اصول کے معاون ہے تو مال کو قرآن نے خیر کا نام دیا ہے:

اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ ...[2] وہ کچھ مال چھوڑے جارہا ہو تو مناسب طور پر وصیت کرے۔

---

[1] ۳۱ لقمان: ۱۵ [2] ۲ بقرہ: ۱۸۰

اس آیہ شریفہ میں آٹھ ایسی چیزوں کا ذکر ہے، جو محبت خدا اور جہاد در راہ خدا کے لیے رکاوٹ بن سکتی ہیں:

i۔ والد کی محبت: ہر انسان اپنے والد کو سب سے محترم اور قابل تعظیم سمجھتا ہے اور انسان اپنے آبا واجداد پر فخر کرتا ہے۔

ii۔ اولاد کی محبت: انسان کو اپنی اولاد میں اپنے وجود کا تسلسل نظر آتا ہے، لہٰذا اولاد کی محبت اپنی ذات کی محبت کا لازمہ ہے۔

iii۔ بھائی: اگر چھوٹا ہے تو بیٹے کی جگہ، بڑا ہے تو باپ کی جگہ تصور کیا جائے۔

iv۔ زوجہ: کی محبت بھی انسانی نوع کی بقا سے مربوط ہے اور سکون نفس کا باعث ہے۔

v۔ برادری سے محبت: خاندانی عصبیت، طاقت وقوت کے مظاہرہ اور تحفظ کی وجہ سے ہے۔

vi۔ دولت سے محبت: موروثی دولت کی بہ نسبت اپنی کمائی ہوئی دولت سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔

vii۔ تجارت: میں کساد بازاری کا خوف، تاجرانہ ذہنیت رکھنے والوں کے لیے نہایت ہی سخت آزمائش کا مرحلہ ہوتا ہے۔ بہت کم لوگ اپنے دین کی خاطر تجارتی خسارہ برداشت کرتے ہیں۔

viii۔ اپنے خانہ کاشانہ کے ساتھ محبت صرف انسان ہی کی نہیں بلکہ ہر ذی روح کی جبلت میں راسخ ہوتی ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی محبت انسان کو اللہ کی محبت اور جہاد سے روک سکتی ہے۔

اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ: مذکورہ چیزوں سے دل لگی خدا و رسولؐ کے مقابلے میں ہو تو ایمان کے منافی ہے۔

فَتَرَبَّصُوۡا: ٹھہرو! یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔ خدا و رسول پر مذکورہ چیزوں کو ترجیح دینے کی صورت میں ایسے لوگوں کی بری عاقبت اور انجام بد کی خبر ہے۔ یہ ”امرہ“ کسی آنے والے حادثے کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے اور عذاب آخرت بھی مراد ہوسکتا ہے۔

وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ: ایسے لوگوں سے اللہ ہاتھ اٹھا لے گا، ان کے لیے سامان ہدایت فراہم نہیں فرمائے گا۔ ان کو اپنی عبودیت اور بندگی کے دائرے سے نکال باہر کر دے گا جو بہت بڑی سزا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کی محبت اور اس کی راہ میں جہاد پر دوسری چیزوں کو ترجیح دینے کی صورت میں اللہ بھی ایسی قوم کی جگہ دوسری قوم کو ترجیح دے گا: فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ ....

لَقَدۡ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ فِیۡ مَوَاطِنَ　۲۵۔ بتحقیق بہت سے مقامات پر اللہ تمہاری مدد کر

كَثِيرَةٍ ۙ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

چکا ہے اور حنین کے دن بھی جب تمہاری کثرت نے تمہیں غرور میں مبتلا کر دیا تھا مگر وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾

۲۶۔ پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنین پر اپنی تسکین نازل فرمائی اور تمہیں نظر نہ آنے والے لشکر اتارے اور کفار کو عذاب میں مبتلا کر دیا اور کفر اختیار کرنے والوں کی یہی سزا ہے۔

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾

۲۷۔ پھر اس کے بعد اللہ جس کی چاہتا ہے توبہ قبول فرماتا ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تشریح کلمات

رَحُبَتْ: (ر ح ب) جگہ کی وسعت کو کہتے ہیں۔ رحبة المسجد مسجد کے کھلے صحن کو کہتے ہیں۔

جُنُوْدًا: (ج ن د) الجند کے اصل معنی پتھریلے علاقے کے ہیں، شدت اور غلظت کے اعتبار سے لشکر کو جند کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں ۹ ہجری میں فتح مکہ کے بعد واقع ہونے والی رسول کریمؐ کی آخری جنگ حنین کا ذکر ہے۔

حنین مکہ اور طائف کے درمیان واقع ایک وادی کا نام ہے۔ فتح مکہ کے بعد طائف اور گرد و پیش کے جنگجو قبیلہ ہوازن کو بھی یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں مسلمان ان پر حملہ نہ کر دیں، لہٰذا قبل اس کے کہ مسلمان ان پر حملہ کریں، انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود مسلمانوں پر حملہ کریں گے۔ قبیلہ ہوازن کی متعدد شاخیں جو سو کے قریب تھیں، مکہ سے طائف تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں طائف کے رہنے والے بنو ثقیف بھی شامل

تھے۔ یہ تمام شاخیں مالک بن عوف کی سربراہی میں جمع ہو گئیں۔ صرف بنی کعب اور بنی کلاب اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ وہ اپنی بیوی بچوں اور مال و مویشی ہمراہ لے کر میدان میں آئے تا کہ مال و اولاد زنجیر پا بن جائیں اور میدان جنگ سے فرار کے لیے کوئی گنجائش نہ رہے۔ ان کا لشکر چار ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھا۔

ان کے مقابلے کے لیے رسول اسلامؐ بارہ ہزار کا لشکر لے کر نکلے۔ ان میں سے دس ہزار مدینے کے انصار و مہاجرین پر مشتمل تھے اور دو ہزار فتح مکہ کے بعد کراہۃً دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے لوگ تھے، جن کو طلقا (آزاد کردہ) کہا جاتا ہے۔ ان میں وہ لوگ شامل تھے جو شکست کی صورت میں مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے نکلے تھے۔ چنانچہ وقتی شکست کے موقع پر ایسے لوگوں کا چہرہ بے نقاب ہو گیا تھا اور فتح کے بعد رسول کریمؐ نے ان کو تالیف قلب کے طور پر دیگر مسلمانوں سے زیادہ غنیمت سے حصہ دیا۔

لشکر اسلام کے پاس فتح مکہ کے بعد بھی ضرورت کا سامان حرب موجود نہ تھا۔ چنانچہ قریش مکہ سے کافی مقدار میں سامان حرب عاریۃً لیا گیا اور حضرت علی علیہ السلام کی علمداری میں لشکر اسلام وادی حنین کی طرف روانہ ہو گیا۔ رسالتمآبؐ کو یہ خبر دی گئی کہ قبیلہ ہوازن مال و اولاد ساتھ لے کر مقابلے پر آ رہا ہے تو آپؐ نے فرمایا: یہ سارا مال و متاع غنیمت بن کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے گا۔

اس سے پہلے مسلمان ایک مختصر لشکر کے ساتھ کفار سے برسر پیکار رہے۔ آج پہلی بار ایک طاقتور لشکر لے کر میدان میں اتر رہے تھے اور کافروں کا لشکر نسبتاً مختصر تھا۔ اس لیے طبعی طور پر مسلمانوں میں غرور آ گیا اور ان میں کاہلی بھی آ گئی۔

لشکر اسلام صبح کے وقت وادی میں اتر رہا تھا، قبیلہ ہوازن نے دفعتاً ہلہ بول دیا اور اردگرد کی گھاٹیوں میں چھپے ہوئے دستوں نے ہر طرف سے حملہ کر دیا اور چار سو سے تیروں کی بارش شروع ہو گئی، جس سے لشکر اسلام بری طرح منتشر ہو کر پسپا ہو گیا اور رسولؐ کے گرد مٹھی بھر چند افراد جمے رہے۔

حضرت علیؑ اور عباسؓ حضورؐ کے سامنے، ابوسفیان بن الحارث بن عبد المطلب لگام تھامے ہوئے اور ابن مسعود بائیں طرف تھے۔ بعض روایات کے مطابق صرف یہی چار افراد ثابت قدم رہے۔[1]

بعض دیگر روایات میں ملتا ہے کہ ثابت قدم رہنے والوں کی تعداد ۹ تھی اور دسویں ام ایمن کے بیٹے ایمن بن عبید تھے۔ یہی روایت قرین حق معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کے راوی حضرت عباسؓ ہیں جو پورے واقعہ میں رسول اللہؐ کے ساتھ رہے اور ایک ٹیلے پر چڑھ کر بھاگنے والوں کو آواز دینے والے بھی حضرت عباسؓ ہی تھے اور اپنے فخر و مباہات میں جو شعر کہا ہے، اس میں بھی یہ تعداد آ گئی۔

نصرنا رسول اللّٰہ فی الحرب تسعة
و قد فرّ من فرّ عنه فاقشعوا

---

[1] فتح الباری

و عاشرنا لاقی الحمام بنفسه
لما ناله فی اللّٰه لا یتوجع

ہم نے رسول اللہؐ کی اس وقت مدد کی جب میدان جنگ میں صرف نو افراد رہ گئے تھے جب کہ رسول اللہ کو چھوڑ کر بھاگنے والے ایسے بھاگے کہ تتر بتر ہو گئے۔ جب کہ ہمارا دسواں جان بحق ہوگیا۔ راہ خدا میں جو بھی مصیبت پیش آئے، وہ محسوس ہی نہیں ہوتی۔

حضورؐ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ اصحاب کو پکاریں کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے شجرہ کے نیچے جہاد کرنے کی بیعت کی تھی۔ حضرت عباسؓ کی آواز پر تمام اصحاب واپس آ گئے، دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اللہ نے بھی ایک نامرئی لشکر بھیج کر لشکر اسلام کی مدد فرمائی۔ لشکر کفر پسپا ہو گیا اور لشکر کفر کے ستر سرداران مارے گئے۔ صرف حضرت علیؑ نے ان کے چالیس افراد قتل کیے اور ان کا سارا مال و متاع مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔[1]

طعنہ: لشکر اسلام کو جب وقتی طور پر شکست کا سامنا ہوا تو ان لوگوں نے طعنہ دینا شروع کر دیا جو فتح مکہ کے بعد بظاہر اسلام کے دائرے میں تو آ گئے تھے مگر اندر سے اسلام کے خلاف عداوت رکھتے تھے۔ چنانچہ اس موقع پر ابوسفیان کا یہ جملہ بہت مشہور ہے: اب مسلمانوں کی یہ شکست سمندر تک چلی جائے گی۔

بھاگنے والے کون تھے؟: روایات و تاریخ میں بہت سے نام ملتے ہیں جنہوں نے راہ فرار اختیار کیا تھا اور ثابت قدم رہنے والوں کی تعداد چار، دس اور حد اکثر ایک سو بتائی جاتی ہے۔ بارہ ہزار میں سے اقلاً گیارہ ہزار نو سو کا فرار قابل توجہ ہے۔ جب کہ ان میں وہ انصار و مہاجرین بھی شامل ہیں جنہوں نے حدیبیہ میں درخت سمرہ (کیکر) کے نیچے اس بات پر حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی کہ وہ جہاد سے دریغ نہیں کریں گے:

وَلَقَدۡ كَانُوۡا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنۡ قَبۡلُ لَا يُوَلُّوۡنَ الۡاَدۡبَارَ ؕ وَكَانَ عَهۡدُ اللّٰهِ مَسۡـُٔوۡلًا ۝[2]

حالانکہ پہلے یہ لوگ اللہ سے عہد کر چکے تھے کہ پیٹھ نہ پھیریں گے اور اللہ کے ساتھ ہونے والے عہد کے بارے میں باز پرس ہو گی۔

سورہ انفال آیت ۱۵ ۔ ۱۶ میں یہ حکم بھی پہلے آ چکا تھا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا لَقِيۡتُمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا زَحۡفًا فَلَا تُوَلُّوۡهُمُ الۡاَدۡبَارَ ۝ وَمَنۡ يُّوَلِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوۡ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدۡ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاۡوٰٮهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ۝

اے ایمان والو! جب میدان جنگ میں کافروں سے تمہارا سامنا ہو جائے تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا اور جس نے اس روز پیٹھ پھیری مگر یہ کہ جنگی چال کے طور پر ہو یا کسی فوجی دستے سے جا ملنے کے لیے تو (کوئی حرج نہیں ورنہ) وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہو گا اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی ۹۸:۸　[2] ۳۳ الاحزاب: ۱۵

لیکن قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس فتح و شکست کے بنیادی عناصر کون تھے۔ اس سلسلے میں تاریخی حقائق کی روشنی میں جو یقینی شواہد سامنے آتے ہیں، وہ یہ ہیں:

i۔ ثابت قدم رہنے والے اور رسول اللہؐ کا ساتھ ایک لمحے کے لیے نہ چھوڑنے والے بنی ہاشم کے چند افراد تھے، جن کی ثابت قدمی کی وجہ سے فوج دوبارہ منظّم ہو سکی اور لشکر اسلام کو بالآخر فتح مل گئی۔ ورنہ بقول مولانا مودودی: فتح مکہ سے جو کچھ حاصل ہوا تھا، اس سے بہت زیادہ حنین میں کھو دینا پڑتا۔

ii۔ بھاگنے والے اور بھی تھے لیکن اصل محرک وہ لوگ تھے جو فتح مکہ کے بعد کراہۃً بظاہر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے جن کو طلقاء کہا جاتا تھا۔[1] یہ لوگ قطعاً لڑنے کے لیے شریک جنگ نہیں ہوئے تھے بلکہ موقع کی تلاش کے لیے مسلمانوں کے ساتھ نکلے تھے۔ اس بات پر دو شواہد ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

الف: ابوسفیان وغیرہ کی طرف سے وقتی شکست کے موقع پر شماتت اور

ب: رسول اسلامؐ نے مال غنیمت کا حصہ ان لوگوں کو جہاد اور اسلام کے عنوان سے نہیں بلکہ مؤلفۃ القلوب کے عنوان سے دیا اور دوسروں سے زیادہ دیا۔ چنانچہ ابوسفیان کو ایک سو اونٹ دیے گئے اور اس کے بیٹے کو بھی ایک سو اونٹ دیے گئے۔

لہٰذا انصاف پسند ذہن کے لیے اس بات کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

پوری تاریخ اسلام میں مسلمانوں کی فتح و شکست کے یہی عناصر کارفرما رہے ہیں، بنی ہاشم اور بنی امیہ۔ خواہ یہ فتح و شکست جنگ کے میدن میں ہو یا اسلامی قدروں کی پاسداری کے میدان میں۔

مواطن کثیرۃ: روایت کے مطابق حضرت امام نقی علیہ السلام نے اس آیت سے استدلال فرمایا ہے کہ کَثِیۡرَۃٍ کو بطور مطلق ذکر کیا جائے تو اسی (۸۰) پر صادق آئے گا، چونکہ اللہ نے ان مقامات کو کَثِیۡرَۃٍ کہا ہے جہاں اپنے رسولؐ کی نصرت فرمائی تھی۔ وہ مقامات ۸۰ ہیں۔

ثُمَّ وَلَّیۡتُمۡ مُّدۡبِرِیۡنَ: خطاب لشکر سے ہے اور تعبیر میں اس فرار کی مذمت میں بڑی صراحت موجود ہے کیونکہ صرف یہ نہیں فرمایا: وَلَّیۡتُمۡ تم بھاگ گئے بلکہ مزید صراحت کے لیے فرمایا: مُّدۡبِرِیۡنَ پیٹھ پھیر کر۔

اہم نکات

۱۔ مادی وسائل کی فراوانی سے توکل علی اللہ میں کمی آتی ہے: اَعۡجَبَتۡکُمۡ کَثۡرَتُکُمۡ ....

۲۔ کثرت کو شکست ہوئی اور فتح اس قلت کی وجہ سے ملی جو ثابت قدم رہی: فَلَمۡ تُغۡنِ عَنۡکُمۡ شَیۡـًٔا ..

۳۔ راہ خدا سے فرار اختیار کرنے والوں پر زمین تنگ ہو جاتی ہے: وَّضَاقَتۡ عَلَیۡکُمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ ....۔

۴۔ جنگ سے فرار اللہ اور رسولؐ سے فرار ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡمُشۡرِکُوۡنَ نَجَسٌ فَلَا یَقۡرَبُوا الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ بَعۡدَ عَامِہِمۡ ہٰذَا ۚ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ عَیۡلَۃً فَسَوۡفَ یُغۡنِیۡکُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖۤ اِنۡ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۸﴾

۲۸۔ اے ایمان والو! مشرکین تو بلاشبہ ناپاک ہیں لہٰذا اس سال کے بعد وہ مسجد الحرام کے قریب نہ آنے پائیں اور اگر (مشرکین کا داخلہ بند ہونے سے) تمہیں غربت کا خوف ہے تو (اس کی پرواہ نہ کرو) اگر اللہ چاہے تو جلد ہی تمہیں اپنے فضل سے بے نیاز کر دے گا، یقیناً اللہ بڑا جاننے والا، حکمت والا ہے۔

تشریح کلمات

نجس: (ن ج س) نجاست کے معنی پلیدی کے ہیں اور پلید چیز کو نجس کہتے ہیں اور ناقابل علاج بیماری کو بھی نجس کہتے ہیں اور راغب کہتے ہیں کہ نجس کی دو قسمیں ہیں: نجاست حسّی یا مادی، جس کا ادراک حس سے ہو سکتا ہو۔ نجاست معنوی، جس کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہے۔

عَیۡلَۃً: (ع ی ل) فقر و تنگدستی کے معنی میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَا الۡمُشۡرِکُوۡنَ نَجَسٌ: لفظ نجس قرآن میں اس معنی میں استعمال ہوا ہے جو لغت میں عربوں کے درمیان مستعمل تھا، جدید فقہی اصطلاح میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا عین ممکن ہے نجاست سے مراد نفسانی یا کردار کی پلیدی ہو اور ممکن ہے کہ پلید سے مراد حسّی ہو۔ اس کا فیصلہ سنت و سیرت رسولؐ و ائمہ (ع) کی روشنی میں فقہاء کرتے ہیں۔

۲۔ فَلَا یَقۡرَبُوا الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ: نجاست کا جو بھی مفہوم مراد لیا جائے، اس نجاست کی وجہ سے مشرکین کے لیے مسجد الحرام میں داخلہ ممنوع ہو گیا کیونکہ اس مسجد میں داخل ہونے کے لیے جس طہارت کی ضرورت ہے وہ شرک و کفر کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔

۳۔ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ عَیۡلَۃً: مکہ والوں کی معیشت کا انحصار تجارت پر تھا۔ یہاں کوئی زراعتی ذرائع تو

موجود نہ تھے۔ لٰہٰذا مشرکین کا داخلہ ممنوع ہونے کی وجہ سے اقتصادی اعتبار سے منفی اثرات مترتب ہونے اور علاقے میں فقر و فلاکت آنے کا اندیشہ ان لوگوں کی طرف سے ظاہر ہونا طبیعی تھا جو ابھی صرف محسوس اور ظاہری علل و اسباب پر یقین رکھتے تھے۔ وہ اس ذات پر ابھی بھروسہ نہیں رکھتے تھے جس کے قبضے میں یہ سب علل و اسباب ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے فرمایا: مشرکوں سے قطع تعلقات سے تمہاری معیشت بہتر ہو گی۔

اہم نکات

۱۔ مسجد الحرام کے نزدیک وہ لوگ بھی نہ جائیں جو نجس ہیں۔

۲۔ اللہ اپنے فضل سے ان لوگوں کو بے نیاز نہیں کرے گا جو مشرکوں کو اپنا آقا سمجھتے ہیں۔

قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ لَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ وَ لَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حَتّٰی یُعۡطُوا الۡجِزۡیَۃَ عَنۡ یَّدٍ وَّ ہُمۡ صٰغِرُوۡنَ ﴿۲۹﴾

۲۹۔ اہل کتاب میں سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ اور اس کے رسول نے جو کچھ حرام کیا ہے اسے حرام نہیں ٹھہراتے اور دین حق بھی قبول نہیں کرتے، ان لوگوں کے خلاف جنگ کرو یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔

تشریح کلمات

جزیۃ: یعنی بدلہ۔ ان مالی واجبات کو کہتے ہیں جو کافر ذمی سے اس کی جان و مال کی حفاظت کے بدلے میں اسلامی حکومت وصول کرتی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ: اہل کتاب اگرچہ اللہ اور آخرت پر ایمان کا اظہار کرتے ہیں لیکن وہ خدائے واحد پر نہیں، ایسے خدا پر ایمان رکھتے ہیں جو کسی بیٹے کا باپ یا کسی اور خدا کے ساتھ شریک ہے۔ یہ نہ صرف خدائے واحد پر ایمان نہیں ہے بلکہ اس ذات واحد کے خلاف جسارت ہے۔

۲۔ وَ لَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ: جس روزِ آخرت کا وہ تصور پیش کرتے ہیں وہ اس روزِ آخرت کے بالکل برخلاف ہے جو عند الواقع موجود ہے۔ وہ جس روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اس میں اللہ لوگوں کو انصاف نہیں دے گا بلکہ نسلی امتیاز برتے گا۔

۳۔ وَلَا یُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ: وہ اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی شریعت کو نہیں مانتے اور نہ دین حق کے پابند ہیں۔

۴۔ وَلَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ: وہ دین جو حق کی طرف لے جاتا ہے اس کو یہ لوگ اپناتے نہیں ہیں۔ جس دین کی یہ لوگ اتباع کر رہے ہیں وہ ان کو حق سے دور کرتا ہے۔

ایسے اہل کتاب کے ساتھ جنگ کرو۔ نہ اس لیے کہ وہ قہراً اور جبراً ایمان لائیں بلکہ وہ اپنی بالادستی ختم کر کے اسلامی حکومت کے قوانین کے مطابق امن وسکون اور آزادی کی زندگی گزاریں۔

۵۔ حَتّٰی یُعۡطُوا الۡجِزۡیَۃَ: اہل کتاب سے جزیہ کے وصول کرنے کے بارے میں کسی معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ اس اسلامی قانون کا پرچار کیا جائے کہ اسلام کسی نظریے کے قبول یا رد کے لیے کسی قسم کے جبر کو برداشت نہیں کرتا۔ لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ ....[1] کسی دین کو قبول کرنے یا رد کرنے میں کسی جبر و اکراہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اہل کتاب نے روز اول سے لے کر آج تک آزادانہ طور پر اپنی خود مختاری سے اسلام کو قبول کرنے والوں کے خلاف قہر و جبر، جنگ وجدال اور ہر قسم کی ناروا سازشیں کرنے میں ذرہ برابر کوتاہی نہیں کی اور آج بھی مسلمانوں پر دنیا کے کسی گوشے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ یا کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو اس میں ان لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ لوگ آج بھی مسلمانوں کو اپنے ہی دین کے حق میں کام کرتے ہوئے دیکھنا گوارا نہیں کرتے اور اپنے ہی وطن میں اپنے نظریے کا پرچار کرنے کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹ ڈالتے ہوئے ذرا بھی خفت محسوس نہیں کرتے۔ وہ اس مہذب دور میں بھی دوسروں کی آزادی اور خود مختاری میں غیر انسانی انداز میں مجرمانہ طور پر مداخلت کر رہے ہیں۔

اسلام ایسے جبر پسند لوگوں کو زیر کرنا چاہتا ہے اور ان کے غیر انسانی جابرانہ تسلط کو ختم کر کے اسلام کے انسان ساز نظام میں لا کر ان کو ہر قسم کی آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام اہل کتاب سے دو چیزیں چاہتا ہے:

i۔ وہ جزیہ دیں۔ یعنی اسلامی حکومت کو ٹیکس ادا کریں۔ اسلامی حکومت اس ٹیکس کو ان سے درج ذیل وجوہات کی بنا پر وصول کرتی ہے:

الف: اسلامی حکومت اپنی مسلم رعایا سے زکوۃ کے عنوان سے مالی واجبات وصول کرتی ہے اور غیر مسلم رعایا سے جزیہ یعنی معاوضہ کے عنوان سے مالی واجبات وصول کرتی ہے۔

ب: اس کے عوض اسلام ان اہل کتاب کی جان و مال اور عزت و ناموس کے تحفظ کی ذمہ داری لیتا ہے اور جیسے مسلم رعایا کا دفاع کرتا ہے، ایسے ہی ان اہل کتاب کا بھی دفاع کرتا ہے اور اپنے مذہب پر آزادی کے ساتھ عمل کرنے کی اجازت دیتا ہے بلکہ موقع فراہم کرتا ہے۔

----

[1] ۲ بقرۃ: ۲۵۶

ج: بیت المال سے اس اہل کتاب کو بھی حصہ مل جاتا ہے جو محنت مزدوری کرنے پر قادر نہیں ہے بلکہ اسی طرح، جس طرح ایک مسلمان کو ملتا ہے۔

د: جنگوں میں شرکت سے ان کو معاف کیا جاتا ہے۔ ملک کا استحکام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔

ii۔ وہ اسلامی حکومت کی بالادستی کو قبول کریں، اسلامی حکومت کی رعیت بن کر رہیں، اس انسان ساز اسلامی قانون کے سامنے سر تسلیم خم کریں اور اپنی نخوت و تکبر اور جابرانہ مزاج کو ترک کر کے آزادی، خودمختاری جیسی انسانی قدروں والے نظام حیات کے اندر زندگی بسر کریں۔

یہی وجہ ہے کہ عورتوں، بوڑھوں، نابیناؤں، معذوروں اور دیوانوں پر جزیہ نہیں ہے بلکہ اسلام ان لوگوں کو بلامعاوضہ تحفظ فراہم کرتا ہے۔

۶۔ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ: وہ جابر نہیں، زیر ہو کر، حاکم نہیں، رعایا بن کر، سرکش نہیں، رام ہو کر اور سازشی نہیں، فرمانبردار بن کر یہ جزیہ ادا کریں۔

اہم نکات

۱۔ اسلام کافر ذمی (اہل کتاب) کو وہی انسانی حقوق دیتا ہے جو مسلمانوں کو دیتا ہے۔

۲۔ اسلام جبر پسندوں کے خلاف جنگ کرتا ہے کہ جبر کا خاتمہ ہو۔

۳۔ جزیہ اسلامی حقوق کی پاسداری کی علامت ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۳۰

۳۰۔ اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں ان لوگوں کی باتوں کے مشابہ ہیں جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں، اللہ انہیں ہلاک کرے، یہ کدھر بہکتے پھرتے ہیں؟

تشریح کلمات

يُضَاهِـُٔوْنَ: (ض ہ ی) المضاهات کے معنی مشابہ اور مشاکلت کے ہیں۔

الافك: (ا ف ك) ہر اس چیز کو کہتے ہیں، جو اپنے صحیح رخ سے پھیر دی گئی ہو۔

تفسیر آیات

عزیر[1] توریت کے تلفظ کے مطابق عزرا (EZRA) غالباً سن ۴۵۰ قبل مسیح تک زندہ تھے۔ بخت نصر کی طرف سے یہودیوں کی تباہی اور بابل کی اسارت کے دوران ان کی توریت نذر آتش ہو گئی۔ وہ ایک صدی پر مشتمل اپنے دور اسیری میں اپنی شریعت، ثقافت اور عبرانی زبان تک بھول چکے تھے۔ عزیر کے زمانے میں بادشاہِ بابل کی طرف سے اجازت ملنے پر عزیر بنی اسرائیل کو لے کر یروشلم واپس آئے۔ اس طرح یہود عزیر کو نجات دہندہ تصور کرنے لگے اور عزیر نے اپنی یادداشت کی بنیاد پر توریت کی از سر نو تدوین کی اور اس توریت پر کلدانی زبان غالب تھی۔ اہل کتاب کا یہ عقیدہ ہے کہ عزیر نے روح القدس کی طرف سے وحی کے ذریعے توریت کی نئے سرے سے تدوین کی ہے۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ عزیر کے پاس توریت کی تدوین کے لیے کوئی ماخذ نہ تھا۔ انہوں نے خود اپنی طرف سے توریت لکھ دی ہے۔ اس لیے آج کے اہل نظر اس توریت کو خود عزیر کا ساختہ و بافتہ قرار دیتے ہیں۔[2]

قرآن نے پہلے فرمایا تھا:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ...[3]

پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو (توریت کے نام سے) ایک کتاب اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔

اس طرح عزیر نے بنی اسرائیل کو بابل کی اسارت سے نجات دلائی۔ انہوں نے گم شدہ توریت کی نئے سرے سے تدوین کر کے یہود کے لیے ان کے دین و مذہب کی تجدید کی۔ لہٰذا وہ نجات دہندہ بھی اور مجدد مذہب بھی قرار پائے۔ یہاں سے بعض یہود نے عزیر کو مثیل موسیٰ (ع) اور ابن اللہ کا لقب دینا شروع کیا۔ ممکن ہے ابن اللہ، اللہ کا چہیتا کے معنوں میں کہا گیا ہو۔ جیسے یہود اپنے آپ کو نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ[4] (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں) کہتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہنا دین مسیح میں بولس کی تحریف کے بعد سے آج تک مسلم مانا جاتا ہے۔

يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ: یعنی اس قسم کی خرافات کے ان سے پہلے کے بت پرست بھی قائل تھے۔ چنانچہ ان میں سے کچھ فرشتوں کو اللہ بیٹیاں کہتے تھے اور علی الخصوص یونانی اور رومانی

---

[1] ممکن ہے عزیر، عزرا کی تصغیر ہو اور عرب یہودیوں نے از روئے محبت تصغیر استعمال کی ہو۔
[2] المنار ۱۰: ۳۲۶ نقل از انسائکلوپیڈیا آف برٹانیکا ترجمہ عربیہ ۹: ۱۴ طبع ۱۹۲۹ء
[3] ۲ بقرۃ: ۷۹　[4] ۵ مائدہ: ۱۸

مشرکانہ عقائد سے مسیحیت کا متاثر ہونا آج کے محققین پر واضح ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے یہود و نصاریٰ دونوں یونانی نظریات و عقائد اور حکمت و فلسفہ سے بہت حد تک متاثر ہو چکے تھے۔ اسی طرح مصر، ایران اور دوسرے ممالک کی قومیں بھی اس قسم کی توہم پرستی میں مبتلا تھیں۔

علامہ طباطبائی علیہ الرحمہ اپنی تفسیر المیزان میں اس آیت کے ذیل میں بعض معاصر اہل تحقیق کا حوالہ دیتے ہیں: (Badhist and Christian aspels Edmuds Aj 2) انہوں نے عہدین کا بدھ اور برہمن مذاہب سے مقابلہ کیا ہے اور عہدین کی تعلیمات، حتیٰ بعض قصے کہانیاں تک بدھ اور برہمن مذاہب سے بالکل مشابہ پائی ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے فرزند ہونے کا نظریہ شان الٰہی میں انتہائی گستاخی ہے۔

۲۔ اہل کتاب بت پرستوں کے مشابہ عقیدہ رکھتے ہیں۔

اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَہُمۡ وَ رُہۡبَانَہُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ الۡمَسِیۡحَ ابۡنَ مَرۡیَمَ ۚ وَ مَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡۤا اِلٰـہًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ سُبۡحٰنَہٗ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۱﴾

۳۱۔ انہوں نے اللہ کے علاوہ اپنے علماء اور راہبوں کو اپنا رب بنا لیا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی حالانکہ انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ذات ان کے شرک سے پاک ہے۔

تشریح کلمات

احبار: حبرٌ کی جمع۔ عالم کو کہتے ہیں۔

رھبان: راھب کی جمع۔ درویش کو کہتے ہیں جو ترک دنیا کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

یہ لوگ اپنے علماء کو اللہ کے مقابلے میں قانون گزاری اور مطلق اطاعت کا حق دیتے تھے۔ قانون گزاری کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اس میں کسی اور کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ بالکل اسی طرح مطلق اطاعت بھی ہے۔ اللہ کے حکم کو بیان کرنے والے رسولؐ و امامؑ کی اطاعت، اللہ کی اطاعت کے ذیل میں آتی ہے۔ یہ درست ہے لیکن اہل کتاب اپنے علماء کی اطاعت، اللہ کی اطاعت کے ذیل میں نہیں، مقابلے میں

کرتے تھے۔ لہٰذا ایسا کرنا ان کو رب بنانے کے مترادف ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

> اہل کتاب کے علماء اور راہبوں نے اپنی عبادت کی دعوت نہیں دی۔ ایسا کرتے تو لوگ قبول نہ کرتے بلکہ انہوں نے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیا۔ اس طرح غیر شعوری طور پر لوگوں نے ان کی عبادت کی۔

اسی مضمون کی روایت عدی بن حاتم نے رسول اللہؐ سے نقل کی ہے۔[1]

یہ اس لیے ہے کہ قانون گزاری اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلا کا حصہ ہے۔ لہٰذا قانون گزاری میں مداخلت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلا میں مداخلت ہے۔ یہی وجہ ہے جب تک کسی حکم پر دلیل قائم نہ ہو اس وقت تک کسی حکم کا اللہ کی طرف نسبت دینا بڑا جرم ہے۔ دلیل کی دو قسمیں ہیں: علم اور علمی۔ علم وہ دلیل ہے جس سے انسان کو یقین حاصل ہوتا ہے۔ جیسے احادیث متواتر، نص قرآن وغیرہ۔ علمی وہ دلیل ہے جس کے دلیل ہونے پر یقینی دلیل قائم ہو۔ جیسے احادیث آحاد۔ لہٰذا ذاتی رائے کے دلیل ہونے پر کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔ اس لیے مذہب جعفری میں ذاتی رائے کی بنیاد پر کس حکم کو اللہ کی طرف نسبت دینا اللہ کی حاکمیت اعلا میں مداخلت اور توحید کے منافی ہے۔ توحید کی امت کو اس بارے میں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

اہم نکات

۱۔ نص کے مقابلے میں اجتہاد کرنا شریعت سازی میں اللہ کے ساتھ شرک کرنے کے مترادف ہے: اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَہُمۡ وَ رُہۡبَانَہُمۡ اَرۡبَابًا ....

یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَ یَاۡبَی اللّٰہُ اِلَّاۤ اَنۡ یُّتِمَّ نُوۡرَہٗ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۳۲﴾

۳۲۔ یہ لوگ اپنی پھونکوں سے نور خدا کو بجھانا چاہتے ہیں مگر اللہ اپنے نور کو مکمل کرنے کے علاوہ کوئی بات نہیں مانتا، اگرچہ کفار کو ناگوار گزرے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں دو باتوں کی طرف اشارہ ملتا ہے:

اولاً: یہ کہ نور اسلام کی عظمت و قوت کے مقابلے میں دشمنوں کی تمام تر کوششیں ایسی ناچیز ہیں کہ جیسے کوئی نور خدا کو پھونکوں سے بجھانے کی کوشش کرے۔ بھلا ایک پھونک کی حقیقت کیا ہے کہ وہ

---

[1] الدر المنثور

نور خدا کو بجھانے کی سوچے۔

ثانیاً: بات اسلام کی عالمگیری اور دشمنوں کی سازشوں کے مقابلے میں اس دین کی کامیابی کی نوید ہے اور ساتھ اس بات پر مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا کہ آئندہ اس دین کو دشمنوں کے حربوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ چنانچہ اسلام کی پوری تاریخ اور ہماری معاصر تاریخ شاہد ہے کہ اہل کتاب نے اس نور کو بجھانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور کر رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ نور خدا کا پھونکوں سے کوئی مقابلہ نہیں ہے، لہٰذا دشمن ناکام رہیں گے: اَنۡ یُّطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ..

۲۔ جو نور خدا کے ساتھ ہے اس کے مقابلے میں تمام طاقتیں ناچیز ہیں: بِاَفۡوَاہِہِمۡ ....۔

۳۔ کافروں کی کراہت کا وقت مؤمنین کی خوشی کا وقت ہوگا: وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ۔

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ۙ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۳﴾

۳۳۔ اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ اسی نے بھیجا ہے تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے اگرچہ مشرکین کو برا ہی لگے۔

تفسیر آیات

اس وقت ادیان عالم میں صرف دین اسلام ہے جو سندِ متّصل اور قطعی ذرائع کے ساتھ تواتر سے ثابت ہے۔ وہ واحد دین ہے جس کی تاریخ محفوظ ہے اور اس دین کا دستور قرآن مجید حرف بحرف محفوظ ہے۔ لہٰذا ادیان عالم میں یہی دین، دین حق ہے۔

لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ: یہ دین آیا اس لیے ہے کہ تمام ادیان پر غالب آئے۔ تمام اقوام عالم کی قیادت کرے۔ پوری دنیا میں عدل و انصاف قائم کرے۔ تمام مظلوم قوموں کی داد رسی کرے:

وَیَضَعُ عَنۡہُمۡ اِصۡرَہُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡہِمۡ ....[۱]

اور ان پر لدے ہوئے بوجھ اور (گلے کے) طوق اتارتے ہیں....

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ہر مفسر نے اپنے عصر کے حالات کو سامنے رکھ کر تفسیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے اس آیت کی تشریح کرنے میں دشواری پیش آئی اور تاویل کا سہارا لینا پڑا کہ بالادستی اور غالب آنے سے مراد منطق و استدلال کی بالادستی ہے۔ کچھ اہل قلم نے تو یہ بھی کہدیا کہ مراد صرف جزیرہ

۱۔ ۷ اعراف: ۱۵۷

عرب ہے کہ یہاں اسلام تمام ادیان پر غالب آئے گا۔

جب کہ قرآنی تعبیر کسی ایک زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ تمام ازمان و اعصار پر محیط ہے۔ ثانیاً اللہ کی سنت میں تشریعی وتکوینی ارتقا تدریجی ہے۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں خلق فرمایا ہے۔ اللہ کے چھ دن بہت بڑی مدت ہوتی ہے اور تشریع میں بھی دین الٰہی آدمؑ سے لے کر خاتمؐ تک بتدریج ارتقائی مراحل طے کرتا رہا ہے اور اس آخری نظام حیات کو بھی اسی تدریجی ارتقائی مراحل سے گزارنا ہے:

سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ ... [1]

ہم عنقریب انہیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ یقیناً وہی (اللہ) حق ہے۔

البتہ یہ بات بھی اپنی جگہ واضح اور مسلم ہے کہ دین اسلام اپنی جامعیت اور ایک کامل نظام حیات ہونے میں سب ادیان پر بالا دست ہے۔ اسلام اپنے دستور حیات میں کسی اور دین اور قانون کا محتاج نہیں ہے کہ اس دین میں کوئی کمزوری ہو جسے دوسرے ادیان سے دور کیا جائے۔ یہ بھی ایک غلبہ ہے۔ رہا اس جامع اور کامل دستور حیات کے نفاذ کا مرحلہ تو اس کے لیے ہم ایک نافذ کنندہ الٰہی طاقت کے منتظر ہیں۔

جب انسانیت مادیت کی اندھی تاریکی میں مزید ڈوب جائے گی، ہر طرف یاس و ناامیدی کے سیاہ بادل چھا جائیں گے اور امن وسکون عنقا بن جائے گا، اس وقت لوگ امن دہندہ کی تلاش میں ہوں گے، ایک نجات دہندہ کو پکاریں گے، جس سے ایک عالمگیر عادلانہ نظام کے لیے زمین ہموار ہو گی اور یہ دین تمام ادیان پر غالب آئے گا۔

سنت نبویؐ میں یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام ظہور فرمائیں گے تو یہ دین تمام ادیان پر غالب آئے گا اور آپؑ دنیا کو عدل وانصاف سے پر کریں گے، جیسے ظلم وجور سے پر ہوگئی ہوگی۔

احادیث ظہور مہدیؑ کے لیے ملاحظہ فرمائیں صحیح ترمذی، سنن ابی دائود کتاب الھدیٰ، مسند احمد بن حنبل، مستدرك حاکم اور سنن ابن ماجه کتاب الفتن وغیرہ۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَ الرُّہۡبَانِ لَیَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ

۳۴۔ اے ایمان والو! (اہل کتاب کے) بہت سے علماء اور راہب ناحق لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور انہیں راہ خدا سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے

----

[1] ۴۱ فصلت: ۵۳

یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَ الۡفِضَّۃَ وَ لَا یُنۡفِقُوۡنَہَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۙ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۳۴﴾	راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے۔

تفسیر آیات

اہل کتاب سے جنگ کرنے کا حکم صادر فرمانے کے بعد وہ حقائق بیان ہو رہے ہیں جن کی وجہ سے ایسا کرنا ضروری ہوا:

i۔ اہل کتاب کے عقائد بت پرستوں کے عقائد کے مشابہ ہیں۔

ii۔ ان کے علماء وشیوخ شریعت سازی میں دخل دیتے ہیں، جس کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔

iii۔ وہ نور خدا کو بجھانے کی ناپاک کوششوں میں رہتے ہیں۔ اور دین حق والوں سے حالت جنگ میں رہتے ہیں۔

iv۔ وہ دین حق کی بالادستی سے کراہت کرتے ہیں۔

v۔ وہ دولت کے عادلانہ تقسیم کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس آیہ شریفہ میں اسی بات کا ذکر ہے۔

کسی معاشرے میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے ایک اہم ترین بنیاد، دولت کی مساویانہ تقسیم ہے اور اس بات کے لیے ضروری ہے کہ اس معاشرے میں استحصالی عناصر کے لیے فضا سازگار نہ ہو۔ ورنہ دولت کی مساویانہ تقسیم ناممکن ہو جائے گی اور اس معاشرے کا سرمایہ چند ایک استحصالی عناصر کے ہاتھوں میں ارتکاز پیدا کرے گا۔

اہل کتاب کے مذہبی عناصر، جن پر عادلانہ نظام قائم رکھنے کی ذمہ داری ہوتی ہے، اسی استحصالی عناصر میں تبدیل ہو گئے تھے۔ لہٰذا اس قسم کے غیر انسانی نظام کے حامل مذہب کو کسی بھی معاشرے پر بالادستی قائم رکھنے کا حق نہیں پہنچتا۔ ان کو طاقت کے ساتھ کسی عادلانہ نظام کے تحت لانا انسانیت کی عظیم خدمت ہے۔

۱۔ وَالَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَ الۡفِضَّۃَ : **ارتکاز دولت:** اس کے بعد اس آیہ شریفہ میں بطور مطلق ایک اہم ترین اقتصادی مسئلے کا ذکر کیا گیا ہے جو تمام ناانصافیوں کی جڑ اور دولت کی عادلانہ تقسیم کے لیے بدترین رکاوٹ ہے۔ وہ ہے دولت کا چند ہاتھوں میں ارتکاز۔

کنز کی تعریف: کسی جگہ محفوظ یا مدفون دولت کو کنز کہتے ہیں۔ شریعت میں کنز کی کیا تعریف بنتی ہے؟ اقوال علماء میں اختلاف اور اضطراب ہے۔ کنز چند ہاتھوں میں سرمائے کا ارتکاز ہے؟ یا کنز سے مراد سرمائے کا انجماد ہے؟ یا کنز سے مراد مالی واجبات کی عدم ادائیگی ہے؟

ایک موقف یہ ہے کہ کنز سے مراد سرمائے کا انجماد ہے۔ ایک شخص اپنی دولت دفن کر کے یا سونے چاندی کو لاکرز میں بند محفوظ رکھتا ہے، یہ کنز ہے۔ اسی کی مذمت ہے۔ اگر وہ اپنے سرمائے کو منجمد نہ رکھے، ملکی اقتصاد میں شامل اور ملکی پیداواری عمل میں داخل رکھے، یہ کنز نہیں ہے لیکن اگلا جملہ وَلَا يُنۡفِقُوۡنَهَا اسے خرچ نہیں کرتے، اس موقف کی نفی کرتا ہے چونکہ پیداواری عمل میں شامل ہونے کو انفاق نہیں کہتے۔

دوسرا موقف یہ ہے کہ کنز اس دولت کو کہتے ہیں جس کے مالی واجبات (جیسے زکوٰۃ) کی ادائیگی نہیں کی گئی۔ اگر اس کے مالی واجبات ادا ہو جائیں تو یہ کنز نہیں ہے۔ اس موقف پر اس حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کل مایؤدی زکوتہ فلیس بکنز و ان	ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا کی گئی ہے، وہ کنز نہیں
کانت تحت سبع ارضین و کل ما لا	ہے خواہ وہ سات زمینوں کے نیچے ہی کیوں نہ ہو
یؤدی زکوتہ فہو کنز و ان کان فوق	اور ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی گئی، وہ کنز
الارض۔[1]	ہے اگرچہ وہ زمین کے اوپر کیوں نہ ہو۔

بظاہر حدیث کی نظر عدم ادائیگی پر ہے کہ واجبات کی عدم ادائیگی کی وجہ سے تھوڑا سرمایہ بھی کنز شمار ہو گا، ارتکاز سرمایہ پر نہیں ہے۔ یعنی کنز کے مصادیق میں سے ایک مصداق کا ذکر ہے نیز اس موقف پر آیت کے اس جملے سے بھی استدلال کیا جاتا ہے: وَلَا يُنۡفِقُوۡنَهَا فِیۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ... یہ لوگ دولت کو ذخیرہ کر رکھتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے۔ یہاں اگر يُنۡفِقُوۡنَهَا میں انفاق سے مراد پوری دولت میں سے صرف زکوۃ کی مقدار مراد لی جائے تو یہ جملہ اس موقف پر دلیل بنتا ہے۔ جب کہ اس جملے میں انفاق کی نسبت پورے کنز کی طرف ہے کہ اس ذخیرے کو راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے۔ چونکہ و لا ینفقون منہا نہیں فرمایا کہ ایک حصہ مراد لیا جائے بلکہ پورا ذخیرہ مراد ہے چونکہ پورا ذخیرہ اس کی ضرورت سے زیادہ ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ۬ قُلِ الۡعَفۡوَ ...[2]	لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں؟ کہد یجیے جو ضرورت سے زیادہ ہو۔

تیسرا موقف یہ ہے کہ کنز سے مراد سرمایے کا چند ہاتھوں میں ارتکاز ہے۔ يَكۡنِزُوۡنَ کا مطلب یہ ہے کہ اپنے سرمائے سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ اس کو ذخیرہ کرتے ہیں۔ سرمائے میں اضافہ کرتے ہیں۔ راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے بلکہ ان پر واجب یہ ہے کہ اپنی ضرورت سے زیادہ آمدنی کو راہ خدا میں خرچ کریں چونکہ دولت کو ذریعہ نہیں، مقصد قرار دے کر اس پر اضافہ کرتے چلے جانا ممنوع ہے کیونکہ یہ

وَّ تُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا ...[3]	اور مال کے ساتھ جی بھر کر محبت کرتے ہو۔

---

[1] الوسائل ۹: ۳۰ [2] ۲ بقرۃ: ۲۱۹ [3] ۸۹ فجر: ۲۰

کے تحت آ جاتا ہے اور یہ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ...[1] ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ [2]	اور جو رزق ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آ جائے پھر وہ کہنے لگے: پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت کیوں نہ دی تا کہ میں صدقہ دیتا اور میں (بھی) صالحین میں سے ہو جاتا۔

درست ہے اسلام نے فردی ملکیت کو قبول کیا ہے تاہم اس ملکیت کو بے لگام بھی نہیں چھوڑا ہے اور چند ہاتھوں میں ارتکاز سرمایہ کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔ ہاں! اگر کوئی سرمایہ محروم لوگوں کے مفاد میں ہے تو وہ کنز نہیں ہے۔ اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایک شخص کے پاس بڑا سرمایہ موجود ہے، اس کو وہ قومی پیداواری عمل میں شامل رکھتا ہے اور اس سے ہونے والے منافع کو وہ راہ خدا میں خرچ کرتا ہے۔ اس صورت میں یہ سرمایہ کنز یعنی ذخیرہ نہیں ہے، نہ ہی اس سے وہ اپنی دولت میں اضافہ کرتا ہے بلکہ راہ خدا میں خرچ کرتا ہے۔ اگر سرمایہ میں اضافہ ہوتا بھی ہے تو اس سے راہ خدا میں خرچ میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

تبادل: غیر متمدن انسان کو تبادلہ مال کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق کمائی کرتا تھا۔ انسان نے جب تمدن میں قدم رکھا اور تسخیر طبیعت کا تجربہ آگے بڑھا تو بعض چیزوں کو اپنی ضرورت سے زیادہ کمانا شروع کیا اور بعض دیگر ضرورت کی چیزوں کو دوسروں سے لینا پڑا تو تبادلہ مال بہ مال کی ضرورت پیش آئی۔ اس طرح تبادل پیداوار اور مصرف کے درمیان ایک ذریعہ بن گیا لیکن یہاں ایک خرابی وجود میں آ گئی۔ وہ یہ کہ مفاد پرستوں نے اس تبادل سے ذخیرہ اندوزی کرنا شروع کیا۔ اس سے تبادل، پیداوار اور ذخیرہ اندوزی کے درمیان ذریعہ بن گیا۔

مال کے مقابل مال کے تبادلہ میں بعض اوقات مشکلات پیش آتی تھیں۔ مال کبھی قابل تقسیم نہیں ہوتا اور کبھی خود مال کا پیش کرنا ممکن نہ ہوتا۔ اس لیے مال بمقابلہ نقد وجود میں آیا۔ یہ تبادل چونکہ قدرتی نہیں ہے جیسے مال بمقابلہ مال ہے بلکہ انسان کا ساختہ ہے، اس لیے نقد کی وجہ سے ارتکاز سرمایہ اور ذخیرہ اندوزی آسان ہوگئی۔ مال کا تبادلہ مال سے ہونے کی صورت میں مال کی قیمت کا تعین رسد اور طلب سے ہوتا تھا لیکن نقد نے رسد اور طلب کے توازن میں ذخیرہ اندوزی کے ذریعے خلل ڈالا چونکہ نقد میں تبادلہ ضرورت کے تحت نہیں بلکہ ذخیرہ اندوزی کے لیے بھی ہوتا ہے۔ اس طرح نقد، پیداوار بڑھانے کا نہیں، دولت بڑھانے کا ذریعہ بن گیا۔ اسلام نے ذخیرہ اندوزی کے خلاف درج ذیل قوانین بنائے:

الف: ضرورت سے زیادہ خرچ کرنے (اسراف) کی ممانعت۔

---

[1] ۵۷ الحدید: ۲۰ [2] ۶۳ منافقون: ۱۰

ب: سونا چاندی پر ہر سال زکوۃ۔

ج: سود لینا حرام۔

د: اسلامی حکومت کو نظارت کا حق دیا۔

البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ اسلام نے ملکیت کے لیے کسی حد کا تعین نہیں کیا۔ ذخیرہ کرنے والا اپنے مال کا مالک رہے گا جب تک شرعی حکومت اس کو اجازت دے۔ ولی امر کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اس کی ملکیت کو محدود کرے۔

واوٗ کا مسئلہ: حضرت عثمان کے زمانے میں حضرت ابی بن کعب کی سربراہی میں قرآن ایک ہی قراء ت کے مطابق لکھا جا رہا تھا۔ اس وقت یہ کوشش کی گئی کہ وَالَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَ الۡفِضَّۃَ میں الَّذِیۡنَ سے پہلے واوٗ نہ لکھی جائے۔ حضرت ابی بن کعب نے اس کے خلاف مقاومت کی اور کہا یہ واوٗ نہ لکھی گئی تو ہم تلوار اٹھائیں گے۔ چنانچہ واوٗ لکھی گئی۔[1]

ظاہر ہے واوٗ نہ لکھنے کی صورت میں یہ آیت صرف اہل کتاب کے ساتھ مختص ہو جاتی اور مسلمان اس میں شامل نہ ہوتے۔ چنانچہ معاویہ کا یہ مؤقف تھا کہ ذخیرہ اندوزی کی مذمت صرف اہل کتاب کے لیے ہے، مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔ حضرت ابوذرؓ کا مؤقف یہ تھا کہ اس آیت میں اہل کتاب اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔[2] یعنی ذخیرہ اندوزی اور سرمائے کا چند ہاتھوں میں ارتکاز مطلق ممنوع ہے۔[3]

اہم نکات

۱۔ اسلام کسی قسم کے مالی استحصال کی ہرگز اجازت نہیں دیتا: لَیَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ..

۲۔ ذخیرہ اندوزی اور ارتکاز دولت کا مرتکب جہنمی ہے: یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَ الۡفِضَّۃَ ....

یَّوۡمَ یُحۡمٰی عَلَیۡہَا فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ فَتُکۡوٰی بِہَا جِبَاہُہُمۡ وَ جُنُوۡبُہُمۡ وَ ظُہُوۡرُہُمۡ ؕ ہٰذَا مَا کَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَکۡنِزُوۡنَ ﴿۳۵﴾

۳۵۔ جس روز وہ مال آتش جہنم میں تپایا جائے گا اور اسی سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پشتیں داغی جائیں گی (اور ان سے کہا جائے گا) یہ ہے وہ مال جو تم نے اپنے لیے ذخیرہ کر رکھا تھا لہٰذا اب اسے چکھو جسے تم جمع کیا کرتے تھے۔

---

[1] الدر المنثور طبع دار الکتب بیروت ۱۹۹۰ء۔ حضرت اُبی کا حضرت عمر کے زمانے میں وفات پانا ثابت نہیں ہے بلکہ یہ بات ثابت ہے کہ وہ عہد عثمان تک زندہ تھے۔

[2] تفسیر المنار ۱۰: ۴۰۵۔

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں اقتصادنا از شہید باقر صدرؒ۔

تفسیر آیات

۱۔ یَّوۡمَ یُحۡمٰی عَلَیۡہَا فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ: اس دن وہ آتش جہنم میں تپایا جائے گا۔ اس مطلب کو بیان کرنے کے لیے فرمایا اس روز آتش کو اس مال پر تپایا جائے گا۔ یوم تحمی (النار) علیھا۔ یہ بتانے کے لیے کہ اس سونے اور چاندی کو اس حد تک گرم کیا جائے گا گویا کہ آتش جہنم کو اس کی حرارت سے تپایا جائے گا۔

۲۔ فَتُکۡوٰی بِہَا: پھر اس سونے چاندی سے پیشانیاں، پہلو اور پشتیں داغی جائیں گی۔ ان اعضا کا ذکر، ممکن ہے اس لیے ہوا ہو کہ ان اعضاء سے جسم کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اشرف الاعضاء ہیں اس لیے ان کا ذکر ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ سائل کے سامنے اس نے منہ موڑا، پشت پھیری ہے۔

۳۔ ہٰذَا مَا کَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ: یہ ہے وہ مال جو تم نے اپنے لیے ذخیرہ کر رکھا تھا۔ یعنی انسان اپنے فائدے اور ضرورت کے لیے مال ذخیرہ کرتا ہے لیکن یہ مال تم نے اپنے عذاب کے لیے ذخیرہ کیا۔

اس شدید عذاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام مالی حقوق کے لیے کس اہمیت کا قائل ہے کیونکہ ایک عادل اقتصادی نظام کا قیام مالی حقوق کی پاسداری سے ہی ممکن ہے۔

اہم نکات

۱۔ انسان دنیا میں جو عمل انجام دیتا ہے وہ نابود نہیں ہوتا۔ قیامت میں عیناً وہی چیز پیش کی جاتی ہے: فَذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَکۡنِزُوۡنَ۔

اِنَّ عِدَّۃَ الشُّہُوۡرِ عِنۡدَ اللّٰہِ اثۡنَا عَشَرَ شَہۡرًا فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ یَوۡمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ مِنۡہَاۤ اَرۡبَعَۃٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ ۬ۙ فَلَا تَظۡلِمُوۡا فِیۡہِنَّ اَنۡفُسَکُمۡ وَ قَاتِلُوا الۡمُشۡرِکِیۡنَ کَآفَّۃً کَمَا یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ کَآفَّۃً ؕ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۳۶﴾

۳۶۔ کتاب خدا میں مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک یقیناً بارہ مہینے ہے جب سے اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، ان میں سے چار مہینے حرمت کے ہیں، یہی مستحکم دین ہے، لہٰذا ان چار مہینوں میں تم اپنے آپ پر ظلم نہ کرو اور تم سب مشرکین سے لڑو جیسا کہ وہ تم سب سے لڑتے ہیں اور جان لو کہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے۔

تفسیر آیات

اس آیہ شریفہ میں اسلامی تقویم کے بارے میں چند مسائل کا ذکر ہے:

۱۔ اِنَّ عِدَّۃَ الشُّھُوۡرِ: عرب جاہلیت نے اپنی مصلحتوں کی خاطر مہینوں کی تعداد بڑھا کر ۱۳ یا ۱۴ کر دی تھی۔ اس جاہلی رسم کی منسوخی کا اعلان بھی ۹ ہجری میں حج کے موقع پر ہوا اور فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کتاب تکوین میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے۔ زمین جب سورج کے گرد چکر پورا کر لیتی ہے تو چاند زمین کے گرد بارہ چکر لگا لیتا ہے۔ یہ ایک قدرتی جنتری ہے جسے ہر شخص صفحہ آسمان پر دیکھ سکتا ہے اور اپنے امور کو اس کے مطابق منظّم کر سکتا ہے۔

۲۔ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ: یہ تعداد اللہ کی کتاب تکوین میں ہے جس میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے وقت اس تعداد کو تکویناً بارہ مہینے مقرر کیا گیا ہے۔البتہ یہ بات صرف خط استوا کی آبادی اور کرۂ ارض سے متعلق ہے، ورنہ قطب شمال اور جنوب میں پورا سال، ایک دن اور ایک رات پر مشتمل ہے۔ دیگر کرات کا سال اس زمانہ سے مربوط ہے جو اس کرہ کو سورج کے گرد ایک چکر پورا کرنے میں لگتا ہے، جو زمین سے مختلف ہے۔ چنانچہ آیت کے پیش نظر کرۂ ارض اور اس کرۂ ارض کی اکثر آبادی ہے جو خط استوا پر آباد ہے۔

۳۔ مِنۡہَاۤ اَرۡبَعَۃٌ حُرُمٌ: ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرمت کے ہیں۔ ان میں امن وسکون برقرار رکھو اور خونریزی کر کے اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔ حرمت کے چار مہینوں سے مراد ذی القعدہ، ذی الحجۃ، محرم اور رجب ہیں۔ عربوں میں ان چار مہینوں کا احترام کیا جاتا تھا جو کہ دین ابراہیم علیہ السلام کے مطابق ہے اور حج اور کعبہ ان کے درمیان ہونے کی وجہ سے دین ابراہیمی کی یہ تعلیم ان کے درمیان باقی رہی تاہم عرب مشرکوں نے اس میں بھی اپنی عارضی مصلحتوں کی بنا پر رد وبدل کیا اور حرمت کے مہینوں میں بھی جنگ کرنے کے بہانے بنا لیے تو مسلمانوں کے لیے یہ حکم آیا۔

۴۔ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ: ان حرمت کے مہینوں میں امور معاش و معاد کے لیے امن و امان فراہم کرنا اس دین کا حصہ ہے جو لوگوں کے معاش و معاد کی مصلحتوں کی پاسداری کرتا ہے۔

۵۔ فَلَا تَظۡلِمُوۡا فِیۡہِنَّ اَنۡفُسَکُمۡ: تم حرمت کے ان مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔ ظلم دوسرے مہینوں میں بھی نہیں کرنا چاہیے تاہم ان حرمت کے مہینوں میں ظلم کرنا زیادہ جرم ہے اور ظلم سے مراد قتال ہے کہ ان مہینوں میں قتال نہ کرو۔

۶۔ وَقَاتِلُوا الۡمُشۡرِکِیۡنَ کَآفَّۃً: کَآفَّۃً اگر اَنۡفُسَکُمۡ سے مربوط ہے تو معنی یہ ہوں گے تم مسلمان سب مل کر لڑو۔ اگر کَآفَّۃً مشرکین سے مربوط ہے تو یہ معنی ہوں گے تم سب مشرکین سے لڑو جیسے وہ تم سب سے لڑتے ہیں۔ ہم نے یہی ترجمہ اختیار کیا ہے۔

اہم نکات

۱۔ احکام شریعت، احکام خلقت کے مطابق ہوتے ہیں: یَوۡمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ....۔

اِنَّمَا النَّسِیۡٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الۡکُفۡرِ یُضَلُّ بِہِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُحِلُّوۡنَہٗ عَامًا وَّ یُحَرِّمُوۡنَہٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوۡا عِدَّۃَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ فَیُحِلُّوۡا مَا حَرَّمَ اللّٰہُ ؕ زُیِّنَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ اَعۡمَالِہِمۡ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۳۷﴾

۳۷۔ (حرمت کے مہینوں میں) تقدیم و تاخیر بیشک کفر میں اضافہ کرتا ہے جس سے کافروں کو گمراہ کیا جاتا ہے، وہ کسی سال ایک مہینے کو حلال اور کسی سال اسے حرام قرار دیتے ہیں تاکہ وہ مقدار بھی پوری کر لیں جسے اللہ نے حرام کیا ہے اور ساتھ ہی خدا کے حرام کو حلال بھی کر لیں، ان کے برے اعمال انہیں بھلے کر کے دکھائے جاتے ہیں اور اللہ کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

تشریح کلمات

النَّسِیۡٓءُ: (ن س ی) تاخیر کر دینا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَا النَّسِیۡٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الۡکُفۡرِ: عرب اگرچہ بنیادی طور پر حرمت کے چار مہینوں میں جنگ اور خونریزی کو حرام سمجھتے تھے، وہ ان چار مہینوں کی تعداد تو پوری کر لیتے تھے مگر وہ ان مہینوں کو اپنی خواہشات کے مطابق بدل دیتے اور کسی حرام مہینے کو حلال کر دیتے تھے، اس کی جگہ کسی حلال مہینے کو حرام قرار دیتے تھے۔ چونکہ یہ جنگجو اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے متواتر تین ماہ تک صبر نہیں کر سکتے تھے اس لیے وہ کسی حرمت کے مہینے کو حلال قرار دے کر جنگ کرتے اور اس کی جگہ کسی حلال مہینے کو حرام قرار دے دیتے۔ یہ عمل اللہ کے مقرر کردہ قوانین میں تصرف اور کفر شمار ہوا۔

۲۔ فَیُحِلُّوۡا مَا حَرَّمَ اللّٰہُ: اگر کفر کی حالت میں اللہ کی حرام کردہ چیز کو حلال کر دے تو اپنے کفر میں اضافہ ہے اور اگر کوئی کلمہ گو یہ کام کرے تو یہ ایمان سے کفر کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

۳۔ زُیِّنَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ اَعۡمَالِہِمۡ: انسان جب برائی کے ارتکاب میں راسخ ہو جاتا ہے تو برائی اچھائی لگنے لگ جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ شریعت سازی میں دخل اندازی کفر ہے: اِنَّمَا النَّسِیۡٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الۡکُفۡرِ ....۔

۲۔ جب احساس گناہ ختم ہو جائے اور گناہ بھلے دکھائی دیں تو اللہ ایسے لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا۔ زُیِّنَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ اَعۡمَالِہِمۡ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی ....۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَا لَکُمۡ اِذَا قِیۡلَ لَکُمُ انۡفِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اثَّاقَلۡتُمۡ اِلَی الۡاَرۡضِ ؕ اَرَضِیۡتُمۡ بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا مِنَ الۡاٰخِرَۃِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیۡلٌ ﴿۳۸﴾

۳۸۔ اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے اللہ کی راہ میں نکلو تو تم زمین سے چمٹ جاتے ہو؟ کیا تم آخرت کی جگہ دنیاوی زندگی کو زیادہ پسند کرتے ہو؟ دنیاوی زندگی کی متاع تو آخرت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ انۡفِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ: ۹ ہجری میں جب آنحضرتؐ غزوہ حنین سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپؐ کو خبر ملی کہ روم کی فوجیں تبوک میں جمع ہو رہی ہیں۔ تبوک مدینہ کے شمال میں شام کی سرحد پر ایک جگہ کا نام ہے جو مدینے سے ۶۱۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ اس مرتبہ لشکر اسلام کو ایک ایسی منظّم شاہی فوج کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے جو اس زمانے کی بڑی طاقت شمار ہوتی ہے۔ چنانچہ آپؐ تیس ہزار کا لشکر لے کر نکلے۔

اس مرتبہ اس جنگ کے لیے نکلنے میں چند ایک دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ مدینے سے تبوک کی مسافت کافی دور تھی۔ موسم بھی سخت گرم تھا۔ فصل پکنے اور کاٹنے کا وقت بھی آ گیا تھا اور پھر اس زمانے کی بڑی طاقت کے ساتھ لڑنا تھا۔ یہ ساری باتیں مسلمانوں کے ایمان کے وزن کو تولنے کے لیے کافی تھیں۔ چنانچہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ رسول کریمؐ کی زندگی کے اواخر میں ایمان و ایقان کی کس منزل پر فائز تھے کہ رسول کریمؐ کی طرف سے جہاد کا اعلان عام ہو رہا ہے لیکن لوگ زمین سے چمٹ رہے ہیں۔ ان کے لیے دنیاوی زندگی اور مال و متاع دنیا، رکاب رسولؐ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہے:

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ مومن تو بس وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول

ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا وَ جٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَ اَنۡفُسِهِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ۝ [1]

پر ایمان لائیں پھر شک نہ کریں اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کریں یہی لوگ (دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔

۲۔ اَرَضِیۡتُمۡ بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا: جب دنیا اور آخرت میں سے ایک کا انتخاب کرنے کی نوبت آئی تو کیا تم نے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی؟ یہ ایک تنبیہی جملہ ہے جس کے سامنے ایک ایسا کردار ہے جو دنیا پرست ہے۔

اِلَّا تَنۡفِرُوۡا یُعَذِّبۡکُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ۬ۙ وَّ یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ وَ لَا تَضُرُّوۡهُ شَیۡئًا ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝۳۹

۳۹۔ اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کرے گا اور تم اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکو گے اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِلَّا تَنۡفِرُوۡا یُعَذِّبۡکُمۡ عَذَابًا: دردناک عذاب کا لہجہ ایسا ہے، جیسا کفر اختیار کرنے والوں کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے یا جنگ سے کترانے والوں کے لیے۔ چنانچہ سورہ فتح میں آیت ۱۶ ۔ ۱۷ میں جنگ سے کترانے والے صحرانشینوں کے لیے یہی لہجہ اختیار فرمایا۔

۲۔ وَّ یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ: اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا جو احکام خدا کی تعمیل کے وقت زمین سے چمٹنے والے نہ ہو گی۔

۳۔ وَ لَا تَضُرُّوۡهُ شَیۡئًا: تمہارے جانے سے اللہ کے دین کو کوئی نقصان نہ ہو گا۔ تمہاری ایسی کوئی حیثیت نہیں کہ تمہارے جانے سے کوئی متاثر ہو جائے۔

یہ بات سنت الٰہی ہے کہ وہ قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی جو اپنا دفاع کرنا نہیں جانتی۔ اپنے امامؑ کے پکارنے پر زمین سے چمٹ جاتی ہے اور اپنے رہبر کی نافرمانی کرتی ہے۔ چنانچہ سورہ محمدؐ میں فرمایا:

وَ اِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ ۝ [2]

اور اگر تم نے منہ پھیر لیا تو اللہ تمہارے بدلے اور لوگوں کو لے آئے گا، پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

کیونکہ دشمن سے خوف کھانا اور اس کے سامنے ہتھیار ڈالنا اپنے وجود کی نفی ہے۔

---

[1] ۴۹ حجرات: ۱۵ [2] ۴۷ محمد: ۳۸

اہم نکات

۱۔ وہ قومیں زندہ نہیں رہ سکتی جو اپنا دفاع کرنا نہیں جانتی: وَّيَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ ....۔

۲۔ اللہ اپنے دین کے لیے کسی ایک قوم پر انحصار نہیں فرماتا: وَّيَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ ....۔

اِلَّا تَنۡصُرُوۡهُ فَقَدۡ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذۡ اَخۡرَجَهُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ثَانِىَ اثۡنَيۡنِ اِذۡ هُمَا فِى الۡغَارِ اِذۡ يَقُوۡلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلَيۡهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوۡدٍ لَّمۡ تَرَوۡهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا السُّفۡلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الۡعُلۡيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۞

۴۰۔ اگر تم رسول کی مدد نہ کرو گے تو (جان لو کہ) اللہ نے اس وقت ان کی مدد کی جب کفار نے انہیں نکالا تھا جب وہ دونوں غار میں تھے وہ دو میں کا دوسرا تھا، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا رنج نہ کر یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے پھر اللہ نے ان پر اپنا سکون نازل فرمایا اور ایسے لشکروں سے ان کی مدد کی جو تمہیں نظر نہ آتے تھے اور یوں اس نے کافروں کا کلمہ نیچا کر دیا اور اللہ کا کلمہ تو سب سے بالاتر ہے اور اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِلَّا تَنۡصُرُوۡهُ: رسولؐ کی آواز پر لبیک نہ کہنے والوں سے تہدید کے لہجے میں فرما رہا ہے کہ تم اگر رسولؐ کی مدد نہ کرو تو وَلَا تَضُرُّوۡهُ شَيۡـًٔا تم اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنے رسولؐ کی تمہارے بغیر بھی مدد کرے گا۔

چنانچہ اس نے رسولؐ کی اس وقت مدد کی جب وہ دو میں کا دوسرا تھا اور کوئی تیسرا آدمی ان کے ساتھ نہیں تھا اور جو ساتھ تھا وہ بھی حزن و اضطراب میں تھا۔ اس سے رسولؐ یہ فرما رہے تھے: رنج نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اس آیت میں ہجرت کے موقع پر رسول اللہؐ کو جن نازک حالات کا سامنا تھا، ان کا نہایت مختصر اور بلیغ انداز میں نقشہ پیش کیا گیا ہے:

i۔ کافر لوگ رسول اللہؐ کو وطن چھوڑ کر نکلنے پر مجبور کر رہے تھے: اِذۡ اَخۡرَجَهُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ....۔

ii۔ وہ دو کا دوسرا تھا، اس کے ساتھ کوئی تیسرا آدمی نہیں تھا: ثَانِىَ اثۡنَيۡنِ ....۔

iii۔ وہ دونوں انتہائی خطرناک حالت میں غار میں پناہ لیے ہوئے تھے اور دشمن تعاقب میں تھا: اِذۡ هُمَا فِی الۡغَارِ ....۔

iv۔ اپنے واحد ساتھی کو تسلی دے رہے تھے: لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ....۔ یہ واحد ساتھی حضرت ابوبکرؓ تھے۔

اس کے بعد اپنے رسولؐ کی مدد کی نوعیت بیان فرماتا ہے:

i۔ اس پر اللہ نے سکون نازل فرمایا۔

ii۔ نظر نہ آنے والے لشکروں سے مدد کی۔

iii۔ اللہ کا کلمہ بلند اور کافروں کا بول نیچا کیا۔

لہٰذا سیاق آیت یہ نہیں ہے کہ ہجرت کے اس نازک موقع پر کسی نے رسولؐ کی مدد کی بلکہ سیاق آیت یہ ہے کہ اللہ نے رسولؐ کی اس وقت مدد کی جب ان کے لیے کوئی مددگار نہ تھا۔

چنانچہ سید قطب فی ظلال القرآن میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> اللہ ان لوگوں کو تاریخ کی ایک ایسی مثال پیش فرما رہا ہے جسے وہ لوگ خود بھی جانتے تھے کہ اللہ نے اپنے رسولؐ کی ان کے بغیر کیسے مدد کی ہے۔
>
> روی البخاری عن عائشه، قالت: استاجر رسول اللّٰه و ابوبکر رجلا من بنی الدیل هادیا خرّیتا و هو علی دین کفار قریش ....۔[1]
>
> بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ اور ابوبکر نے بنی الدیل کے ایک شخص کو راستہ دکھانے کے لیے اجرت پر لیا جب کہ یہ شخص کفار قریش کے دین پر تھا۔

۲۔ فَاَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ: پھر اللہ نے رسولؐ پر سکون نازل فرمایا۔ متعدد مقامات پر جب بھی رسول اللہؐ کو غیر معمولی حادثہ پیش آیا، اللہ کی طرف سے سکون و اطمینان نازل ہوا۔ چنانچہ جنگ حنین میں جب کمزور ایمان مسلمان فرار ہوئے تو رسولؐ پر سکون نازل ہوا۔

ثُمَّ وَلَّيۡتُمۡ مُّدۡبِرِيۡنَ ۚ ثُمَّ اَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَعَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ...[2] پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مؤمنین پر اپنی تسکین نازل فرمائی ....۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب لوگوں میں بے چینی پھیل گئی کہ یہ صلح مسلمانوں کے حق میں نہیں ہے جب کہ فی الواقع یہ صلح مسلمانوں کے لیے ایک فتح مبین تھی، اللہ نے اپنے رسولؐ پر سکون نازل فرمایا:

اِذۡ جَعَلَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡحَمِيَّةَ جب کفار نے اپنے دلوں میں تعصب رکھا تعصب

---

[1] القرطبی ۸: ۱۴۵ [2] ۹ توبة: ۲۵۔ ۲۶

حَمِیَّۃَ الۡجَاہِلِیَّۃِ فَاَنۡزَلَ اللّٰہُ سَکِیۡنَتَہٗ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ وَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ... [1] بھی جاہلیت کا تواللہ نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنا سکون نازل فرمایا...

اس آیت میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنا سکون نازل فرمانے کا ذکر ہے: فَاَنۡزَلَ اللّٰہُ سَکِیۡنَتَہٗ عَلَیۡہِ وَ اَیَّدَہٗ بِجُنُوۡدٍ لَّمۡ تَرَوۡہَا ... ۔ پھر اللہ نے رسول پر اپنا سکون نازل فرمایا اور ایسے لشکر سے ان کی مدد کی جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے۔ جب کہ دیگر آیات میں رسول کے ساتھ مؤمنین پر بھی سکون نازل فرمانے کا ذکر ہے۔

۳۔ وَ اَیَّدَہٗ بِجُنُوۡدٍ لَّمۡ تَرَوۡہَا: اور اللہ نے اپنے رسولؐ کی ایسے لشکروں سے تائید فرمائی جو تمہیں نظر نہ آتے تھے۔ اسی نامرئی لشکروں کی حمایت میں رسولؐ گھر سے نکلے۔ کسی کی نظر آپؐ پر نہ پڑی۔ غار میں تین دن تک رہے، وہ غار کے اندر جھانک کر نہ دیکھ سکے جب کہ وہ غار تک پہنچ گئے تھے۔ غار کے دہانے پر مکڑی کا جال اور بروایتی پرندوں نے بھی گھونسلہ بنایا تھا۔ سراقہ کا واقعہ مشہور ہے جو کہ شعروں میں بھی آیا ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعاقب کیا اور رسولؐ کے قریب بھی پہنچ گیا اور معلوم ہوا کہ محمدؐ اس جگہ سے روانہ ہو رہے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ قریش کو اطلاع دے مگر اس کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا تو اس نے پکارا محمدؐ اپنے رب سے دعا کرو میرا گھوڑا آزاد ہو جائے۔ قسم بخدا میں آپ کی خبر کسی کو نہیں بتاؤں گا۔[2] واقعہ مختلف لفظوں میں اعلام الوری و دیگر مصادر میں موجود ہیں۔

۳۔ وَ جَعَلَ کَلِمَۃَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا السُّفۡلٰی: وہ فیصلہ جو مشرکین نے دار الندوۃ میں کیا تھا۔ قرآنی محاورہ میں لفظ کلمۃ حتمی اور اٹل فیصلہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وَ لَوۡ لَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتۡ ...[3] اگر پہلے سے فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا اور یہ ہجرت، اسلام کی تقویت کا باعث بن گئی۔

۴۔ وَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ہِیَ الۡعُلۡیَا: اللہ کا فیصلہ ہی بالا دست اور بالاتر ہو کر رہا۔ کیوں نہ ہو عزت اور حکمت کا وہی مالک ہے۔

اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاہِدُوۡا بِاَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۱﴾

۴۱۔ (مسلمانو) تم ہلکے ہو یا بوجھل (ہر حالت میں) نکل پڑو اور اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کرو، اگر تم سمجھو تو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا: ہلکے اور بوجھل میں، انسان کے لیے درپیش تمام احوال آگئے اور ہر حالت

---

[1] ۴۸ فتح: ۲۶ [2] الکافی ۸: ۲۱۳ [3] ۱۰ یونس: ۱۹

اور ہر صورت میں جہاد کے لیے نکلنے کا حکم ہوگیا۔ تنگدست ہو یا مالدار، خوشدلی سے ہو یا بے دلی سے، شوق جہاد ہو یا نہ ہو، بال بچے والے ہوں یا نہ ہوں، سوار ہو کر جا سکتے ہوں یا پیدل جب رسولؐ نے نکلنے کا حکم دے دیا تو تمہیں نکلنا چاہیے۔

۲۔ وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ : اس جملے سے جہاد مالی و جانی جہاد واجب ہو گیا اور جہاد میں خیر ہی خیر ہے بشرطیکہ تمہیں اس خیر کی حدود کا علمی احاطہ ہو۔ یعنی تم کو علم ہو جائے کہ جہاد کے کیا اثرات ہیں اور اسلامی امت کی تشکیل اور بقا میں جہاد کا کیا کردار ہے۔ چنانچہ جن ہستیوں کا علمی احاطہ زیادہ تھا ان کے جہاد کا احاطہ بہت وسیع ہے۔

اہم نکات

۱۔ جنگ کے لیے جو لوگ نکلے تھے، ان میں مختلف لوگ شریک تھے۔ جہاد کے لیے رضا و رغبت رکھنے والے بھی اور کراہت رکھنے والے بھی۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّا تَّبَعُوْكَ وَ لٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

۴۲۔ اگر آسانی سے حاصل ہونے والا کوئی فائدہ ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور آپ کے پیچھے چل پڑتے لیکن یہ مسافت انہیں دور نظر آتی اور اب وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں گے: اگر ہمارے لیے ممکن ہوتا تو یقیناً ہم آپ کے ساتھ چل دیتے (ایسے بہانوں سے) وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور اللہ کو علم ہے کہ یہ لوگ یقیناً جھوٹ بول رہے ہیں۔

تشریح کلمات

قَاصِدًا: القصد: متوسط درمیانہ کو کہتے ہیں۔

الشُّقَّةُ: طویل سفر کو کہتے ہیں، جسے طے کرنے میں مشقت پیش آتی ہو۔

تفسیر آیات

یہ جنگ خالصتاً ایک امتحان تھی جس سے بہت سے لوگ فاش ہو گئے اور کلام اللہ میں ان لوگوں کے ایمان کا وزن ثبت ہو گیا۔ منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کے چہرے بے نقاب ہوگئے کہ ان کی

ترجیحات کیا ہیں۔ وہ جنگوں میں شرکت کرتے بھی ہیں تو آسانی سے حاصل ہونے والے مفادات کے لیے کرتے ہیں۔ وہ عذر تراشتے ہیں تو جھوٹے ہوتے ہیں۔

۱۔ لَوۡ کَانَ عَرَضًا قَرِیۡبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا: آسانی سے حاصل ہونے والا کوئی مفاد ہوتا اور ساتھ سفر بھی زیادہ پر مشقت نہ ہوتا تو یہ لوگ آپؐ کے ساتھ ہو لیتے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ان دونوں میں سے ایک نہ ہو تو یہ آپ کے ساتھ ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔

۲۔ وَ لٰکِنۡۢ بَعُدَتۡ عَلَیۡہِمُ الشُّقَّۃُ: مسافت دور تھی۔ چنانچہ مدینہ سے تبوک تک کی مسافت کہتے ہیں ۶۱۰ کلومیٹر ہے۔

۳۔ سَیَحۡلِفُوۡنَ: وہ قسمیں کھا کر کہیں گے ہمارے لیے آپ کے ساتھ چلنا ممکن نہ تھا ورنہ ہم ضرور نکلتے۔

۴۔ یُہۡلِکُوۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ: اپنے شرک کو چھپا کر یا یہ کہ جنگ میں شرکت نہ کر کے وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ تبوک کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ دوسری جنگوں میں کس غرض سے شرکت کرتے رہے۔ یہ سورہ غزوہ تبوک کے بعد نازل ہوا ہے۔

عَفَا اللّٰہُ عَنۡکَ ۚ لِمَ اَذِنۡتَ لَہُمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ تَعۡلَمَ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۴۳﴾

۴۳۔ (اے رسول) اللہ آپ کو معاف کرے آپ نے انہیں کیوں اجازت دے دی قبل اس کے کہ آپ پر واضح ہو جاتا کہ سچے کون ہیں اور آپ جھوٹوں کو جان لیتے؟

تفسیر آیات

۱۔ عَفَا اللّٰہُ عَنۡکَ: ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے عذریں گھڑ کر رسول اللہؐ سے جنگ میں عدم شرکت کی اجازت لی تھی۔ اس بارے میں بظاہر اجازت دینے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سرزنش ہو رہی ہے لیکن فی الواقع منافقین کو فاش کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ آیت میں ''آپ نے کیوں اجازت دی؟'' سے پہلے ''اللہ آپ کو معاف کرے'' کا ذکر آنا خود اس پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے حبیب کے ساتھ یہ لہجہ سر دلبران در حدیث دیگران کے طور پر ہے کہ بظاہر خطاب رسول کریمؐ سے ہے مگر دوسروں کی سرزنش مراد ہے۔[۱] ان منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کو اجازت دینے میں ہی مصلحت تھی کیونکہ وہ اگر جنگ میں شریک

---

[۱] ملاحظہ ہو عیون اخبار الرضا ۱: ۲۰۲

ہوتے تو وہ خرابی میں اور اضافہ کرتے اور لشکر اسلام کے درمیان فتنہ کھڑا کرتے:

لَوۡ خَرَجُوۡا فِیۡکُمۡ مَّا زَادُوۡکُمۡ اِلَّا خَبَالًا ...[1] اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے بھی تو تمہارے لیے صرف خرابی میں اضافہ کرتے....

اور اجازت نہ دینے کی صورت میں ان کے نفاق پر پردہ پڑا رہتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ لہجہ اختیار فرمایا کہ ان کا ضمیر بھی فاش ہو جائے اور ان کے شر سے اسلام محفوظ بھی رہ جائے نیز اگلی آیت میں فرمایا:

وَّ لٰکِنۡ کَرِہَ اللّٰہُ انۡۢبِعَاثَہُمۡ فَثَبَّطَہُمۡ ...[2] لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا ناپسند تھا اس لیے اس نے (ان سے توفیق سلب کر کے) انہیں ملنے نہ دیا۔

اس مختصر بیان سے ان لوگوں کا یہ نظریہ باطل ثابت ہوتا ہے جو صاحب مَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی..[3] کو مجتہد کا درجہ دیتے ہیں اور یہ بھی جائز سمجھتے ہیں کہ رسولؐ سے مالا نص فیه میں اجتہادی غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

> جس اجازت پر عتاب ہو رہا ہے وہ حضورؐ کی طرف سے ایسے موضوع میں اجتہاد تھا جس میں بذریعہ وحی کوئی نص نہ تھی اور یہ بات انبیاء علیہم السلام سے صادر ہو سکتی ہے کیونکہ وہ ایسی باتوں میں معصوم عن الخطاء نہیں ہیں۔ وہ وحی کی تبلیغ و بیان اور اس پر عمل کرنے میں بالاتفاق معصوم ہیں۔[4]

اس کا مطلب یہ ہوا رسولؐ اولاً حکم خدا کے بغیر فیصلے کرتے ہیں، جب کہ اللہ کا حکم تو یہ ہے:

وَ اصۡبِرۡ حَتّٰی یَحۡکُمَ اللّٰہُ ...[5] اللہ کا فیصلہ آنے تک صبر کریں....

ثانیاً ان فیصلوں میں ان سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے اور انبیاء (ع) ایسی باتوں میں معصوم نہیں ہیں تو اس سے لازم آتا ہے کہ انبیاء (ع) بیان احکام میں معصوم نہیں ہیں۔ سبحانك هذا بهتان عظيم۔

لَا یَسۡتَاۡذِنُکَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ اَنۡ یُّجَاہِدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۴۴﴾

۴۴۔ جو لوگ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے ہرگز آپ سے اجازت نہیں مانگیں گے اور اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔

تفسیر آیات

ایمان و نفاق میں تمیز قائم کرنے کے لیے اس آیت میں ایک کسوٹی کا ذکر ہے۔ مؤمن وہ ہے جس

---

[1] ۹ توبة: ۴۷ [2] ۹ توبة: ۴۶ [3] ۵۳ نجم: ۳ [4] المنار ۱۰: ۴۶۵ [5] ۱۰ یونس: ۱۰۹

کے نزدیک اس کا دین، اس کی جان و مال سے زیادہ عزیز ہے۔ لہٰذا وہ محاذ جنگ پر جانے سے دریغ نہیں کرتا اور منافق وہ ہے، جس کے نزدیک مفادات عزیز ہیں۔ دین کا اظہار وہ صرف اس وقت کرتا ہے جب اس کا مفاد اس دین کے ساتھ وابستہ ہو۔ دوسری صورت میں وہ اس دین کے لیے کسی قسم کی قربانی پیش کرنے میں عذریں گھڑتے ہیں۔

وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالۡمُتَّقِیۡنَ: تقویٰ کا ایک اہم پہلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رکاب میں جان و مال کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن اسے کہتے ہیں کہ جب دینی قدریں اس کے دنیاوی مفاد میں نہ ہوں تو دنیا پر دینی قدروں کو ترجیح دے۔

۲۔ مجاہد وہ ہے جو متقی ہو۔

اِنَّمَا یَسۡتَاۡذِنُکَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ ارۡتَابَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ فَہُمۡ فِیۡ رَیۡبِہِمۡ یَتَرَدَّدُوۡنَ﴿۴۵﴾

۴۵۔ ایسی اجازت یقیناً وہی لوگ مانگیں گے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں مبتلا ہیں، پس اس طرح وہ اپنے شک میں بھٹک رہے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَا یَسۡتَاۡذِنُکَ: ان لوگوں کے عدم ایمان کا لازمہ یہ ہے کہ مال و جان سے راہ اسلام میں جہاد کرنے سے کتراتے ہیں۔ وہ اسلام کی حقانیت پر یقین نہیں رکھتے تو وہ اس کا دفاع بھی نہیں کر پائیں گے۔

۲۔ وَ ارۡتَابَتۡ: انسان کا کردار اس کے دل کی کیفیت کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ دل میں ایمان ہے تو کردار میں اس کے تقاضے پورے ہو ہی جاتے ہیں۔ دل میں ایمان نہیں ہے تو اس دل سے ایمان والا کردار ادا نہیں ہوتا۔

اہم نکات

۱۔ منافق دینی قدروں پر دنیاوی مفاد کو ترجیح دیتا ہے اور جہاں دنیاوی مفادات کا احتمال ہو، وہاں یہ لوگ تردد میں رہتے ہیں۔

وَلَوۡ اَرَادُوا الۡخُرُوۡجَ لَاَعَدُّوۡا لَہٗ

۴۶۔ اور اگر وہ نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کے لیے

عُدَّةً وَّلٰكِنۡ كَرِهَ اللّٰهُ انۡۢبِعَاثَهُمۡ فَثَبَّطَهُمۡ وَ قِيۡلَ اقۡعُدُوۡا مَعَ الۡقٰعِدِيۡنَ ﴿۴۶﴾

سامان کی کچھ تیاری کرتے لیکن اللہ کو ان کا اٹھنا ناپسند تھا اس لیے اس نے (ان سے توفیق سلب کر کے) انہیں ہلنے نہ دیا اور کہدیا گیا: تم بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔

تشریح کلمات

ثبط: (ث، ب ،ط) روک دینا۔ ہلنے نہ دینا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَوۡ اَرَادُوا الۡخُرُوۡجَ: کسی کام کا ارادہ ہوتا ہے تو اس کے آثار سامنے آتے ہیں۔ جب ان میں جہاد کا ارادہ ہی نہیں تھا تو ان سے جہاد کے لیے کسی قسم کی تیاری عمل میں نہیں آئی۔

۲۔ وَّلٰكِنۡ كَرِهَ اللّٰهُ: جب ان لوگوں میں جہاد میں شرکت کا سرے سے کوئی شوق نہ تھا تو اللہ کو بھی ان کی طرف سے جہاد میں بے دلی اور کراہت کے ساتھ شرکت کرنا پسند نہیں تھا۔ اس لیے اللہ نے ان سے توفیق کے سارے راستے بند کر دیے، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے سامنے بدتوفیقی کے سارے راستے کھل گئے اور رسولؐ کی آواز کی مخالف سمت کی آواز آئی: بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ یہ آواز ان کے لیے آشنا تھی، اس لیے اس کی تعمیل ہوگئی۔

اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ان کا جہاد میں شرکت کرنا اللہ کو پسند ہی نہیں تھا۔ یہ ناپسندیدگی جہاد سے ان کی کراہت کی وجہ سے تھی۔

۳۔ قِيۡلَ اقۡعُدُوۡا: ان سے کہا گیا: جہاد نہ کرنے اور بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ یہ کوئی حکم نہیں ہے کہ سابقہ آیہ اِنۡفِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ''راہ خدا میں جہاد کے لیے نکلو'' کے ساتھ متضاد ہو جائے بلکہ ان کے خلاف ایک تہدیدی جملہ ہے۔ جیسے ملحدین سے فرمایا:

اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ۝ [۱]

جو چاہو کرو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے یقیناً خوب دیکھنے والا ہے۔

اہم نکات

۱۔ حرکات وسکنات سے ارادوں کا کھوج لگایا جاسکتا ہے: وَلَوۡ اَرَادُوا الۡخُرُوۡجَ لَاَعَدُّوۡا لَهٗ ....۔

---

[۱] ۴۱ حٰم سجدہ: ۴۰

لَوۡ خَرَجُوۡا فِیۡکُمۡ مَّا زَادُوۡکُمۡ اِلَّا خَبَالًا وَّ لَاۡاَوۡضَعُوۡا خِلٰلَکُمۡ یَبۡغُوۡنَکُمُ الۡفِتۡنَۃَ ۚ وَ فِیۡکُمۡ سَمّٰعُوۡنَ لَہُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۷﴾

۴۷۔اور اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے بھی تو تمہارے لیے صرف خرابی میں اضافہ کرتے اور تمہارے درمیان فتنہ کھڑا کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے اور تمہارے درمیان ان کے جاسوس (اب بھی) موجود ہیں اور اللہ ظالموں کا حال خوب جانتا ہے۔

تشریح کلمات

خَبَالًا: (خ ب ل) الخبل، الخبال اس فساد یا خرابی کو کہتے ہیں جو کسی جاندار کو لاحق ہو کر اس میں اضطراب اور بے چینی پیدا کر دے۔ جیسے جنون۔

اَوۡضَعُوۡا (و ض ع) دوڑ دھوپ، تیز رفتاری۔

تفسیر آیات

۱۔ لَوۡ خَرَجُوۡا فِیۡکُمۡ : اگر یہ منافقین اور ضعیف الایمان اسلامی لشکر میں شامل ہوتے تو عسکری نظم و ضبط میں خلل ڈالتے۔ جیسا کہ جنگ احد میں ان لوگوں نے راستے سے واپس ہو کر اسلامی لشکر میں بدنظمی پھیلائی اور جنگ حنین میں ان لوگوں اور مکہ کے طلقاء نے مل کر لشکر اسلام کو شکست سے دوچار کر دیا۔ لہٰذا درحقیقت مصلحت تو اسی میں تھی کہ یہ لوگ جنگ میں شرکت نہ کریں۔

رسول کریمؐ کی اجازت کو اجتہادی غلطی قرار دینے والے اس آیت کے ذیل میں کہتے ہیں: ثبت هذه الایة انه مبنی علی اصل صحیح۔[1] اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ رسولؐ کا اجتہاد ایک صحیح بنیاد پر استوار تھا کہ ان کی شرکت میں کوئی مصلحت نہ تھی۔ مگر وہ اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ حضورؐ کو علم نہ تھا کہ اجازت نہ دینے کی صورت میں بھی وہ نکلنے والے نہ تھے۔

جبکہ تاریخ و حدیث سے ہٹ کر صرف قرآنی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ کو ان لوگوں کے بارے میں علم تھا۔ چنانچہ سابقہ آیت میں فرمایا: وَلَوۡ اَرَادُوا الۡخُرُوۡجَ لَاَعَدُّوۡا لَہٗ عُدَّۃً .... اگر وہ نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کے لیے سامان تیار کرتے۔ یہ ایسی محسوس باتیں ہیں جو مدینہ کے ایک مختصر معاشرہ میں سب کے لیے عیاں تھیں۔ جب کہ دوسری جگہ مدینہ میں نازل ہونے والے سورۂ محمدؐ میں فرمایا: وَلَتَعۡرِفَنَّہُمۡ فِیۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ ....[2] اور آپ ان لوگوں کو ان کے طرز کلام سے ضرور پہچان لیں گے۔

---

[1] المنار ۱۰: ۴۷۳ [2] ۴۷ محمد: ۳۰

۲۔ وَفِیۡکُمۡ سَمّٰعُوۡنَ لَهُمۡ : اس جملے کی دو شرحیں بیان کی جاتی ہیں: ایک یہ کہ تم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ان منافقین کی زیادہ سنتے ہیں۔ یعنی ان کی باتوں میں آنے والے لوگ تمہارے اندر موجود ہیں۔ دوسری یہ کہ تمہارے اندر ان کے جاسوس موجود ہیں۔ یہی دوسری شرح قرین حق معلوم ہوتی ہے کیونکہ لغت اور خود قرآن میں بھی صیغہ سمّاع جاسوسی کے لیے استعمال ہوا ہے: سَمّٰعُوۡنَ لِقَوۡمٍ اٰخَرِیۡنَ ۙ لَمۡ یَاۡتُوۡکَ ...[1]

دشمن کی طرف سے دو اہم خطروں کو عسکری اعتبار سے اہم سمجھا جانا چاہیے:

الف: وہ ہماری صفوں میں داخل ہو کر ہمیں اندرونی خلفشار سے دو چار کرتے ہیں جنہیں آج کل کی اصطلاح میں ففتھ کالم کہتے ہیں: لَوۡ خَرَجُوۡا فِیۡکُمۡ مَّا زَادُوۡکُمۡ اِلَّا خَبَالًا ...۔

ب: وہ اپنے جاسوسوں کے ذریعے ہمارے راز چراتے اور ہمارے کمزور نقطے تلاش کرتے ہیں: وَفِیۡکُمۡ سَمّٰعُوۡنَ ...۔

لَقَدِ ابۡتَغَوُا الۡفِتۡنَۃَ مِنۡ قَبۡلُ وَقَلَّبُوۡا لَکَ الۡاُمُوۡرَ حَتّٰی جَآءَ الۡحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمۡرُ اللّٰهِ وَهُمۡ کٰرِهُوۡنَ ﴿۴۸﴾

۴۸۔ یہ لوگ پہلے بھی فتنہ انگیزی کی کوشش کرتے رہے ہیں اور آپؐ کے لیے بہت سی باتوں میں الٹ پھیر بھی کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ حق آ پہنچا اور اللہ کا فیصلہ غالب ہوا اور وہ برا مانتے رہ گئے۔

تفسیر آیات

اس سے پہلے وہ غزوۂ احد میں فتنہ انگیزی کر چکے ہیں۔ چنانچہ عبد اللہ بن ابی لشکر اسلام کے ایک تہائی کو لے کر راستے سے واپس ہو گئے، جس سے اوس و خزرج کے بعض قبائل بھی بددل ہو کر واپس جانے والے تھے مگر اللہ نے ان کو ہدایت دی اور منافقین کے دھوکے میں نہیں آئے اور اللہ کا فیصلہ غالب آیا۔

بعض کے نزدیک اس فتنہ انگیزی سے مراد وہ بارہ منافقین ہیں جنہوں نے جنگ تبوک کے موقع پر لیلۃ العقبۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کی سازش کی تھی۔

اہم نکات

۱۔ صفوں میں داخل ہو کر الٹ پھیر کرنا دشمن کا زیادہ خطرناک حربہ ہے: وَقَلَّبُوۡا لَکَ الۡاُمُوۡرَ ...۔

----

[1] ۵ المائدۃ: ۴۱

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ ائۡذَنۡ لِّیۡ وَ لَا تَفۡتِنِّیۡ ؕ اَلَا فِی الۡفِتۡنَۃِ سَقَطُوۡا ؕ وَ اِنَّ جَہَنَّمَ لَمُحِیۡطَۃٌۢ بِالۡکٰفِرِیۡنَ﴿۴۹﴾

۴۹۔ ان میں کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے: مجھے اجازت دیجیے اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالیے، دیکھو یہ فتنے میں پڑ چکے ہیں اور جہنم نے ان کافروں کو یقیناً گھیر رکھا ہے۔

تفسیر آیات

کچھ منافقین نے یہ عذر تراش لیا کہ میں اگر اس جنگ میں شریک ہو جاؤں تو ممکن ہے مال غنیمت سے لگاؤ مجھے گمراہ کر دے۔ بعض روایات کے مطابق منافق نے کہا تھا کہ رومی عورتیں خوش شکلی میں مشہور ہیں، ممکن ہے میں ان پر فریفتہ ہو کر گمراہ ہو جاؤں۔ آیت میں جواب دیا گیا کہ اس قسم کے فتنے میں تو تم گرفتار ہو چکے ہو۔ جہاد میں شرکت کے لیے عذر تراش لینا سب سے بڑا فتنہ ہے اور آخرت میں آتش جہنم کے گھیرے میں آنا بہت بڑا فتنہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ معصیت کار اپنی نافرمانی کے لیے کوئی عذر تراش لیا کرتا ہے۔

اِنۡ تُصِبۡکَ حَسَنَۃٌ تَسُؤۡہُمۡ ۚ وَ اِنۡ تُصِبۡکَ مُصِیۡبَۃٌ یَّقُوۡلُوۡا قَدۡ اَخَذۡنَاۤ اَمۡرَنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ یَتَوَلَّوۡا وَّ ہُمۡ فَرِحُوۡنَ﴿۵۰﴾

۵۰۔ اگر آپ کا بھلا ہوتا ہے تو انہیں دکھ ہوتا ہے اور اگر آپ پر کوئی مصیبت آئے تو کہتے ہیں: ہم نے پہلے ہی سے اپنا معاملہ درست کر رکھا ہے اور خوشیاں مناتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں۔

تفسیر آیات

اے رسول آپؐ کو فتح و نصرت میسر آئے تو ان منافقین کو دکھ ہوتا ہے اور کبھی شکست و ناکامی سے دوچار ہونا پڑے تو یہ کہتے ہیں ہم نے پہلے ہی احتیاطی پیش بندی کر رکھی تھی اور مسلمانوں کی ناکامی اور اپنی خوش تدبیری پر خوشیاں مناتے ہیں۔

الدر المنثور میں آیا ہے کہ جو منافقین جنگ میں شرکت نہ کر کے مدینہ رہ گئے تھے ان لوگوں نے یہ خبر پھیلا دی کہ محمدؐ اور ان کے ساتھی اس سفر میں تھک ہار کر ہلاک ہو گئے ہیں۔ بعد میں جب رسولؐ اور ساتھیوں کی خیریت کی خبر پہنچی تو یہ خبر ان کو بری لگی۔

قُلۡ لَّنۡ یُّصِیۡبَنَاۤ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا ۚ ہُوَ مَوۡلٰىنَا ۚ وَ عَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۱﴾

۵۱۔ کہد یجیے: اللہ نے ہمارے لیے جو مقدر فرمایا ہے اس کے سوا ہمیں کوئی حادثہ ہرگز پیش نہیں آتا، وہی ہمارا کارساز ہے اور مومنین کو چاہیے کہ اللہ پر بھروسہ کریں۔

تفسیر آیات

مؤمن کا مولا اللہ ہے۔ مؤمن پر اپنے مولا یعنی اللہ کی حاکمیت ہے۔ ایسا حاکم جو اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ہے۔ لہٰذا لازماً مؤمن اپنے مہربان مولا کے فیصلے پر ہی بھروسہ کرتا ہے۔ دیگر ظاہری اور وقتی علل و اسباب، کامیابی و ناکامی پر نہیں۔ نادان دشمن اسے ناکامی سمجھ کر خوش ہوتا ہے کیونکہ منافق کی نگاہ محسوسات تک محدود ہوتی ہے، جب کہ مؤمن کی نگاہ ان تمام محسوسات کو چیرتے ہوئے اپنے مولا کے فیصلے پر رکتی ہے۔

مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا: انسان کو پیش آنے والی شدائد و مشکلات اور حوادث دو قسم کی ہیں: اول یہ کہ انسان اپنی شامت اعمال کی وجہ سے مصائب سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں فرمایا:

وَمَاۤ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ ...[1]

اور تم پر جو مصیبت آتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آتی ہے۔

دوم یہ کہ انسان کو مشکلات و مصائب اس لیے پیش آتے ہیں کہ اس نے ایک ذمہ داری کو قبول کیا ہے اور راہ حق میں جہاد کرنے کو اختیار کیا ہے۔ اس راہ میں پیش آنے والی مصیبتوں سے دنیا میں انسان کو ارتقا ملتا ہے اور آخرت میں خوشنودی رب۔ یہ مصیبتیں وہ ہیں جن کو اللہ نے اپنی تکوینی کتاب میں ثبت کر رکھا ہے کہ جو میری راہ میں جہاد کرے گا اسے مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جو اللہ کے ہاں مقام حاصل کرنا چاہے گا، اسے مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔

اس آیت میں اُن مشکلات کی طرف اشارہ ہے جو راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کو پیش آتی ہیں۔

اہم نکات

۱۔ جس کے ہاتھ میں تمام فیصلے ہیں، اسی کو مولا کہتے ہیں یا جس کو وہ مولا بنائے۔

قُلۡ ہَلۡ تَرَبَّصُوۡنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحۡدَی الۡحُسۡنَیَیۡنِ ؕ وَ نَحۡنُ نَتَرَبَّصُ

۵۲۔ کہد یجیے: کیا تم ہمارے بارے میں دو بھلائیوں (فتح یا شہادت) میں سے ایک ہی کے منتظر ہو اور ہم تمہارے بارے میں اس بات کے منتظر ہیں

----

[1] ۴۲ شوریٰ: ۳۰

بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

کہ اللہ خود اپنے پاس سے تمہیں عذاب دے یا ہمارے ہاتھوں عذاب دلوائے، پس اب تم بھی انتظار کرو، ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ: دو موقفوں، دو نظریوں اور دو کائناتی تصورات کا موازنہ ہے۔ ایک موقف کے مطابق مجاہد کے لیے ناکامی کا تصور نہیں ہے۔ اگر فتح ملتی ہے تو کامیابی کیونکہ اس میں ایک ملت کے اپنے ہدف کا حصول ہے اور اگر شہادت نصیب ہوتی ہے تو کامیابی کیونکہ اس میں افراد کی عند اللہ سرخروئی بھی ہے اور ملت کی کامرانی کے لیے ان شہیدوں کا خون کام آیا ہے۔

۲۔ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ: دوسرے موقف کے مطابق کامیابی کا تصور یہ ہے: اگر وہ غالب آتے ہیں تو چند روز وہ زندہ رہ سکیں گے لیکن کل عذاب الٰہی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اگر وہ مارے گئے تو بھی وہ مؤمنین کے ہاتھوں عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔

لہٰذا تم ہماری سعادت کا انتظار کرو ہم تمہاری بدبختی کا انتظار کرتے ہیں۔ انتظار دونوں کو ہے۔ ولی این کجا و آں کجا.

اہم نکات

۱۔ مؤمن کے لیے ناکامی اور منافق کے لیے کامیابی کا تصور نہیں ہے۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾

۵۳۔ کہدیجیے! تم اپنا مال بخوشی خرچ کرو یا بادل نخواستہ، تم سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ تم فاسق قوم ہو۔

وَ مَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ

۵۴۔ اور ان کے خرچ کیے ہوئے مال کی قبولیت کی راہ میں بس یہی رکاوٹ ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا ہے اور نماز کے لیے آتے ہیں تو کاہلی کے ساتھ اور راہ خدا

كٰرِهُوْنَ﴿۵۴﴾ میں تو بادل نخواستہ ہی خرچ کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ قُلۡ اَنۡفِقُوۡا طَوۡعًا اَوۡ کَرۡہًا: راہ خدا میں خرچ کرنے کا عمل اپنی جگہ ایک نیک عمل ہے لیکن یہاں عمل کا نیک ہونا کافی نہیں، عامل کا نیک ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر عمل کرنے والا حسن نہیں رکھتا تو صرف عمل کا حسن فائدہ مند نہیں ہے۔

۲۔ وَ مَا مَنَعَہُمۡ اَنۡ تُقۡبَلَ: اگر کوئی فرزند باپ کو باپ ہی نہیں مانتا تو باپ ایسے بیٹے کی کسی نیکی کو قبول نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ اللہ اور رسولؐ کو مانتے ہی نہیں۔ اس کی علامت یہ ہے کہ وہ نماز کو ایک امر مجبوری کے طور پر پڑھتے ہیں اور خرچ بھی بڑی کراہت کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس بات سے ان لوگوں کے اس سوال کا جواب بھی آ گیا کہ جو لوگ انسانیت کے لیے اتنی بڑی خدمات انجام دیتے ہیں، ان کو ثواب کیوں نہیں ملتا۔ اگرچہ وہ مسلم نہیں ہیں لیکن ان کی خدمات بہت گرانقدر ہیں۔

اہم نکات

۱۔ قبول اعمال کے لیے فعل کے حسن کے ساتھ فاعل کا حسن بھی ضروری ہے: لَّنۡ یُّتَقَبَّلَ مِنۡکُمۡ ..

۲۔ کفر کی حالت میں عمل حبط ہو جاتا ہے۔

فَلَا تُعۡجِبۡکَ اَمۡوَالُہُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُہُمۡ ؕ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَہُمۡ بِہَا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ تَزۡہَقَ اَنۡفُسُہُمۡ وَ ہُمۡ کٰفِرُوۡنَ﴿۵۵﴾

۵۵۔ لہٰذا ان کے مال اور اولاد کہیں آپ کو فریفتہ نہ کریں، اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ ان چیزوں سے انہیں دنیاوی زندگی میں بھی عذاب دے اور کفر کی حالت میں ہی ان کی جان نکلے ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ فَلَا تُعۡجِبۡکَ اَمۡوَالُہُمۡ: ہم کئی بار اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ اللہ کا طرز خطاب ایاك اعنی فاسمعی یا جارة۔ سر دلبراں در حدیث دیگراں کے طریق پر ہے۔ خطاب اپنے حبیبؐ سے ہے اور سمجھانا دوسروں کو مقصود ہے کہ دشمنوں کی دولت اور اولاد کی کثرت تمہیں کہیں فریفتہ نہ کرے۔ غیر مؤمن کے پاس اگر مال و اولاد کی فراوانی ہے تو اس کے دو برے نتائج ہوتے ہیں۔

i۔ لِیُعَذِّبَہُمۡ: دولت غیر مؤمن سے امن و سکون سلب کرتی ہے اور ہمیشہ اضطراب اور پریشانی

میں رہتا ہے۔ لوگ اسے خوشحال سمجھتے ہیں، لیکن اندر سے عذاب میں مبتلا ہوتا ہے: لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا...۔

ii۔ وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ : دولت غیر مؤمن کو نا قابل ہدایت بناتی ہے اور وہ کفر کی ہی حالت میں جان دیتا ہے: وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ...۔

اہم نکات

۱۔ دولت مؤمن کے لیے نعمت، غیر مؤمن کے لیے نقمت ہے۔

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾

۵۶۔ وہ اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تمہاری جماعت میں شامل ہیں، حالانکہ وہ تمہاری جماعت میں شامل نہیں ہیں، دراصل وہ بزدل لوگ ہیں۔

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾

۵۷۔ اگر انہیں کوئی پناہ گاہ یا غار یا سر چھپانے کی جگہ میسر آ جائے تو وہ اس کی طرف لپکتے ہوئے جائیں گے۔

تشریح کلمات

يَجْمَحُوْنَ: (ج م ح) جمح گھوڑے کا دوڑتے ہوئے جانا اور سوار کے قابو میں نہ رہنا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَيَحْلِفُوْنَ: اگر کسی جماعت میں شامل ہونے کے لیے کسی کے پاس کردار کا ثبوت نہ ہو تو وہ قسموں کا سہارا لیا کرتا ہے۔ منافقین کے پاس مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہونے پر کردار کا ثبوت تو تھا نہیں، لہٰذا وہ قسم کھا کر ثبوت پیش کرنا چاہتے تھے۔

مدینے کے تمام منافقین مالدار تھے، اس وجہ سے اس نئے دین کے لیے جو مالی و جانی قربانیاں پیش کرنا پڑتی تھیں اس سے وہ سخت پریشان رہتے اور ہمیشہ راہ فرار سوچتے تھے۔

یا مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کی جگہ پر فرار کا کوئی راستہ مل جاتا تو وہ جائے فرار کی طرف لپک جاتے۔

۲۔ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً : وہ جنگ سے اس قدر خائف ہیں کہ جنگ سے بچنے کے لیے وہ کسی

پناہ گاہ یا غار میں یا کسی سر چھپانے کی جگہ چھپنے کے لیے دوڑنے کو تیار ہیں۔

اہم نکات

۱۔ جس کے مؤقف میں نفاق ہو وہ ڈرپوک ہوا کرتا ہے: وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ....

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَاۤ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾

۵۸۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو صدقات (کی تقسیم) میں آپ کو طعنہ دیتے ہیں، پھر اگر اس میں سے انہیں کچھ دے دیا جائے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر اس میں سے کچھ نہ دیا جائے تو بگڑ جاتے ہیں۔

تشریح کلمات

یلمز: (ل م ز) لَمز کے معنی کسی کی غیبت، عیب گوئی کرنے کے ہیں۔

تفسیر آیات

نفاق کی ایک علامت یہ ہے کہ ذاتی مفاد کو محور قرار دیتے ہیں۔ اگر ذاتی مفاد حاصل ہوا تو یہ عدل و انصاف ہے ورنہ عدل نہیں ہے۔ اسی سلسلے میں منافقین رسول کریمؐ کی عیب جوئی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔

چنانچہ ابو سعید خدری راوی ہے:

تقسیم زکوٰۃ و غنیمت میں ایک بار ذوالخویصرہ تمیمی نے آ کر کہا: یا رسول اللہؐ انصاف سے کام لیں۔ حضورؐ نے فرمایا: افسوس ہے تجھ پر کہ میں انصاف نہ کروں تو کون کرے گا۔ جس پر حضرت عمر نے کہا: رسول اللہؐ! میں اس کی گردن مار دوں؟ حضورؐ نے فرمایا: اسے رہنے دو۔ اس کے اور بھی ساتھی ہیں۔ تم اپنی نمازوں کو ان کی نمازوں کے مقابلے میں اور اپنے روزوں کو ان کے روزوں کے مقابلے میں حقیر سمجھو گے۔ یہ لوگ دین سے ایسے خارج ہو جائیں گے جیسے تیر کمان سے.... ان کی نشانی وہ سیاہ آدمی ہے جس کی چھاتی عورتوں کی چھاتی کی طرح ہو گی یا گوشت کے لوتھڑے کی طرح، لوگوں میں تفرقہ کے وقت یہ لوگ نمودار ہوں گے۔

ابو سعید کہتے ہیں:

میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہؐ سے یہ فرمان سنا تھا اور اس کی بھی گواہی دیتا ہوں کہ علی علیہ السلام نے جب انہیں (نہروان میں) قتل کیا اور میں ان کے ہمراہ تھا تو اسی شخص کو سامنے لایا گیا جس کے اوصاف رسول اللہؐ نے بیان فرمائے تھے۔[1]

اہم نکات

۱۔ منافق کی خوشنودی کی بنیاد مالی مفادات ہیں: فَاِنۡ اُعۡطُوۡا مِنۡہَا رَضُوۡا ....

۲۔ اگر نظریہ و عقیدہ ساتھ نہیں ہے تو دولت کی طمع لامحدود ہوتی ہے: وَ اِنۡ لَّمۡ یُعۡطَوۡا مِنۡہَاۤ اِذَا ہُمۡ یَسۡخَطُوۡنَ۔

۳۔ عصر رسولؐ کے منافق، عصر علیؑ کے خارجی اور آج کل کے ناصبی ہیں۔

وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ ۙ وَ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰہُ سَیُؤۡتِیۡنَا اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ رَسُوۡلُہٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَی اللّٰہِ رٰغِبُوۡنَ ﴿۵۹﴾

۵۹۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو کچھ انہیں دیا ہے وہ اس پر راضی ہو جاتے اور کہتے: ہمارے لیے اللہ کافی ہے، عنقریب اللہ اپنے فضل سے ہمیں بہت کچھ دے گا اور اس کا رسول بھی، ہم اللہ سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔

تفسیر آیات

مدینے کے محدود معاشرے میں عربوں نے اتنی دولت ایک جگہ نہیں دیکھی تھی جو زکوٰۃ کے فنڈ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خزانے میں جمع ہوتی تھی۔ منافق اس دولت کو مسلمانوں میں تقسیم ہوتے دیکھ نہیں سکتے تھے اور جل کر حضورؐ کو مطعون کرنے کی کوشش کرتے اور جو کچھ ان کے حصہ میں آتا اس پر قانع بھی نہیں رہتے تھے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ زکوٰۃ سے منافقین کو بھی حصہ ملا کرتا تھا مگر وہ صرف مادی نگاہ سے اس حصے کو دیکھتے تھے تو اس پر راضی نہیں ہوتے تھے، نہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے کسی فضل و کرم پر بھروسہ رکھتے تھے۔

اس آیت میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ عنایت کرنے اور دینے میں اللہ کے بعد رسولؐ کا بھی ذکر آیا ہے۔

وَلَوۡ اَنَّہُمۡ رَضُوۡا: ایمان کے آثار میں سے ایک اللہ اور رسولؐ کے فیصلوں پر راضی ہونا ہے۔

---

[1] صحیح البخاری کتاب المناقب

وَقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰہُ: یہ موقف اختیار کرنا ہے کہ ہر مشکل کے لیے اللہ کافی ہے۔
سَیُؤۡتِیۡنَا اللّٰہُ: تیسرا یہ اللہ اور رسول کی عنایتوں کی امید رکھنا ہے۔
ایک بار امام ابوحنیفہ نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ساتھ کھانا کھایا۔ جب کھانا کھا چکے تو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

> الحمد للہ رب العالمین۔ اللّٰھم ھذا منك و من رسولك۔ حمد و ثنا کامل خدائے رب العالمین کے لیے۔ اے اللہ! یہ روزی تیری اور تیرے رسولؐ کی طرف سے ہے۔ تو ابوحنفیہ نے کہا ہے: ابا عبد اللہ آپ نے شرک کا ارتکاب کیا تو آپؑ نے فرمایا: افسوس کا مقام ہے، اللہ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: وَمَا نَقَمُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ اَغۡنٰہُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ مِنۡ فَضۡلِہٖ[1] ان کو اس بات پر غصہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ ۙ وَ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰہُ سَیُؤۡتِیۡنَا اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ رَسُوۡلُہٗۤ ....ابوحنیفہ نے تعجب کے لہجے میں کہا: گویا کہ یہ آیت قرآن میں میں نے پڑھی ہی نہیں۔[2]

اہم نکات

۱۔ اللہ کا فضل جب رسولؐ کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے تو اس کا ذکر کرنا، نہ صرف یہ کہ شرک نہیں بلکہ اس کا ذکر نہ کرنا کفران نعمت ہے۔
۲۔ مؤمن فضل خدا اور رسولؐ پر بھروسہ رکھتا ہے۔
۳۔ کسی نعمت کے موقع پر یہ کہنا درست ہے: بفضل خدا و رسولؐ۔
۴۔ اللہ اور رسولؐ کے فیصلے پر راضی ہونا آداب بندگی کی سب سے پہلی اہم بات ہے: وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ رَضُوۡا....

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ الۡعٰمِلِیۡنَ عَلَیۡہَا وَ الۡمُؤَلَّفَۃِ قُلُوۡبُہُمۡ وَ فِی الرِّقَابِ وَ الۡغٰرِمِیۡنَ	۶۰۔ یہ صدقات تو صرف فقیروں، مساکین اور صدقات کے کام کرنے والوں کے لیے ہیں اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مقصود ہو

---
[1] ۹ توبہ ۷۴
[2] بحار الانوار ۱۰: ۲۱۶

وَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ ؕ فَرِیۡضَۃً مِّنَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۶۰﴾

اور غلاموں کی آزادی اور قرضداروں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے ایک مقرر حکم ہے اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

اسلامی مالی نظام کا ایک باب: تقسیم زکوۃ ہے۔ کسی مالی نظام کے عادلانہ ہونے کا دار و مدار تقسیم کے عدل و انصاف پر ہے۔ جب منافقین اور ضعیف الایمان مسلمانوں نے خود رسالتمآب ؐ کو زکوۃ و خیرات کی تقسیم کے بارے میں مطعون کیا تو اس آیۂ شریفہ کے ذریعے تقسیم زکوۃ کا یہ دائمی دستور نازل ہوا:

i۔ فقراء فقر (ف ق ر) احتیاج کے معنی میں ہے۔ جو اپنے لوازم زندگی کے لیے خود کفیل نہ ہو بلکہ دوسروں کا محتاج ہو۔ لہٰذا فقراء میں وہ حاجت مند شامل ہیں جو اپنی زندگی کو خود چلا سکتے ہیں مگر دوسروں کی طرف سے مدد اور سہارا مل جائے تو۔

ii۔ مساکین۔ مسکنت (س ك ن) میں درماندگی اور ذلت و خواری کا مفہوم ہے۔ یعنی حاجت مندی کے علاوہ تہی دستی کا یہ حال ہے کہ اپنی آبرومندی اور عزت نفس سے بھی درگزر کر کے دست سوال دراز کرنے پر مجبور ہے۔ اسے مسکین کہتے ہیں۔ جیسے نابینا، معذور، مفلوج وغیرہ۔

iii۔ وَ الۡعٰمِلِیۡنَ: وہ لوگ جو زکوۃ وصول کرنے، اس کی حفاظت کرنے، اس کا حساب کتاب لکھنے اور مستحقین تک تقسیم کے ذریعے پہنچانے کے لیے حکومت کی طرف سے متعین ہوئے ہوں۔ ایسے ملازمین کی تنخواہیں اسی صدقات کی مد سے دی جاتی ہیں خواہ وہ فقیر و مسکین نہ ہوں۔

یہ بات ہم مسئلہ خمس میں بیان کر چکے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، بنی ہاشم پر جیسا کہ فقراء اور مساکین کی مدات سے زکوۃ حرام ہے، اسی طرح عاملین کی مد سے بھی حرام ہے۔ یعنی بنی ہاشم کا کوئی فرد جمع زکوۃ میں ملازمت اختیار کر لے تو وہ یہ کام بلا معاوضہ کر سکتا ہے لیکن وہ زکوۃ سے اپنی تنخواہ نہیں لے سکتا۔

iv۔ وَ الۡمُؤَلَّفَۃِ قُلُوۡبُہُمۡ: تالیف قلب، یعنی دل موہ لینا یا مخالفین اسلام کی آتش عداوت کو ٹھنڈا کرنا۔ اس غرض کے لیے بھی زکوۃ کی مد سے ان لوگوں پر مال خرچ کیا جائے گا۔

اس بات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ زمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی یہ مد باقی رہی یا نہیں۔ امامیہ کا مؤقف یہ ہے کہ امام عادل کے موجود ہونے کی صورت میں یہ مد باقی ہے۔ امام ابو حنفیہ کا نظریہ یہ ہے کہ یہ مد حضرات ابوبکر و عمر کے زمانے سے ساقط ہو گئی ہے اور اس پر دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ

حضرت ابوبکر نے اس مد سے کچھ لوگوں کو ایک زمین کا قطعہ تحریراً دے دیا، دیگر اصحاب نے اس تحریر پر اپنی گواہیاں ثبت کر دیں لیکن جب یہ لوگ حضرت عمر کے پاس گواہی لینے کے لیے گئے تو انہوں نے اس تحریر کو پھاڑ دیا اور کہا اب اللہ نے اسلام کو عزت و شوکت سے نوازا ہے۔ جاؤ! تمہارے ساتھ تالیف قلب کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر وہ حضرت ابوبکر کے پاس گئے اور کہا: خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟

اس قسم کے طرز استدلال پر جناب مولانا فضل گیلانی صاحب نے درست گرفت کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

> لیکن اس کا یہ مطلب قرار دینا کہ ہر شخص کے لیے حضرت عمر نے اس مد کو ساقط کر دیا، میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ قرآن نے جس مصرف کو منصوص کیا ہے، اس کو اولاً حضرت عمر منسوخ ہی کیسے کر سکتے ہیں نیز ایک ایسی واحد خبر سے قرآن کے ایک قانون پر خط نسخ نہیں پھیرا جا سکتا۔ [1]

v۔ وَ فِی الرِّقَابِ: گردنیں چھڑانے، یعنی غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ غلام نے اپنے مالک سے یہ معاملہ کیا کہ مقررہ رقم کی ادائیگی کی صورت میں اسے آزادی مل جائے اور غلام مقررہ رقم کی ادائیگی پر قادر نہ ہو تو زکوٰۃ کی مد سے اس کی آزادی کی قیمت ادا کی جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک غلام اپنے مالک کی طرف سے ظلم و زیادتی کا شکار ہے۔ زکوٰۃ کی مد سے اسے آزاد کرایا جائے گا۔

vi۔ وَالۡغٰرِمِیۡنَ: وہ لوگ جو اپنے قرض کی ادائیگی سے عاجز ہوں۔ اگر یہ قرض کسی معصیت اور اسراف کے لیے نہ لیا گیا ہو تو زکوٰۃ کی مد سے یہ قرض ادا کیا جائے گا۔

vii۔ وَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ: اس میں جہاد سے لے کر وہ تمام امور شامل ہیں جن میں عام مسلمانوں کی دینی و دنیوی مصلحتیں ہیں۔ جیسے پل بنانا، راستے بنانا وغیرہ۔

viii۔ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ: مسافر اگرچہ اپنے گھر میں مالدار ہو، حالت سفر میں اگر زاد راہ ختم ہونے کی وجہ سے وہ محتاج ہو تو اس کو زکوٰۃ سے زاد راہ دیا جائے گا۔

اہم نکات

۱۔ اسلام کا مالی نظام وہ واحد نظام ہے جس میں مقروض کے لیے ایک مد مقرر کیا ہے۔

وَمِنۡہُمُ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ النَّبِیَّ ۶۱۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نبی کو

---

[1] تفسیر دریابادی ص ۴۱۰

وَيَقُوْلُوْنَ هُوَاُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍلَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۱﴾	اذیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ کانوں کے کچے ہیں، کہد یجیے وہ تمہاری بہتری کے لیے کان دے کر سنتا ہے، اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور مؤمنوں کے لیے تصدیق کرتا ہے اور تم میں سے جو ایمان لائے ہیں ان کے لیے رحمت ہیں اور جو لوگ اللہ کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تشریح کلمات

اُذُنٌ: اذن کے معنی کان کے ہیں اور استعارہ کے طور پر ہر اس شخص پر اُذُنٌ بولا جاتا ہے جو ہر ایک کی بات سن کر اسے مان لیتا ہو۔

تفسیر آیات

۱۔ وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ: رسولؐ کے اخلاق کریمانہ میں ایک بات یہ تھی کہ آپؐ ہر ایک کی بات پوری توجہ سے سن لیتے تھے۔ منافق جو صرف ظاہری صورت پر نظر رکھتے تھے، یہ خیال کرتے تھے کہ ہر ایک بات مان لیتے ہیں اور یہ بات سربراہان کے لیے عیب ہے کہ وہ اچھی اور بری باتوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہر ایک کی بات مان لیتے ہیں۔

دوسری بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اہل ایمان چونکہ ان منافقوں کی ہر ناشائستہ بات اور حرکت کو رسول اللہؐ تک پہنچاتے تھے، اس سے منافقین اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کے لیے حضورؐ پر عیب لگاتے تھے کہ آپؐ کان کے کچے ہیں، ہمارے خلاف ہر بات پر یقین کر لیتے ہیں۔

۲۔ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ: یعنی وہ مانتے اس بات کو ہیں جس میں اہل ایمان کی بہتری ہے کہ ہر ایک کی بات توجہ سے سن کر کسی کا راز فاش نہیں کرتے۔ ہر ایک کو اپنی بات کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ اس طرح امت کے لیے کلام و بیان کی آزادی ہے۔ کسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

۳۔ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ: رہا بات ماننے اور اچھی اور بری باتوں میں تمیز کا مسئلہ تو رسول اللہؐ اس سلسلے میں ایک تو اپنے اللہ کو مانتے ہیں، اللہ کی طرف سے جو وحی نازل ہوتی ہے اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کی اتباع کرتے ہیں۔

۴۔ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ: دوسرے وہ ان مؤمنین کی باتوں پر یقین کرتے ہیں جو جانی اور مالی قربانیوں کے ذریعے اپنی سچائی کا ثبوت پیش کر چکے ہیں۔

۵۔ وَرَحۡمَۃٌ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا: اور یہ رسولؐ تم میں سے جو سچے ایمان والے ہیں ان کے لیے رحمت خاص ہے۔ رسولؐ اگرچہ عالمین کے لیے رحمت ہیں، باین معنی پورے عالمین کے لیے رحمت کا ذریعہ بن کر آئے ہیں تاہم اس رحمت سے بھرپور فائدہ اٹھانے والے وہ لوگ ہیں جو خالص الایمان ہیں۔

ایذاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: اس آیت کے آخر میں اسی مناسبت سے ایک عمومی حکم بیان فرمایا: وَالَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰہِ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۔ جو لوگ اللہ کے رسولؐ کو اذیت دیتے ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یعنی جو لوگ سچے دل سے ایمان لاتے ہیں، ان کے لیے رسولؐ رحمت ہیں اور جو لوگ رسولؐ کو اذیت دیتے ہیں، وہ ایمان کے مقابلے میں ہیں۔ اس لیے ان کے لیے وہ چیز ہے جو رحمت کے مقابلے میں ہے یعنی عذاب۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسولؐ کو ایذا دینا کفر ہے خواہ اصطلاحاً وہ کافر نہ بھی کہلائے۔ کیونکہ یہاں وَالَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰہِ، لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ کے مقابلے میں آیا ہے اور ایمان کے مقابلے میں کفر ہی ہوتا ہے۔ یہ امر بھی تسلیم شدہ ہے کہ رسولؐ کی زندگی کے بعد ان کو اذیت دینا بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ زندگی میں اذیت دی ہے۔

لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات کے بعد حضرت فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا و دیگر آل رسولؐ کو اذیت دینا حدیث صحیح کے مطابق رسولؐ کو اذیت دینا ہے۔ صحیح مسلم کتاب فضل الصحابۃ باب فضائل فاطمۃ، صحیح ترمذی باب ماجاء فی فضل فاطمۃ میں آیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

انما فاطمہ بضعۃ منی یؤذینی مایوذیھا۔ فاطمہ میرا ٹکڑا ہے۔ جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔

رسولؐ کی ایذا، جسے بعض مفسرین[1] خفیف ایذا کہتے ہیں، سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجۡہَرُوۡا لَہٗ بِالۡقَوۡلِ کَجَہۡرِ بَعۡضِکُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ○[2]

اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اونچی نہ کرو اور نبی کے ساتھ اونچی آواز سے بات نہ کرو۔ جس طرح تم آپس میں اونچی آواز سے بات کرتے ہو کہیں تمہارے اعمال حبط ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

جس طرح کفر سے ایمان لانے کی صورت میں ایمان، کفر کے گناہوں کے لیے کفارہ بن جاتا ہے اور کفر کے دنوں کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ایمان سے کفر اختیار کرنے یا ایمان کے منافی (جیسے ایذائے رسولؐ) کوئی کام انجام دینے کی صورت میں اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ سورہ محمد آیت ۲۸ میں فرمایا:

---

[1] المنار ۱۰: ۵۲۱　[2] ۴۹ حجرات: ۲

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَاۤ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝

یہ اس لیے کہ انہوں نے اس بات کی پیروی کی جو اللہ کو ناراض کرتی ہے اور اللہ کی خوشنودی سے بیزاری اختیار کرتے ہیں لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال حبط کر دیے۔

اہل ایمان سے خطاب ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ۝ [1]

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلانے پر کھانے کو ترجیح دینے والے کو یہ بد دعا ملی: لا اشبع الله بطنه۔[2] اللہ اس کے شکم کو سیر نہ کرے۔

جب کہ رسول اللہؐ نے ابو رافع غفاری کو لڑکپن کی عمر میں دعا دی۔ اللّٰھم اشبع بطنه۔[3] اے اللہ! اس کا شکم سیر فرما۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکم عدولی سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور رسولؐ کی آواز سے اپنی آواز اونچی کرنے سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں تو وہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے خالی ہاتھ ہر نیکی سے عاری ہو کر پہنچ جائے گا۔ اس سے زیادہ بدنصیبی کیا ہو سکتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ اہل ایمان پر حضورؐ کی شفقت و مہربانی کمال درجہ کی تھی: وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ....

۲۔ مؤمنین کی شہادت مقبول ہے: وَیُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ ....

۳۔ رسول کی ایذا سے ایمان کی نفی ہوتی ہے: وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔

یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِیُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۲﴾

۶۲۔ یہ لوگ تمہیں راضی کرنے کے لیے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہیں کہ انہیں راضی کیا جائے اگر یہ مومن ہیں۔

اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ ﴿۶۳﴾

۶۳۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرتا ہے اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔

---

[1] ۴۷ محمد: ۳۳ [2] سنن ابی داود کتاب الجهاد۔ باب من قال انه یاکل مماسقط [3] صحیح مسلم باب من لعنه النبی۔

تشریح کلمات

يُحَادِدِ: (ح د د) کے معنی مخالفت اور مقابلے کے ہیں۔ اس مخالفت کو یحادّون کہنا یا روکنے کے اعتبار سے ہے یا الحدید کے استعمال کی وجہ سے ہے۔ چونکہ جب مقابلے کے لیے آمادہ ہوتا ہے تو جنگ کے لیے حدید یعنی لوہا استعمال ہوتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ يَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ: منافقین چونکہ گمراہ ہیں اور گمراہ کو پتا نہیں چلتا کہ کون سا عمل اس کے حق میں بہتر ہے۔ وہ عام مسلمانوں کو راضی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں اس طرح ان کا راز فاش نہ ہوگا۔ لوگ ان پر اعتماد کریں گے۔

۲۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَحَقُّ: جب کہ ان کے حق میں بہتری اس میں تھی کہ وہ اللہ اور رسولؐ کو راضی کریں۔

۳۔ اَلَمۡ يَعۡلَمُوۡۤا: مگر وہ اللہ اور رسولؐ کی مخالفت کر کے اپنے زعم میں دوسرا چارہ کار تلاش کر رہے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے: اللہ اور رسولؐ کی مخالفت کے ساتھ جہنم اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۴۔ ذٰلِكَ الۡخِزۡىُ الۡعَظِيۡمُ: ابدی جہنم سے بڑھ کر اور رسوائی نہیں ہوسکتی۔

اہم نکات

۱۔ اللہ اور رسولؐ کی خوشنودی کو چھوڑ کر جو بھی چارہ کار تلاش کیا جائے، اس میں نامرادی ہے۔

يَحۡذَرُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ اَنۡ تُنَزَّلَ عَلَيۡهِمۡ سُوۡرَةٌ تُنَبِّئُهُمۡ بِمَا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ قُلِ اسۡتَهۡزِءُوۡا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخۡرِجٌ مَّا تَحۡذَرُوۡنَ ﴿۶۴﴾

۶۴۔ منافقوں کو یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں ان کے خلاف مسلمانوں پر کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان کے دلوں کے راز فاش کر دے، ان سے کہد یجیے: تم استہزا کیے جاؤ، اللہ یقیناً وہ راز فاش کرنے والا ہے جس کا تمہیں ڈر ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ يَحۡذَرُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ: منافقین، رسولؐ کو سچا تو نہیں کہتے تھے تاہم انہیں گزشتہ چند سالوں میں ایسے اتفاقات پیش آئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے رازوں کا علم ہوا ہے۔ وہ اسے بذریعہ وحی

نہیں بلکہ یہ تصور کرتے تھے کہ رسولؐ کے لوگوں نے کھوج لگا کر یہ باتیں ان کو بتائی ہیں۔ اب غزوۂ تبوک کے سفر کے دوران ان منافقین کو زیادہ خوف لاحق رہتا تھا کہ کہیں ہمارے دل کی باتوں کا ان لوگوں نے کھوج لگا لیا ہو اور محمدؐ انہیں قرآن بنا کر لوگوں میں پیش نہ کریں اور ہم نے آپس میں رسولؐ کا جو استہزا کیا ہے، اسے کہیں برملا نہ کریں۔ اس طرح ہم بے نقاب ہو جائیں گے۔

۲۔ قُلِ اسۡتَہۡزِءُوۡا: کہد یجیے تم اپنا استہزا جاری رکھو۔ ہم تمہارا راز فاش کرتے جائیں گے۔ واضح رہے اسۡتَہۡزِءُوۡا امر ہے اس قسم کے امر کو امر تہدیدی کہتے ہیں۔ یعنی جب دھمکی دینا ہو یا کسی عذاب کی خبر سنانا ہو تو پہلے اس قسم کا امر صادر ہوتا ہے۔

وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ لَیَقُوۡلُنَّ اِنَّمَا کُنَّا نَخُوۡضُ وَ نَلۡعَبُ ؕ قُلۡ اَبِاللّٰہِ وَ اٰیٰتِہٖ وَ رَسُوۡلِہٖ کُنۡتُمۡ تَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۶۵﴾

۶۵۔ اور اگر آپ ان سے دریافت کریں تو وہ ضرور کہیں گے کہ ہم تو صرف مشغلہ اور دل لگی کر رہے تھے کہد یجیے: کیا تم اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول کا مذاق اڑا رہے تھے؟

تشریح کلمات

نَخُوۡضُ: (خ و ض) الخوض کے معنی پانی میں اترنے اور اس کے اندر چلے جانے کے ہیں۔ بطور استعارہ کسی کام میں مشغول رہنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں اس کا زیادہ تر استعمال فضول کاموں میں لگے رہنا پر ہوا ہے۔

تفسیر آیات

مختلف اور متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تضحیک کرتے تھے۔ جب بذریعہ وحی رسولؐ کو اس کی اطلاع ہو جاتی اور ان منافقین سے دریافت کیا جاتا تو وہ جو جواب دیتے اس جواب میں بھی اللہ، اس کی آیتوں اور رسول اسلامؐ کا مذاق اڑاتے تھے۔ یعنی یہ کہنا کہ ہم خوش گپی میں یہ باتیں کہہ گئے۔ یہ خود اللہ اور رسولؐ کے ساتھ استہزا ہے۔

اہم نکات

۱۔ کسی ادبی نکتے یا لطیفہ گوئی، ہنسی مذاق میں بھی اللہ اور رسولؐ کے بارے میں خلاف ادب بات نہیں کرنی چاہیے۔

لَا تَعۡتَذِرُوۡا قَدۡ کَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ

۶۶۔ عذر تراشی مت کرو، تم ایمان لانے کے بعد

اِیۡمَانِکُمۡ ؕ اِنۡ نَّعۡفُ عَنۡ طَآئِفَۃٍ مِّنۡکُمۡ نُعَذِّبۡ طَآئِفَۃًۢ بِاَنَّہُمۡ کَانُوۡا مُجۡرِمِیۡنَ ﴿۶۶﴾

کافر ہو چکے ہو، اگر ہم نے تم میں سے ایک جماعت کو معاف کر بھی دیا تو دوسری جماعت کو ضرور عذاب دیں گے کیونکہ وہ مجرم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَعۡتَذِرُوۡا: یہ منافقین اگرچہ مؤمن نہیں تھے تاہم وہ اظہار ایمان کرتے تھے تو بظاہر ان پر اسلام کا حکم جاری ہوتا تھا۔ اب چونکہ اس اظہار ایمان کے بعد اظہار کفر بھی ہو گیا، لہٰذا اب یہ کافر شمار ہوں گے۔

دوسری تشریح یہ ہو سکتی ہے کہ یہ لوگ شروع میں واقعی ایمان لے آئے تھے، بعد میں کافر ہو گئے۔ چنانچہ ان میں سے بعض کی توبہ قبول ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ لوگ ایمان کے بعد کفر میں مبتلا ہو گئے تھے۔

۲۔ اِنۡ نَّعۡفُ عَنۡ طَآئِفَۃٍ مِّنۡکُمۡ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین میں سے ایک گروہ نے اپنے نفاق سے توبہ کی ہے اور سچے دل سے اسلام میں داخل ہو گیا ہے اور اللہ نے ان کے گزشتہ نفاق اور استہزا کو معاف فرمایا ہے۔

۳۔ نُعَذِّبۡ طَآئِفَۃً: البتہ ایک گروہ اپنے نفاق اور جرم پر قائم رہا جو مستوجب عذاب قرار پایا۔

اہم نکات

۱۔ جرم کے ارتکاب کے بعد عذر تراشی سے نہیں، توبہ سے بات بنتی ہے۔

اَلۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الۡمُنٰفِقٰتُ بَعۡضُہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۘ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمُنۡکَرِ وَ یَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَقۡبِضُوۡنَ اَیۡدِیَہُمۡ ؕ نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَہُمۡ ؕ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۶۷﴾

۶۷۔ منافق مرد اور عورتیں آپس میں ایک ہی ہیں وہ برے کاموں کی ترغیب دیتے ہیں اور نیکی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ روکے رکھتے ہیں انہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا ہے بے شک منافقین ہی فاسق ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ بَعۡضُهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ :اس آیۂ شریفہ میں منافق عورتوں کا بھی ذکر آیا کہ فتنہ نفاق میں عورتوں کا بھی ایک کردار ہے۔ ان سب کی سوچ اور کردار میں بھی ہمآہنگی پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ ہم فکر ہونے کی وجہ سے ایک جتھے کی تشکیل کر رہے ہیں اور ایک منظم جماعت کے طور پر اسلام کے خلاف برسر پیکار ہیں۔

۲۔ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمُنۡکَرِ وَ یَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمَعۡرُوۡفِ : اسلامی تعلیمات کی عین مخالف سمت یہ سب مل کر ہم قدم ہوتے ہیں۔ اچھے کاموں کی جگہ برے کاموں کی ترغیب دیتے ہیں اور معاشرے کو فاسد کرنے پر لگے ہوتے ہیں۔

۳۔ وَ یَقۡبِضُوۡنَ اَیۡدِیَهُمۡ : راہ خدا میں خرچ کرنے سے اپنے ہاتھ روکے رکھتے ہیں۔ چونکہ وہ اس کو اپنے مال کا ضیاع سمجھتے ہیں اور اگر کبھی خرچ کیا بھی تو دکھاوے کے لیے کیا۔

۴۔ نَسُوا اللّٰهَ : انہوں نے اللہ کو بھلا دیا۔ اللہ کی اطاعت ترک کر دی۔ فَنَسِیَهُمۡ تو اللہ نے بھی انہیں بھلا دیا۔ اللہ کو بھول لاحق نہیں ہوتی۔ روایات کے مطابق بھلانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے بھی انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جو سب سے بڑی سزا ہے۔

۵۔ الۡمُنٰفِقِیۡنَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ : ترکیب کلام سے ظاہر ہوتا ہے فسق کو منافقین میں منحصر کیا گیا ہے۔ یعنی نفاق جس قسم کا فسق ہے، وہ واقعاً صرف منافقین میں منحصر ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہر زمانے میں برے کاموں کی ترغیب دینا، راہ خدا میں کچھ بھی خرچ نہ کرنا اور اللہ کو بھلا دینا نفاق کی علامات ہیں۔

۲۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور راہ خدا میں انفاق، ذکر خدا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ الۡمُنٰفِقٰتِ وَ الۡکُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ هِیَ حَسۡبُهُمۡ ۚ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّقِیۡمٌ ﴿۶۸﴾

۶۸۔ اللہ نے منافق مردوں اور عورتوں اور کافروں سے آتش جہنم کا وعدہ کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے یہی ان کے لیے کافی ہے اور اللہ نے ان پر لعنت کر دی ہے اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں منافقین اور کفار کے خلاف نہایت شدید لہجہ اختیار کیا گیا:

i۔ آتش جہنم میں ہمیشہ رہنا۔

ii۔ یہ عذاب اس حد تک ہو گا کہ اس سے زائد کے لیے گنجائش نہیں: ہِیَ حَسۡبُہُمۡ ....۔

iii۔ ان پر اللہ کی لعنت ہے۔

iv۔ ان کے لیے ایک اور عذاب ذکر ہوا جس کے لیے لفظ مُّقِیۡمٌ استعمال فرمایا۔ ممکن ہے یہ عذاب جہنم کے عذاب کے علاوہ دنیاوی عذاب ہو اور اس زندگی میں بھی ایک نفسیاتی اور معنوی عذاب میں ہمیشہ مبتلا رہتے ہوں۔

كَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ كَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡكُمۡ قُوَّةً وَّاَكۡثَرَ اَمۡوَالًا وَّ اَوۡلَادًا ؕ فَاسۡتَمۡتَعُوۡا بِخَلَاقِهِمۡ فَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِخَلَاقِكُمۡ كَمَا اسۡتَمۡتَعَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ بِخَلَاقِهِمۡ وَ خُضۡتُمۡ كَالَّذِىۡ خَاضُوۡا ؕ اُولٰٓـئِكَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۶۹﴾

۶۹۔ (تم منافقین) ان لوگوں کی طرح (ہو) جو تم سے پہلے تھے وہ تم سے زیادہ طاقتور اور اموال اور اولاد میں تم سے بڑھ کر تھے انہوں نے اپنے حصے کے مزے خوب لوٹے پس تم بھی اپنے حصے کے مزے اسی طرح لوٹ رہے ہو جس طرح تم سے پہلوں نے اپنے حصے کے خوب مزے لوٹے اور جس طرح وہ باطل بحثیں کرتے تھے تم بھی کرتے رہو یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں برباد ہو گئے اور یہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

تشریح کلمات

خلاق: (خ ل ق) وہ فضیلت (حصہ) جو انسان اپنے اخلاق سے حاصل کرتا ہے۔

تفسیر آیات

منافقین کی تاریخ کا ذکر ہے کہ شاید عصر نزول قرآن اور اس کے بعد آنے والے منافقین، تاریخ سے عبرت حاصل کریں کہ گزشتہ تاریخ کے منافقین تو زیادہ عیش و نوش اور کیف و سرور میں زندگی بسر کرتے تھے اور ان کی زندگی بھی تمہاری طرح بے قیمت تھی اور باطل بحثوں اور گندی باتوں میں وقت گزارتے تھے۔ زندگی سے کوئی معقول فائدہ نہیں اٹھایا۔ یوں ان کی زندگی تلف ہو گئی۔

۱۔ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ : تم منافقین اسی طرح دین الٰہی کے مقابلے میں کھڑے ہوئے ہو جس طرح تم سے پہلے بہت سے لوگ دین حق کے مقابلے میں کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بھی تمہاری طرح دنیا کے مال و منال کو ترجیح دی۔

ابوھریرہ راوی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لتتبعن سنن الذین من قبلکم شبراً بشبر و ذراعا بذراع وباعا بباع حتی لو دخلوا حجر ضب لدخلتموہ۔ [۱]	قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم سابقہ امتوں کی روش پر چلو گے۔ شانہ بشانہ قدم بہ قدم۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل گھس گئے ہوں تو تم بھی گھس جاؤ گے۔

۲۔ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً: وہ لوگ مال و اولاد اور طاقت میں بھی تم سے زیادہ قوی اور دولتمند تھے۔

۳۔ فَاسْتَمْتَعُوْا: جو کفار و منافقین تم سے زیادہ طاقت ور تھے انہوں نے اپنی زندگی کے مزے لوٹے اور اس دنیا سے اپنا حصہ حاصل کیا۔ آخر میں انہوں نے دیکھ لیا ان کو اس دنیا سے کچھ نہیں ملا۔

۴۔ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ : تم بھی اس دنیا سے اپنے حصے کے مزے لوٹ کر دیکھ لو، انجام کار کیا کچھ ہونے والا ہے۔

۵۔ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا: تم بھی اپنے پیشروؤں کی طرح فضولیات اور گندی باتوں میں لگے رہتے ہو۔

۶۔ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ : یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال حبط ہو گئے۔ دنیا میں بھی رسوا ہو گئے تاریخ ان کی سیاہ ہو گئی اور آخرت میں ابدی عذاب میں مبتلا ہو گئے۔

۷۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ: جو لوگ دنیا و آخرت دونوں میں خسارے میں ہوں۔ وہ خسارہ اٹھانے والوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں:

آج کے منافقین عہد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منافقین سے بھی بدتر ہیں۔
کہا: وہ کیسے؟ کہا: وہ اپنے نفاق کو چھپاتے تھے۔ یہ لوگ اعلاناً نفاق کرتے ہیں۔ [۲]

واضح رہے: عصر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اواخر میں منافقین مردوں اور عورتوں کی ایک جماعت موجود تھی۔ چنانچہ رسالتمابؐ کو یہ حکم ملتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ . [۳] — اے نبی! کفار اور منافقین سے لڑو۔

---

[۱] ابن کثیر [۲] تفسیر ثعلبی نبقل مجمع البیان [۳] ۹ توبة: ۷۳

عصر رسالتؐ کے بعد مرتدین سے لڑنے کا اتفاق ہوا لیکن یہ سارے منافقین کہاں گئے؟ حضرت حذیفہؓ سے اس کا جواب مل جاتا ہے کہ عصر رسولؐ کے بعد منافقت نے اپنا طریقہ واردات بدل دیا تھا اور ان کو اپنا نفاق چھپانے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

اہم نکات

۱۔ ان لوگوں کی زندگی تلف اوراعمال حبط ہیں جو عیش وطرب اور لا یعنی باتوں میں لگے رہتے ہیں۔

اَلَمۡ یَاۡتِہِمۡ نَبَاُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ ۬ۙ وَ قَوۡمِ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اَصۡحٰبِ مَدۡیَنَ وَ الۡمُؤۡتَفِکٰتِ ؕ اَتَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظۡلِمَہُمۡ وَ لٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۷۰﴾

۷۰۔ کیا ان کے پاس ان سے پہلے لوگوں (مثلاً) قوم نوح اور عاد وثمود اور قوم ابراہیم اور اہل مدین اور الٹی ہوئی بستیوں والوں کی خبر نہیں پہنچی جن کے پاس ان کے رسول نشانیاں لے کر آئے، پھر اللہ تو ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا بلکہ یہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔

تشریح کلمات

الۡمُؤۡتَفِکٰتِ: الٹی ہوئی بستیاں۔

تفسیر آیات

تاریخ کے اہم ابواب کا مطالعہ ہے کہ نوح (ع) کی قوم نے اسی طرح اپنے رسولؑ کا مذاق اڑایا، وہ غرق ہوگئی۔ یہی وطیرہ اختیار کرنے پر قوم عاد کو آندھی نے ہلاکت میں ڈال دیا۔ اپنے رسولؑ کے ساتھ اسی قسم کا سلوک کرنے پر ثمود کی قوم بھی نابود ہوگئی۔ ابراہیمؑ کی قوم کو جو مذلت اٹھانا پڑی، وہ بھی صفحۂ تاریخ میں ثبت ہے۔ مدین والے اور لوط (ع) کی قوم کا جو حشر ہوا، وہ بھی تاریخ کا ایک عبرتناک واقعہ ہے۔

اہم نکات

۱۔ سرکش انسان کو طاقت، نشے میں ڈالتی ہے اور نعمتوں کی فروانی، اس سے بینائی کی قوت سلب کرتی ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾	۷۱۔ اور مومن مرد اور مومنہ عورتیں ایک دوسرے کے بہی خواہ ہیں، وہ نیک کاموں کی ترغیب دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ رحم فرمائے گا، بے شک اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ: ایک موقف، ایک مزاج اور ایک ہی قسم کی سوچ نے جس طرح منافقین کو ایک جتھا بنا دیا تھا، اسی طرح ایک عقیدے، ایک نظریے اور ایک ہی قسم کے ایمان نے مؤمنین کو ایک امت بنا دیا اور تمام مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں جسد واحد کی طرح ہوگئے۔

۲۔ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ: کسی نیکی کو دیکھ لیا تو خود بھی اس پر عمل کیا اور ساتھ یہ خواہش بھی دل میں جاگزین ہوگئی کہ میرا ہم عقیدہ برادر ایمانی بھی اس پر عمل کرے۔ اسی طرح برائی سے خود بھی دور رہے اور اپنے مؤمن بھائی کو بھی دور رکھنے کی کوشش کی۔ اس طرح مؤمن ایک دوسرے کے ساتھ ولاء اور ولایت کا حق ادا کرتے ہیں۔

۳۔ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ: اس جماعت کی شناخت اقامہ نماز ہے، ادائے زکوٰۃ ہے۔ نماز قائم کر کے اپنا تعلق اللہ سے بہتر رکھتے ہیں اور زکوۃ ادا کر کے لوگوں سے بھی اچھا سلوک کرتے ہیں۔

۴۔ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ: اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کر کے اپنی نیکیوں کو محفوظ رکھتے اور اپنے اعمال حبط ہونے سے بچا لیتے ہیں۔

۵۔ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ: اللہ ارحم الراحمین ضرور ہے لیکن اس بے پایاں رحمت کے لیے اہل ہونا ضروری ہے۔ یہ لوگ رحمت خدا کے لیے اہل قرار پاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ منافق آپس میں ایک ضرور ہیں مگر آپس میں ولایت کا رشتہ نہیں رکھتے، جیسا کہ مؤمن رکھتے ہیں: بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ ....

وَعَدَ اللّٰهُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا وَمَسٰکِنَ طَیِّبَةً فِیۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ ؕ وَ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَکۡبَرُ ؕ ذٰلِکَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۷۲﴾

۷۲۔ اللہ نے ان مومن مردوں اور مومنہ عورتوں سے ایسی بہشتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان دائمی جنتوں میں پاکیزہ قیام گاہیں ہیں اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو ان سب سے بڑھ کر ہے، یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

تشریح کلمات

عَدۡنٍ: (ع د ن) کے معنی کسی جگہ قرار پکڑنے اور ٹھہرنے کے ہیں۔ اسی سے اَلمعدِنُ (کان) ہے کیونکہ کان بھی جواہرات کے ٹھہرنے اور پائے جانے کی جگہ ہوتی ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت میں دو جنتوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور دوسری جنت عدن۔ عدن کی جنت کے بارے میں روایت ہے کہ یہ جنت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے، جس میں انبیاء و رسل شہداء ہوں گے۔ شواھد التنزیل میں آیا ہے: رسول اللہؐ نے فرمایا:

انا شجرة و فاطمة فرعها و علّی لقاحها و حسن و حسین ثمرها و محبوهم من امتی ورقها ثم قال هم فی جنة عدن والذی بعثنی بالحق.[1]

میں شجر ہوں، فاطمہ اس کی ٹہنی، علی اس کی آب یاری، حسن و حسین اس کے پھل، ان کے محبین اس کے پتے ہیں۔ پھر فرمایا: مجھے قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے برحق مبعوث کیا ہے۔ وہ جنت عدن میں ہوں گے۔

وَرِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَکۡبَرُ: تمام تر نعمتیں اللہ کی خوشنودی کے ساتھ مربوط ہیں اور بندگی و عبودیت بھی نہ جنت کی طمع اور نہ جہنم کے خوف سے بلکہ رضائے رب سے عبارت ہے۔ ۔محبؐ کی ساری کائنات، محبوب کی خوشنودی ہے اور بندے کا فوز عظیم رب کی رضامندی ہے، نہ کہ جنت کا حصول۔ اگر رضائے رب نہیں تو جنت، نعمت کی جگہ نقمت بن جائے۔

اکبر سے مراد ممکن ہے اکبر من کل شئ ہو۔ جنت کی تمام نعمتیں خواہ کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہوں، رضائے رب کے مقابلے میں ہیچ اور حقیر دکھائی دیں گی اور ممکن ہے اکبر من ان یوصف ہو۔ یعنی اللہ کی

---

[1] شواھد التنزیل ۱: ۴۰۷

خوشنودی کی عظمت، وصف و بیان کی حد سے بڑھ کر ہے۔ جیسا کہ اللہ کی ذات کے لیے جب ہم اللہ اکبر کہتے ہیں تو یہی مراد ہوتی ہے کہ اللہ کی ذات، وصف و بیان کی حد سے بڑھ کر ہے۔ اس کی رضامندی کی عظمت بھی امکان وصف و بیان سے بالاتر و والاتر ہے۔

بندۂ مؤمن جب دنیا کی دکھ بھری زندگی سے فارغ ہو کر رب رحیم کے جوار میں اس کی خوشنودی کی پرسکون اور کیف و سرور کی فضا میں قدم رکھے گا تو اس کے لیے ایک لمحہ بھی وصف و بیان سے بڑھ کر ہو گا۔ رضائے رب کی اس پرنور فضا میں اگر یہ آواز گونجے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ...۔ تو شاید اس ذات کبریا کی رضا کی کبریائی کا کسی حد تک اندازہ لگایا جا سکے۔

اہم نکات

۱۔ عارفان حق کا منتہائے مقصود رضائے رب ہے۔

۲۔ اس کائنات میں رضائے رب سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾

۷۳۔ اے نبی! کفار اور منافقین سے لڑو اور ان پر سختی کرو اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے جو بہت برا ٹھکانا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ جَاهِدِ الْكُفَّارَ: پورے ۹ سال کا عرصہ مہلت دینے اور تمام عرب کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے بعد ان مار آستین کو مزید مہلت دینے کا مطلب یہ تھا کہ ان منافقین کو اپنے نفاق کا زہر پھیلانے کا موقع فراہم ہوتا رہے اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کہیں یہ لوگ مسلمانوں کو اندرونی خطرات سے دو چار نہ کریں لہٰذا اب وقت آ گیا تھا کہ ان کی منافقت سے چشم پوشی کا سلسلہ ختم کیا جائے اور ان کو اسلامی سوسائٹی کا حصہ سمجھنے کی جگہ کافروں کی صف میں کھڑا کیا جائے۔ منافقوں کے خلاف جہاد کا مطلب قتال نہیں بلکہ ان کو بے نقاب کر کے مسلمانوں کی صفوں سے نکال کر کافروں کی صفوں میں داخل کرنے کے لیے پیہم کوشش ہے۔

۲۔ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ: غلظت اور شدت کے ساتھ پیش آیا کرو۔ منافقین اب آپ کے خلق عظیم کے اہل رہے اور نہ وہ مصلحت باقی رہی جس کے تحت ان کے جرائم سے چشم پوشی اختیار کی جاتی رہی۔

اہم نکات

۱۔ منافق کو اگر معاشرے میں عزت ملے تو دوسروں کو غداری و منافقت کی جرأت مل جاتی ہے:

جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ....

۲۔ دشمنان اسلام سے رواداری، اسلامی حمیت و غیرت کی نفی ہے: وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ....

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِى الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾

۷۴۔ یہ لوگ اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ انہوں نے کچھ نہیں کہا حالانکہ انہوں نے کفر کی بات کہدی ہے اور وہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے ہیں اور انہوں نے وہ کچھ کرنے کی ٹھان لی تھی جو وہ نہ کر پائے اور انہیں اس بات پر غصہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان (مسلمانوں) کو دولت سے مالا مال کر دیا ہے پس اگر یہ لوگ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہو گا اور اگر منہ پھیر لیں تو اللہ انہیں دنیا و آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور روئے زمین ان کا نہ کوئی کارساز ہوگا اور نہ مددگار۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ: جو کفر یہ لوگ سینوں میں چھپائے رکھتے تھے اس کا اظہار ہو گیا اور کفر کا اقرار کر لیا جس کی وجہ سے یہ لوگ ظاہراً بھی کافر ہو گئے۔ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ ظاہری اسلام قبول کرنے کے بعد یہ لوگ دوبارہ کفر کی طرف چلے گئے۔ ایمان تو ان کے دلوں میں کبھی بھی داخل نہیں ہوا تھا۔ ظاہری اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ اب اس سے بھی نکل گئے۔

کلمہ کفر: وہ کون سا کلمہ تھا جو ان لوگوں نے برملا کہدیا۔ بعض کے نزدیک وہ استہزا اور تمسخر ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کچھ منافقین جنگ تبوک میں شریک تھے۔ اپنی خلوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سَبّ کرتے تھے۔ حضرت حذیفہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتا دیا۔ حضرت حذیفہؓ کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی۔

۲۔ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا: یہ لوگ جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ نہ کر سکے۔ ان لوگوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کی ٹھان لی تھی۔ تاریخ تفسیر اور سیرت کی کتابوں میں ہے کہ تبوک سے واپسی کے موقع پر مسلمانوں کا لشکر اس جگہ کے نزدیک آ گیا جہاں سے پہاڑوں کے درمیان سے گزرنا تھا۔ منافقوں کی

ایک جماعت نے آپس میں یہ فیصلہ کر لیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کو کسی گھاٹی سے گزرتے ہوئے کھڈ میں دھکیل دیں۔ آنحضرتؐ کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع ہو گئی۔ آپؐ نے حکم دیا کہ لشکر وادی کے راستے سے نکل جائے اور آپؐ خود صرف حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت حذیفہ بن یمانیؓ کو ساتھ لے کر گھاٹی کے راستے پر چل دیے۔ اثنائے راہ معلوم ہوا بارہ منافقین پیچھے پیچھے آ رہے ہیں اور چہروں کو چھپائے ہوئے ہیں۔ حضرت عمارؓ کو ان لوگوں نے گھیر لیا مگر حضرت حذیفہؓ نے ان کو بھگا دیا۔ آنحضرتؐ نے حضرت حذیفہؓ کو بتا دیا کہ وہ بارہ آدمی فلاں اور فلاں تھے۔ دیگر بعض روایا ت میں آیا ہے: فسماھم لھما و قال اکتماھم۔ حضورؐ نے عمارؓ اور حذیفہؓ دونوں کو ان سب کے نام بتائے پھر فرمایا ان کو راز میں رکھو۔[1]

۳۔ وَمَانَقَمُوۡۤا: ان منافقین کو اس بات پر غصہ ہے کہ ان مسلمانوں کو اللہ نے غنیمت کے مال سے مالا مال فرمایا۔ اَغۡنٰہُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوۡلُہٗ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۔ اللہ کے رسولؐ نے بھی ان کو دولت دے کر فقر و تنگدستی سے نکالا اور اس دنیا کی زندگی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے آسائش سے مالا مال ہو گئی۔ چنانچہ جنگ حنین کی فتح کے بعد غنیمت میں حاصل ہونے والے فراوان اموال حضورؐ نے تالیف قلب کی مد سے ابوسفیان وغیرہ کو دے دیے اور انصار کو کچھ نہیں دیا۔ اس پر انصار آزردہ خاطر ہوئے تو فرمایا:

یامعشر الانصار الم اجدکم ضلالاً فھداکم اللّٰہ بی و کنتم متفرقین فالفکم اللّٰہ بی و عالۃ فاغناکم اللّٰہ بی۔[2]	اے انصار کے لوگو! کیا تم گمراہ نہیں تھے پھر اللہ نے میرے ذریعے تمہاری ہدایت فرمائی۔ کیا تم بٹے ہوئے نہیں تھے پھر اللہ نے میرے ذریعے تم کو باہم متحد کیا۔ کیا تم فقیر تنگدست نہیں تھے پھر اللہ نے میرے ذریعے تم کو مالدار بنایا۔

۴۔ مِنۡ فَضۡلِہٖ: کی ضمیر اللہ کی طرف ہے۔ یہاں من فضلھما نہیں فرمایا۔ چونکہ اللہ کی تعظیم کے منافی ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو ایک ضمیر میں جمع کیا جائے۔ چنانچہ کسی نے رسول اللہؐ کے حضور کہا:

من اطاع اللّٰہ و رسولہ فقد اھتدی و من عصاھما فقد غوی۔

حضورؐ نے ٹوکا اور اس کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

و من عصا ھما نہ کہو۔ و من عصی اللّٰہ و رسولہ کہو۔[3]

---

[1] اس کے باوجود بعض حضرات نے ان لوگوں کے نام بتانے کی کوشش کی ہے۔ تفسیر ابن کثیر اس کا مطلب یہ نکلتا کہ حضرت حذیفہؓ نے جو صاحب سر رسولؐ مشہور ہیں، یہ راز فاش کیا ہے۔ حضرت حذیفہؓ اس الزام سے پاک ہیں۔ المنار نے وہ وجہ بھی بتا دی جس کے لیے ان منافقین کا نام بتانے کی کوشش کی گئی تا کہ روافض کے لیے اصحاب رسولؐ کو مطعون کرنے کا موقع ہاتھ نہ آئے۔

جب کہ روافض کا ایمان ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ صاحب سرِّ رسولؐ ہیں۔ انہوں نے یہ راز فاش نہیں کیا۔ لہٰذا وہ حضرت حذیفہؓ کو مطعون نہیں کرتے۔ نہ معلوم یہ حضرات کس غرض سے حضرت حذیفہؓ کو مطعون کر رہے ہیں۔ اگر حضرت حذیفہؓ نے یہ راز فاش کیا ہوتا تو وہ صاحب سِر نہ رہتے۔

[2] صحیح بخاری۔ کتاب المغازی باب غزوۃ الطائف [3] المیزان ذیل آیت

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنۡ اٰتٰىنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۷۵﴾

۷۵۔ اور ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کر رکھا تھا کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل سے نوازا تو ہم ضرور خیرات کیا کریں گے اور ضرور نیک لوگوں میں سے ہو جائیں گے۔

فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا بِهٖ وَ تَوَلَّوۡا وَّ هُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۷۶﴾

۷۶۔ لیکن جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نوازا تو وہ اس میں بخل کرنے لگے اور (عہد سے) روگردانی کرتے ہوئے پھر گئے۔

تفسیر آیات

شان نزول: اس آیت کے شان نزول میں روایت ہے کہ انصار کا ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اصرار کرتا ہے کہ دولت کی فروانی کے لیے دعا فرمائیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں اس صورت میں تمام مالی حقوق ادا کروں گا۔ چنانچہ تھوڑے عرصے میں وہ بڑا دولت مند ہو جاتا ہے۔ رسول اللہؐ کی طرف سے زکوۃ کی وصولی کے موقع پر اس نے زکوۃ دینے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ یہ طنز بھی کیا کہ یہ جزیے کا بھائی ہے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔[1]

مِنۡ فَضۡلِهٖ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ مال کو اللہ تعالیٰ اپنا فضل قرار دیتا ہے۔ آگے انسان کے ہاتھ میں ہے وہ اس کو اللہ کا فضل رہنے دیتا ہے یا اللہ کے غضب کا سبب بناتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ ممکن ہے کسی کو مال و دولت نہ دینا بھی اللہ کی طرف سے لطف و رحمت ہو: فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا بِهٖ ....

فَاَعۡقَبَهُمۡ نِفَاقًا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ يَلۡقَوۡنَهٗ بِمَاۤ اَخۡلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوۡهُ وَ بِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ﴿۷۷﴾

۷۷۔ پس اللہ نے ان کے دلوں میں اپنے حضور پیشی کے دن تک نفاق کو باقی رکھا کیونکہ انہوں نے اللہ کے ساتھ بدعہدی کی اور وہ جھوٹ بولتے رہے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَاَعۡقَبَهُمۡ نِفَاقًا: اللہ کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا کہ اگر اللہ مجھے دولت عطا فرمائے تو میں

---

[1] مجمع البیان۔ ذیل آیہ

خیرات اور صالح لوگوں کا کردار ادا کروں گا۔ بعد میں مال و دولت ملنے پر اس عہد کی خلاف ورزی کی، خیرات سے بخل کیا اور صالح بننے سے روگردانی کی۔ اس کے نتیجے میں نفاق آ گیا۔ ایک جرم نے دوسرے جرم کو جنم دیا۔

۲۔ اِلٰی یَوۡمِ یَلۡقَوۡنَہٗ: یہ نفاق اللہ کے سامنے پیشی کے دن تک ان کے دلوں میں جاگزیں رہے گا۔ پیشی کا دن، موت کا وقت ہو سکتا ہے۔ چونکہ نفاق تادم مرگ باقی رہ سکتا ہے۔ بعد از موت نفاق کے اثرات ونتائج بھگتنا ہوں گے۔ وہ یَوۡمِ یَلۡقَوۡنَہٗ کے بعد بھی باقی رہیں گے۔

۳۔ بِمَاۤ اَخۡلَفُوا اللّٰہَ: اللہ کے ساتھ بدعہدی اور بخل کا طبعی نتیجہ یہ ہوا کہ قیامت تک کے لیے ان کے دلوں میں نفاق جاگزیں ہو گیا۔ جب ان لوگوں سے مذکورہ بالا نافرمانیاں سرزد ہوئیں تو اس سے وہ اللہ کی طرف سے ہدایت وتوفیق کے قابل نہ رہے۔ جب توفیق و ہدایت سلب ہو جاتی ہیں تو ان کی جگہ نفاق اور کفر لیتے ہیں۔

۳۔ وَبِمَا کَانُوۡا یَکۡذِبُوۡنَ: بدعہدی اور جھوٹ وہ عوامل ہیں جن کی وجہ سے نفاق راسخ ہو جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ اطاعت سے ایمان اور معصیت سے نفاق میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ سِرَّہُمۡ وَنَجۡوٰىہُمۡ وَ اَنَّ اللّٰہَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ ﴿۷۸﴾

۷۸۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ اللہ ان کے پوشیدہ رازوں اور سرگوشیوں سے بھی واقف ہے اور یہ کہ اللہ غیب کی باتوں سے بھی خوب واقف آگاہ ہے۔

تفسیر آیات

منافقین کی اندرونی حالت پر شدید لہجے میں تنبیہ ہو رہی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے بارے میں سینوں میں کس قدر عناد رکھتے ہیں اور آپس کی سرگوشیوں میں اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اس سے اللہ بخوبی واقف ہے۔ چونکہ ہر غیب کی بات اللہ کے لیے شہود کی منزل میں ہے۔

اہم نکات

۱۔ جس کے دل کے رازوں میں اللہ کا تصور زندہ ہے وہ معصیت نہیں کرتا۔

اَلَّذِیۡنَ یَلۡمِزُوۡنَ الۡمُطَّوِّعِیۡنَ

۷۹۔ جو لوگ ان مؤمنوں کا مذاق اڑاتے ہیں

مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۹﴾	جو برضا ورغبت خیرات کرتے ہیں اور جنہیں اپنی محنت و مشقت کے سوا کچھ بھی میسر نہیں ان پر ہنستے بھی ہیں اللہ ان کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تشریح کلمات

یلمز (ل م ز) لمز کے معنی کسی کی غیبت کرنا، اس کی عیب چینی کرنا کے ہیں۔

المطوع التطوع وہ عمل جس کے انجام دینے سے نفس کراہت نہ کرے اور شاق بھی نہ گزرے۔ اسی لیے مستحب کو تطوع کہتے ہیں۔

تفسیر آیات

غزوہ تبوک کی تیاری کے موقع پر مسلمانوں نے مالی اعانت کی مہم شروع کی تو جب کوئی مسلمان اپنی وسعت کے مطابق بڑی رقم پیش کرتا تو یہ منافقین اس پر ریاکاری کا الزام لگاتے۔ اگر کوئی نادار مسلمان اپنی محنت مزدوری سے کچھ کھجوریں پیش کرتا تو یہ منافقین اس کا بھی مذاق اڑاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو ان مؤمنین کا انفاق خواہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو، پسند تھا۔ اس لیے منافقین کے تمسخر کے جواب میں خود اللہ ان منافقین کا تمسخر فرماتا ہے۔

۱۔ یَلۡمِزُوۡنَ الۡمُطَّوِّعِیۡنَ: رضا ورغبت کے ساتھ ایک معتدبہ دولت پیش کرنے والوں کا ذکر ہے۔

۲۔ وَالَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ اِلَّا جُهۡدَهُمۡ: نادار لوگوں کا ذکر ہے جن کے پاس محنت و مشقت کے سوا خرچ کرنے کے لیے مال موجود نہیں ہے۔ ان کی کل جائیداد اپنی محنت و مشقت ہے۔ وہ اسے راہ خدا میں خرچ کر رہے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اس محنت و مشقت کے لیے اس نادار کی کل جائیداد کے تناظر میں قدر و قیمت کا تعین فرماتا ہے۔

۳۔ سَخِرَ اللّٰهُ مِنۡهُمۡ: اللہ ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ اللہ کی طرف سے مذاق کا مطلب وہ عذاب ہے جس سے یہ تمسخر کرنے والے انتہائی ذلت و رسوائی سے دوچار ہوں گے۔

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال ہوا کہ کون سی خیرات بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جهد المقل. نادار کی محنت مشقت۔[1]

---

[1] سنن نسائی۔ کتاب الزکوۃ باب جهد المقل۔ الکافی ۴: ۱۸۔ باب الایثار

اہم نکات

۱۔ کسی عمل کی عظمت کا معیار کثرت نہیں، خلوص ہے۔

۲۔ جس نیک عمل کا لوگ تمسخر اڑائیں، اس میں ریاکاری کا شائبہ نہیں ہوتا۔

اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴿۸۰﴾

۸۰۔ (اے رسول) آپ ایسے لوگوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں یا دعا نہ کریں (مساوی ہے) اگر ستر بار بھی آپ ان کے لیے مغفرت طلب کریں تو بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا، اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور اللہ فاسقین کو ہدایت نہیں دیتا۔

تفسیر آیات

۱۔ اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ : اے رسول! ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا۔ یعنی جب یہ لوگ بدتر جرم جو کفر اور فسق سے عبارت ہے، کے ارتکاب میں مشغول ہیں، عین اس وقت ان کے لیے درگزر اور معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس بات کے ناممکن اور نامعقول ہونے کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے فرمایا:

۲۔ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ : اے رسولؐ! خواہ آپ بنفس نفیس ان کے لیے ستر بار بھی مغفرت کی دعا کریں پھر بھی یہ لوگ قابل عفو و درگزر نہیں ہیں کیونکہ ان کی طرف سے جرم ہنوز جاری ہے۔

۳۔ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً : ستر سے کثرت مراد ہے، حد بندی نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جرم جاری ہے۔ اس وقت ان کے لیے خود رسولؐ استغفار کریں یا نہ کریں۔ ایک بار کریں یا بار بار کریں۔ ہر صورت میں استغفار بے سود ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

لو علمت انه لوزدت علی السبعین مرة غفر لهم لفعلت۔[1]

اگر مجھے علم ہو جائے کہ ستر سے ایک بار زیادہ کرنے پر ان کو معافی مل جائے گی تو میں یہ کام کر دیتا۔

۴۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا: عدم فائدہ کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے کفر پر قائم ہیں اور فسق و فجور پر بھی اڑے ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے وہ معافی کے قابل ہیں اور نہ ہدایت کے۔

---

[1] مجمع البیان ذیل آیت

اہم نکات

۱۔ جرم کے ارتکاب سے باز آنے کی صورت میں استغفار کی نوبت آتی ہے۔

فَرِحَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ بِمَقۡعَدِہِمۡ خِلٰفَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ وَ کَرِہُوۡۤا اَنۡ یُّجَاہِدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ قَالُوۡا لَا تَنۡفِرُوۡا فِی الۡحَرِّ ؕ قُلۡ نَارُ جَہَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوۡ کَانُوۡا یَفۡقَہُوۡنَ﴿۸۱﴾

۸۱۔ (غزوہ تبوک میں) پیچھے رہ جانے والے رسول اللہ کا ساتھ دیے بغیر بیٹھے رہنے پر خوش ہیں، انہوں نے اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کرنے کو ناپسند کیا اور کہنے لگے: اس گرمی میں مت نکلو، کہد یجیے: جہنم کی آتش کہیں زیادہ گرم ہے، کاش وہ سمجھ پاتے۔

تفسیر آیات

۱۔ فَرِحَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ: سفر تبوک کے دوران نازل ہونے والی اس آیت میں ان منافقین کا ذکر ہے جو مختلف عذر تراش کر پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ اپنے اس عمل پر خوش تھے۔ ترک جہاد پر خوش تھے۔ رسول اللہؐ کا ساتھ نہ دینے کے فیصلے کو صائب قرار دے رہے تھے۔ ایمان کی فراست سے محروم لوگ اپنے فیصلوں کے وقتی نتائج دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں اور ابدی نصیحت اور دائمی رسوائی کے دور رس نتائج سے بے خبر ہو کر اپنی صائب نظری پر ناز کرتے اور دوسروں کا مذاق اڑاتے ہیں۔

۲۔ وَ کَرِہُوۡۤا اَنۡ یُّجَاہِدُوۡا: راہ خدا میں جہاد سے کراہت کرتے ہیں۔ چونکہ وہ جہاد کی روح سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کو بے وقوفی سمجھتے ہیں۔

۳۔ قَالُوۡا لَا تَنۡفِرُوۡا فِی الۡحَرِّ: کہتے ہیں اس گرمی میں مت نکلو۔ مقصد کا ادراک نہ ہو تو معمولی رکاوٹ ان کے لیے عذر بن جاتی ہے کہ اس شدید حرارت میں دور و دراز سفر کر کے سلطنت روم جیسی بڑی طاقت سے ٹکر لینا بے وقوفی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ حقیقت پر مبنی مذاق کہ دھوپ کی تپش سے فرار ہو کر یہ نافہم لوگ آتش جہنم میں جا گرے۔

اہم نکات

۱۔ باعزت مشقت پر، ذلت کی آسائش کو ترجیح دینے والے رسوا ہوتے ہیں۔

فَلۡیَضۡحَکُوۡا قَلِیۡلًا وَّ لۡیَبۡکُوۡا کَثِیۡرًا ۚ

۸۲۔ انہیں چاہیے کہ کم ہنسا کریں اور زیادہ رویا

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ﴿۸۲﴾ کریں، یہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے جو وہ کرتے رہے ہیں۔

تفسیر آیات

فَلۡيَضۡحَكُوۡا قَلِيۡلًا: اس فضیحت و رسوائی کے بعد اس دنیا کی زندگی میں بھی ان منافقوں کو خوشی نصیب نہ ہو گی۔ ان لوگوں نے رسولؐ کا ساتھ چھوڑنے پر جو خوشیاں منائی تھیں، اس کی پاداش میں وہ رویا کریں گے۔ دو دن کی خوشی کی پاداش میں تا زیست رونا ہو گا۔

یہ فرمان کہ کم ہنسا کریں اور روئیں زیادہ، ایک دستور عام اور کلی حکم نہیں ہے بلکہ یہ بات ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جنہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ چھوڑا اور منافقت کا ارتکاب کیا۔ اگرچہ مؤمن کو خوف خدا میں زیادہ رونا اور ہنسی مذاق کم کرنا چاہیے لیکن یہ آیت اس قسم کے رونے اور ہنسنے کے بیان میں نہیں ہے۔ آیت منافقین کے جرائم کی سزا کے ذکر میں ہے۔

حدیث میں آیا ہے:

كثرة الضحك تذهب بماء الوجه[۱] زیادہ ہنسنے سے آبرو جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ جرم کا ارتکاب کر کے بدمستی کرنے والوں کو ہمیشہ رونا پڑتا ہے۔

فَاِنۡ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنۡهُمۡ فَاسۡتَاۡذَنُوۡكَ لِلۡخُرُوۡجِ فَقُلۡ لَّنۡ تَخۡرُجُوۡا مَعِىَ اَبَدًا وَّلَنۡ تُقَاتِلُوۡا مَعِىَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمۡ رَضِيۡتُمۡ بِالۡقُعُوۡدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقۡعُدُوۡا مَعَ الۡخٰلِفِيۡنَ﴿۸۳﴾

۸۳۔ پھر اگر اللہ آپ کو ان میں سے کسی گروہ کے پاس واپس لے جائے اور وہ آپ سے (ساتھ) نکلنے کی اجازت مانگیں تو آپ کہدیں: اب تم میرے ساتھ ہرگز نہیں نکلو گے اور نہ ہی میرے ساتھ کسی دشمن سے لڑائی کرو گے پہلی مرتبہ تم نے بیٹھے رہنے کو پسند کیا لہٰذا اب پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔

تفسیر آیات

جو لوگ ضرورت کے وقت پیچھے ہٹتے ہیں، آسودگی کے وقت بڑھ چڑھ کر آگے آنے اور لوگوں کو

---

[۱] الکافی ۲: ۶۶۴۔ باب الدعابة

دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس آیت میں حکم ہوا ہے کہ ایسے لوگوں کو کوئی ایسا موقع نہ دیں کہ وہ اپنے نفاق پر پردہ ڈال سکیں۔ ایسے لوگوں کو کسی عام سفر میں بھی اپنی صحبت میں نہ رکھیں۔ نہ کسی جہاد میں شرکت کرنے کی اجازت دیں۔

۱۔ فَاِنۡ رَّجَعَكَ اللّٰهُ: پھر اگر اللہ آپ کو ان منافقین میں سے کسی گروہ کے پاس واپس لے جائے۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات جنگ تبوک سے واپسی پر راستے میں نازل ہوئی ہیں۔

۲۔ فَاسۡتَاۡذَنُوۡكَ: کسی اور جنگ میں آپ کے ساتھ نکلنا چاہیں تو ان سے کہد یجیے: اب تم میرے ساتھ کسی مہم میں ہرگز نہیں نکلو گے۔ وَّلَنۡ تُقَاتِلُوۡا مَعِىَ میرے ساتھ کسی لڑائی میں شرکت نہیں کرو گے۔ اسلامی لشکر کو منافقین سے پاک ہونا چاہیے چونکہ ان کا نفاق اسلامی لشکر میں بدنظمی پیدا کرے گا۔

۳۔ اِنَّكُمۡ رَضِيۡتُمۡ بِالۡقُعُوۡدِ: تم نے جنگ تبوک میں شرکت نہ کر کے گھر بیٹھنے کو ترجیح دی ہے۔

۴۔ فَاقۡعُدُوۡا مَعَ الۡخٰلِفِيۡنَ: خالفین سے بعض نے عورتوں، بچوں کو مراد لیا ہے۔ بعض نے مخالفین مراد لیا ہے۔ بعض نے بغیر عذر کے شرکت نہ کرنے والے لوگ مراد لیے ہیں۔ اس آیت میں یہی فرمایا کہ تم نے جن خالفین کے ساتھ بیٹھ جانے کو پسند کیا ہے، ان کے ساتھ ہمیشہ کے لیے بیٹھے رہو۔

اہم نکات

۱۔ اسلامی قیادت کو چاہیے کہ وہ موقع پرستوں کے دھوکے میں نہ آئے۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰى قَبۡرِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَمَاتُوۡا وَهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۸۴﴾

۸۴۔ اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس پر آپ کبھی بھی نماز نہ پڑھیں اور نہ ہی اس کی قبر پر کھڑے ہوں انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ نافرمانی کی حالت میں مرے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ: ان منافقین میں سے جو مر جائے اس پر آپ کبھی بھی اَبَدًا نماز نہ پڑھیں۔ چونکہ منافقین پر بظاہر اسلامی احکام جاری ہوتے تھے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پر بھی نماز پڑھا کرتے تھے لیکن اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض روایات کے مطابق حضورؐ نے کسی منافق پر نماز نہیں پڑھی۔ البتہ بعض اہل سنت اور شیعہ مصادر میں آیا ہے کہ آپ نے عبد اللہ بن ابی پر نماز پڑھی اور اس کے مؤمن بیٹے کی درخواست پر اس کے لیے استغفار بھی کیا حالانکہ عبداللہ بن ابی نہ صرف منافق تھا بلکہ

منافقوں کا سرکردہ تھا۔

لیکن آیت میں صریحاً منع کیا گیا کہ کسی منافق پر نماز مت پڑھو اور اس حکم میں نہایت تاکیدی لفظ اَبَدًا بھی ہے۔ لہٰذا یہ روایات صریح قرآن کے خلاف ہونے کی وجہ سے مسترد ہیں اور خود روایات تضادات سے پر ہیں۔ ملاحظہ ہو المیزان۔

۲۔ وَلَا تَقُمۡ عَلٰی قَبۡرِہٖ: منافق کے دفن ہونے کے بعد اس کی قبر پر کھڑے نہ ہوں۔ اس امر سے اس لیے روکا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی مسلمان کی تدفین کے بعد اس کی قبر پر کھڑے ہوتے اور فرماتے تھے:

استغفروا لاخیکم واسئلوا له التثبت فانه الآن یسئل۔[۱]	اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو اور ثابت قدمی کی دعا کرو چونکہ اس وقت اس سے سوال ہو رہا ہے۔

زیارۃ القبور: منافق کی قبر پر کھڑا ہونا، منع ہونے سے ثابت ہوا ہے۔ مؤمن کی قبر پر کھڑا ہونا سنت نبوی ہے خواہ دفن کے بعد ہو خواہ دوسرے اوقات میں ہو۔ اس کو صرف دفن کے بعد کے لیے مخصوص گردانا خلاف ظاہر قرآن ہے۔ چنانچہ شیعہ سنی مصادر میں زیارۃ القبور کے عنوان سے متعدد احادیث منقول میں فرمایا:

نهیتکم عن ثلاث نهیتکم عن زیارة القبور اَلَا فزوروها...۔[۲]	میں نے تم کو تین چیزوں سے روک دیا تھا۔ (ان میں سے ایک) قبروں کی زیارت تھی۔ اب قبروں کی زیارت کرو۔

دوسری حدیث میں فرمایا:

فانها تذکرة الآخرة...۔[۳]	قبروں کی زیارت آخرت کو یاد کرنے کا ذریعہ ہے۔

۳۔ اِنَّہُمۡ کَفَرُوۡا بِاللّٰہِ: یہ حکم اس لیے ہوا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف کفر پر قائم ہیں۔ کافر کے لیے نہ نماز ہے نہ استغفار۔

۴۔ وَمَاتُوۡا وَہُمۡ فٰسِقُوۡنَ: اور کفر کے ساتھ حالت فسق پر مر گئے ہیں۔ ان سے توبہ بھی واقع نہیں ہوئی۔

نماز جنازہ پڑھنا اور میت کی قبر پر بغرض دعا و زیارت کھڑا ہونا میت کے لیے عزت و تکریم ہے۔ منافق جو مسلمانوں کی صف میں داخل نہیں ہے، وہ عزت و تکریم کا مستحق نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن کی قبر پر کھڑے ہو کر اس کے لیے دعا کرنا سنت نبویؐ ہے۔

---

[۱] المنار ۱۰: ۵۷۳ [۲] الوسائل ۱۴: ۱۷۰۔ نسائی باب الاذن بذلك [۳] مستدرک الوسائل ۲: ۳۶۲۔ نسائی باب الاذن

وَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَاَوۡلَادُهُمۡ ؕ اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ اَنۡ یُّعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِی الدُّنۡیَا وَ تَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ کٰفِرُوۡنَ ﴿۸۵﴾	۸۵۔اوران کی دولت اور اولاد کہیں آپ کو فریفتہ نہ کریں، اللہ تو بس ان چیزوں کے ذریعے انہیں دنیا میں عذاب دینا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان کی جان کنی کفر کی حالت میں ہو۔

تفسیر آیات

وَلَا تُعۡجِبۡكَ: اس آیت کی تشریح اسی سورہ میں آیت ۵۵ کے ذیل میں ہو چکی ہے۔

وَ اِذَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَۃٌ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوۡا مَعَ رَسُوۡلِهِ اسۡتَاۡذَنَكَ اُولُوا الطَّوۡلِ مِنۡهُمۡ وَقَالُوۡا ذَرۡنَا نَكُنۡ مَّعَ الۡقٰعِدِیۡنَ ﴿۸۶﴾	۸۶۔اور جب کوئی ایسی سورت نازل ہوتی ہے (جس میں کہا جاتا ہے) کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کی معیت میں جہاد کرو تو ان (منافقین) میں سے دولت مند افراد آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمیں چھوڑ جائیں کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ (بیٹھے) رہیں۔

تشریح کلمات

الطَّوۡلِ: (ط و ل) فضل و احسان کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور دولت مند اور خوشحال طبقہ مراد لیا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاِذَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَۃٌ: اِذَاۤ کے لفظ سے تکرار کے معنی سمجھے جاتے ہیں کہ یہ واقعہ کئی بار بلکہ ہر بار پیش آیا کہ جب بھی ایمان باللہ اور رسولؐ کے ساتھ جہاد کا حکم آیا تو منافقین میں سے صاحبان ثروت نے ہمیشہ جنگ میں شرکت نہ کرنے کی اجازت مانگی۔

سُوۡرَۃٌ سے مراد یہاں جزء سورہ ہے۔ جیسا کہ قرآن کا اطلاق جزو اور کل دونوں پر ہوتا ہے۔

۲۔ وَقَالُوۡا ذَرۡنَا نَكُنۡ مَّعَ الۡقٰعِدِیۡنَ: اور یہ درخواست کی ہم کو بھی گھر بیٹھے رہنے والے بچوں معذوروں اور عورتوں کے ساتھ رہنے دو۔

رَضُوۡا بِاَنۡ یَّكُوۡنُوۡا مَعَ	۸۷۔انہوں نے گھر بیٹھنے والی عورتوں میں شامل

الۡخَوَالِفِ وَ طُبِعَ عَلٰی قُلُوۡبِھِمۡ فَھُمۡ لَا یَفۡقَھُوۡنَ﴿۸۷﴾

رہنا پسند کیا اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی پس وہ کچھ سمجھنے کے قابل ہی نہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ رَضُوۡا بِاَنۡ یَّکُوۡنُوۡا: خوشحال طبقے کے لوگ ہمیشہ مراعات طلب ہوتے ہیں۔ دولت و آسائش اور تن پروری کی وجہ سے ان میں مردانگی اور حمیت بھی نہیں رہتی۔ اس لیے قرآنی تعبیر میں ان کو گھر بیٹھنے والی عورتوں میں شامل کیا گیا جو ایک تحقیر آمیز طنز ہے۔

۲۔ وَ طُبِعَ عَلٰی قُلُوۡبِھِمۡ: ان کے کفر و نفاق کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگنا ایک طبعی امر ہے جس کی تفصیل گزشتہ متعدد مقامات میں آ چکی ہے۔

اہم نکات

۱۔ اسلامی ریاست کو جہاد و دفاع کے مسئلے میں مراعات یافتہ، خوشحال طبقہ سے توقعات وابستہ نہیں رکھنی چاہئیں۔

لٰکِنِ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ جٰھَدُوۡا بِاَمۡوَالِھِمۡ وَ اَنۡفُسِھِمۡ ؕ وَ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الۡخَیۡرٰتُ ۫ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴿۸۸﴾

۸۸۔ جب کہ رسول اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں نے اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا اور اب ساری خوبیاں انہی کے لیے ہیں اور وہی کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِھَا الۡاَنۡھٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡھَا ؕ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ﴿۸۹﴾

۸۹۔ ان کے لیے اللہ نے ایسی جنتیں تیار کی ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی عظیم کامیابی ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لٰکِنِ الرَّسُوۡلُ: سابقہ کردار کے مقابلے میں دوسرا کردار۔ کفر و نفاق کی تاریخ کے سیاہ صفحات کے مقابلے میں ایمان و جہاد کے تابندہ صفحات، ذلت و رسوائی کے کردار کے مقابلے میں عزت و وقار کا کردار۔ یہ کردار رسول خداؐ اور ان کے ساتھ ایمان لانے والے پیش کرتے ہیں: جٰھَدُوۡا بِاَمۡوَالِھِمۡ وَ اَنۡفُسِھِمۡ .... وہ مالی اور جانی جہاد سے دریغ نہیں کرتے۔

۲۔ وَاُولٰٓئِکَ لَھُمُ الۡخَیۡرٰتُ: دو قدروں کا مقابلہ۔ ہر ایک قدر کے اہل افراد کا ذکر ہے کہ عورتوں کی طرح گھروں میں بیٹھنے والوں کو عار و ننگ ملا ہے تو راہ خدا میں جہاد کرنے والے ساری خوبیوں کے مالک ہو گئے: وَاُولٰٓئِکَ لَھُمُ الۡخَیۡرٰتُ ....

۳۔ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ: یہ دنیا کی سیادت اور آخرت کی سعادت، دونوں جہاں میں کامیاب ہیں۔

۴۔ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمۡ: ان کے لیے جنت کی نعمتیں آمادہ ہیں اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے۔

اہم نکات

۱۔ ہر دور میں کامیابی ان لوگوں کا مقدر ہے جو جان مال کی قربانی دیتے ہیں: ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ۔

وَجَآءَ الۡمُعَذِّرُوۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ لِیُؤۡذَنَ لَھُمۡ وَ قَعَدَ الَّذِیۡنَ کَذَبُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ ؕ سَیُصِیۡبُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡھُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۝۹۰

۹۰۔ اور کچھ عذر تراشنے والے صحرانشین بھی (آپ کے پاس) آئے کہ انہیں بھی (پیچھے رہ جانے کی) اجازت دی جائے اور جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جھوٹ بولا وہ (گھروں میں) بیٹھے رہے ان میں سے جو کافر ہو گئے ہیں انہیں عنقریب دردناک عذاب پہنچے گا۔

تشریح کلمات

الۡاَعۡرَابِ: (ع ر ب) اگرچہ یہ لفظ عرب کی جمع ہے مگر یہ لفظ صحرانشین لوگوں کے ساتھ مختص ہو چکا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیت کی دو تفسیریں ہیں: ایک یہ کہ صحرانشین واقعی عذر رکھتے تھے اور دوسرے لوگ جنہیں کَذَبُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ کہا ہے، بغیر عذر کے گھروں میں بیٹھے رہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ صحرانشین لوگوں نے عذر تراش لیا لیکن دوسرے لوگوں نے تو یہ تک گوارا نہیں کیا اور عذر پیش کیے بغیر گھروں میں بیٹھے رہے۔ ان دونوں تفسیروں میں سے پہلی تفسیر قرین واقع معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ وَجَآءَ الۡمُعَذِّرُوۡنَ: صحرانشینوں میں سے جن کو واقعی عذر لاحق تھا وہ آپ کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوئے لِیُؤۡذَنَ لَھُمۡ تاکہ آپؐ کی طرف سے ان کو اجازت مل جائے۔ چنانچہ روایات میں آیا ہے کہ ان کے عذر معقول تھے۔

۲۔ وَقَعَدَ الَّذِیۡنَ کَذَبُوا: اور وہ منافق بغیر اجازت کے بیٹھے رہے جو اس بات میں بھی جھوٹے ہیں

کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ واضح رہے منافق، خدا اور رسول کی تکذیب کا اظہار نہیں کرتے بلکہ وہ ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اپنے ایمان کے اظہار میں جھوٹے ہیں۔

۳۔ سَیُصِیۡبُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا: ان بدوؤں میں سے جن لوگوں نے عذر تک پیش نہیں کیا ان کے لیے دنیا و آخرت میں عذاب الیم ہے۔

اہم نکات

۱۔ اگر واقعی عذر موجود ہے تو اسلامی قیادت کو اس عذر سے آگاہ کرنا چاہیے۔

لَیۡسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَی الۡمَرۡضٰی وَ لَا عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یَجِدُوۡنَ مَا یُنۡفِقُوۡنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوۡا لِلّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ؕ مَا عَلَی الۡمُحۡسِنِیۡنَ مِنۡ سَبِیۡلٍ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۹۱﴾

۹۱۔ ضعیفوں اور مریضوں اور ان لوگوں پر جن کے پاس خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے خیر خواہ ہوں، نیک لوگوں پر الزام کی کوئی راہ نہیں ہوتی اور اللہ بڑا معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

اس آیۂ شریفہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کا عذر معقول اور قابل قبول ہے۔

۱۔ لَیۡسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ: ضعفاء میں وہ لوگ آتے ہیں جن میں جہاد کرنے کی جسمانی طاقت نہیں ہے۔ جیسے بوڑھے، بچے، عورتیں، بدنی طور پر معذور لوگ۔

۲۔ وَ لَا عَلَی الۡمَرۡضٰی: جو بیماری لاحق ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر جہاد میں شرکت نہیں کر سکتے۔ جب بیماری ختم ہو جائے تو یہ جہاد میں شرکت کرتے ہیں۔

۳۔ لَا یَجِدُوۡنَ مَا یُنۡفِقُوۡنَ: جو لوگ مالی استطاعت نہیں رکھتے کہ جنگ میں شرکت کرنے کی صورت میں اپنے اہل و عیال کا خرچ برداشت کر سکیں اور ساتھ سامان سفر و خرچہ سفر مہیا کر سکیں۔ واضح رہے اس وقت اسلام کے پاس کوئی بیت المال نہیں تھا کہ ایسے لوگوں کے لیے خرچ فراہم کیا جا سکے۔ ان لوگوں کے جنگ میں شرکت نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۴۔ اِذَا نَصَحُوۡا لِلّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ: مذکورہ افراد کا عذر اس وقت قبول ہے۔ جب اللہ و رسولؐ کے لیے

مخلص ہوں نَصَحَ خالص کو کہتے ہیں۔ محاورا ہے نصح العسل۔ شہد خالص ہے۔ حدیث میں الدین النصیحة. دین خلوص کا نام ہے۔ یعنی وہ اپنے ایمان، اطاعت، قول و عمل اور جذبہ جہاد میں اخلاص رکھتے ہیں۔

۵۔ مَا عَلَی الۡمُحۡسِنِیۡنَ مِنۡ سَبِیۡلٍ: یہ نیکی کرنے والے لوگ ہوں گے۔ ان کے خلاف کسی قسم کا قدم اٹھانے کے لیے کوئی جواز، کوئی سبیل نہیں ہے۔ سبیل سے پہلے عَلی ہو تو سبیل سے مراد الزام اور مواخذہ ہے۔

درج بالا چیزیں اس صورت میں قابل درگزر عذر بنتی ہیں جب یہ چیزیں اس کی نیت عزم اور ارادے کے سامنے رکاوٹ ہوں۔ یعنی یہ شخص اللہ اور رسولؐ کا خیر خواہ تھا، جذبہ جہاد سے سرشار تھا، اعلان جہاد سن کر یہ بستر پر تلملاتا ہے اور جہاد میں شرکت سے رہ جانے پر افسوس کرتا ہے۔

ان لوگوں کے لیے یہ چیزیں عذر نہیں بنتیں جو جہاد میں شرکت کا جذبہ نہیں رکھتے، بیماری اور ضعیفی ان کے عزم و ارادے کے سامنے رکاوٹ نہیں بلکہ وہ تو خوش ہوتے ہیں کہ اچھے موقع پر بیماری آ گئی، ورنہ یہ مصیبت اٹھانا ہی پڑتی۔

اہم نکات

۱۔ اعمال کا حسن، عمل کنندہ کے حسن کے تابع ہے۔ لہٰذا بیمار اگر نیک آدمی ہے تو اس پر گرفت نہیں ہے۔ اگر نیک نہیں ہے تو گرفت میں آتا ہے جب کہ جہاد میں دونوں نے شرکت نہیں کی۔

وَّلَا عَلَی الَّذِیۡنَ اِذَا مَاۤ اَتَوۡکَ لِتَحۡمِلَہُمۡ قُلۡتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحۡمِلُکُمۡ عَلَیۡہِ ۪ تَوَلَّوۡا وَّ اَعۡیُنُہُمۡ تَفِیۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ حَزَنًا اَلَّا یَجِدُوۡا مَا یُنۡفِقُوۡنَ ﴿۹۲﴾

۹۲۔ اور نہ ہی ان لوگوں پر کوئی الزام ہے جنہوں نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ ان کے لیے سواری فراہم کریں، آپ نے کہا: میرے پاس کوئی سواری موجود نہیں کہ تمہیں اس پر سوار کروں، (یہ سن کر) وہ واپس گئے جب کہ ان کی آنکھیں اس غم میں آنسو بہا رہی تھیں کہ ان کے پاس خرچ کرنے کے لیے کچھ نہ تھا۔

تفسیر آیات

۱۔ وَّلَا عَلَی الَّذِیۡنَ: نہ ہی ایسے لوگوں پر کوئی الزام ہے جو سچے دل سے جہاد میں جانا چاہتے ہیں لیکن سواری نہیں ہے۔ اے رسولؐ! وہ آپؐ سے سواری کا مطالبہ کرتے ہیں چونکہ ۶۱۰ کلومیٹر کا فاصلہ بغیر سواری کے طے کرنا ممکن نہیں۔ یہ لوگ سابقہ آیت میں مذکور لَا یَجِدُوۡنَ مَا یُنۡفِقُوۡنَ میں شامل ہیں مگر ان کے خلوص کی وجہ سے از باب ذکر الخاص بعد العام ان کا خصوصی طور پر ذکر ہو رہا ہے جو ان کے لیے

فضیلت ہے۔

۲۔ قُلۡتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحۡمِلُکُمۡ : اے رسولؐ! آپؐ نے ان سے فرمایا: میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔ قابل توجہ ہے کہ اسلامی ریاست ایک سپر پاور کے ساتھ حالت جنگ میں ہے۔ اس جنگ کے سپاہی اسلحہ نہیں مانگتے صرف وسائل سفر مانگتے ہیں۔ اسلامی ریاست کے پاس سپاہیوں کے لیے نہ سواری ہے، نہ زاد راہ ہے۔

۳۔ تَوَلَّوۡا وَّ اَعۡیُنُہُمۡ تَفِیۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ: وہ واپس جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں کہ جہاد کی فضیلت حاصل کرنے سے عاجز رہ گئے۔

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو جذبۂ جہاد سے سرشار ہیں۔ اللہ اور رسولؐ کے خیر خواہ ہیں لیکن ان کے اس نیک ارادے کے سامنے وسائل کا فقدان مانع ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ جنگی وسائل نہ حکومت کے پاس ہیں، نہ عوام کے پاس۔ اس وقت ان کے سچے جذبات ان کے مقدس رخساروں پر آنسوؤں کی شکل میں شہادت دے رہے تھے۔

اہم نکات

۱۔ ان لوگوں کو کوئی غم نہ ہوگا جو جہاد میں شرکت کرنا ممکن نہ ہونے کے غم میں رو رہے ہیں: اَعۡیُنُہُمۡ تَفِیۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ ....

اِنَّمَا السَّبِیۡلُ عَلَی الَّذِیۡنَ یَسۡتَاۡذِنُوۡنَکَ وَ ہُمۡ اَغۡنِیَآءُ ۚ رَضُوۡا بِاَنۡ یَّکُوۡنُوۡا مَعَ الۡخَوَالِفِ ۙ وَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۳﴾

۹۳۔ الزام بس ان لوگوں پر ہے جو دولت مند ہونے کے باوجود آپ سے درخواست کرتے ہیں (کہ جہاد سے معاف کیے جائیں) انہوں نے گھر بیٹھنے والی عورتوں میں شامل رہنا پسند کیا اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی لہٰذا وہ نہیں جانتے۔

تفسیر آیات

۱۔ اِنَّمَا السَّبِیۡلُ: الزام اور مؤاخذہ ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جو مال و ثروت کے اعتبار سے اور بدنی اعتبار سے بھی جہاد کرنے پر قادر ہیں۔ پھر بھی وہ عذریں تراشتے ہیں۔

۲۔ رَضُوۡا بِاَنۡ یَّکُوۡنُوۡا مَعَ الۡخَوَالِفِ: یہ عار و ننگ انہیں قبول ہے کہ گھر بیٹھنے والی عورتوں کے ساتھ بیٹھے رہیں۔

٣۔ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ : ان کے اپنے جرائم کی وجہ سے اللہ ان کو ان کے حال پر چھوڑتا ہے۔ جب ہدایت کے سرچشمہ سے ان کا رابطہ کٹ جاتا ہے تو پھر دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔

٤۔ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٩٣﴾ : نتیجتاً اپنے نفع و نقصان کے علم کے بھی قابل نہیں رہتے۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۭ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ۭ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٤﴾

٩٤۔ جب تم ان کے پاس واپس پہنچ جاؤ گے تو وہ تمہارے سامنے عذر پیش کریں گے، کہد یجیے: عذر مت تراشو! ہم تمہاری بات ہرگز نہیں مانیں گے، اللہ نے ہمیں تمہارے حالات بتا دیے ہیں اور عنقریب اللہ تمہارے اعمال دیکھے گا اور اس کا رسول بھی، پھر تم لوگ غیب و شہود کے جاننے والے کی طرف پلٹائے جاؤ گے پھر وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

تفسیر آیات

١۔ يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ : جب تم (مدینہ) واپس پہنچ جاؤ گے تو وہ تمہارے سامنے عذر پیش کریں گے۔ اس آیت سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ آیات تبوک کے سفر کے دوران واپس پہنچنے سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ میں جمع کا لفظ استعمال فرمایا۔ چونکہ منافقین اپنا عذر صرف رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں نہیں، دوسرے مؤمنین و مجاہدین کی خدمت میں بھی پیش کرنے والے تھے۔

٢۔ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ : آپ کہد یجیے عذر پیش نہ کرو۔ ہم تمہارے عذر کو نہیں مانیں گے۔ تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جن کی بات پر حسن ظن رکھنا یا حسن ظاہر پر عمل کرنا چاہیے۔

٣۔ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ : اللہ تعالیٰ نے تمہاری خبریں ہمیں بتا دی ہیں۔ تمہارا راز فاش ہو چکا ہے۔

٤۔ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ : جنگ تبوک کے بعد تم کیا کچھ کرنے والے ہو، وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے سامنے آئے گا۔ پھر تمہارے اعمال کے تناظر میں تم کو تولا جائے گا۔

٥۔ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ : پھر تم کو غیب و شہود کے جاننے والے کی طرف پلٹایا جائے گا۔ وہاں اللہ تعالیٰ کے سامنے تمہیں جواب دینا ہوگا۔

اہم نکات

۱۔ مجرم ہمیشہ عذر تراشیاں کرتا ہے: یَعۡتَذِرُوۡنَ ....

۲۔ اسلامی قیادت کو چاہیے ایسے لوگوں کا عذر قبول نہ کریں: لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکُمۡ ....

سَیَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰہِ لَکُمۡ اِذَا انۡقَلَبۡتُمۡ اِلَیۡہِمۡ لِتُعۡرِضُوۡا عَنۡہُمۡ ؕ فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡہُمۡ ؕ اِنَّہُمۡ رِجۡسٌ ۫ وَّ مَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۹۵﴾

۹۵۔ جب تم ان کی طرف لوٹ کر جاؤ گے تو وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے درگزر کرو، پس تم ان سے درگزر کر دینا یہ لوگ ناپاک ہیں اور ان سے سرزد ہونے والے اعمال کی سزا میں ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ سَیَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰہِ لَکُمۡ اِذَا انۡقَلَبۡتُمۡ: جب تم واپس پہنچ جاؤ گے تو یہ منافقین اللہ کی قسمیں کھائیں گے۔ لِتُعۡرِضُوۡا عَنۡہُمۡ تاکہ تم ان سے درگزر کرو۔ فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡہُمۡ ان کو اعتنا میں نہ لاؤ۔ پہلے جملے لِتُعۡرِضُوۡا میں اعراض سے مراد درگزر ہے کہ وہ چاہیں گے کہ ان کے عذر قبول ہوں اور ان کو درگزر کیا جائے۔ دوسرا جملے فَاَعۡرِضُوۡا میں اعراض سے مراد بے اعتنائی ہے۔ یعنی ان منافقین کی باتوں کو اعتنا میں نہ لاؤ کیونکہ یہ لوگ ناپاک ہیں۔ ان کو نزدیک نہ آنے دیں۔ یعنی منافقین چاہیں گے ان کا عذر قبول کر کے ان سے درگزر کیا جائے۔ حکم یہ ہوا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡہُمۡ ان کی اس خواہش کو اعتنا میں نہ لائیں۔ ان کے جرائم کی پردہ پوشی نہ کریں ان کو فاش کریں۔

اہم نکات

۱۔ ناپاک لوگوں سے قطع تعلقات کرنا چاہیے: فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡہُمۡ اِنَّہُمۡ رِجۡسٌ ....

یَحۡلِفُوۡنَ لَکُمۡ لِتَرۡضَوۡا عَنۡہُمۡ ۚ فَاِنۡ تَرۡضَوۡا عَنۡہُمۡ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَرۡضٰی عَنِ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۹۶﴾

۹۶۔ یہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ پس اگر تم ان سے راضی ہو بھی جاؤ تو اللہ یقیناً فاسق قوم سے راضی نہ ہو گا۔

تفسیر آیات

۱۔ یَحۡلِفُوۡنَ لَکُمۡ : منافقین تمہارے سامنے جو قسمیں کھائیں گے، ان کا مقصد دینی نہیں ہے بلکہ جہاں تک دنیاوی مفادات تم سے وابستہ ہیں، ان کی خاطر پہلے تو یہ چاہتے ہیں کہ تم ان سے درگزر کرو۔

۲۔ لِتَرۡضَوۡا عَنۡہُمۡ : پھر دوسرے مرحلے میں چاہتے ہیں کہ تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ۔

۳۔ فَاِنۡ تَرۡضَوۡا: اگر تم کسی مفاد، مصلحت کے تحت ان سے راضی ہو بھی جاؤ تو اللہ ان سے راضی نہ ہوگا۔ اس جملے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ منافق کی رضا جوئی، اللہ کی رضا جوئی کے مقابلے میں ہے۔

اہم نکات

۱۔ کسی مجرم کو لوگ پسند بھی کریں، خواہ اسے پسند کرنے والے مسلمان ہی کیوں نہ ہوں اسے اللہ ہرگز پسند نہیں کرتا: فَاِنۡ تَرۡضَوۡا ....

اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ کُفۡرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجۡدَرُ اَلَّا یَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۹۷﴾

۹۷۔ یہ بادیہ نشین بدو کفر و نفاق میں انتہائی سخت ہیں اور اس قابل ہی نہیں کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو کچھ نازل کیا ہے ان کی حدود کو سمجھ سکیں اور اللہ بڑا دانا اور حکمت والا ہے۔

تشریح کلمات

اَجۡدَرُ: (ج د ر) الجدیر سزا وار اور قابل کے معنوں میں ہے۔ جَدۡرَ کے معنی کسی چیز کے لائق ہونے کے ہیں۔ اس سے صیغہ صفت جدیرٌ آتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ کُفۡرًا: معلوم ہوتا ہے اس آیت سے آگے کی چند آیات غزوہ تبوک سے واپسی پر نازل ہوئی ہیں۔ یہاں ذکر دیہاتی عربوں کا ہے کہ یہ لوگ تہذیب و تمدن سے دور ہونے کی وجہ سے سخت مزاج، تندخو اور کفر و نفاق میں بھی شہریوں سے زیادہ سخت مؤقف رکھنے والے ہوتے ہیں۔

۲۔ وَّ اَجۡدَرُ اَلَّا یَعۡلَمُوۡا: علماء، صالحین کی صحبت نہ ملنے کی وجہ سے ان میں انسانی قدریں بیدار نہیں ہوتیں، اس لیے یہ لوگ اسلام کے انسان ساز دستور و احکام کو بھی نہیں سمجھ پاتے۔

اہم نکات

۱۔ صالحین و علماء کی ہم نشینی سے انسان بدتہذیبی سے دور رہتا ہے۔

وَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ مَغۡرَمًا وَّ یَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَیۡہِمۡ دَآئِرَۃُ السَّوۡءِ ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۹۸﴾

۹۸۔ اور ان بدوؤں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ تم پر گردش ایام آئے، بری گردش خود ان پر آئے اور اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

تشریح کلمات

مَغۡرَمًا: (غ ر م) الغرام وہ مالی نقصان جو کسی قسم کی خیانت یا جرم و جنایت کے بغیر انسان کو اٹھانا پڑے۔

الدَّوَآئِرَ: (د و ر) الدائرۃ مصیبت، گردش زمانہ کے معنوں میں آتا ہے۔

دَآئِرَۃُ: کسی مکروہ چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بالمقابل جو محبوب چیز گھوم کر آئے اسے دولۃ کہا جاتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَا یُنۡفِقُ مَغۡرَمًا: یہ بدو لوگ راہ خدا میں خرچ ہونے والے مال کو تاوان خیال کرتے ہیں۔ چونکہ جس راہ میں یہ اموال خرچ ہوتے ہیں وہ اس راہ کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ اس کے خلاف ہیں۔ لہٰذا ایسی چیزوں میں خرچ کرنا مال کا تلف ہے۔

۲۔ وَّ یَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَآئِرَ: وہ راہ اسلام کو نہ صرف برحق نہیں سمجھتے بلکہ اس کو چند دنوں کا ایک شور سمجھتے ہیں اور اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ یہ شور کب ختم ہو گا۔ گردش زمانہ کے سیلاب میں ان مسلمانوں نے بہہ جانا ہے۔

۳۔ عَلَیۡہِمۡ دَآئِرَۃُ السَّوۡءِ: اس آیت میں جملہ عَلَیۡہِمۡ دَآئِرَۃُ السَّوۡءِ بری گردش خود ان منافقین کے خلاف ہو، ایک پیشگوئی کی حیثیت رکھتا ہے کہ گردش زمانہ میں خود منافقین مبتلا ہوں گے۔ چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا۔ اسلام کا دئرہ وسیع ہوتا گیا اور منافقین پر زمین تنگ ہوتی گئی۔

اہم نکات

۱۔ حاسداور معاند خود بلاؤں سے دو چار ہوتے ہیں۔

وَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ یَتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰہِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّہَا قُرۡبَۃٌ لَّہُمۡ ؕ سَیُدۡخِلُہُمُ اللّٰہُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۹۹﴾

۹۹۔ اور انہی بدوؤں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے تقرب اور رسول سے دعائیں لینے کا ذریعہ سمجھتے ہیں ہاں! یہ ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے اور اللہ انہیں عنقریب اپنی رحمت میں داخل کرے گا بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ: بدوؤں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ سب بدو ایک جیسے نہیں ہیں۔ صحرا نشین اور دور افتادہ جگہوں پر ہونے کے باوجود ایمان کے نور سے ان کے دل روشن ہوتے ہیں۔

۲۔ وَ یَتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ قُرُبٰتٍ: صحرا نشینوں میں سے اہل ایمان کا ذکر ہے۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے کی وجہ سے جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں، اس کے کئی مقاصد ان کے سامنے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے قرب الٰہی حاصل ہو جائے۔ وہ اس بات کا شعور رکھتے ہیں کہ مال قرب الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔

۳۔ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ: دوسرا یہ کہ رسولؐ کی دعائیں ان کو نصیب ہو جائیں۔ چونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے یہ حکم ہے کہ زکوٰۃ وصدقات دینے والوں کے لیے دعا کریں:

وَ صَلِّ عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمۡ ... [1] اور ان کے حق میں دعا کریں یقیناً آپ کی دعا ان کے لیے موجب تسکین ہے۔

اہم نکات

۱۔ راہ خدا میں خرچ کرنا رضائے خدا و دعائے رسولؐ کا ذریعہ ہے۔

----

[1] ۹ توبہ۔۱۰۳

وَ السّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُہٰجِرِیۡنَ وَ الۡاَنۡصَارِ وَ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡہُمۡ بِاِحۡسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ وَ اَعَدَّ لَہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ تَحۡتَہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۰۰﴾

۱۰۰۔اور مہاجرین و انصار میں سے جن لوگوں نے سب سے پہلے سبقت کی اور جو نیک چال چلن میں ان کے پیرو ہوئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسی جنتیں تیار کی ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ابد تک ہمیشہ رہیں گے، یہی عظیم کامیابی ہے۔

تفسیر آیات

انصار و مہاجرین کے فی الواقع چار گروہ بنتے ہیں۔ ان میں سے اہل نفاق کا ذکر آنے کے بعد باقی اہل ایمان کو تین گروہ میں تقسیم فرمایا:

۱۔ وَالسّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ : مہاجرین میں سابقین اولین ان اصحاب کو کہتے ہیں جو اپنا وطن (مکہ) چھوڑ کر رسول اللہؐ کی اطاعت میں مدینہ آئے۔ سابقین اولین مہاجرین ہیں جو جنگ بدر سے پہلے ایمان لے آئے اور ہجرت کی۔ بدر کے موقع پر نفاق شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ سورۂ انفال میں ذکر ہوا:

اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ غَرَّ ہٰۤؤُلَآءِ دِیۡنُہُمۡ ....[1]

جب (ادھر) منافقین اور جن کے دلوں میں بیماری تھی کہہ رہے تھے: انہیں تو ان کے دین نے دھوکا دے رکھا ہے....

اور جنگ بدر ۲ھ میں ہوئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت کے دوسرے سال نفاق شروع ہو گیا تھا۔

لہٰذا سابقین اولین میں وہ لوگ شامل ہیں جنہوں نے حبشہ اور مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ اس دین حق کے اختیار کرنے کے جرم میں مصائب و آلام برداشت کیے۔ دین کی بنیادوں کو استوار کر دیا اور ناقابل تحمل اذیتوں کو برداشت کیا۔ ان میں سب سے پہلے جنہوں نے ایمان لانے میں سبقت کی ہے، عورتوں میں حضرت خدیجہؑ اور مردوں میں حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ چنانچہ حاکم ابو عبد اللہ کا یہ مؤقف مشہور ہے:

لا اعلم خلافا بین اصحاب التواریخ ان علیاً اولھم اسلاماً۔[2]

علمائے تاریخ میں اس بات پر کوئی اختلاف میرے علم میں نہیں ہے کہ علی نے ان میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا ہے۔

صاحب المنار کا مؤقف یہ ہے: سب سے پہلے علی الاطلاق حضرت خدیجہ نے اسلام قبول کیا۔ اس

---

[1] ۸ انفال: ۴۹ [2] تفسیر قرطبی ۸: ۲۳۶

کے بعد آپؐ کے گھر کے افراد میں سے حضرت علیؑ اور زید بن حارثہؓ نے اور گھر سے باہر سے حضرت ابو بکر نے۔[1]

۲۔ انصار میں سے سابقین اولین میں سب سے پہلے وہ سات افراد ہیں جنہوں نے بعثت کے گیارہویں سال منیٰ کی بیعت عقبہ میں شرکت کی۔ ان کے بعد وہ ستر افراد ہیں جنہوں نے دوسری مرتبہ بعثت کے بارہویں سال میں بیعت میں شرکت کی۔ ان کے بعد ان لوگوں کا رتبہ آتا ہے جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرستادہ مصعب بن عمیر کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ ان کے بعد ان لوگوں کا رتبہ آتا ہے جنہوں نے رسول اسلامؐ کی آمد کے موقع پر اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد جب اسلام نے قوت پکڑلی تو ہجرت کے دوسرے سال سے منافقت شروع ہوگئی تھی۔

۳۔ تابعین ان کو کہتے ہیں جو مہاجرین و انصار کی نیک کرداری میں ان کی اتباع کریں۔ اس میں دو جملے قابل توجہ ہیں:

i۔ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ : وہ لوگ جو ان کے پیرو ہوئے۔ اس سے مہاجرین و انصار کے مقام و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ اور مقتدیٰ ثابت ہوئے۔ ان کا ایمان وایثاراور جهاد فی سبیل اللّٰہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

ii۔ بِاِحْسَانٍ : یہ پیروی مطلق نہیں بلکہ نیک کرداری کی قید ہے۔

دریابادی صاحب اس جگہ لکھتے ہیں:

> بِاِحْسَانٍ کی قید بہت قابل غور ہے۔ مہاجر ہوں یا انصار، صحابہ کرام کی کوئی بھی قسم ہو، بہرحال یہ حضرات معصوم نہ تھے۔ عصمت صرف خاصۂ نبوت ہے۔ اس لیے حکم ان حضرات کی اتباع مطلق کا نہیں بلکہ قید یہ لگی ہوئی ہے کہ نیک کرداری میں ان کی اتباع کی جائے۔

اس کے بعد قرطبی کی یہ عبارت نقل کرتے ہیں:

باحسان: ای ما یتبعون فیه من افعالهم و اقوالهم لا فی ما صدر عنهم من ألهفوات و الزلات اذ لم یکونوا معصومین.	باحسان کا مطلب یہ ہے کہ ان کے افعال و اقوال میں جو نیک ہیں ان کی اتباع کی جائے۔ نہ یہ کہ ان کی غلطیوں ولغزشوں کی پیروی کی جائے چونکہ یہ حضرات معصوم تو تھے نہیں۔

باحسان کی قید ایسے ہی ہے جیسے درج ذیل آیت میں بایمان کی قید ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ....[2]	اور جولوگ ایمان لے آئے اوران کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی پیروی کی ان کی اولاد کو (جنت میں) ہم ان سے ملا دیں گے....

---

[1] المنار ۱۱:۸ [2] ۵۲ طور :۲۱

یہاں کسی تعصب اور تنگ نظری کے بغیر انصاف کی بات یہ نکلتی ہے کہ جب مہاجرین و انصار کی نیک کرداری پر عمل کرنا ہے تو یہ تشخیص لازم ہے کہ ان کا کون سا کردار نیک تھا اور کون سا نیک نہ تھا۔ بقول قرطبی کون سا کردار احسان تھا اور کون سا کردار ھفوات و ذلات تھا۔ اس تشخیص کو طعن کہنا ناانصافی ہے۔ ایک شخص پوری دیانت و امانت کے ساتھ مستند مصادر سے ان کے ھفوات و زلات کو سامنے لاتا ہے تو اس میں طعن نہیں بلکہ یہ اتباع احسان کے لیے ضروری ہے۔

صحیح بخاری میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہؐ سے عرض کیا:

یا رسول اللّٰہ یدخل علیك البر و الفاجر فلو امرت امھات المؤمینن بالحجاب فانزل اللّٰہ اٰیة الحجاب۔	یا رسول اللہ آپ کے پاس نیک لوگ بھی آتے ہیں اور فاجر لوگ بھی۔ کیا اچھا ہوا گر آپ امہات مؤمنین کو پردے کا حکم دیں۔ چنانچہ آیہ حجاب نازل ہوئی۔

اس سے معلوم ہوا رسول اللہؐ کی خدمت میں پہنچنے والوں میں فاجر لوگ بھی ہوتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ افراد امت میں سب سے زیادہ فضیلت ان مہاجرین کو حاصل ہے جنہوں نے ایمان و ہجرت میں سبقت حاصل کی۔ اس کے بعد انصار کو فضیلت حاصل ہے جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت میں سبقت حاصل کی۔ ان کے بعد ان لوگوں کا درجہ آتا ہے جنہوں نے نیک کرداری میں ان کی اتباع کی۔

رَّضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ: ان تینوں گروہوں پر حسب درجات اللہ راضی ہے۔ اللہ کی خوشنودی ایک ناقابل وصف و بیان نعمت ہے۔ وَ رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ...[1] یہ جملہ بھی ایک دلیل ہے کہ اللہ ان لوگوں پر راضی ہے جن سے اللہ کو ناپسندیدہ حرکات سرزد نہیں ہوئیں۔

اہم نکات

۱۔ مہاجرین میں بھی سب سے افضل وہ ٹھہرا، جو ایمان میں سابق و اول ہے۔

۲۔ تابعین میں بھی افضل وہ ٹھہرا جو اتباع احسان میں سب سے آگے ہو۔

وَ مِمَّنۡ حَوۡلَکُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ مُنٰفِقُوۡنَ ۚۛ وَ مِنۡ اَہۡلِ الۡمَدِیۡنَۃِ ۟ۛ مَرَدُوۡا عَلَی النِّفَاقِ ۟ لَا تَعۡلَمُہُمۡ ؕ نَحۡنُ نَعۡلَمُہُمۡ ؕ سَنُعَذِّبُہُمۡ	۱۰۱۔ اور تمہارے گرد و پیش کے بدوؤں میں اور خود اہل مدینہ میں بھی ایسے منافقین ہیں جو منافقت پر اڑے ہوئے ہیں، آپ انہیں نہیں جانتے (لیکن) ہم انہیں جانتے ہیں، عنقریب

----

[1] ۹ توبۃ: ۷۲

مَّرَّتَیۡنِ ثُمَّ یُرَدُّوۡنَ اِلٰی عَذَابٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۰۱﴾	ہم انہیں دوھرا عذاب دیں گے پھر وہ بڑے عذاب کے لیے لوٹائیں جائیں گے۔

تشریح کلمات

مَرَدُوۡا: (م ر د) المرد اڑ جانا۔ مہارت حاصل کرنا یا بمعنی سرکش وطغیان ہونا کے ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ مِمَّنۡ حَوۡلَکُمۡ: مدینہ کے گرد و پیش دیہاتوں میں موجود اہل نفاق کی اجمالی نشاندھی ہے اور دیہاتی منافقین اپنی دیہی سطح فکر کے مطابق منافق ہیں۔

دو مرتبہ عذاب سے مراد ممکن ہے ایک دنیا میں فضیحت و رسوائی، دوسرا عذاب قبر اور عذاب عظیم آخرت میں ہو اور ممکن ہے دنیا میں ہی دوہرا عذاب ملے لیکن آیت میں اس عذاب کی نوعیت کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔

۲۔ وَمِنۡ اَہۡلِ الۡمَدِیۡنَۃِ ۟ۛ مَرَدُوۡا عَلَی النِّفَاقِ: شہری ہونے کے اعتبار سے مدینہ کے باشندوں کو نفاق میں مہارت ہے اور وہ ہوشیاری سے نفاق کرتے ہیں۔ مثلاً جہاں کوئی بے ضرر موقف اختیار کرنا ہوتا ہے وہاں بڑھ چڑھ کر بولنا، زیادہ اخلاص کا مظاہرہ کرنا اور جہاں کوئی قربانی دینا پڑتی ہے وہاں بڑی مہارت سے عذریں تراشنا وغیرہ۔

۳۔ لَا تَعۡلَمُہُمۡ ؕ نَحۡنُ نَعۡلَمُہُمۡ: آپؐ ان منافقوں کو نہیں جانتے۔ مصلحت اسی میں تھی کہ ان کے بارے میں اجمالی علم ہو اور تفصیلی علم اللہ نے کسی کی طرف منتقل نہ کیا ہو۔ چنانچہ بعض منافقین کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم ہونے پر بھی ان کو برملا نہ کرنے کا حکم دیا جاتا تھا۔ تبوک سے واپسی پر ان منافقین کا علم ہو گیا تھا جنہوں نے رسول اللہؐ کو شہید کرنے کی سازش کی تھی پھر بھی ان کو بے نقاب نہیں کیا اور حضرت حذیفہؓ کو حکم فرمایا کہ یہ راز کبھی بھی فاش نہ کرنا۔

چنانچہ ابن عساکر کی روایت ہے کہ ایک شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا دی تو وہ سچا مسلمان ہو گیا۔ اس نے کہا: یا رسول اللہؐ میرے اور بھی منافق ساتھی ہیں۔ میں ان کا رئیس تھا۔ کیا میں ان کو آپ کے پاس لے آؤں؟ تو حضورؐ نے فرمایا:

... لاتخرقن علی احد ستراً۔[۱]	کسی کا پردہ چاک نہ کرو۔

لَا تَعۡلَمُہُمۡ اور قَدۡ نَبَّاَنَا اللّٰہُ مِنۡ اَخۡبَارِکُمۡ ...[۲] میں منافات نہیں ہے۔ چونکہ جنگ تبوک میں جن

---

۱ تفسیر القاسمی۔ ۸:۳۰۶	۲ ۹ توبۃ:۹۴

لوگوں نے جنگ میں شرکت نہیں کی ان کے بارے میں اجمالی خبر دی تھی اور اس آیت میں تفصیلی علم کی نفی ہے۔ اسی طرح آیہ:

وَلَتَعۡرِفَنَّهُمۡ فِیۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ ...[1] اور آپ انداز کلام سے ہی انہیں ضرور پہچان لیں گے۔

کے ساتھ بھی منافات اور تضاد نہیں ہے چونکہ کچھ منافقین کو حضورؐ بھی جانتے تھے۔ اس آیت میں فرمایا کہ آپؐ ان سب منافقین کو نہیں جانتے۔

۴۔ سَنُعَذِّبُهُمۡ مَّرَّتَیۡنِ: ہم انہیں دوہرا عذاب دیں گے۔ ایک بار دنیا میں رسوا کر کے دوسری بار قبر میں یا دنیا میں قتل و اسیری اور قبر کا عذاب مراد ہے۔

اہم نکات

۱۔ منافق اپنی منافقت پر مہارت رکھتا ہے: مَرَدُوۡا عَلَی النِّفَاقِ ....

۲۔ نفاق یعنی دو روئی اختیار کرنے والے کو دوہرا عذاب ملے گا: سَنُعَذِّبُهُمۡ مَّرَّتَیۡنِ ....

وَ اٰخَرُوۡنَ اعۡتَرَفُوۡا بِذُنُوۡبِهِمۡ خَلَطُوۡا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا ؕ عَسَی اللّٰهُ اَنۡ یَّتُوۡبَ عَلَیۡهِمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۰۲﴾

۱۰۲۔ اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا، انہوں نے نیک عمل کے ساتھ دوسرے برے عمل کو مخلوط کیا بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

شان نزول

جنگ تبوک میں کچھ ضعیف الایمان انصار نے بھی شرکت سے پہلوتہی کی تھی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ پیچھے رہنے والوں کی مذمت میں آیات نازل ہوئی ہیں تو انہوں نے ندامت سے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہم کو کھولیں گے۔ ان کی توبہ کی قبولیت کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر آیات

۱۔ وَ اٰخَرُوۡنَ اعۡتَرَفُوۡا بِذُنُوۡبِهِمۡ: کچھ دوسرے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف

----

[1] ۴۷ محمد: ۳۰

کیا۔ وہ گناہ کا ارتکاب کر کے عذر اور بہانے نہیں بناتے اور ان کا ضمیر مردہ بھی نہیں ہے۔ گناہ کو گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے:

سَيِّئَةٌ تَسُوؤُكَ خَيْرٌ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ حَسَنَةٍ تُعْجِبُكَ۔[1] وہ گناہ جو خود تجھے بُرا لگے، بہتر ہے اس نیکی سے جو تجھے خود پسندی میں مبتلا کر دے۔

۲۔ خَلَطُوۡا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا: انہوں نے نیک عمل کے ساتھ دوسرے برے عمل کو مخلوط کیا ہے۔ اگرچہ ان لوگوں نے گناہ کا ارتکاب کیا ہے تاہم ان کے اعمال صالح بھی ہیں۔ ان کا کوئی عمل حبط نہیں ہوا۔

۳۔ عَسَی اللّٰہُ اَنۡ یَّتُوۡبَ عَلَیۡہِمۡ: عَسَی امید ہے۔ امید ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرے۔ عمل صالح کے اثرات میں سے ایک یہ ہے کہ ان کو توبہ کرنے کی توفیق ملے گی۔ عَسَی امید ہے، اس لیے فرمایا تا کہ بندہ خوف اور امید کے درمیان رہے اور توبہ کو چھوڑ کر صرف عفو الٰہی کے بھروسے پر نہ رہے۔

اہم نکات

۱۔ یہ آیت گنہگار مؤمنین کے لیے نوید ہے، بشرطیکہ توبہ و اعتراف گناہ ہو۔

۲۔ عَسَی اللہ کی طرف سے مکمل یقین دہانی ہے۔

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ صَدَقَۃً تُطَہِّرُہُمۡ وَ تُزَکِّیۡہِمۡ بِہَا وَ صَلِّ عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۱۰۳﴾

اَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ ہُوَ یَقۡبَلُ التَّوۡبَۃَ عَنۡ عِبَادِہٖ وَ یَاۡخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰہَ ہُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۰۴﴾

۱۰۳۔ (اے رسول) آپ ان کے اموال میں سے صدقہ لیجیے اس کے ذریعے آپ انہیں پاکیزہ اور بابرکت بنائیں اور ان کے حق میں دعا بھی کریں یقیناً آپ کی دعا ان کے لیے موجب تسکین ہے اور اللہ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔

۱۰۴۔ کیا انہیں علم نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور صدقات بھی وصول کرتا ہے اور یہ کہ اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

جب ان حضرات کی توبہ قبول ہوگئی اور ستون مسجد کی بندش سے آزاد ہوگئے تو وہ اپنے اموال لے

---

[1] مجمع البیان. وسائل الشیعة ۱: ۵ باب تحریم الاعجاب بالنفس و ....

کر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیے تو آپؐ نے فرمایا: مجھے اس سلسلے میں کوئی حکم نہیں ملا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

۱۔ خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً: شان نزول اگرچہ خاص افراد ہیں لیکن قرآن کا حکم عام ہے، قیامت تک کے لیے ہے اور صاحبان نصاب سے زکوٰۃ وصول کرنا، مستحب زکوٰۃ و صدقات وصول کرنا، سب اس میں شامل ہیں۔

۲۔ تُطَهِّرُهُمۡ: اے رسول زکوٰۃ وصول کر کے ان لوگوں کو بخل، طمع، بے رحمی، دولت پرستی جیسے برے اوصاف سے پاک کریں۔

۳۔ تُزَكِّيۡهِمۡ: ان میں سخاوت، ہمدردی، ایثار و قربانی جیسے اچھے اوصاف کی نشو ونما کریں۔ اس طرح زکوٰۃ اوصاف رذیلہ کی تطہیر اور اوصاف حمیدہ کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔

۴۔ وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ: زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے لیے دعا کریں۔ اگرچہ واجب کام ادا کیا جا رہا ہے، اگرچہ یہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا ثواب خود ان کو ملتا ہے، اگرچہ تمام فوائد و نتائج زکوٰۃ دینے والے کے حق میں ہیں، اگرچہ زکوٰۃ وصول کرنے والا خود اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا، پھر بھی زکوٰۃ دہندہ کے حق میں دعا کرنی چاہیے۔ اس کی قدر دانی کرنی چاہیے کیونکہ اس کے اس عمل خیر میں اس کے ذاتی اجر و ثواب کے علاوہ مسلم معاشرے کے ایک محروم طبقے کے لیے آسودگی ہے۔ مسکینوں کی دادرسی ہے۔ غریب و نادار لوگوں کی آس ہے۔

۵۔ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ: اس دعا سے ان کو سکون ملتا ہے کہ یہ صدقہ اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوا ہے۔ دعا اس کار خیر کا ایک روحانی اور معنوی معاوضہ بھی ہے جس سے اس احساس کی تلافی ہوتی ہے جو مال کے ہاتھ سے جانے سے انسان میں وجود میں آ سکتا ہے۔

۶۔ اَلَمۡ يَعۡلَمُوۡۤا: اگر علم ہو جائے کہ اللہ توبہ قبول کرتا ہے تو وہ یاس و ناامیدی کا شکار نہیں ہوتے اور توبہ عمل میں آ جاتی ہے۔

۷۔ يَاۡخُذُ الصَّدَقٰتِ: صدقات قبول فرماتا اور ثواب کی ضمانت دیتا ہے۔ یہاں نبیؐ کی طرف اخذ کرنے کو اللہ کا اخذ کرنا قرار دیا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

ان الصدقة تقع فی ید اللّٰہ قبل ان تصل فی ید السائل۔[1]	صدقہ سائل کے ہاتھ میں جانے سے پہلے اللہ کے ہاتھ میں جاتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ زکوٰۃ اوصاف رذیلہ کی تطہیر اور اوصاف حمیدہ کی تکمیل کا ذریعہ ہے: تُطَهِّرُهُمۡ وَ تُزَكِّيۡهِمۡ ...۔

----

[1] الوسائل ۹: ۴۳۳

۲۔ کسی محتاج نے زکوٰۃ وصول کی تو ایسا ہے کہ خود اللہ وصول کر رہا ہے: یَاۡخُذُ الصَّدَقٰتِ ....

وَ قُلِ اعۡمَلُوۡا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمۡ وَ رَسُوۡلُہٗ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ وَ سَتُرَدُّوۡنَ اِلٰی عٰلِمِ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾

۱۰۵۔ اور کہہ دیجیے: لوگو! عمل کرو کہ تمہارے عمل عنقریب اللہ اور اس کا رسول اور مومنین دیکھیں گے پھر جلد ہی تمہیں غیب وشہود کے جاننے والے کی طرف پلٹا دیا جائے گا پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

تفسیر آیات

تم اس زندگی میں جو عمل خیر یا عمل شر انجام دیتے ہو۔ اس سے اللہ آگاہ ہے۔ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ اس سے اس کائنات میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ کائنات اللہ کا دربار ہے۔ دربار میں بیٹھ کر جو بھی کام انجام دیا جاتا ہے وہ صاحب دربار سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

وَ رَسُوۡلُہٗ: اللہ کے رسولؐ بھی تمہارے اعمال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے اعمال کے شاہد ہیں۔

وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ: اور مومنین بھی تمہارے اعمال پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہوں گے کیونکہ یہ لوگ بھی تمہارے اعمال کے شاہد ہیں۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی تفسیر و روایت کے مطابق الۡمُؤۡمِنُوۡنَ سے مراد ائمہ اہل بیت (ع) ہیں۔

وَ سَتُرَدُّوۡنَ: آخرت کے دن خود تم بھی اپنے اعمال کا مشاہدہ کرو گے جب اللہ کی بارگاہ میں جوابدہی کے لیے حاضر کیے جاؤ گے۔

اس آیت میں اگرچہ روئے سخن منافقین کی طرف ہے لیکن یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ قرآنی تعبیر دیکھنی چاہیے۔ تعبیر اگر عام ہے تو قیامت تک کے لوگوں کے لیے ہے۔ صرف نزول قرآن کے زمانے کے مخاطبین تک محدود نہیں ہے۔

اس آیت سے تجسم اعمال پر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ عمل ایک بار وجود میں آنے کے بعد معدوم نہیں ہوتا اور جزائے عمل کے موقع پر خود عمل دکھایا جائے گا۔ لہٰذا ''عمل دیکھیں گے'' کی جگہ ''جزائے عمل دیکھیں گے'' کی تاویل غیر ضروری ہے۔

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے بہت کثرت سے روایات ہیں کہ لوگوں کے اعمال رسول کریم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ ہدی علیہم السلام کی خدمت میں پیش ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے:

اِنَّ اَعْمَالَ الْعِبَادِ تُعْرَضُ عَلَی نَبِیِّکُمْ کُلَّ عَشِیَّةِ خَمِیْسٍ فَلْیَسْتَحْیِ اَحَدُکُمْ اَنْ یُعْرَضَ عَلَی نَبِیِّهِ الْعَمَلُ الْقَبِیحُ۔ [1]

تمام اعمال تمہارے نبی کے سامنے ہر جمعرات کی شام کو پیش کیے جاتے ہیں، لہٰذا تم اس بات کی شرم کرو کہ برے عمل اپنے نبی کے سامنے پیش ہوں۔

اسی طرح ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے شاہد اعمال ہونے اور ان کے سامنے اعمال پیش ہونے کے بارے میں کثرت سے روایات موجود ہیں۔

اہم نکات

۱۔ مؤمن کے ذہن میں یہ تصور ہمیشہ زندہ رہنا چاہیے کہ میرا ہر عمل اللہ کے سامنے حاضر ہے اور رسول اللہؐ و ائمہ ہدی (ع) کی خدمت میں پیش ہوتا ہے۔ اس طرح وہ گناہ سے باز رہے گا۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا یُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا یَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ﴿۱۰۶﴾

۱۰۶۔ اور کچھ اور لوگ ہیں جن کا معاملہ اللہ کا حکم آنے تک ملتوی ہے وہ چاہے انہیں عذاب دے اور چاہے تو ان کی توبہ قبول کرے اور اللہ بڑا دانا حکیم ہے۔

تشریح کلمات

مُرْجَوْنَ: (ر ج و) تاخیر اور ملتوی کے معنوں میں ہے۔

تفسیر آیات

روئے سخن اگرچہ اس تیسرے گروہ کی طرف ہے جس نے جنگ تبوک میں شرکت سے پہلوتہی کی۔ پہلا گروہ منافقین، دوسرا گروہ وہ ضعیف الایمان مؤمنین جنہوں نے فوری اور صادقانہ طور پر توبہ کی، تیسرا یہ گروہ جس نے عذر تراشے بغیر سچی بات کر دی [2] اور توبہ کا اظہار کیا مگر اس شد و مد سے نہیں جس طرح دوسرے گروہ نے کیا۔ تاہم تعبیر قرآن عام ہے ان لوگوں کے لیے جو نیکیوں اور گناہوں کے درمیان ایک برزخ میں معلق اور خوف و رجاء کی انتظار گاہ میں بیٹھے ہیں۔ ایک روایت میں شان نزول اس طرح ہے:

یہ آیت ان مشرکین کے بارے میں ہے جنہوں نے حضرت حمزہؓ اور جعفر طیارؓ

---

[1] وسائل الشیعة ۱۶: ۱۱۳۔ ۱۰۱ باب وجوب الحذر من عرض العمل ....۔

[2] اس کی تفصیل اسی سورہ کی آیت ۱۱۸ میں آگے بیان کی جائے گی۔

جیسے مسلمانوں کو شہید کیا پھر اسلام میں داخل ہوئے۔ توحید پر ایمان لے آئے، شرک ترک کر دیا۔ ایمان ان کے دلوں میں ایسے داخل نہیں ہوا کہ ان کا شمار مؤمنین میں ہو جائے اور جنت ان کے لیے واجب ہو جائے، نہ ہی وہ منکر ہیں کہ کافر ہو جائیں اور جہنم جائیں۔ یہ لوگ حکم خدا کے منتظر ہیں کہ اللہ ان کو عذاب میں ڈالے یا ان کی توبہ قبول فرمائے۔[1]

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ : آگے ان کے اعمال و کردار اور نیات و ارادوں کا اللہ کو علم ہے، اس کے مطابق فیصلہ ہو گا اور ساتھ کس وقت تک ان کو خوف و رجاء اور بیم و امید میں ٹھہرانا چاہیے، ان مصلحتوں کو بھی وہ جانتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ بندۂ گناہگار کو ہمیشہ خوف و رجاء، امید و بیم میں رہنا چاہیے۔ نہ عذاب خدا سے مامون اور بے فکر اور نہ اس کی رحمت سے مایوس ہونا چاہیے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

۱۰۷۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی ضرر رسانی اور کفر اور مؤمنین میں پھوٹ ڈالنے کے لیے نیز ان لوگوں کی کمین گاہ کے طور پر جو پہلے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑ چکے ہیں اور وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ ہمارے ارادے فقط نیک تھے لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔

تشریح کلمات

اِرْصَادًا: (ر ص د) الرّصد۔ گھات لگا کر بیٹھنا۔

تفسیر آیات

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو مدینے کے مضافات میں آباد محلّہ قبا میں قیام فرمایا اور ایک جگہ نماز کے لیے معین فرمائی۔ اسی جگہ بعد میں ایک مسجد تعمیر ہو گئی جو مسجد قُبا کے نام سے مشہور ہے۔ منافقین نے اس کے مقابلے میں ایک اور مسجد بنائی اور بہانہ یہ بنایا کہ یہ مسجد ان لوگوں کے لیے ہے جو ضعیفی، کمزوری، تاریکی اور بارش کی وجہ سے مسجد قُبا نہیں جا سکتے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ

---

[1] الکافی ۲: ۴۰۷

وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ ایک بار اس مسجد میں تشریف لے آئیں۔ تبوک سے واپسی پر یہ آیات نازل ہوئیں اور اس مسجد کی تعمیر کے پیچھے جو منافقانہ محرکات تھے، ان کو فاش کیا۔

۱۔ ضِرَارًا: منافقین مؤمنین کو ضرر پہنچانے، اسلام کے خلاف سازشیں کرنے اور اپنے ہم خیال لوگوں کے باہمی ارتباط کے لیے عبادت کے نام پر ایک اہم جگہ پر مسجد تیار کر رہے تھے۔

۲۔ کُفۡرًا: کافرانہ نظریات کی تقویت کے لیے، وہ اس مسجد کی آڑ میں اپنا کفر چھپانا چاہتے تھے۔ مثلاً نماز جمعہ و دیگر اسلامی اجتماعات میں عدم شرکت کو چھپانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دھوکہ دینے کے لیے وہ اپنی مسجد کو بہانہ بنانا چاہتے تھے۔

۳۔ وَّتَفۡرِیۡقًۢا بَیۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: چونکہ تمام مؤمنین ایک ہی جگہ اجتماع کرتے تھے۔ اس زمانے میں مدینے میں دو مسجدیں تھیں: ایک مسجد نبوی شہر کے اندر موجود تھی اور دوسری مسجد قبا جو شہر کے مضافات میں تھی۔ اس تیسری مسجد کا مقصد یہ تھا کہ مؤمنین کو مختلف جگہوں میں پراگندہ کیا جائے۔ جب کہ مساجد کے ذریعے اسلام جن مقاصد کا حصول چاہتا ہے ان میں سے ایک باہمی الفت و محبت، تعارف و تعاون ہے۔

فقہ جعفری میں تین میل کے اندر دو جمعے قائم نہیں ہو سکتے اور اس فاصلے کے اندر قائم ہونے والا دوسرا جمعہ ضرار اور باطل ہے اور قریب میں مسجد ہونے کے باوجود دوسری مسجد بنانے کا نتیجہ یہی تفریق اور ضرار ہے۔ ہمارے معاشروں میں تعمیر ہونے والی معتدبہ مساجد کی بنیاد تفریق پر ہے: اعاذنا اللّٰہ من ذلك۔

۴۔ وَاِرۡصَادًا: ان منافقین کا چوتھا مقصد یہ تھا کہ اس مسجد کو ایک کمین گاہ اور اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے ایک مورچہ کے طور پر استعمال میں لایا جائے۔

اس آیت میں صاف لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کے لیے اس مسجد کو کمین گاہ بنانا چاہتے تھے جو پہلے اللہ اور رسولؐ کے ساتھ لڑ چکا ہے۔ یہ شخص قبیلہ خزرج کا راہب ابو عامر تھا۔ جو زمانہ جاہلیت میں مسیحی مذہب کا راہب تھا۔ جنگ بدر کے بعد یہ مدینے سے نکلا اور اسلام کے خلاف تبلیغ میں مشغول ہو گیا۔ پھر احد، احزاب اور حنین کی جنگوں میں یہ شخص لشکر کفر میں سرگرم رہا۔ آخر میں وہ قیصر روم کے پاس گیا کہ اسلام کے خلاف فوج کشی کے لیے امداد حاصل کی جائے۔ اس کی مدینہ کے منافقین سے یہ قرارداد ہوئی تھی کہ ایک مسجد بنائی جائے جس میں خود اسلام ہی کے پردے میں اسلام کے خلاف تمام تر سازشیں تیار کی جائیں اور ابو عامر کی طرف سے طے پانے والی ساری باتیں یہاں پہنچ جائیں۔

چنانچہ رسالتمآبؐ نے چند اصحاب کو حکم دیا کہ جا کر اس مسجد کو نذر آتش کر دیں۔

اہم نکات

۱۔ ہر وہ مسجد جو تفریق بین المؤمنین کا سبب بنے مسجد ضرار ہے۔

۲۔ دشمن کا خطرناک حربہ خود مذہب کو مذہب کے خلاف استعمال کرنا ہے۔

لَا تَقُمۡ فِیۡهِ اَبَدًا ؕ لَمَسۡجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقۡوٰی مِنۡ اَوَّلِ یَوۡمٍ اَحَقُّ اَنۡ تَقُوۡمَ فِیۡهِ ؕ فِیۡهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوۡنَ اَنۡ یَّتَطَهَّرُوۡا ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الۡمُطَّهِّرِیۡنَ ﴿۱۰۸﴾

۱۰۸۔ آپ ہرگز اس مسجد میں کھڑے نہ ہوں البتہ جو مسجد پہلے ہی دن سے تقویٰ کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے وہ زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے لوگ ہیں جو صاف اور پاکیزہ رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ پاکیزہ رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لَا تَقُمۡ فِیۡهِ اَبَدًا: مسجد ضرار میں کھڑے ہونے کی نہی ہے۔ کھڑے ہونے سے مراد نماز کے لیے کھڑا ہونا ہے۔ جیسے قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ؕ[۱] میں قیام سے مراد نماز کا قیام ہے۔

۲۔ لَمَسۡجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقۡوٰی: مسجد قبا کے بارے میں فرمایا: یہ مسجد تقویٰ کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے کہ اس میں اللہ کی عبادت، مؤمنین کا اجتماع، باہمی تعاون و تعارف ہو اور نفاق و خود غرضی سے پاک لوگوں کا اس مسجد میں اجتماع ہوتا ہے، لہٰذا آپؐ اس پاک مسجد میں نماز پڑھیں۔

۳۔ فِیۡهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوۡنَ اَنۡ یَّتَطَهَّرُوۡا: اس مسجد میں نماز قائم کرنے والے پاکیزہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم کس طرح طہارت کرتے ہو؟ اللہ نے تمہاری طہارت کو پسند فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا: ہم پانی سے استنجا کرتے ہیں۔[۲]

اہم نکات

۱۔ فضیلت اس مسجد کو حاصل ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر ہو اور اس کے بانیان پاکیزہ لوگ ہوں۔

اَفَمَنۡ اَسَّسَ بُنۡیَانَهٗ عَلٰی تَقۡوٰی مِنَ اللّٰهِ وَ رِضۡوَانٍ خَیۡرٌ اَمۡ مَّنۡ اَسَّسَ بُنۡیَانَهٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانۡهَارَ بِهٖ فِیۡ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَ

۱۰۹۔ بھلا جس شخص نے اپنی عمارت کی بنیاد خوف خدا اور اس کی رضا طلبی پر رکھی ہو وہ بہتر ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد گرنے والی کھائی کے کنارے پر رکھی ہو، چنانچہ وہ (عمارت) اسے

---

[۱] ۷۳ مزمل: ۲ [۲] بحار الانوار۔ ۲۱: ۲۵۴

اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۰۹﴾

لے کر آتش جہنم میں جا گرے؟ اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔

تشریح کلمات

شَفَا: (ش ف ؤ) کنارے کو کہتے ہیں۔

جُرُفٍ: (ج ر ف) الجرف دریا کے اس کنارے کو کہتے ہیں جو کٹ کر نیچے گر رہا ہو۔

ھَارٍ: (ہ و ر) و انہار البناء۔ عمارت منہدم ہو گئی۔

تفسیر آیات

دونوں مسجدوں کے بانیوں میں فرق کو واضح فرمایا کہ ایک بانی اپنی عمارت کی بنیاد تقویٰ اور رضائے الٰہی پر استوار کرتا ہے، اسے ثبات اور دوام حاصل ہے۔ جب کہ دوسرا بانی اپنی عمارت کو کھائی کے کنارے پر بناتا ہے تو ایسے بانی کی نہ صرف عمارت اس کھائی میں گر جائے گی بلکہ خود بانی کو لے کر گر جائے گی اور وہ بھی جہنم کی آگ میں۔

اہم نکات

۱۔ جس کے عمل میں اخلاص نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ عمل اکارت جاتا ہے بلکہ صاحب عمل کو بھی ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔

۲۔ جو خدا و رسول کے خلاف کام کرتے ہیں وہ اپنی زندگی کی عمارت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہوتے ہیں۔

لَا یَزَالُ بُنۡیَانُہُمُ الَّذِیۡ بَنَوۡا رِیۡبَۃً فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ اِلَّاۤ اَنۡ تَقَطَّعَ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۱۱۰﴾

۱۱۰۔ ان لوگوں کی بنائی ہوئی یہ عمارت ہمیشہ ان کے دلوں میں کھٹکتی رہے گی مگر یہ کہ ان کے دل پاش پاش ہو جائیں اور اللہ بڑا دانا حکمت والا ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ بَنَوۡا رِیۡبَۃً فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ: یہ عمارت چونکہ ایک سازش اور برے مقاصد کے لیے بنی تھی اس لیے ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں راز فاش نہ ہو جائے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا:

یَحۡذَرُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ اَنۡ تُنَزَّلَ عَلَیۡہِمۡ — منافقوں کو یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں ان کے خلاف

سُوْرَۃٌ ...[1] (مسلمانوں پر) کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے...

۲۔ اِلَّاۤ اَنۡ تَقَطَّعَ: مگر یہ کہ ان کے دل پاش پاش ہو جائیں شک و تردد کے زائل ہونے سے یا موت آنے سے۔

کیونکہ اس عمارت کے بنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن مذموم مقاصد کے لیے انہوں نے یہ عمارت بنائی تھی، وہ بھی پورے نہیں ہوئے اور ساتھ دنیا میں رسوائی اور فضیحت سے بھی دوچار ہو گئے۔ یہ ندامت اور حسرت ان کے دلوں میں مرتے دم تک رہے گی۔ دلوں کا پاش پاش ہونا۔ ممکن ہے موت کی طرف اشارہ ہو۔

اہم نکات

۱۔ جو عمل اللہ کے لیے ہوتا ہے وہ باعث سکون ہوتا ہے، اسی طرح جو کام اللہ کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے، وہ باعث اضطراب و پریشانی ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ ۟ وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىۃِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ وَ الۡقُرۡاٰنِ ؕ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۱۱﴾

۱۱۱۔ یقیناً اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض خرید لیے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں یہ توریت و انجیل اور قرآن میں اللہ کے ذمے پکا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنا عہد پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ پس تم نے اللہ کے ساتھ جو سودا کیا ہے اس پر خوشی مناؤ اور یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر آیات

دائرہ ایمان میں داخل ہونے کا مطلب صرف دعوائے ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان ایک معاملہ ہے، اپنے رب کے ساتھ، ایک عہد ہے اپنے ہی مالک کے ساتھ، تبادلہ پر مشتمل ایک عمل ہے، ایک ارتقائی اور متحرک عمل۔ اس معاملے کا ایک فریق اللہ تعالیٰ ہے، دوسرا فریق عبد مؤمن ہے۔ جس مال پر سودا ہو رہا ہے

----

[1] ۹ توبۃ: ۶۴

وہ مؤمن کی جان و مال ہے اور اس کی قیمت جنت اور سند معاملہ، توریت، انجیل اور قرآن ہے۔

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی: اس بیعی معاملہ میں مشتری اللہ تعالیٰ ہے جو اپنے بندے کی جان و مال خرید رہا ہے۔ اس جان و مال کا اللہ تعالیٰ خود مالک ہے۔ مالک، فضل و کرم کا بھی مالک۔ وہ اپنے ہی مال کو قیمتاً خریدتا ہے۔

۲۔ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: بائع، بندۂ مؤمن ہے اور اس معاملے میں لطف یہ ہے کہ یہ مالک اور مملوک کے درمیان، مالک کل اور محتاج و نادار کے درمیان ہو رہا ہے۔ مشتری، وہ جو ہر شیٔ کا مالک ہے۔ بائع، وہ جو کسی شیٔ کا بھی مالک نہیں ہے۔ بھلا وہ اس مشتری کے ہاتھ کیا چیز فروخت کرے؟

۳۔ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ: جس مال کا سودا ہو رہا ہے، وہ مؤمن کی جان اور مال ہے اور مؤمن اپنی جان و مال کا مالک نہیں ہے، اس کا حقیقی مالک خود مشتری ہے۔ بائع یعنی مؤمن صرف اس کا امین ہے۔ وہ یہ امانت اپنے حقیقی مالک کو واپس کر رہا ہے۔

۴۔ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ: اس امانت داری پر مالک خوش ہو جاتا ہے اور اس کو انعام سے نوازتا ہے۔ یہ انعام جنت ہے۔ لہٰذا مومن کی جان و مال کے مقابلے میں جنت از روئے انعام ہے، نہ از روئے استحقاق اور قیمت۔ البتہ یہ انعام زندگی میں نہیں بلکہ اس وقت ملے گا جب وہ اس امانت (جان و مال) کو اپنے حقیقی مالک کے سپرد کر چکے گا۔

۵۔ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ: اس معاملہ کے مضمون پر عمل شروع ہوتا ہے راہ خدا میں قتال و جہاد سے۔ خدا کے ساتھ معاملے پر عمل کرنے والوں کی یہ نشانی ہے۔

۶۔ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ: اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونے والے اس سودے پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ یا تو کافروں کو قتل کریں یا خود قتل ہو جائیں۔ دونوں کا تعلق ایک ہی معاملے سے ہے۔ فاتح ہو یا شہید، دونوں صورتوں میں کامیابی ہے۔

۷۔ وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا: یہ وعدہ اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ کسی اور نے اللہ کے ذمے نہیں کیا بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لیا ہے۔ یہ تمام آسمانی صحیفوں میں درج ہے۔ تمام امتوں کے ساتھ ہونے والا معاملہ ہے۔

۸۔ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ مِنَ اللّٰہِ: اللہ سے بڑھ کر اپنا عہد پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ جس کے لیے نہ کوئی طاقت مانع ہو سکتی ہے نہ کوئی مفاد۔

۹۔ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ: تم اس سودے پر خوشی مناؤ۔

اہم نکات

۱۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مؤمن کا یہ سودا اس قدر عظیم کامیابی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اس پر مبارک باد

دیتا ہے۔ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ ....۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

۱۱۲۔ (یہ لوگ) توبہ کرنے والے، عبادت گزار، ثنا کرنے والے (راہ خدا میں) سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کی دعوت دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے ہیں اور (اے رسول) مؤمنین کو خوشخبری سنا دیجیے۔

تفسیر آیات

۱۔ اَلتَّآئِبُوْنَ: جو مؤمنین اس مبارک سودے کو انجام دینے میں کامیاب ہوئے ہیں تو وہ صرف زبانی دعوؤں کی وجہ سے نہیں، وہ توبہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ جب بھی کوئی لغزش سرزد ہوتی ہے اور آداب بندگی میں کوئی خامی رہ جاتی ہے، مقام عظمت الٰہی کے سامنے کوئی جسارت ہوتی ہے تو وہ فوراً توبہ وانابت کے ذریعے اس کی تلافی کرتے ہیں۔

۲۔ الْعٰبِدُوْنَ: یہ عبادت گزار ہوتے ہیں۔ اللہ کے کمال کے سامنے جھکنا اپنے لیے کمال سمجھتے ہیں۔

۳۔ الْحٰمِدُوْنَ: ہمیشہ اللہ کی حمد و ثنا بجا لاتے ہیں کیونکہ صرف وہی ذات ہے جس کی ہر حالت میں حمد کی جاتی ہے۔ نعمت کے موقع پر اور مصیبت کے موقع پر بھی۔ الحمد للّٰہ الذی لا یحمد علی مکروہ سواہ۔ حمد و ستائش ہے اس ذات کے لیے کہ صرف اس کی ذات ہے جس کی مصیبت کے موقع پر بھی حمد و ستائش کی جاتی ہے۔

۴۔ السَّآئِحُوْنَ: وہ مقامات عبادت و ذکر خدا کی طرف سفر کرتے ہیں۔ شدّ رحال کرتے ہیں۔

۵۔ الرّٰكِعُوْنَ: اللہ کی عظمت کے سامنے جھک جاتے ہیں۔

۶۔ السّٰجِدُوْنَ: اپنے آپ کو عبودیت کے مقام پر فائز کرنے کے لیے اس کمال مطلق کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

۷۔ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: نیکی اور برائی میں تمیز رکھتے اور لوگوں میں نیکیاں عام کرنے اور ان کو برائیوں سے پاک رکھنے میں ایک فعال کردار ادا کرتے ہیں۔

۸۔ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ: اور اسلام کے انسان ساز و حیات بخش دستور کی محافظت کرتے ہیں۔

۹۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ: ایسی اقدار کے مالک مؤمنین کو اللہ بشارت دیتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:

سِيَاحَةُ أُمَّتِي الْمَسَاجِدُ....[1] میری امت کی سیاحت مساجد ہیں۔

اہم نکات

۱۔ اسلام اعمال و اقدار کا مذہب ہے، جس پر ایمان لانے والا تطہیر و ارتقائے معاشرہ کا داعی ہوتا ہے: اَلتَّآئِبُوۡنَ الۡعٰبِدُوۡنَ ... الۡاٰمِرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ....

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ يَّسۡتَغۡفِرُوۡا لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ وَلَوۡ كَانُوۡۤا اُولِىۡ قُرۡبٰى مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُمۡ اَصۡحٰبُ الۡجَحِيۡمِ ﴿۱۱۳﴾

۱۱۳۔ نبی اور ایمان والوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت طلب کریں خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں جب کہ یہ بات ان پر عیاں ہو چکی ہے کہ وہ جہنم والے ہیں۔

تفسیر آیات

شرک اللہ کی وحدانیت کی نفی ہے اور وحدانیت کا انکار شان توحید میں سب سے بڑی گستاخی ہے۔ اس لیے یہ ناقابل تلافی جرم ہے۔ سورۂ نسآء آیت ۱۱۶ میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ .... اللہ صرف شرک سے درگزر نہیں کرتا اس کے علاوہ جس کو وہ چاہے معاف کر دیتا ہے۔

قرآنی تعبیر مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ اس سے کم، سے معلوم ہوا کہ شرک سب سے بڑا گناہ ہے۔ اسی لیے اس آیۂ شریفہ میں یہ نہیں فرمایا: مشرکوں کے لیے استغفار نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ استغفار ہو جاتی ہے لیکن اس کا کرنا جائز نہیں ہے بلکہ یہ فرمایا کہ استغفار کا حق ہی حاصل نہیں ہے اور اس کا اختیار ہی نہیں ہے کیونکہ یہ کام اللہ کے دشمن کے ساتھ ہمدردی کا اظہار ہے اور ایک دل میں اللہ اور اس کے دشمن کی محبت جمع نہیں ہو سکتی۔

اہل سنت کی صحاح میں آیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوطالب علیہ السلام کی وفات کے موقع پر نازل ہوئی کہ ابوطالبؑ کی طرف سے کلمہ پڑھنے سے انکار کے باوجود آپؐ نے ان کے لیے استغفار کیا۔ یہ روایت از لحاظ متن و سند قابل قبول نہیں ہے:

اولاً: یہ سورہ ۹ ھ میں نازل ہوا ہے جب کہ حضرت ابو طالبؑ نے ہجرت سے پہلے مکہ میں وفات پائی۔

---

[1] مستدرك الوسائل ۷: ۵۰۷

ثانیاً: اس کا راوی سعید بن مسیب ناصبی اور اہل بیت اطہار (ع) کے ساتھ عناد رکھنے والا ہے۔ جیسا کہ واقدی نے لکھا ہے کہ اس نے امام زین العابدین علیہ السلام کے جنازے میں شرکت تک گوارا نہیں کی۔

ثالثاً: اس آیت کے شان نزول کے سلسلے میں دیگر متعدد اور مضطرب روایات موجود ہیں۔ مثلاً حضرت ابن عباس، ابن مسعود اور عطیہ کی طرف سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی والدہ حضرت آمنہ کے لیے استغفار کی اجازت مانگی تو یہ آیت نازل ہوئی۔[1]

دیگر متعدد روایتوں میں آیا ہے کہ اصحاب نے کہا کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لیے استغفار کی ہے تو کیوں نہ ہم اپنے آبا کے لیے استغفار کریں تو یہ آیت نازل ہوئی۔[2]

مِنۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ: جب واضح ہو جائے کہ یہ مشرک جہنمی ہے تو استغفار جائز نہیں ہے۔ جب مشرک حالت شرک میں مرتا ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جہنمی ہے۔ حیات کے وقت اس کے لیے ہدایت و مغفرت کی دعا کرنا جائز ہے۔ واضح ہونے کی دوسری صورت وحی بھی ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ ابولہب کا عدم ایمان قطعی ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس کے لیے زندگی میں بھی استغفار نہیں ہوسکتی تھی۔

اہم نکات

۱۔ اللہ کے مقام وحدانیت کے ساتھ گستاخی، ناقابل معافی جرم ہے۔

۲۔ ایمان نہ ہونے کی صورت میں صرف نسبت کافی نہیں ہے: وَ لَوۡ کَانُوۡۤا اُولِیۡ قُرۡبٰی ....

وَ مَا کَانَ اسۡتِغۡفَارُ اِبۡرٰہِیۡمَ لِاَبِیۡہِ اِلَّا عَنۡ مَّوۡعِدَۃٍ وَّعَدَہَاۤ اِیَّاہُ ۚ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗۤ اَنَّہٗ عَدُوٌّ لِّلّٰہِ تَبَرَّاَ مِنۡہُ ؕ اِنَّ اِبۡرٰہِیۡمَ لَاَوَّاہٌ حَلِیۡمٌ ﴿۱۱۴﴾

۱۱۴۔ اور (وہاں) ابراہیم کا اپنے باپ (چچا) کے لیے مغفرت طلب کرنا اس وعدے کی وجہ سے تھا جو انہوں نے اس کے ساتھ کر رکھا تھا لیکن جب ان پر یہ بات کھل گئی کہ وہ دشمن خدا ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گئے، ابراہیم یقیناً نرم دل اور بردبار تھے۔

تشریح کلمات

لَاَوَّاہٌ: (ا و ہ) وہ شخص جو بہت زیادہ تأوّہ کرتا ہو اور تأوّہ کے معنی ہیں حزن و غم ظاہر کرنے کے لیے اَوّہ آہیں زبان پر لانا اور خشیت الٰہی کا بہت زیادہ اظہار کرنے والے شخص کے لیے اَوّاہ بولا

---

[1] تفسیر المنار ۱۱: ۵۸　[2] تفسیر قرطبی ۸: ۲۷۴ از نسائی

جاتا ہے۔

تفسیر آیات

حضرت ابراہیمؑ کی دعا ایک مدت تک کے لیے تھی۔ وہ امید ہدایت کی مدت تھی کیونکہ اس استغفار کی وجہ حضرت ابراہیمؑ کی نرم دلی و بردباری بتائی ہے۔ اس لیے ابراہیمؑ کی یہ خواہش تھی کہ آزر ایمان لے آئے اور اللہ اسے بخش دے لیکن جب یہ بات کھل گئی کہ وہ دشمن خدا ہے تو ابراہیمؑ نے اس سے بیزاری اختیار کی۔ تَبَیَّنَ بات کھل گئی۔ یعنی کفر کے حالت میں مرنے سے بات کھل گئی یہ دشمن خدا تھا۔ چنانچہ ابن عباس کی ایک روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ آذر کے مرنے تک اس کے لیے استغفار کرتے رہے۔ جب مر گیا تو بات کھل گئی یہ دشمن خدا تھا۔

اہم نکات

۱۔ دشمن خدا سے بیزاری اختیار کی جاتی ہے، نہ کہ ہمدردی اور سکوت: اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنۡهُ ....

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوۡمًاۢ بَعۡدَ اِذۡ هَدٰٮهُمۡ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمۡ مَّا يَتَّقُوۡنَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۱۱۵﴾

۱۱۵۔ اور اللہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ نہیں کرتا یہاں تک کہ ان پر یہ واضح کر دے کہ انہیں کن چیزوں سے بچنا ہے بتحقیق اللہ ہر چیز کا خوب علم رکھتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ‌ؕ وَمَا لَـكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۱۱۶﴾

۱۱۶۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت یقیناً اللہ ہی کے لیے ہے، زندگی بھی وہی دیتا ہے اور موت بھی اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ مددگار۔

تفسیر آیات

اس آیت کے شان نزول میں آیا ہے کہ کچھ مسلمان بعض فرائض، واجبات کے نزول سے پہلے وفات پا گئے تو چند افراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: جو افراد ان واجبات کو بجا نہیں لائے اور وفات پا گئے، ان کا انجام کیا ہو گا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور فرمایا: بیان احکام سے پہلے جو لوگ وفات پا گئے ہیں، ان سے باز پرس نہ ہو گی۔ باز پرسی کی صورت یہ ہے کہ لوگوں پر

احکام واضح ہو گئے ہوں، حجت پوری ہو چکی ہو، اس کے باوجود بلاعذر انہیں انجام نہ دیں۔

۱۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا: جب اللہ ایمان کی ہدایت سے کسی کو نوازتا ہے تو اس کو اس بنا پر گمراہ شمار نہیں فرماتا کہ اس نے ان احکام کی تعمیل نہیں کی جو ابھی بیان نہیں ہوئے (لِيُضِلَّ) گمراہ نہیں فرمائے گا۔ حالت کفر کے گناہوں کی وجہ سے مستقبل کے اعمال برباد نہیں ہوں گے جیسا کہ فرمایا:

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝[1] جنہوں نے کفر اختیار کیا اور راہ خدا میں رکاوٹ ڈالی اللہ نے ان کے اعمال حبط کر دیے۔

۲۔ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ: اللہ کسی کا عمل برباد نہیں کرتا جب تک ان پر یہ واضح نہ کر دے کہ انہیں کن چیزوں سے بچنا ہے۔ بتانے سے پہلے مواخذہ نہ ہو گا۔

حَتّٰى يُبَيِّنَ سے ایک کلی حکم اور ضابطہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے: احکام بیان ہونے سے پہلے ذمے داری نہیں آتی۔ حجت پوری ہونے سے پہلے مؤاخذہ نہیں ہوتا۔ حلال و حرام واضح کر کے بیان کرنے سے پہلے عذاب نہیں ہو سکتا۔ ہر عاقل سمجھتا ہے کہ حکم بیان کرنے سے پہلے مؤاخذہ نہیں ہو سکتا۔

یہاں سے ایک کلیہ سامنے آتا ہے کہ ہر چیز مباح ہے جب تک اس کے واجب یا حرام ہونے پر شریعت کی طرف سے بیان نہ آئے۔

۳۔ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: کل کائنات کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ سب اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اسی بنا پر موت و حیات بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ اس کے دروازے کو چھوڑ کر کسی غیر اللہ کے دروازے پر کھڑے رہو تو تمہیں کوئی کارساز ملے گا اور نہ مددگار۔ لہٰذا مشرکین سے بیزاری اختیار کرو۔ اللہ کی طرف آ جاؤ۔ اس ذات کے پاس آ جاؤ جس کے پاس سب کچھ ہے اور ایسے غیر اللہ کے پاس نہ جاؤ جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

اہم نکات

۱۔ کسی تک اللہ کا پیغام نہ پہنچے اور اس میں اس کی کوتاہی نہ ہو تو اس کی باز پرس نہ ہوگی: حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ ....

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا

۱۱۷۔ بتحقیق اللہ نے نبی پر اور ان مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی جنہوں نے مشکل گھڑی میں نبی کا ساتھ دیا تھا، بعد اس کے کہ ان میں سے

[1] ۴۷ محمد: ۱

كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ	بعض کے دلوں میں کجی آنے ہی والی تھی پھر
ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ	اللہ نے انہیں معاف کر دیا بے شک وہ ان پر
رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾	بڑا شفقت کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

ا۔ لَقَدۡ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ: یہاں تَابَ بمعنی مہربانی ہے چونکہ یہاں تَابَ کا ذکر گناہ یا کوتاہی کے بعد نہیں بلکہ ایک کڑی آزمائش میں کامیابی کے بعد ہوا ہے۔ اگر کسی گناہ کے سلسلے میں ذکر ہوا تو یہ تَابَ قبول توبہ کے معنی میں ہوگا۔ جیسے:

فَمَنۡ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوۡبُ عَلَيۡهِ ....[1]	پس جو شخص اپنی زیادتی کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح کر لے تو اللہ یقیناً اس کی توبہ قبول کرے گا ....

اسی آیت میں، بعض کے دلوں میں کجی آنی والی تھی، کے ذکر کے ساتھ تَابَ، قبول توبہ کے معنی میں ہے کیونکہ ایک لغزش کے بعد تَابَ کا ذکر آیا ہے لیکن آیت کی ابتدا میں تَابَ، مہربانی کے معنی میں اس طرح فرمایا: اللہ نے مہربانی فرمائی نبی اور ان مہاجرین و انصار پر، جنہوں نے مشکل گھڑی میں نبی کا ساتھ دیا۔

البتہ، کچھ لوگوں کے دلوں میں کجی آنے والی تھی لیکن اللہ نے انہیں معاف کیا، اس معافی کے بعد یہ لوگ بھی اللہ کی مہربانی میں شامل ہو گئے۔ اس طرح اس آیت میں لفظ تَابَ دو بار آیا ہے: پہلی بار بیان فضلیت کے ساتھ، لہٰذا یہاں توبہ اللہ کی طرف سے شفقت و مہربانی کے معنوں میں ہے۔ دوسری بار ایک کوتاہی، دلوں میں کجی آنے والی تھی، کے ذکر کے ساتھ، یہاں معافی مراد لی گئی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا سراسر ناانصافی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی لغزش ہوئی تھی۔ اللہ نے اپنے نبیؐ اور ان مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی جنہوں نے مشکل گھڑی میں رسالتمآبؐ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

۲۔ اتَّبَعُوۡهُ فِیۡ سَاعَةِ الۡعُسۡرَةِ: یہ ان مہاجرین و انصار کے لیے بہت بڑی فضیلت ہے کہ سخت ترین حالات میں اپنے رسولؐ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ ورنہ موسم کی گرمی، سفر کی درازی، سواری کی اتنی قلت کہ دس دس افرد کے حصے میں ایک اونٹ، بھوک اور پیاس کا یہ عالم کہ ایک خرما دو افراد میں تقسیم ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک حالت بھی پاؤں میں لغزش لانے اور ہمت ہارنے کے لیے کافی تھی۔

۳۔ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا كَادَ يَزِيۡغُ قُلُوۡبُ: البتہ ان مہاجرین و انصار میں سے بعض کے دلوں میں کجی کی طرف میلان پیدا ہوا تھا، جس کا ذکر سابقہ آیات میں کئی بار آیا تاہم اس کجی کے میلان کی بعد میں تلافی کی گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ كَادَ سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ یہ کجی آنے ہی والی تھی، آئی نہیں تھی۔

----

[1] ۵ مائدہ: ۳۹

یعنی بعض مؤمن صحابہ بھی جنگ پر جانے سے جی چرانے لگے تھے۔ ان کے عزم و ارادوں میں کمزوری آ گئی تھی مگر یہ کمزوری تا آخر نہ رہی۔ بعد میں اس کی تلافی کر دی گئی۔

وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

۱۱۸۔ اور ان تینوں کو بھی (معاف کر دیا) جو (تبوک میں) پیچھے رہ گئے تھے، جب اپنی وسعت کے باوجود زمین ان پر تنگ ہو گئی تھی اور اپنی جانیں خود ان پر دوبھر ہو گئی تھیں اور انہوں نے دیکھ لیا کہ اللہ کی گرفت سے بچنے کے لیے خود اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں تو اللہ نے ان پر مہربانی کی تا کہ وہ توبہ کریں بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

تفسیر آیات

یہ تین اصحاب جن پر اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی، کعب بن مالک، بلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تبوک سے واپس تشریف لائے تو بہت سے منافقین معذرت کرنے کے لیے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ منافقین نے عذر تراش لیے۔ حضورؐ نے ان کا عذر مان لیا مگر ان تین اصحاب نے اپنے قصور کا صاف صاف اعتراف کر لیا۔ رسول کریمؐ نے ان کا معاملہ التوا میں رکھا کیونکہ یہ حضرات اپنے خلوص کا مختلف مقامات پر مظاہرہ کر چکے تھے۔ بلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع تو بدر میں بھی شریک تھے۔ کعب بن مالک اگرچہ بدری نہ تھے لیکن دیگر تمام غزوات میں حضورؐ کے ساتھ تھے۔ حتیٰ بیعت عقبہ میں حاضر تھے اور خود یہ اظہار کیا کرتے تھے کہ بدر سے عقبہ میں حاضر رہنا زیادہ اہم تھا۔[۱] تاہم مسلمانوں کو ان سے سلام کلام کرنے کی ممانعت ہو گئی۔ چالیس دن کے بعد ان کی بیویوں کو بھی الگ کر دینے کا حکم ہوا۔[۲] جب ان کے مقاطعہ کو پچاس دن ہو گئے تو ان کے لیے معافی کا حکم لے کر یہ آیت نازل ہوئی۔

۱۔ ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ: ان پر زمین تنگ ہو گئی تھی کہ اس وسیع و عریض زمین میں کوئی ٹھکانا نہیں مل رہا تھا۔

۲۔ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ: کسی سے میل جول نہیں، دل تنگ ہو گئے۔ پچاس دن تک منقطع رہنے کے بعد اپنی جان بھی دوبھر ہو گئی۔

۱و۲ تفسیر محاسن التاویل ۸: ۱۱۹

۳۔ وَظَنُّوۡۤا اَنۡ لَّا مَلۡجَاَ : انہیں علم ہو گیا کہ اللہ سے فرار کے لیے کوئی راستہ نہیں۔ اگر کوئی راستہ ہے تو اللہ کی طرف جانے کا راستہ ہے جو ہر وقت کھلا رہتا ہے۔

۴۔ ثُمَّ تَابَ عَلَیۡہِمۡ : پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی۔ ان کے ضمیر اور وجدان میں توجہ بخدا کاشعور پیدا فرمایا۔

۵۔ لِیَتُوۡبُوۡا: تاکہ یہ توبہ کریں۔ اللہ کی طرف رجوع کریں۔ معافی طلب کریں۔

۶۔ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ : بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ یہاں اللہ کی طرف سے دو توجہ کے درمیان بندے کی ایک توجہ ہے: تاب اور التواب کے درمیان لِیَتُوۡبُوۡا ہے۔

اہم نکات

۱۔ حکم رسولؐ سے ایک بار بے اعتنائی کرنے پر بدر و احد کے جانباز بھی گرفت سے نہ بچ سکے۔

۲۔ منافقین کو سزا نہیں دی گئی، چند راستگو مؤمنین کو سزا دی کہ انہوں نے مؤمن ہو کر منافقوں والا کام کیوں کیا۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ﴿۱۱۹﴾

۱۱۹۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

تفسیر آیات

سچ اس قول و عمل کو کہتے ہیں جو واقع کے مطابق ہو اور واقع کو حق کہتے ہیں۔ اس آیت میں یہ حکم ہے کہ سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ ساتھ (معیت) سے مراد اتباع ہے۔ جو لوگ اپنے جہاد، معاہدوں، وعدوں اور اقوال میں سچے ہیں ان کی صحبت میں رہو۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں اس بات کا حکم دیا جا رہا ہے کہ اول تقویٰ اختیار کرو۔ اس کے بعد صادقین کے ساتھ ہو جاؤ۔ یہ نہیں فرمایا: سچے رہو بلکہ فرمایا: سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ خود سچا رہنا ایک حکم ہے۔ وہ اپنی جگہ ثابت ہے لیکن یہ حکم اس کے علاوہ ہے۔ یعنی خود سچا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ سچوں کی معیت اختیار کرو تو بات پوری ہوتی ہے۔

واضح رہے حقیقی معنوں میں سچا شخص وہ ہے جس سے کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہوا ہو جو اس کے عقیدے اور نظریے کے خلاف ہو اور اسی کو معصوم کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے فخر الدین رازی نے اس آیت سے سمجھا کہ معصوم کی اتباع واجب ہے اور یہ ہر عصر اور زمانے کے مسلمانوں کے لیے ہے۔ لہٰذا ہر زمانے میں ایک معصوم کا ہونا لازمی ہے۔ ورنہ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ کا حکم بے معنی ہو جاتا ہے۔ آگے چل کر وہ اس معصوم

کی تلاش اور تشخیص میں دوسروں کی طرح راستہ گم کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ معصوم اجماع امت ہے۔ جواب یہ ہے: اولاً اجماع امت کے حجت ہونے پر صرف خبر واحد لا تجتمع امتی علی خطاء ہے جس سے حجت ثابت نہیں ہوتی۔ ثانیاً امت کے لیے حکم ہو کہ امت کے ساتھ ہو جاؤ، کوئی معنی نہیں رکھتا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس راوی ہیں کہ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ سے مراد حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔ اسی طرح ابن عساکر نے حضرت امام محمد باقر (ع) سے روایت کی ہے کہ الصّٰدِقِیۡنَ سے مراد علی علیہ السلام ہیں۔[1] ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے اس مضمون کی روایت بکثرت موجود ہیں۔

ملاحظہ ہو الدر المنثور ۳:۲۹۰۔ تفسیر شوکانی ۲: ۲۹۵۔ روح المعانی ۱۱: ۴۱۔ التذکرہ لابن الجوزی صفحہ ۲۰۔ کفایۃ الطالب: ۱۱۱ وغیرہ۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احقاق الحق ۳: ۲۹۶

اہم نکات

۱۔ انسان سچائی کی منزل پر اس وقت فائز ہو سکتا ہے جب خود سچا ہونے کے ساتھ ساتھ سچوں کے ساتھ ہو جائے۔

مَا كَانَ لِاَهۡلِ الۡمَدِيۡنَةِ وَمَنۡ حَوۡلَهُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ اَنۡ يَّتَخَلَّفُوۡا عَنۡ رَّسُوۡلِ اللّٰهِ وَلَا يَرۡغَبُوۡا بِاَنۡفُسِهِمۡ عَنۡ نَّفۡسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ لَا يُصِيۡبُهُمۡ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّلَا مَخۡمَصَةٌ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَئُوۡنَ مَوۡطِئًا يَّغِيۡظُ الۡكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوۡنَ مِنۡ عَدُوٍّ نَّيۡلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمۡ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۲۰﴾

۱۲۰۔ اہل مدینہ اور گرد و پیش کے بدوؤں کو یہ حق حاصل ہی نہ تھا کہ وہ رسول خدا سے پیچھے رہ جائیں اور اپنی جانوں کو رسول کی جان سے زیادہ عزیز سمجھیں یہ اس لیے کہ انہیں پیاس کی تکلیف ہو گی اور نہ مشقت کی اور نہ راہ خدا میں بھوک کی اور نہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھائیں گے جو کافروں کو ناگوار گزرے اور نہ انہیں دشمن سے کوئی گزند پہنچے گا مگر یہ کہ ان کے لیے نیک عمل لکھا جاتا ہے بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا ثواب ضائع نہیں کرتا۔

تشریح کلمات

ظَمَاٌ: (ظ م ء) الظِمأ دو مرتبہ پانی پینے کے درمیان کا وقفہ۔ الظِمأ پیاس جو اس وقفے میں عارض ہو۔

---

[1] الدر المنثور

نَصَبٌ: (ن ص ب) کے معنی تکلیف و مشقت کے ہیں۔ مخمصۃٌ بھوک کے معنوں میں ہے۔

یَنَالُوْنَ: (ن ی ل) نیلاً تکلیف اور گزند کے معنوں میں ہے۔ و اصلہ من نلت الشیء انال ای اصبت۔ یہ لفظ تناول (ن و ل) سے نہیں ہے، جیسا کہ تقریباً تمام مترجمین نے سمجھا ہے۔ چنانچہ شیخ الہند کو بھی یہی اشتباہ لاحق ہوا اور وَلَا یَنَالُوْنَ کا ترجمہ کیا ہے: نہ چھینتے ہیں دشمن سے کوئی چیز۔ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ نیلاً ای قتلا و ھزیمۃ۔ (قرطبی)۔ نیلاً ای لا یصیبون من عدوھم قتلاً واسراً وغنیمۃ او ھزیمۃً (معالم التنزیل)۔ ہم نے اسی لیے نیلاً کا ترجمہ ''گزند'' کیا ہے نیز سیاق آیت کے ساتھ نیل بمعنی گزند اور مصیبت سازگار ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ: ایک بار پھر تبوک میں شرکت نہ کرنے والوں کا ذکر آیا کہ اسلام و ایمان میں داخل ہونے کے بعد اہل مدینہ اور صحرانشینوں کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ رسولؐ سے پیچھے رہ جائیں

۲۔ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ: اور نہ یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی جانوں کو رسولؐ کی جان سے عزیز سمجھیں۔ یہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت سے متعلق دو باتوں کا ذکر ہے: ایک حکم رسولؐ کی تعمیل۔ دوسری بات رسولؐ کی جان کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز سمجھیں:

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ....[1]	نبی مومنین کی جانوں پر خود ان سے زیادہ حق تصرف رکھتا ہے۔

لیکن ان لوگوں نے رسولؐ کی جان سے اپنی جان کو عزیز سمجھا ہے جو ایمان کے سراسر منافی ہے۔

۳۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ: اس مذمت کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے ساتھ جنگ میں شرکت کی وجہ سے جو بھی تکلیفیں اور مشقتیں تحمل کرنا پڑیں اس کا اجر ہے اور یہ خود ان کے لیے باعث نجات ہے۔ مثلاً اس جنگ میں درج ذیل تکالیف اٹھانا پڑی تھیں:

i۔ ظَمَاٌ: پیاس کی تکلیف۔ چنانچہ تبوک کے سفر میں پیاس کی یہ حالت تھی کہ بعض لوگ اپنا اونٹ ذبح کر کے اس کے اوجھ سے پانی نکال کر پی لیتے۔

ii۔ نَصَبٌ: مشقت کی تکلیف کی یہ حالت تھی ایک اونٹ پر دس آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔

iii۔ مَخْمَصَةٌ: بھوک کی تکلیف کا یہ عالم تھا کہ ایک ہی چھوارہ کئی لوگ چوستے۔ ایک شخص کو ایک چھوارہ بھی کھانے کو نہیں ملتا تھا۔

iv۔ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا: وہ نہ ایسا قدم اٹھائیں گے جو دشمنوں کو ناگوار گزرے۔ یعنی یہ مجاہدین ایسی

---

[1] ۳۳ احزاب: ۶

چیزوں کوروند ڈالتے ہیں جو دشمن کو ناگوار گزرے چونکہ اس سے ان کی نخوت کی پامالی ہوتی ہے۔

v۔ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا: نہ ہی کسی دشمن سے انہیں کوئی گزند پہنچتی ہے۔ مثلاً زخمی وقتل ہونا، قیدی بن جانا اور کبھی شکست کھانا پڑے۔ واضح رہے نیل بمعنی ''گزند'' لینے سے سیاق آیت کے ساتھ سازگاری ہو جاتی ہے اور اس کو ''حاصل کرنے'' یعنی غنیمت حاصل کرنے کے معنوں میں لیا جائے تو ربط کلام ٹوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ پیاس، مشقت، بھوک کے ساتھ غنیمت کا حصول بے جوڑ ہے۔

vi۔ اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ: ان تمام تکلیفوں اور کارناموں کے عوض اللہ تعالیٰ ان کے لیے عمل صالح کا درجہ ثبت فرمائے گا۔

اہم نکات

۱۔ جب تک انسان رسول کریمؐ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز نہ سمجھے وہ مسلمان نہیں ہے۔ (حدیث): لَا يَرْغَبُوْا....

وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

۱۲۱۔ (اسی طرح) وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں خواہ چھوٹا ہو یا بڑا یا اور جب کوئی وادی (بغرض جہاد) پار کرتے ہیں تو یہ سب ان کے حق میں لکھ دیا جاتا ہے تاکہ اللہ انہیں ان کے اچھے اعمال کا صلہ دے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً: جہاد فی سبیل اللہ میں اللہ کے نزدیک تھوڑے اور زیادہ میں فرق نہیں ہے۔ یہ فرق احتیاج رکھنے والوں کے لیے ہوتا ہے۔ زیادہ سے، زیادہ احتیاج دور ہوتی ہے اور تھوڑے سے، تھوڑی۔ خدائے بے نیاز نیتوں کا جاننے والا ہے۔ وہ کھجور کے ایک دانے کو احسن عمل میں شامل کر لیتا ہے۔

۲۔ وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا: بے آب و گیاہ وادیوں میں سخت گرمی کی حالت میں سفر کرنا، وہ بھی کبھی پیدل کبھی سوار، خود اپنی جگہ بڑا جہاد ہے۔

۳۔ اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ: یہ اعمال ان کے حق میں ثبت ہو جائیں گے تاکہ اللہ انہیں جزا دے۔

۴۔ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: احسن العمل کی نشاندہی ہے کہ راہ خدا میں جہاد کرنا بہترین

اعمال میں سے ہے۔

اہم نکات

۱۔ مجاہد کا ایک چھوٹا عمل بھی احسن عمل میں شامل ہوتا ہے: نَفَقَةً صَغِيْرَةً ...۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۭ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآىِٕفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿١٢٢﴾

۱۲۲۔ اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب کے سب مؤمنین نکل کھڑے ہوں پھر کیوں نہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے تا کہ وہ دین کی سمجھ پیدا کریں اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آئیں تو انہیں تنبیہ کریں تا کہ وہ (ہلاکت خیز باتوں سے) بچے رہیں۔

تشریح کلمات

لِيَنْفِرُوْا: نَفَرَ (ن ف ر) اگر مِنْ اور عَنْ کے ساتھ نفر منه او عنه تو دوری اور متفرق ہونے کے معنی میں ہے اور اگر اِلَی کے ساتھ نَفَر اليه تو نکلنے اور روانہ ہونے کے معنی میں ہے۔

كَآفَّةً: (ك ف ف) سب کے سب اور تمام کے معنی میں ہے۔

لولا: اس آیت میں یہ لفظ تشویق و ترغیب کے لیے ہے۔

لِّيَتَفَقَّهُوْا: الفقه (ف ق ه) العلم بالشئ کسی چیز پر علم اور فہم کے معنی میں ہے۔

تفسیر آیات

۱۔ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً: سب مؤمنین پر نکلنا واجب نہیں ہے۔ اس کی دو تفسیریں ہیں:

الف: یہ جہاد سے مربوط ہے کہ تمام مؤمنین پر جہاد کے لیے نکلنا واجب نہیں ہے بلکہ ہر گروہ اور قبیلے سے ایک جماعت جہاد پر نکلنے کی بجائے دینی تعلیم کے لیے نکلے۔ اس صورت میں دینی تعلیم حاصل کرنے والوں پر دوران تعلیم جہاد واجب نہیں ہے۔

ب: یہ آیت دینی تعلیم کے لیے ایک دستور ہے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا سب مؤمنین دینی تعلیم کے لیے نکلیں۔ ایسا کرنے سے نظام زندگی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کیوں نہ ان کے ہر گروہ اور قبیلے سے ایک جماعت علمی مراکز کی طرف سفر کرے کہ دینی تعلیم حاصل کر کے واپس آئے اور اپنی قوم کو تعلیم دے۔

جہاد اور تعلیم کے لیے ایک تعبیر نفر استعمال کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ تعلیم بھی جہالت کے خلاف ایک جہاد ہے نیز اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ حصول تعلیم کے لیے وطن سے دور جانا پڑے تو جانا ہوگا۔

۲۔ فَلَوۡلَا نَفَرَ :لو لا چونکہ تشویق اور ترغیب کے لیے ہے لہٰذا اس سے طلب علم کے لیے نکلنا واجب ثابت ہوتا ہے۔ جیسے

لَوۡلَا تَسۡتَغۡفِرُوۡنَ اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ○[1] تم اللہ سے مغفرت کیوں طلب نہیں کرتے ہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

یعنی استغفار کرو تم پر رحم کیا جائے گا۔ البتہ علم کے لیے نکلنا واجب کفائی ہے کہ کچھ لوگوں کے انجام دینے سے باقی سے ساقط ہو جاتا ہے۔

۳۔ لِّیَتَفَقَّهُوۡا فِی الدِّیۡنِ: تا کہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں۔ دین کی سمجھ حاصل کرنا تو سب پر واجب ہے لیکن تعلیم کے لیے سفر کرنا سب کے لیے ممکن نہیں ہے تو ایک جماعت یہ فریضہ انجام دے اور سفر کر کے دینی تعلیم حاصل کرے، واپس آنے پر دوسروں کو دینی تعلیم دے اور دوسروں پر واجب ہے کہ وہ ان سے دینی تعلیم حاصل کریں۔

الفقہ قرآنی اصطلاح میں مطلق سمجھ اور فہم کے لیے استعمال ہوتا ہے:

قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّفۡقَهُوۡنَ ○[2] ہم نے سمجھنے والوں کے لیے نشانیاں تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں۔

لہٰذا اس آیت میں اصول و فروع، حلال و حرام پر مشتمل تمام دینی تعلیمات کی فہم مراد ہے۔ بعد میں فقہاء کی اصطلاح میں فقہ کا لفظ حلال و حرام کے لیے مختص ہو گیا۔

۴۔ وَلِیُنۡذِرُوۡا قَوۡمَهُمۡ : دینی سمجھ حاصل کرنے والوں پر واجب ہے کہ وہ اپنی قوم، جس معاشرے میں وہ رہتے ہیں، کے لیے دینی احکام بیان کریں۔ یہاں لِیُنۡذِرُوۡا میں انذار (تنبیہ) کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ جن احکام کو یہ لوگ بیان کریں گے ان پر عمل کرنا واجب ہے ورنہ انذار (تنبیہ) بے سود ہو گی۔

۵۔ لَعَلَّهُمۡ یَحۡذَرُوۡنَ: تا کہ وہ بچے رہیں، سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ان کے بیان کردہ احکام پر عمل کرنا واجب ہے۔

اہم نکات

۱۔ دینی تعلیم حاصل کرنے والی جماعت پوری قوم کی طرف سے واجب کفائی بجا لا رہی ہوتی ہے:

---

[1] ۲۷ نمل: ۴۶ [2] ۶ انعام: ۹۸

فَلَوۡلَا نَفَرَ مِنۡ کُلِّ فِرۡقَۃٍ ....

۲۔ ہر قوم کو اس کے علاقے میں دینی تعلیم کی سہولت میسر آنی چاہیے: لِّیُنۡذِرُوۡا قَوۡمَہُمۡ اِذَا رَجَعُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ ....

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ یَلُوۡنَکُمۡ مِّنَ الۡکُفَّارِ وَ لۡیَجِدُوۡا فِیۡکُمۡ غِلۡظَۃً ؕ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۲۳﴾

۱۲۳۔ اے ایمان والو! ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے نزدیک ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر ٹھوس شدت کا احساس کریں اور جان رکھو اللہ متقین کے ساتھ ہے۔

تشریح کلمات

غِلۡظَۃً: (غ ل ظ) شدت طاقت ور (غلاظ شداد)

تفسیر آیات

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر سرحدی علاقے کے لوگوں پر واجب ہے کہ اپنا دفاع کرتے ہوئے قریب کے کافروں سے جنگ کریں اگر علاقے میں اسلام خطرے میں پڑ جائے۔[1]

اس سلسلے میں اس بات تاکید ہوئی کہ وَلۡیَجِدُوۡا فِیۡکُمۡ غِلۡظَۃً دشمن کو یہ محسوس ہونا چاہیے کہ تم اپنے مؤقف میں کسی قسم کی کوئی لچک نہیں رکھتے۔ نہ سودا بازی ہوسکتی ہے، نہ کوئی سازش کامیاب ہوسکتی ہے۔ دشمن ہمیشہ اپنے مدمقابل کا کمزور پہلو تلاش کرتا ہے۔ اسی سے وہ حملہ کرتا ہے اور جب وہ یہ دیکھے کہ مسلمانوں میں کوئی کمزور پہلو نہیں ہے، وہ ناکام ہوجائے گا۔

واضح رہے غِلۡظَۃً کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان تندخوئی، بدمزاجی اور بداخلاقی سے پیش آئے بلکہ غِلۡظَۃً یہ ہے کہ جرات و بہادری اور سازش ناپذیری سے پیش آئے۔

اہم نکات

۱۔ دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں ہمارے معاصر مسلمانوں کی ناکامی اسی ٹھوس مؤقف کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

وَ اِذَا مَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَۃٌ فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ

۱۲۴۔ اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان

---

[1] طوسی۔ التبیان ۵: ۳۲۴

يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

میں سے کچھ لوگ (از راہ تمسخر) کہتے ہیں: اس سورت نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا ہے؟ پس ایمان والوں کے ایمان میں تو اس نے اضافہ ہی کیا ہے اور وہ خوشحال ہیں۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

۱۲۵۔ اور البتہ جن کے دلوں میں بیماری ہے ان کی نجاست پر اس نے مزید نجاست کا اضافہ کیا ہے اور وہ مرتے دم تک کفر پر ڈٹے رہے۔

تفسیر آیات

۱۔ وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ: منافقین اپنے دل کی کیفیت پر دوسروں کو قیاس کرتے ہوئے یہ خیال کرتے تھے کہ جس طرح ان کے دلوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے، کسی کے دل پر بھی اس کا کوئی اثر مترتب نہیں ہو رہا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس تصور کی رد میں فرمایا کہ سارے دل یکساں نہیں ہوتے۔ قرآن اگرچہ سب کے لیے ہدایت ہے لیکن اس سے فیض لینے والے یکساں نہیں۔ آفتاب سب کو نور دیتا ہے، بارش سب کو فیض دیتی ہے لیکن فیض لینے والے یکساں نہیں ہوتے۔ مؤمن کا دل زرخیز ہوتا ہے۔

۲۔ وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ: اس پر قرآنی بارش جس قدر زیادہ ہوگی، اتنی ہی اس میں شادابی آئے گی۔

۳۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: جب کہ منافق کا دل شورہ زار ہے۔ اس پر قرآنی بارش جس قدر زیادہ برسے گی، اتنا ہی اس کی شورہ زاری میں اضافہ ہوگا۔ ہر جدید سورہ ایک معجزہ، ایک رہنمائی ایک حیات بخش دستور لے کر آتا ہے تو مؤمن کا دل ایمان کے نور سے اور منور ہوتا ہے۔ جب کہ کافر پہلے بھی شک میں تھا، جدید سورے میں بھی شک کرتا ہے تو اس کے شک اور خباثت میں اور اضافہ ہوتا ہے۔

اہم نکات

۱۔ قرآن سے مؤمن کے ایمان اور منافق کے شک میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲۔ دل کی بیماری سخت تر، اس کا علاج مشکل، اس کی دوا کمیاب اور اس کے طبیب کمیاب ہوتے ہیں۔

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

۱۲۶۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ انہیں ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالا جاتا ہے؟ پھر نہ تو وہ توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی عبرت حاصل کرتے ہیں۔

تفسیر آیات

سال میں ایک یا دو مرتبہ ایسے واقعات سامنے آتے رہے ہیں جن سے ان کا ضمیر فاش اور ان کا پردہ چاک ہوتا رہا ہے۔ کبھی ان کے مفادات اور خواہشات کے خلاف کوئی حکم آتا ہے۔ کبھی کوئی جنگ پیش آ جاتی ہے، جس سے ان کے دعوائے ایمان کا پول کھل جاتا ہے۔ کبھی خدا و رسولؐ کے مقابلے میں ان کے تعلقات و روابط آ جاتے ہیں۔ ایسے مواقع میں ان کی حقیقت کھل کر سامنے آتی رہتی ہے لیکن یہ توبہ کرتے ہیں، نہ عبرت لیتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ جس کے دل میں ایمان کا شائبہ نہ ہو، اس میں شرم و گناہ کا احساس نہیں ہوتا: لَا یَتُوۡبُوۡنَ وَلَا ہُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ۔

۲۔ آزمائش اللہ کی طرف متوجہ ہونے اور عبرت لینے کے لیے ہوتی ہے: ثُمَّ لَا یَتُوۡبُوۡنَ وَلَا ہُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ۔

وَ اِذَا مَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَۃٌ نَّظَرَ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ ؕ ہَلۡ یَرٰىکُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ ثُمَّ انۡصَرَفُوۡا ؕ صَرَفَ اللّٰہُ قُلُوۡبَہُمۡ بِاَنَّہُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَفۡقَہُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾

۱۲۷۔ اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں کہ کوئی تمہیں دیکھ تو نہیں رہا؟ پھر نکل کر بھاگتے ہیں، اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر رکھا ہے کیونکہ یہ ناسمجھ لوگ ہیں۔

تفسیر آیات

۱۔ نَّظَرَ بَعۡضُہُمۡ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں حاضر منافقوں کی منافقانہ روش کا ذکر ہے کہ جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے حاضرین کو پڑھ کر سنا دیتے ہیں تو جہاں مؤمنین کے دل خشوع و خضوع سے سرشار ہوتے ہیں، منافقین کے چہروں پر اضطراب اور شکوک و شبہات کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ نَّظَرَ بَعۡضُہُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ اور وہ آپس میں نگاہوں میں ایک دوسرے سے یہ کہ رہے ہوتے ہیں ہَلۡ یَرٰىکُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ کہ کہیں ہماری اس کیفیت کو کوئی دیکھ تو نہیں رہا، پھر وہ اس مجلس سے کھسک جاتے ہیں۔

۲۔ ثُمَّ انۡصَرَفُوۡا: وہ رسولؐ کی محفل سے اس لیے کھسک جاتے تھے کہ یا تو نورانی محفل میں منافق کو سکون نہیں ملتا یا اس لیے کہ بعض آیات کی تلاوت سے ان کے چہروں پر انکار و اضطراب کے آثار نمایاں ہونے تھے، اس کے فاش ہونے کے خوف سے کھسک جاتے تھے۔

۳۔ صَرَفَ اللّٰہُ قُلُوۡبَہُمۡ: منافقین کے اپنے جرائم کے نتیجہ میں اللہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ نتیجتاً ان کے دل راہ حق سے پھر جاتے ہیں۔

اہم نکات

۱۔ منافق کو ایمانی محفلوں میں چین نہیں آتا: انۡصَرَفُوۡا ....

لَقَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ عَزِیۡزٌ عَلَیۡہِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِیۡصٌ عَلَیۡکُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۲۸﴾

۱۲۸۔ بتحقیق تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہے، تمہیں تکلیف میں دیکھنا ان پر شاق گزرتا ہے، وہ تمہاری بھلائی کا نہایت خواہاں ہے اور مومنین کے لیے نہایت شفیق مہربان ہے۔

تشریح کلمات

عَنِتُّمۡ: (ع ن ت) المعانتۃ ایسے عناد کو کہتے ہیں جس میں خوف اور ہلاکت کا پہلو بھی ہو۔

عَزِیۡزٌ: (ع ز ز) عزّ علیّ کذا۔ یعنی مجھ پر یہ بات نہایت ہی گراں گزری۔

تفسیر آیات

سورۂ براءت میں آیات کا ایک سلسلہ منافقین اور کافرین کے خلاف جاری رہا۔ ان کے خلاف سخت رویہ اختیار کرنے اور ان کی ہر سازش کو ناکام بنانے کی بڑی تاکید فرمائی۔ اس کے بعد اپنے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کا پہلو اجاگر کرنا مناسب تھا کہ منافقین کے خلاف یہ رویہ اس لیے ہے کہ وہ رحمت حق اور رحمت رسولؐ کے لیے اہل نہیں ہیں۔ خدا ارحم الراحمین ہے اور رسول رحمۃ للعالمین ہیں لیکن یہ منافقین اس رحمت میں شامل حال ہونے کی اہلیت اور ظرفیت نہیں رکھتے ورنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاق یہ ہے:

i۔ تم کو تکلیف اور ضرر میں دیکھنا ان پر شاق گزرتا ہے۔ ان کا وجود مبارک رحمت و رأفت کے اس مقام پر فائز ہے کہ ایک شخص رسولؐ کی دشمنی اور ضد میں اپنے آپ کو گمراہ کرتا اور ہلاکت میں ڈالتا ہے تو بشری تقاضائے انتقام تو یہ ہے کہ دشمن کے ہلاک اور ذلیل ہونے پر خوش اور مطمئن

ہونا چاہیے لیکن رسول نہ خوش ہوتے ہیں نہ مطمئن بلکہ ان پر شاق گزرتا ہے۔

ii۔ حَرِیۡصٌ عَلَیۡکُمۡ : یہ رسولؐ تمہاری بھلائی کے نہایت حریص ہیں۔ حریص و آرزومند رہتے ہیں کہ تم مؤمن بن جاؤ، اللہ کی خوشنودی تمہیں حاصل رہے، جنت میں تمہاری جگہ بنے اور دنیا میں ہمیشہ سر بلند رہو۔ جاہل انسان اس سے دور بھاگتا ہے اور رسولؐ اسے نزدیک لانا چاہتے ہیں۔ گویا کہ رسولؐ کو اس سے کام ہے حالانکہ اس کو رسولؐ سے بہت کچھ مل سکتا تھا۔

iii۔ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ : مؤمنین کے لیے نہایت شفیق و مہربان ہیں۔ یہ خیال نہ گزرے کہ رسولؐ مؤمنین کو مشکلات اور مصائب میں ڈالتے ہیں، ان پر مہربان نہیں ہیں کیونکہ مشکلات میں انسان کے کمالات نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ مصائب سے انسان چٹان کی طرح مضبوط ہو جاتا ہے اور اس کے ایمان کی پختگی کی رسولؐ سے سند اور سعادت ابدی کی راہداری مل جاتی ہے۔

اہم نکات

۱۔ اس امت پر اغیار کی بالادستی ہوتی ہے تو یقیناً رسولؐ پر شاق گزرتا ہے۔

۲۔ دنیا کا کوئی سربراہ ایسا نہیں گزرا جس میں اپنی قوم و امت کے لیے اتنی مہر و شفقت موجود ہو۔

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِیَ اللّٰہُ ۫٭ۖ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ وَ ہُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۱۲۹﴾

۱۲۹۔ پھر اگر یہ روگردانی کریں تو آپ کہد یجیے: میرے لیے اللہ ہی کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی پر میرا بھروسہ ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

تفسیر آیات

اس رحمت و رأفت اور شفقت و مہربانی کے باوجود اگر یہ ناقدرے آپؐ سے روگردانی کریں تو آپؐ کہد یجیے: میرے لیے وہ ذات کافی ہے جو اس کائنات کا واحد معبود ہے۔ اسی پر توکل کرتا ہوں۔ اپنے امور کو اپنے مولیٰ کے حوالے کرتا ہوں کیونکہ وہی اس کائنات کا صاحب اقتدار اعلیٰ ہے۔

اہم نکات

۱۔ دیگر علل و اسباب کے منقطع ہونے کی صورت میں عرش عظیم کا مالک کافی ہوتا ہے اگر انسان اس پر توکل کرے: فَقُلۡ حَسۡبِیَ اللّٰہُ ....

فہرست مطالب

سورة الاعراف

سورۃ الانفال

سورۃ البرائۃ

☆☆☆☆☆